THE HAREEM

Feb. 81

Rs. 1.20

گزشتہ ۵۰ سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والا
ہندوستان کا سب سے قدیم اردو رسالہ

ماہنامہ حریم لکھنؤ

جلد (۵۹) • نمبر شمارہ (۲)

بیادگار ۔ سیّد محمد سلیم امہٹوی مرحوم
شفیق النساء بیگم سلیم امہٹوی مرحوم

مدیر و نگراں نسیم امہٹوی
معاون ۔ شوکت جہاں بیگم • جانی بیگم ردولوی
منیجنگ مدیر ۔ فہیم امہٹوی

قیمت سالانہ (اعزازی) منی آرڈر سے پچیس روپے
مخصوص خریداری ۔ منی آرڈر سے تیئیس روپے
معمولی خریداری ۔ منی آرڈر سے بیس روپے
وی، پی سے رسالہ منگوانے پر چار روپے زائد
غیر ممالک سے (سی میل سے) ۴۵ روپے
ایرمیل سے مختلف ملکوں کے لئے مختلف شرحیں
فی پرچہ :- ایک روپیہ پچیس پیسے
مقام اشاعت و ترسیل ۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ
مالکان ۔ نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

فہرست مضامین ماہ فروری سنہ ۱۹۸۱ء

ایڈیٹر پبلشر فہیم امہٹوی نے سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں باہتمام سید انصار حسین چھپوا کر دفتر حریم ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

لمعات

حریم کے یہ لمعات بہن عفت موہانی نے لکھے ہیں جس کی درخواست میں نے ان سے کی تھی اس لئے کہ تعریف کے باوجود مجھ سے کچھ لکھا نہیں جاتا۔ امید ہے حریم کی بہنیں اسے پسند کریں گی۔

[illegible]

"ملک الایام نداولها بین الناس" زمانہ عوام الناس کے درمیان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس مختصر سی آیت میں انقلابات زمانہ کے بڑے بڑے عبرت آمیز واقعات پوشیدہ ہیں۔ کوئی سی تاریخ اٹھا کے دیکھ لیجئے۔ ہر ورق اور ہر نئے باب میں کسی نہ کسی انقلاب کی داستان ضرور نظر آئے گی۔ انقلاب چاہے خوشگوار ہو کہ ناگوار انسان کے اپنے ہاتھوں آتا ہے۔ آدمی عالم الغیب نہیں۔ انسان کو یہ تک پتہ نہیں کہ اس کی زندگی کا دوسرا لمحہ اس کے لئے کیا لائے گا۔

لیکن وہ آدمی جو سمجھ بوجھ رکھتا ہے اسے یہ تو علم ہوتا ہی ہے کہ وہ اپنے اچھے یا برے وقت کے لئے بادل ناخواستہ ہی تیار رہے! دنیا کے انقلابوں کو دور رکھئے۔ ہم اگر اپنا، اپنے خاندان کا یا صرف اپنے گھر کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ غیر محسوس طریقے سے وہ انقلاب گھر میں آچکا ہے جو اگر منہ سے کہہ کے آتا تو ہم ہرگز اس کی پذیرائی کے لئے آمادہ نہ ہوتے۔ بیرونی ردوبدل کا اثر اندرونی ماحول پر پڑنا ایک قدرتی بات ہے۔ گرانی، نئی نئی بیماریاں، فلم بینی کا بڑھتا ہوا شوق، قوت خرید میں بے تحاشہ اضافہ، آمدنی میں کمی، کنبہ کے افراد میں زیادتی، مجلسی زندگی میں [illegible] آخر ہمیں کس رخ پر بہائے لئے جارہا ہے۔ بیشتر چیزیں ہماری زندگی میں ناگزیر ہیں۔ مثلاً پیدائش، ناگہانی بیماری اور اموات۔ ان سب پر اسی صورت میں قابو حاصل کیا جاسکتا ہے کہ ہم اپنی اس روایتی چادر کا جائزہ لیں جس میں ہمیں پاؤں پھیلانا ہیں۔ فضول خرچی سے احتراز، اور کفایت شعاری کا لزوم ہی اس فکر کا مؤثر علاج ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی جائز ضرورتوں کا گلا گھونٹ دیں۔ فضول خرچی ایک مرض ہے۔ آج جو چیز ہم بے حد شوق سے خواہ مخواہ روپیہ پھینک کر لے آتے ہیں وہ کچھ ہی دنوں بعد دل سے اتر جاتی ہے۔ جو چیز ضروری اور لازمۂ حیات نہ ہو۔ اس کے لئے روپیہ برباد کر دینا [illegible] بیدردی ہے۔ اگر کسی سے کفایت شعاری کے فوائد پر بحث کیجئے تو یہ جواب سننے کو مل سکتا ہے کہ بادشاہوں کی سلطنتیں نہ رہیں۔ اگر ہم تھوڑا بہت کچھ پس انداز کرلیں گے تو کون سا قلعہ کھڑا کرلیں گے۔ کیا روپیہ پیسہ قبر میں ساتھ جائے گا۔ لہذا کھاؤ پیو موج اڑاؤ۔ دنیا میں بار بار تو آنا نہیں ہے کہ بس ترس ترس کے جی رہے۔ [illegible] یہ بات بھی شاید ان لوگوں کے لئے صحیح ہے جن کی آمدنی زیادہ ہے۔ جو ہنگامی خواہشوں پر پیسہ پھونک سکتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کی نقل میں جو لوگ محدود آمدنی رکھ کے آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی ضروری وقت پر بہت پریشانی اٹھاتے ہیں۔ اکثر یہ تجربہ شاہد ہے کہ برے وقت پر قرض بھی نہیں ملتا۔ ہاتھ پھیلانے کے بعد بھی شرمندگی اور خجالت اٹھانی پڑتی ہے۔ کئی گھرانے ایسے ہیں جہاں اگر شوہر فضول خرچ ہے تو بیوی بھی فضول خرچ ہی ہے۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کتنی فضول خرچی کرتے ہیں۔ کسی معمولی سی پارٹی یا بڑی دعوت کے موقعہ پر اتنی چیزیں تیار کرلی جاتی ہیں جو بعض وقت خراب ہو کر پھینک دی جاتی ہیں۔ فلم بینی کھانے پینے کی طرح بے حد ضروری ہوگئی ہے۔ چھ سات سہیلیاں ساتھ جاتی ہیں۔ ٹکٹوں کا بار کسی ایک پر پڑتا ہے۔ اگر ٹکٹ مقررہ ریٹ پر نہ مل سکے تو چوگنے داموں پر خریدے جاتے ہیں کہ تھیٹر سے بے نیل و مرام واپسی ہم چشموں میں ذلت اور خفت کی بات ہے۔ منہ دکھانے کی گنجائش تو رہے کہ تین روپیہ کا ٹکٹ بڑی شان سے نو روپیے میں بلیک لیا مگر بھی پہلے

کو میں نیا کھیل دیکھ تو لیا۔ یہ کتنی بڑی بیدردی ہے اپنے ساتھ، ——— اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ یہ روپیہ جو وقتی شوق پر صرف ہوا۔ کبھی آپ کے یا آپ کے بچوں کے کام آسکتا تھا۔ ! اور آپ کا ضمیر جو مسلسل نیش زنی کرتا ہے وہ نہایت تکلیف دہ ہے۔

آمدنی جتنی ہو اگر اسی میں خرچ ہو تو ہم بڑی پریشانی سے بچ رہتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی خواہشوں کو دبا سکیں جو بے ضرورت ہے۔! فضول خرچی کا اثر بچوں پر بھی ہوتا ہے آہستہ آہستہ بچوں کی عادتیں پختہ ہو جاتی ہیں۔ اور وہ کبھی اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لئے کوئی سا جائز یا ناجائز حصول اختیار کرنے میں نہیں شرماتے!۔

یہ کام ایک عورت کا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی آمدنی کو کیسے استعمال کرتی ہے۔ اگر شوہر کی آمدنی کم ہو تو ایک ہمدرد عورت گھر میں چھوٹے موٹے کام کر کے شوہر کے ہاتھ مضبوط کر سکتی ہے۔ ایک مختصر سے کنبہ کو دیکھا کہ شوہر کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ اخراجات کو کور نہ کر سکتی تھی۔ بیوی نے گھر میں چھوٹا سا مکتب کھول لیا۔ محلے کے بچوں کو ابتدائی کتابیں پڑھا کر وہ مہینے بھر بعد اتنا روپیہ پیدا کر لیتی تھی کہ کم از کم مہینے بھر کے لئے روزمرہ کا خرچ تو فراہم کر سکے۔

بیماری، پیدائش اور اموات۔ یہ بنیادی ضرورتیں ہیں۔ جس کے لئے سب کو تیار رہنا چاہیئے۔ بعض بیماریاں بہت خرچ طلب ہوتی ہیں اگر آپ کفایت شعار نہیں ہیں۔ اگر آپ نے کچھ بھی پس انداز نہیں کیا ہے۔ اور اچانک ایسی شدید ضرورت آپڑے تو کتنی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل اموات ناگہانی ہونے لگی ہیں۔ ایک صبح جو صحت مند آدمی چلتا پھرتا نظر آتا ہے ——— دوسری صبح وہ کندھوں پر دکھائی دیتا ہے۔ ایسے وقت کے لئے اگر کچھ جمع جتھا نہ ہو تو ظاہر ہے کہ رنج و غم کے ساتھ ساتھ زندوں کو بھی خودکشی کے امکانات پر غور کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح خواتین محض ناک نہ کٹنے کے خیال سے شادی بیاہ کے تقلیدی جہل رسوم پر بدریغ روپیہ لٹانا اپنی شان سمجھتی ہیں۔ فی زمانہ جوڑے گھوڑے کی لعنت سے نجات نہیں ہے۔ حسب حیثیت جہیز تیار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے جہیز ماں باپ پر ایک فرض ہے جسے وہ فرض کا نام دے کر طوعاً و کرہاً ادا کرتے ہی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کبھی مصنوعی وقار کی نمائش کی خاطر جو بے تکان روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ ہرگز قابل ستائش نہیں۔ لوگ جائیدادیں فروخت کرتے ہیں۔ آبائی مکان رہن کر دیتے ہیں۔ اور چند لمحوں کی واہ واہ کے لئے اپنے واسطے عمر بھر کی ہائے ہائے خرید لیتے ہیں شادیاں بھی ایک اہم فرض کی طرح کرنی چاہئیں۔ اپنی حد کے اندر رہ کے۔ دانشمندی سے کام لے کر جس قدر روپیہ آپ بچائیں گی وہ کسی اہم وقت پر ضرور آپ کے کام آئے گا

ہمارے معاشرے میں چند مذموم رسمیں شرعی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ رسم تسمیہ خوانی، عقیقہ، بے شک شرعی ہیں لیکن ان پر بے جا صرف کرنا ہرگز شرع نے نہیں سکھایا۔ اس کے علاوہ کن چھیدن، سالگرہ، مانجھا، ساچق، مہندی ——— اور چوتھی وغیرہ ایسی رسمیں ہیں جو صرف خواتین نے مرتب کر لی ہیں اور محض تفریح کی خاطر ان رسموں پر جو خرچ کیا جاتا ہے وہ ہرگز ہرگز عقلمندی، کفایت شعاری اور عاقبت اندیشی نہیں کہلایا جا سکتا!!

سالنامہ کی اشاعت میں تاخیر

ہمیں بیحد افسوس کہ ہر کوشش کے باوجود سالنامہ حریم ۱۹۸۱ء حسب سابق بروقت نہ نکل سکا۔ جس کا سبب یہ تھا کہ لکھنؤ کے اس حصّہ شہر میں، جہاں کاتب رہتے ہیں اور جہاں سرفراز پریس ہے، شیعہ سنی مناقشہ کے تحت چند روز کے لئے شب و روز کرفیو لگا رہا۔ پھر اس میں نرمی ہو گئی لیکن جو کاتب سالنامہ کی کتابت کر رہے تھے وہ خوفزدہ ہو کر شہر سے باہر چلے گئے۔ سالنامہ کا جو مسودہ ان کے پاس تھا وہ بھی انھوں نے واپس نہیں کیا۔ اس لئے ہم مجبور ہو گئے۔ ان کی واپسی پر کتابت مکمل ہوئی تو بجلی کی کمیابی

کے باعث پریس ہفتہ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کر سکا ہر کوشش کے بعد سالنامہ کی طباعت ۱۴ جنوری کو ختم ہوئی اور ۱۵ کو ہم معمولی ڈاک کے پرچے سپرد ڈاک کر سکے۔ اس کے بعد آٹھویں اور نویں ربیع الاول کے سلسلہ میں بائنڈر کا کارخانہ بند رہا، جس سے مزید جلد سازی نہ ہو سکی اور جب جلد سازی ہوئی تو وی پیوں اور رجسٹریوں کی ترسیل کا سلسلہ ۱۷ جنوری سے شروع کیا گیا، لیکن ۱۸ کو اتوار اور ۱۹ کو بارہ ربیع الاول کے باعث ڈاک خانہ بند رہا۔ وی۔ پی اور رجسٹری کا کام بند رہا۔ پھر ۲۰ جنوری سے شروع کیا گیا جو ۲۲ کو مکمل ہو سکا۔

۱۵ کو جو سالنامے معمولی ڈاک سے روانہ کئے گئے ہیں وہ ۲۰ سے پہلے قریبی مقامات میں کبھی ڈلیور نہ ہو سکیں گے اور دور دراز کے مقامات اور قصبات میں یہ پرچے ۳۰ جنوری سے پہلے شاید ہی پہنچ سکیں اس تاخیر سے نہ صرف صدہا حریمی بہنوں کو شکایتی خطوط لکھنا پڑیں گے بلکہ ذہنی تکلیف بھی ہو گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ سالنامہ کا کس بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے، لیکن جو مجبوریاں لاحق تھیں ان کے تحت آپ سب ہمیں معاف کر سکتی ہیں۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ حریم وقت مقررہ پر شائع ہو، لیکن چند ماہ سے بجلی اور پریس وغیرہ کی دشواریوں کے باعث چند روز کی تاخیر ہو جاتی ہے اور اس سے بھی زیادہ تاخیر کا موجب پوسٹ آفس کا موجودہ نظام جو اخبار و رسائل تو در کنار تار بھی بروقت نہیں پہنچتا۔ اکثر مہمان کی آمد کی اطلاع کا تار ان کے رخصت ہو جانے کے بعد پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ٹیلیگراموں کی ڈلیوری کا یہ حال تو اخبار و رسائل کس شمار میں ہیں۔

غور کرنے کی بات

بعض حریمی بہنیں یہ شکایت کرتی ہیں، ان کے شہر یا قصبے میں دوسرے خریداروں کے پاس حریم آ جاتا ہے مگر ان کو اس وقت تک نہیں ملتا، جب تک کہ وہ دفتر کو شکایت نہ لکھیں۔ ایسی بہنوں کو غور کرنا چاہیئے کہ ان سے ہمیں کوئی عداوت تو ہوتی نہیں کہ انھیں حریم نہ بھیجیں اور پھر شکایت کے بعد تو بھیجا ہی جاتا ہے۔ اس میں ہمارا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ حریم کے تمام ریپر لکھے جانے کے بعد دو آدمی رجسٹر سے ملاتے ہیں، اس کے بعد روانگی عمل میں آتی ہے۔ اس کے باوجود بعض بہنوں کو سال میں بہت سے پرچے پہلی ترسیل میں نہیں ملتے۔ کیوں نہیں ملتے، یہ ہم خود نہیں سمجھ پائے۔ اکثر بہنیں لکھتی ہیں کہ انھیں ہر ماہ پندرہ پیسے کا کارڈ لکھنا پڑتا ہے، ایسی بہنوں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ انھیں تو پندرہ ہی پیسے صرف کرنا پڑتے ہیں، ہم تو ایک روپیہ تیس پیسے کا پرچہ بھیجتے ہیں۔

سپرانٹنڈنٹ پوسٹ آفیسر سے

لکھنؤ پی۔ ایس۔ او (پریس سارٹنگ آفس) اب قلب شہر سے ہٹا کر شہر کے باہر موتیا میں قائم کر دیا گیا ہے جو ان تمام اخبارات و رسائل کے لئے ایک مسئلہ بن گیا ہے جن کے جرائد پی۔ ایس۔ او سے پوسٹ ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے یہ آفس ہیلا و دیالیہ کے سامنے تھا، جہاں ہر طرف کے اخبارات و رسائل آسانی سے پوسٹ ہو جاتے تھے، لیکن اب نہ صرف یہ کہ کافی کرایہ موتیا تک جانے میں صرف ہوتا ہے، بلکہ وقت بھی زیادہ صرف ہوتا ہے۔

دنیا کا ہر محکمہ اخبارات و رسائل کو ہر طرح کی سہولیت بہم پہنچاتا ہے، خود محکمہ پوسٹ بھی رعایتی محصول لیتا ہے، اس لئے محکمہ کا یہ طرز عمل حیرتناک ہے کہ اس نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ انھیں کتنی زحمت ہو گی ہماری درخواست ہے کہ سپرانٹنڈنٹ پوسٹ آفیسر کوشش کر کے اس آفس کو اندرون شہر واپس لائیں تاکہ بچاسوں اخبارات و رسائل کی دشواریاں ختم ہو جائیں۔

کچھ اپنے متعلق

خدا کا شکر ہے کہ ۲۰ روز فریش رہنے کے بعد حریم کی محبت نے میری سانس کی تکلیف کم کر دی اور میں کسی طرح دفتر آنے لگا ہوں۔ ورنہ تو شاید سالنامہ اس سے بھی زیادہ تاخیر سے نکلتا۔ اب میں چند گھنٹے روزانہ دفتر میں کام کرتا ہوں کمزوری کا وہی عالم ہے اس لئے کہ ہم بہت جاتا ہے۔ کھانسی کا بھی زور ہے۔ خون کی افزائش نہیں ہوتی، اس کے باوجود اگر سانس کی تکلیف شدت اختیار نہ کرے تو میں برابر دفتر آتا رہوں۔ دفتر آ کر مجھے بیماری کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ گھر پر لیٹے لیٹے نہ صرف دل گھبراتا ہے کہ بیماری کا ... ان تمام حریمی بہنوں اور بھائیوں کا ...

ظہورِ قدسی

آپؐ رحمۃ اللعالمینؐ بن کر مبعوث ہوئے

(تحریر: سید فضل الرحمان جعفری)

دنیا بڑی بھیانک بن گئی تھی۔ ظلم و عدوان کے ہولناک سائے روئے زمین پر پھیلتے جا رہے تھے۔ ہدایت کی کوئی ہلکی شعاع بھی کہیں موجود نہ تھی اور ظلمت کی ہر طرف حکمرانی تھی۔ یہ اس لئے تھا کہ دنیا چھ سو سال سے آسمانی ہدایت سے محروم تھی۔ اور اللہ کی زمین پر اللہ کا کوئی نبی بھٹکی ہوئی انسانیت کے لئے چراغِ راہ بن کر نمودار نہ ہوا تھا۔ غرض دنیا کے لوگ جہل و گمراہی کی زہرہ گداز اندھیریوں میں زندگی کا بوجھ اٹھائے پھر رہے تھے۔ انسان جانور سے بدتر بن گیا تھا۔ ظلم و جفا کا دور دورہ تھا۔ ہر برائی نیکی بن گئی تھی۔ اور ہر نیکی نے برائی کا روپ دھار لیا تھا۔ لوگ شراب پیتے تھے۔ لڑکے جوا کھیلتے تھے اور ... تھے۔ ہر طاقتور ہر کمزور کے لئے شمشیرِ بے نیام تھا۔ کمزور دل پر ظلم ہوتا تھا لیکن کوئی مظلوم کی فریاد سننے والا نہیں تھا۔ یتیموں کا حق چھین لیا جاتا تھا۔ لیکن کوئی ہاتھ اس کی مدد کے لئے نہ بڑھتا تھا۔ بیواؤں کے ساتھ بڑا نازیبا سلوک ہوتا تھا۔ لیکن کوئی آواز اس کی حمایت میں نہ اٹھتی تھی۔ غرض دنیا کے لوگ ظلم و ستم، اور جور و جفا کی بھٹی میں سلگ رہے تھے۔ اور سب سے زیادہ عرب کا علاقہ ان تمام برائیوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ پھر ایسے ناسازگار اور مایوس کن حالات میں کائنات کے خالق و مالک کو اپنے بندوں پر رحم آیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں اور نوازشوں کی بارش کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ حجاز کی سرزمین پر ایک نبی بھیجا جو خاتم النبیینؐ اور رحمۃ اللعالمینؐ بن کر وادئ مکہ میں مبعوث ہوا۔ یہ پیکرِ رحمت اور خلقِ مجسم ذاتِ عبداللہ کے بیٹے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تھی۔ اور وہ مبارک مہینہ ربیع الاول کا ہے جس کی ۱۲ ربیع کو آپ پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئے۔

آپؐ کی ولادت باسعادت دنیا کی امن و سلامتی کی ضمانت تھی۔ خالقِ حقیقی نے آپؐ کو نبوت کا آخری تاج دے کر بھیجا تھا۔ دین کی تکمیل کی تھی اور اپنی نعمتیں آپؐ پر تمام کی تھیں۔ اور اسلام کو دین کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ چنانچہ وہ آخری آسمانی کتاب اور آخری صحیفۂ ہدایت جو قرآن مجید کی شکل میں آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ اور تاابد موجود رہے گا۔ آپؐ کو عطا فرمایا گیا۔ پھر اسی چراغِ ہدایت اور نورِ مبین کو لے کر آپؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عرب کے بادیہ نشینوں اور وحشیوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سکھائی، اور توحید کا سبق پڑھایا۔ اور اپنی حسنِ تدبیر سے توحید کے مرکزِ اول کو بتوں کی گندگیوں سے پاک کیا۔

آپؐ نے توحید کی آواز وادئ مکہ میں بلند کی اور پھر حق کی یہ آواز صفا کی چوٹیوں سے نکل کر جزیرۃ العرب کے گوشے گوشے میں پہنچی اور پھر عرب و عجم اور صحرائے افریقہ اور چین و ہند میں پھیل گئی۔ ایران میں، روم میں، اور ہندوستان میں روحانی مراکز کی مذہبی حرارت باقی نہ رہی تھی۔ روم و افرنگ اگرچہ اپنے کو مذہب و حکومت کا فرمانروا سمجھتے تھے حق پرستی سے یکسر دور تھے۔ حضرت عیسیٰؑ، مریمؑ اور روح القدس کے مرتبے نے بے شمار فرقوں کو وجود بخشا تھا جن میں باہم آتشِ رقابت بھڑکتی رہتی تھی۔ توحید کا نام و نشان نہ تھا اور اس کی جگہ تثلیث نے لے لی تھی۔ مذہبی پیشوا کلیسا ... عیش و نشاط کے اڈے بن گئے تھے۔ ہندوستان میں بھی توحیدِ خالص کا یکسر فقدان تھا۔ شرک و بدعات عام تھیں۔ کرشن اور گوتم بدھ کا اخلاقی درس دلوں سے فراموش ہو چکا تھا۔ ... باہم ...

انتہائی عروج پر تھی اور معبودوں اور خداؤں کی تعداد کی کوئی حد نہ تھی۔ انسانوں کے درمیان پست و بلند کا بڑا ظالمانہ معیار قائم تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگ ادنیٰ پر غالب اور حکمراں بنے رہتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بڑے بڑے صاحب عزیمت انبیا مبعوث ہوئے۔ بڑے بڑے مصلح اور صالح انسان پیدا ہوئے۔ اور ان سب نے اخلاق و احسان کی صدائیں بلند کیں۔ اور ان کا کچھ اثر بھی لوگوں نے قبول کیا۔ لیکن چشم فلک نے یہ دیکھا کہ انسان نے توحید و اخلاق کی پاکیزہ تعلیمات کو بہت جلد گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیا۔ اور پانچویں صدی عیسوی میں تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی حقیقی خداشناس اور توحید پرست قوم باقی نہ رہی تھی، یہ اسلام ہی کا اعجاز تھا کہ جب مکے کے، ایک امی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا نعرہ بلند کیا تو اگرچہ کفر و شرک کی تمام قوتیں، اس کے خلاف صف آرا ہو گئیں اور اصنام کے پجاری توحید کے پرستاروں پر برق خاطف بن کر گرتے رہے لیکن بالآخر جزیرۃ العرب ہی نہیں بلکہ ایران و ہندوستان۔ روم اور افریقہ تک اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ اور پھر جب بعثت کا مقصد یعنی توحید کی دعوت۔ اور اخلاق کی اصلاح کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافتِ الٰہیہ کی تشکیل کی اور وہ دائمی شریعت اور آسمانی قانون نافذ کر دیا جو انسانوں کی دنیوی فلاح اور اخروی نجات کا ضامن تھا۔ اور وہ دائمی منشور حجۃ الوداع کے موقع پر دنیا کو سنا دیا گیا تھا۔ اس منشور کے بنیادی خد و خال یہ تھے۔

۱۔ ہاں! جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

۲۔ لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں! عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے :

۳۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی جہالت، اور آبا و اجداد پر فخر کو مٹا دیا۔ انسان یا خدا سے ڈرنے والا مومن ہوتا ہے، اس کا نافرمان شقی۔

"تم سب کے سب آدمؑ کی اولاد ہو، اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔"

۴۔ اسلام کے رشتے نے مختلف رنگ و نسل کے انسانوں کو باہم بھائی بنا دیا۔

۵۔ ہر مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہے۔ اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔

۶۔ تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی انھیں کھلاؤ۔ اور جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔

۷۔ جاہلیت کے تمام خون و انتقام، باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان) ربیعہ ابن حارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔

۸۔ جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے اپنے خاندان عباس بن مطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔

۹۔ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو، تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔

۱۰۔ تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے جس طرح یہ دن اس مہینے میں، اور اس شہر میں حرام ہے۔

۱۱۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ چیز کیا ہے؟ "کتاب اللہ"

یہ احکام بیان فرما کر مجمع سے یہ سوال کیا۔

لوگو! میری نسبت تم سے خدا پوچھے گا تو کیا جواب دوگے؟

ایک لاکھ سے زیادہ زبانوں نے ہم آہنگ ہو کر جواب دیا۔

"ہم کہیں گے کہ آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ اور اپنا فرض ادا کر دیا۔"

پھر آپؐ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور فرمایا۔

"اے خدا! تو گواہ رہنا! اے خدا تو گواہ رہنا!"

کچھ کرنا چاہتے ہو تو — غریبوں کی مدد کرو

کہیں جانا چاہتے ہو تو — مقدس مقامات کو جاؤ

اگر کھانا چاہتے ہو تو — غم اور غصہ کو کھاؤ۔

اگر لینا چاہتے ہو تو — والدین کی دعائیں لو

اگر دینا چاہتے ہو تو — خدا کی راہ میں دو

اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو — نیک کام کرو۔

اگر بیٹھنا چاہتے ہو تو — نیکوں کی صحبت میں بیٹھو

اگر بولنا چاہتے ہو تو — سچ بولو۔

مرسلہ:۔ شاہدہ تبسم (صبیحہ تبسم لکھیم پور)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں، سنجیدہ ہو، ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کیا گیا ہو۔ ... تاریخ کے بعد وصول ہونے والے اشعار شائع نہیں کیے جاتے۔ فروری کے لئے عنوان ہے قدرت ... مارچ کے لئے تغافل ـــــــ ادارہ

ہمیں دنیا کو دل کے زخم دکھلانا نہیں آتا
تڑپتا ہوں ولیکن مجھکو تڑپانا نہیں آتا

مرسلہ: مہ جبیں امام میمونہ تسنیم گیہرا (آہبیہ)

جس زخم کی ہو سکتی ہے تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اسے قسمت میں عدو کی

مرسلہ: نجم السحر (کرنول)

سیراب آب تیغ سے ہو کر بہ رنگ گل
ہر ایک زخم عاشق ناکام ہنس پڑا

مرسلہ: مس زاہد النساء (کرنول)

دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

مرسلہ: شادیہ بخاری (حیدرآباد)

دلشاد کے لبوں پہ تبسم ضرور ہے
کھا کھا کے زخم جیتے ہیں کتنی خوشی سے ہم

مرسلہ: مسز آمنہ دلشاد (سکندرآباد)

دل کا ہر زخم چمکتا ہے ستارہ بنکر
آپ کی یاد درخشاں کبھی ایسی تو نہ تھی

مرسلہ: بی آر تسنیم بیگم (وانم باڑی)

چھری کا تیر کا تلوار کا تو زخم بھرا
لگا جو زخم زباں کا، رہا ہمیشہ ہرا

مرسلہ: حبیبہ صدیقی (آمبور)

اب کہاں جائیں بہاروں کی تمنا لے کر
دل کا ہر زخم مہکتا ہے گلستاں کی طرح

مرسلہ: رومانہ نکہت (دامن گنج۔ پٹاموں)

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

مرسلہ: مہر افروز صفیہ راحت (ملکاپور)

ہر ایک زخم جگر لو دے کے جل اٹھتا ہے پھر اپنا
کسی کی یاد پہروں خون کے آنسو رلاتی ہے

مرسلہ: نجمہ انصار مشا (بھٹکل)

زخموں سے چور چور ہے اپنا دل غریب
کچھ دوستی کے زخم ہیں کچھ دشمنی کے زخم

مرسلہ: رشیدہ عبد الرحیم دھوراجوی (حیدرآباد)

ہویدا کر کے اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

مرسلہ: عصمت آرا (بانکا)

اے چارہ ساز کوشش مرہم فضول ہے
واقف ہیں اپنے زخم کی گہرائیوں سے ہم

مرسلہ: عنبر فاطمہ تبسم (آرہ۔ بھوجپور)

ہر شاخ گل پہ پھول نہیں زخم ابھرے ہیں
نہ جانے کس نے ان کو گل تر بنا دیا

مرسلہ: جہاں قیصر جہاں (امیرسلطانپور)

اکثر خوشی کی کھوٹ میں ہم کوٹے ہیں غم
کانٹوں سے زخم کھائے ہیں پھولوں کی چاہ میں

مرسلہ: شاہین بانو (امراوتی)

دے کر وہ زخم یادوں کے لاکھ ہیچ کبھی
دل سے بھلا کے مجھکو نہ جانے کدھر گیا

مرسلہ: روحی اختر (آرہ)

او نمک پاش تجھے اپنی ملاحت کی قسم
بات تو جب ہے کہ ہر زخم نمکداں ہو جائے

مرسلہ: ثمینہ نظیر (دھنباد)

جذبۂ دل کو آزما تی ہوں
زخم کھا کر بھی مسکراتی ہوں

مرسلہ: ساجدہ بیگم (ہنگلا پیٹ)

میرے زخم دل سے نہ کھیلئے میری بے بسی سے نہ کھیلئے
میری زندگی بے کلی کلی، میری زندگی سے نہ کھیلئے

مرسلہ: نجمہ حافظ (منگلور)

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

مرسلہ: زبیدہ بتول۔ شہیدہ بانو (آمبور)

میں تو سمجھا تھا مرے غم کا مداوا کر دیا
تم نے ہنس کر زخم دل کو اور گہرا کر دیا

مرسلہ: مس زرینہ حبیب (رائے بریلی)

جتنی شدت سے مجھے زخم دیئے ہیں تو نے
اتنی شدت سے تو میں نے تجھے چاہا بھی نہ تھا

مرسلہ: فرزانہ جعفری (سیتاپور)

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کا ہے

مرسلہ: برکت تسنیم (دیوبند)

مجھے زخم دینے والے تو رہے سدا شگفتہ
تجھے آنچ تک نہ آئے یہی میری بس دعا ہے

مرسلہ: گوہر بے نیلوفر نسرین (ادیلابور)

یاد اک زخم سہی کسک ہے درد
بھول جانے کا کچھ خیال تو تھا

مرسلہ: خورشید شمیم (شیموگا)

زخم نگاہ ناز سلامت رہے شکیل
سو بار مسکرائیں گے ہم ایک بار کیا

مرسلہ: کشور سلطانہ (لال باغ۔ لکھنؤ)

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلان بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

مرسلہ: کشور جہاں شمسی (ایلی جیت)

● نمبر خریداری ▬ ۔ آپ کا مرسلہ شعر بالکل ناموزوں تھا۔ شائع نہ ہو سکا۔

زخم جب بھی کوئی ذہن و دل پہ لگا زندگی کی طرف اک دریچہ کھلا
ہم بھی گویا کسی ساز کے تار ہیں چوٹ کھاتے رہے گنگناتے رہے

مرسلہ: نسیمہ شاہد۔ بلیادی۔ جھریا

جتنی شدت سے مجھے زخم دیئے ہیں تم نے
اتنی شدت سے تو میں نے تمہیں چاہا بھی نہ تھا

مرسلہ: فرح جعفری (الہ آباد)

محبت کرنے والے بھی عجب خوددار ہوتے ہیں
جگر پر زخم لیتے ہیں مگر مرہم نہیں لیتے

مرسلہ: قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

وقت کے افسوس سے تھمتا نالہ ماتم نہیں
وقت زخم تیغ فرقت کا مرہم نہیں

مرسلہ: آفتاب حاجی سیفی (چمپارن)

ختم المرسلینؐ

کی آمد پوری انسانیت پر احسانِ عظیم ہے

(علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب آدمی کی سمجھ بوجھ پوری اور عقل پختہ ہو جاتی ہے۔ شروع جوانی کی خواہشیں مر چکی ہوتی ہیں دنیا کا اچھا برا تجربہ ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی عمر اس کے لئے مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا رسول اور قاصد بنائے اور جاہلوں کے سکھانے اور نادانوں کے بتانے کے لئے اس کو ان کا استاد مقرر فرمائے۔

اللہ اپنے رسولوں کو فرشتوں کے ذریعہ سے اپنی باتوں سے آگاہ فرماتا ہے اور وہ کلام سن کر خدا کے بندوں کو سناتے ہیں۔ اللہ کے نیک بندے رسول کے منہ سے خدا کا کلام سن کر خدا کی بات مانتے ہیں اور ان کے حکم پر چلتے ہیں۔ وہ مسلمان کہلاتے ہیں۔ اللہ ان سے خوش ہوتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ اور جب تک وہ جیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرح کا انعام دیتا ہے اور ان پر اپنی برکت اتارتا ہے اور جب وہ مر جاتے ہیں تو ان کی روح کو آرام اور چین عطا کرتا ہے۔

قیامت کے بعد جب پھر سب لوگ جی کر اٹھیں گے تو نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ وہاں ہر طرح کی خوشی عطا کرے گا۔ وہ بادشاہوں سے بڑھ کر وہاں ہر طرح کا آرام و چین پائیں گے۔

جو لوگ اس رسول کی بات نہیں مانتے اور خدا کے کلام کو نہیں سنتے اور اس کے حکموں پر نہیں چلتے وہ اس دنیا میں بھی دل کا چین اور روح کا آرام نہیں پاتے اور مرنے کے بعد بھی خدا کی خوشنودی سے محروم رہتے ہیں۔ وہ قیامت کے بعد بھی دکھ اور سزا پائیں گے۔

جس اللہ نے اپنے بندوں کے لئے زمین و آسمان بنایا۔ طرح طرح کے میوے اور پھل اگائے۔ جس نے انسان کے چند روزہ آرام کے لئے یہ سب کچھ بنایا، کیا اس نے ان کے ہمیشہ آرام کا سامان نہ کیا ہوگا؟

اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس دنیا کے قاعدے اور قانون بتانے اور سکھانے کے لئے استاد، طبیب اور ڈاکٹر بنائے ہیں اسی طرح اس دنیا کے قاعدے اور قانون بتانے کے لئے رسول اور پیغمبر بنائے ہیں اور جس طرح اس دنیا کے استادوں اور ڈاکٹروں کا کہنا نہ ماننے پر ہمیں دنیا میں اپنی نادانی اور جہالت سے بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اسی طرح اگر ہم اپنی نادانی اور جہالت سے رسولوں اور پیغمبر کا کہنا نہ مانیں گے تو اس دنیا میں ہم بہت تکلیفیں اٹھائیں گے۔ اللہ کے سارے احسانات میں سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ہم کو اپنی باتیں سمجھانے اور نیکی کا راستہ دکھانے کے لئے اپنے رسول بھیجے۔

حضرت آدمؑ کے وقت سے حضرت عیسیٰؑ تک ہر زمانہ میں اور ہر قوم میں خدا کے رسول آتے رہے۔ سب کے بعد اللہ تعالیٰ نے سب رسولوں کے رسول حضرت محمدؐ (اللہ کا درود ان پر ہو) کو بھیجا۔ آپ کے بعد پھر کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ کیونکہ خدا کی بات پوری ہو چکی اور خدا کا پیغام ہر جگہ پہنچ چکا۔

ہمارے رسولؐ کو چالیس برس کی عمر میں جب اللہ تعالیٰ نے رسول بنانا چاہا۔ اس سے پہلے آپ کو اکیلے رہنا پسند تھا۔ کئی کئی روز کا کھانا لے لیتے اور مکہ کے قریب ایک پہاڑ کے غار میں جس کا نام "حرا" تھا چلے جاتے اور غور کرتے۔

دنیا کی گمراہی اور عرب کے لوگوں کی بری حالت دیکھ کر آپ کا دل دکھتا تھا۔ آپؐ اس غار میں دن رات خدا کی عبادت کرتے اور سوچ میں پڑے رہتے تھے ایک دن ایسا ہوا کہ اللہ کا وہ فرشتہ جو اللہ کا کلام اور پیام لے کر رسولوں کے پاس آتا ہے اور جس کا نام جبریلؑ ہے نظر آیا۔ اس فرشتہ نے خدا کا بھیجا

یہ سب سے پہلا پیام جس کو وحی کہتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا۔

وحی کا آنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی امت کی تعلیم کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ نادانوں کو بتانا۔ انجانوں کو سکھانا۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کو روشنی دکھانا اور بتوں کے پجاریوں کو خدائے پاک کے نام سے آشنا کرنا آپ کا کام ٹھہرایا گیا۔

آپ کا دل اس بوجھ کے ڈر سے کانپ گیا۔ اسی حالت میں آپ گھر واپس آئے اور اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور کہا کہ آپ غریبوں پر رحم فرماتے ہیں بیوا، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں اور جو قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہیں ان کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو یوں نہ چھوڑے گا۔

پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے ہاں لے گئیں، ورقہ عیسائی ہوگئے تھے۔ اور عبرانی زبان جانتے تھے۔ وہ حضرت موسیٰ کی کتاب توراۃ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب انجیل پڑھے ہوئے تھے انھوں نے خدا کے رسول (ان پر درود ہو) سے سارا ماجرا سنا تو کہا کہ یہ وہی خدا کا فرشتہ تھا جو موسیٰؑ پر اترا تھا۔ پھر کہا اے کاش میں اس وقت طاقتور اور تندرست ہوتا جب تمہاری قوم تم کو تمہارے گھر سے نکال دے گی۔" آپؐ نے پوچھا۔ کیا ایسا ہوگا۔؟

وحی کے آنے کے بعد آپؐ پر فرض ہوگیا کہ خدا کی باتیں سنائیں۔ اپنے رب کی بڑائی بیان کریں اور ناپاکی اور گندگی کی باتوں سے بچیں اور بچائیں۔

عرب کے لوگ پرلے درجے کے جاہل، نادان اور خدا کے دین سے بے خبر ہوگئے تھے اور کفر و شرک میں ایسے پھنسے تھے کہ اپنے معبودوں کی برائی وہ سن بھی نہ سکتے تھے۔ سچائی کی یہ آواز سب سے پہلے جس کے کانوں میں پڑی وہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی خدیجہؓ تھیں آپؐ نے جب ان کے سامنے خدا کی تعلیم تبلیغ کی تو وہ فوراً مسلمان ہوئیں۔ آپ کے مرد ساتھیوں میں ابوبکرؓ (جو قریش کے ایک مشہور سوداگر تھے) نے جب آپؐ کی زبان مبارک سے خدا کا پیام سنا تو وہ بھی فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگئے۔

آپ کے پیارے چچا ابوطالب کے کمسن بیٹے علیؓ آپ کی گود میں پلے تھے اور آپ ہی کے ساتھ رہتے تھے وہ بچپن ہی سے مسلمان رہے۔

ہمارے رسولؐ کو جب دین کی کھلم کھلا منادی کا حکم ہوا تو آپؐ نے مکہ کی ایک پہاڑی پر جس کا نام صفا تھا کھڑے ہوکر قریش کو آواز دی۔ عرب کے دستور کے مطابق اس آواز کو سن کر قبیلے کے سارے آدمیوں کا جمع ہوجانا ضروری تھا۔ مکہ کے بڑے بڑے سردار اس پہاڑی کے نیچے آکر جمع ہوگئے، آپؐ نے ان سے پوچھا۔

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے تمہارے دشمنوں کا ایک لشکر آرہا ہے تو کیا تمہیں اس کا یقین آجائے گا؟"

سب نے کہا: "ہاں بے شک! کیونکہ ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے دیکھا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم نے خدا کے پیغام کو نہ مانا تو تمہاری قوم پر ایک بہت بڑی آفت آئے گی۔" یہ سن کر ابولہب نے کہا "کیا تم نے یہی سنانے کے لئے ہم کو یہاں بلایا تھا؟" یہ کہہ کر اٹھا اور چلا گیا قریش کے دوسرے سردار بھی خفا ہوکر چلے گئے۔

لیکن ہمارے رسولؐ نے ان سرداروں کی خفگی کی پرواہ نہ کی اور بت پرستی کی برائی کھلم کھلا بیان کرتے رہے۔ آپؐ سختیاں جھیلتے اور اپنا کام کئے جاتے تھے۔ قریش نے دیکھا کہ یہ کسی طرح باز نہیں آتا تو ایک دن اکٹھے ہوکر آپؐ کے چچا ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے باپ دادا کو گمراہ بتاتا ہے اور ہم کو نادان ٹھہراتا ہے۔ اب یا تو بیچ سے ہٹ جاؤ یا تم بھی میدان میں آجاؤ تاکہ ہم دونوں میں ایک کا فیصلہ ہوجائے۔

ابوطالب نے دیکھا کہ اب وقت نازک ہے، حضرتؐ کو بلا کر کہا کہ بھتیجے! مجھ بوڑھے پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ اٹھا نہ سکوں، ظاہر میں حضرت کو اگر کسی مدد کا سہارا تھا تو یہی چچا تھے۔ ان کی یہ بات سن کر آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر فرمایا۔

"چچا جان! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا۔"

آپ کی یہ مضبوطی اور پکا ارادہ دیکھ کر اور آپؐ کی پر اثر بات سن کر ابوطالب پر بڑا اثر ہوا اور انھوں نے آپؐ سے کہا۔ بھتیجے! جاؤ اپنا کام کئے جاؤ۔ یہ تمہارا کچھ بھی نہیں کرسکتے۔

"نقاب"

عفت موہانی

آستانے پر پہونچ کر اسے بڑا سکون ملا۔ جیسے اس کی جلتی ہوئی روح کو کسی نے میٹھے پانی کے چشمہ میں ڈبو دیا ہو۔ اس نے اپنی ملتجی نظریں ادھر اُدھر گھمائیں۔ اور اس کی آنکھوں سے عقیدت چھلکنے لگی! کتنے بہت سے مرد عورتیں بڈھے جوان اور بچے یہاں وہاں بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان سب کے چہروں سے پختہ ارادت کا نور چھن رہا تھا۔ جیسے وہ یہ عزم کر کے وہاں جم گئے تھے کہ بس کچھ مرادیں لے کے ہی ہٹیں گے۔

اللہ والوں کے ٹھکانوں پر ایسا ہی ایمان افروز نور نظر آتا ہے۔ پرسکون، سناٹا، روح پرور ماحول۔ اسے آس بندھ گئی۔ اس کی مراد بھی اسی در سے پوری ہو جائے گی!۔

اس کی بوڑھی ساس برگد کے نیچے بیٹھی بڑی بیزاری سے تمباکو کھا رہی تھی اور اس کا شوہر دم بخود سا بیٹھا ہر آنے جانے والے کو یوں گھور رہا تھا جیسے وہی اس کی مراد اس کی جھولی میں ڈالنے آ رہا ہو۔

وہی اسے یہاں لایا تھا۔ اکثر اپنے کام سے شہر آتا تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا بڑے بابا کے آستانے پر ماتھا رگڑو۔ شاید مولیٰ انہی کی سن لے۔ اللہ والے بزرگ ہیں۔ ان کی زبان کا کہا ٹلتا نہیں۔ اب تک سینکڑوں حاجت مند اپنی حاجتیں ان سے پوری کروا چکے ہیں۔ مزہ یہ کہ وہ کچھ نذرانہ نہیں لیتے۔ بلکہ اکثر غریبوں کو اپنے پاس سے دے دیتے ہیں۔ اتنے برگزیدہ ایسے نیک نفس اور شریف انسان ہیں کہ آج کی دنیا میں ان کی مثال ملنی دشوار ہے۔

گاؤں کا رہنے والا سیدھا سادا آدمی شہری دوستوں کی باتوں پر ایمان لے آیا۔ پھر اپنے کام میں اس کا جی ہی نہ لگا۔ گاؤں واپس گیا تو ماں سے تذکرہ کیا۔

"اماں اس درگاہ سے ضرور ہمارے گھر میں چراغ جلے گا۔ جہاں ہم نے اتنے جتن کئے ہیں وہاں ایک یہ بھی سہی۔ انتظام کرو۔ ہم کل ہی نکل چلیں گے۔"

بڑھیا کی دھندلی ملگجی آنکھوں میں آس کے دیئے ٹمٹمانے لگے۔ آسمان کی طرف آنچل پھیلا کے گھگھیائی "اللہ کرے اسی طرح میری بہو کی گود میں پھول کھلے۔ ارے ایک ہی تو بیٹا ہے۔ وہ بھی بے اولاد رہ جائے گا تو آگے نسل کیسے چلے گی۔۔۔۔ اچھا کل ہی چلو!"

وہ بڑی خوشی خوشی سفر کی تیاریوں میں لگ گئی۔ اور محروم کم نصیب زاہدہ کے بدن میں ایک بچے کا ارمان کلبلانے لگا!۔ شاید خدا اسی مرشد کی سن لے۔ اپنی زبان میں اثر کہاں۔ اللہ والوں کی دعائیں تو تیر کی طرح عرش پر پہونچتی ہیں۔ خواہ مخواہ تھوڑی اللہ والے بن بیٹھے ہیں۔ اس کے رخساروں کے پژمردہ گلاب موہوم سی توقع کی آبیاری سے پھر تر و تازہ ہو گئے۔

اس کی شادی کو پورے دس سال گزر چکے تھے۔ وہ تیرہ برس کی تھی اور احمد اٹھارہ سال کا۔ اور اب۔ ساری دنیا کی نگاہوں میں وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ غضب خدا کا۔ تئیس سال کی عورت اور اٹھائیس برس کا پہاڑ سا مرد۔ ایک چوہے کا بچہ پیدا نہ کر سکے! بےچاری بڑی ماں کی نسل کیسے چلے گی ایک ہی تو غریب کا بیٹا تھا وہ بےاولاد۔ احمد دن بھر باہر رہتا۔ اپنے کام میں مگن رہ کر وہ اپنا غم ہلکا کر لیتا تھا۔ مگر بےچاری زاہدہ کو بیشتر اٹھتی ہوئی انگلیوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ دبی زبان میں طعنے دیئے جاتے۔ بانجھ ہونے کا ٹھپہ لگ گیا تھا۔ قصور سارا اکیلی اسی کا تھا جو اپنے شوہر کو ایک بچہ نہ دے سکی تھی۔ احمد کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا۔ بس بہت ترس کھاتے تھے۔ عجیب دنیا ہے۔ اس کی ریت نرالی۔ زاہدہ یوں چور بنی رہتی جیسے اس نے کسی کے یہاں ڈاکہ ڈالا ہو۔ کسی کے خون سے ہاتھ رنگے ہوں۔ چپکے چپکے دوائیں کیں۔ گنڈے کرائے۔ ادھر ادھر بھاگی پریشانی اٹھائی۔ سب بیکار۔ ان عورتوں کو وہ بڑی حسرت سے تکتی جن کے آگے پیچھے بچوں کی فوج ہوتی۔ جو بچوں سے بیزار رہتیں مگر

ہر سال ان پر اللہ کی رحمت نازل ہو جاتی تھی اور ایک وہ تھی! جسے خدا نے یکسر محروم رکھ دیا تھا۔ آخر اس نے کیا گناہ کیا تھا۔ ایک ایک لمحہ کر کے اس نے پورے دس سال گزارے تھے۔ دس صدیاں جو اس کی رگوں کا لہو چوستی اسے، رو رو کے گلتی گزر رہی تھیں۔ اس کا شباب بے رونق ہو چکا تھا۔ آس اور امید کے چراغ بجھنے لگے تھے۔ اور اب کسی دوا یا دعا پر اعتقاد باقی نہ رہا تھا!۔

ایسے میں احمد بڑے بابا کے مراد آفریں آستانے کی نوید لایا تو زاہدہ کے مرے ہوئے دل میں بھی نئی امنگ زندہ ہوئی۔ وہ رات اس نے بڑی بے چینی سے کاٹی اور صبح ہی صبح ساس اور شوہر کے ہمراہ بڑے بابا کے آستانے پر حاضر ہو گئی!۔

لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ اور آہستہ آہستہ زاہدہ کے دل کی دھڑکنیں تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ کیا پوچھیں گے بڑے بابا۔ کیا کہے گی وہ ــ؟

دس سال گزر چکے ہیں بڑے بابا۔ مگر میری گود میں ابھی تک کوئی پھول نہیں مہکا کوئی کلی نہیں مسکرائی دعا کیجئے۔ صرف ایک ہی بچہ سہی۔ دس بارہ نہیں مانگتی۔

وہ اپنی ننھی سی زر کار تھیلی میں چھپا کر گیارہ روپئے لیتی آئی تھی۔ کیا پتہ بڑے بابا کسی سے نذرانہ قبول نہ کریں۔ مگر وہ تو یہ تھیلی ان کے قدموں میں رکھ دے گی!۔

"دیکھ۔ زبی۔ گھبرائیو نہیں" احمد اس کے کان کے پاس منمنا رہا تھا "جو کچھ دل میں ہے۔ سب کہہ دیجیو۔ اچھا؟ بار بار یہاں تھوڑی آنا ہے۔ کوئی پچھتاوا نہ رہ جائے کہ ہم نے یہ نہیں کہا۔"

"شرم لگے ہے جی" وہ پھولی پھولی سانسوں میں بولی۔

"کاہے کی شرم" وہ چپکے سے بگڑا "کام نہ بگاڑ دینا۔ پاگل دین۔ ارے وہ تیرے دادا نانا کے برابر ہوں گے۔ ہا۔ ہا۔ نورانی سفید داڑھی ہوگی۔ مولیٰ کے نور سے چمکتا چہرہ۔ واہ کرم ہے مالک کا۔ اس در پر آ پہونچے ہیں" وہ جھوم اٹھا۔

آستانے کے دروازے پر ایک مرید نظر آیا۔ احمد نے زاہدہ کو ٹہوکا دیا "چل اٹھ۔ شاید تیری ہی باری ہے"

زاہدہ خود کو قابو میں کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ڈولتے قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی گونج رہی تھی۔ اعتقاد۔ بے اعتقادی۔ لوگوں کے وہ فقرے۔ بڑے بابا کا سا درویش ملنا مشکل ہے جس پر نگاہ ڈالی۔ کمال کر دیا فلاں پر آسیب تھا۔ بس آستانے پر آنے کی دیر تھی۔ جن ایسا بھاگا کہ سایہ تک نہ چھوڑا۔ فلاں بے چاری اولاد کو ترس رہی تھی۔ اب دیکھو کہ چھ سات بچے آنگن میں چہکتے پھر رہے ہیں!۔ واہ۔ کیا شان ہے۔!

"اندر چلو" مرید کی آواز نے اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا۔

اس نے بڑے احترام سے لباس برابر کیا۔ سر پر آنچل اوڑھا اور آنکھوں میں دید کی طاقت پیدا کرتی دل میں عقیدت کا دریا سمیٹے وہ حجرے میں داخل ہوئی۔

اس کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔

اس کے سامنے کوئی بیٹھا تھا۔ بس ایک پھسلتی ہوئی نظر اس پر پڑی تھی۔ احمد نے کہا تھا کہ بڑے بابا اس کے دادا نانا کے برابر ہوں گے۔ مگر یہ مرشد صاحب۔ زاہدہ کا دل سینے سے اڑ کر حلق میں آ گیا۔ اس نے ایک دفعہ چڑیا گھر میں بن مانس دیکھا تھا۔ وحشی، ہیبت ناک بالوں سے بھرا ہوا جسم۔ جوان اور قد آور ــ اس کی کمزور پنڈلیاں کانپنے لگیں نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ طرح طرح کی خوشبوئیں جو بڑے بڑے بخور دانوں سے مرغولے بناتی حجرے میں کھیل رہی تھیں۔ ایک گاڑھی دھند کی طرح اس کے وجود کے گرد حصار بند ہو گئیں۔ تیز نشہ سا اس پر چھا گیا۔ ایک معمول مسحور کی طرح وہ صرف یہ دیکھ رہی تھی کہ دو سرخ دہکتی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں سے تیر کی تیزی سے دل میں اترتی جا رہی تھیں۔ وہ پلکیں تک نہ جھپکا سکی۔ اعرض مدعا کے مبہم الفاظ اس کے خشک لبوں پر پھڑکتے رہ گئے!۔ اور وہ ایک اندھے کنویں میں گرنے لگی!۔

احمد بہت بڑا چڑھاوا آستانے کے لئے لایا تھا۔ پھولوں کے ہار، مٹھائی کے خوان، نذرانے کے اکیاون روپئے اور گڑ کی بھیلی۔ خوشی کے مارے اس کے دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔

بڑے بابا کی کرامت سے احمد کا بیٹا ٹھیک انہی کی شکل لے آیا تھا!۔

زاہدہ نے نفرت سے منہ پھیر لیا!!

"درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ تک"

حجّن عفّت حجّانی ماں

الحاج برقؔ آشیانوی

حج کرنا زندگی میں صرف ایک بار فرض ہے۔ دوسری بار حج کیا جائے تو وہ نفل ہوگا۔ ہم ۱۹۷۶ء میں حج بیت اللہ و زیارت مدینہ منورہ کی سعادت حاصل کر کے بغلیں بجانے لگے کہ چلو اب ہم حاجی یا الحاج ہوگئے اور اب ہمیں لوگ حاجی یا الحاج برقؔ آشیانوی کہیں گے خطوط میں الحاج برقؔ آشیانوی لکھا کریں گے۔ لیکن ہمیں بے حد مایوسی ہوئی بلکہ یوں کہئے کہ رنج پہنچا جبکہ ہمارے قریبی دوست ملا مجرالیہود نے ہمیں نہ حاجی کہا اور نہ الحاج نہ ہی لوگوں نے خطوط میں الحاج برقؔ آشیانوی لکھا۔ غرض جن آرزوؤں اور ارمانوں سے ہم حج کر کے آئے تھے ان پر پانی پھر گیا۔ آخر ہم نے ایک روز ملا مجرالیہود سے شکایت کی کہ قبلہ حج سے فارغ ہوئے عرصہ گذرا لیکن ابھی تک آپ نے ہمیں "حاجی صاحب" سے مخاطب نہیں فرمایا تو ملا صاحب نے کچھ ایسا عبرت انگیز لطیفہ سنایا کہ ہم دم بخود ہو کر رہ گئے۔ ملا صاحب نے کہا "میاں حاجیوں سے متعلق ایک لطیفہ سن لو پھر اس کے بعد بھی تم چاہو کہ ہم تمہیں حاجی صاحب سے مخاطب کریں تو ہم ضرور تمہاری خواہش پوری کریں گے لطیفہ یہ ہے کہ ایک اندھا گداگر کاسۂ گداگری لئے کھڑا تھا لوگ اس میں بطور خیرات کے ریزگاری ڈال رہے تھے۔ آخر ایک صاحب نے اس کے کشکول میں ہاتھ ڈالا اور مٹھی بھر ریزگاری نکالنا چاہتے تھے کہ گداگر نے ہاتھ پکڑ لیا اور ڈانٹ کر کہا "کیوں حاجی صاحب"۔ ان صاحب نے گداگر سے دریافت کیا "میاں لو تمہاری ریزگاری اور ہمارا ہاتھ چھوڑو لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں حاجی ہوں ـــ" گداگر نے جواب دیا "جناب یہ کام حاجی لوگ ہی کرتے ہیں ـــ" یہ لطیفہ بیان کر کے ملا صاحب نے ہم سے کہا "برادر برخوردار (حالانکہ ہمیں برخوردار نہیں کہنا چاہئے لیکن ملا صاحب کبھی کبھی ازراہِ مذاق ہمیں برخوردار کہہ لیا کرتے ہیں اور ایک دفعہ تو یہ رائے بھی دی تھی کہ ہم بجائے برقؔ آشیانوی کے بجائے برخوردار کے نام سے مضامین لکھا کریں) کیا اب بھی تم حاجی صاحب کہلانے کے خواہش مند ہو۔۔؟" سچ پوچھئے قبلہ وہ تو ہم نے مذاق میں کہا تھا؛ پھر اس کے بعد ایسی خواہش ظاہر نہیں کی چار سال خیر و عافیت سے گذرنے کے بعد اللہ میاں کا حکم ہوا کہ ہم پھر ایک بار حج کو جائیں۔ اس اطلاع کو سن کر ملا مجرالیہود نے کہا "میاں سچ تو یہ ہے کہ تم نے حج تو کر لیا تھا لیکن اور ہم نے حاجی کی جو تعریف کی ہے اس پر پورے نہیں اترے اس لئے پھر تمہیں حج کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ کم از کم اس مرتبہ حج کرنے کے بعد تو پورے حاجی بن جاؤ کیونکہ ابھی تک تم "ادھورے حاجی" ہو۔ ملا صاحب کی اس گفتگو کو سن کر ہم نے کہا۔ انشاء اللہ آپ کے معنی میں تو نہیں البتہ اپنے معنی میں کوشش کریں گے۔ بات آئی گئی ہوگئی اور ایک روز ہم بہ عزم حج سابو صدیق مسافر خانے میں مع اہلیہ کے جا دھمکے۔ اہلیہ کے ساتھ اس لئے گئے کہ اس مرتبہ اہلیہ حج کو جا رہی تھیں اور ہم ان کے ساتھ "محرم" کی حیثیت سے جا رہے تھے۔ اس پر بھی ملا مجرالیہود نے ایک پھبتی کہی کہ۔ میاں "محرم" تو شرعی اصطلاح میں ہو در اصل تمہاری حیثیت قلی کی ہے" غرض اللہ میاں نے خواتین پر حج کے لئے "محرم" کی شرط رکھ کر ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے اگر یہ شرط نہ ہوتی تو اہلیہ اکیلی جاتیں اور ہمیں دوسری بار حج کی سعادت نصیب نہ ہوتی۔ ہم نے اللہ میاں کا اس لحاظ سے بھی بے حد شکر ادا کیا کہ مردوں کے لئے "محرم" کی شرط نہیں لگائی۔ اگر مرد کے لئے بھی "محرم" کی شرط ہوتی تو پہلے حج میں ہم اپنی اہلیہ کو بطور "محرم" کے لے جاتے اس طرح دونوں کا حج ایک ہی ساتھ ہو جاتا اور دوسری بار حج کی نوبت نہ آتی مزید شکر ہے کہ اللہ میاں نے نماز اور روزے کے لئے جو اسلام کے ایسے ہی ارکان ہیں جیسے حج، محرم کی شرط نہیں

ورنہ جب بھی اہلیہ مغرب کی نماز کے لئے کھڑی ہوجاتیں ہمیں سینما جانے کے بجائے اہلیہ کے ساتھ نماز ادا کرنا لازمی ہوجاتا۔ یا وہ فجر کی نماز کے لئے اٹھتیں تو ہمیں بھی میٹھی نیند سے بیدار ہوکر ان کے ساتھ مجبوراً ادا کرنا پڑتی ـــــــ یا رمضان میں اہلیہ جب روزے رکھتیں تو ہمیں چھپ کر ہوٹلوں میں کھانے کے بجائے اہلیہ کے ساتھ روزے رکھنے پڑتے۔

بہرحال ہم اور اہلیہ یکم اکتوبر کو ممبئی کے مسافر خانے میں اُتر چکے اور ۱۱ر اکتوبر کے انتظار میں دن کاٹنے لگے۔ اس سفر میں صاحبزادے اور بہو دو تو ہمیں رخصت کرنے کے بہانے سے ہمارے ساتھ ہوگئے اور ہمیں بازار سے سودا لا لے اور اہلیہ کو پکوان کرنے اور اُن کی بچی کو سنبھالنے کی سعادت عطا کرکے روزانہ ممبئی کی سیر میں مصروف ہوگئے۔ تو ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ وہ لوگ ہماری خدمت کے لئے ساتھ نہیں آئے ہیں بلکہ ان کی خدمت کے لئے وہ ہمیں اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ جس تاریخ کو ہم نے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو اطلاع دے دی تھی اس تاریخ سے اہلیہ کو لوگوں نے حجانی ماں" سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا ـــ حجانی ماں" کی اصطلاح دکن میں عام ہے۔ لوگوں نے جب انھیں حجانی ماں کہنا شروع کر دیا تو ہمارا بھی دل چاہا کہ ہم بھی انھیں "حجانی ماں" سے مخاطب کریں لیکن انھوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اس میں "ماں" کا لفظ آیا ہے جو کوئی شوہر اپنی بیوی کو نہیں کہہ سکتا البتہ یہ رائے دی کہ ہم انھیں "حجانی بی" کہا کریں لیکن یہ اصطلاح ہماری غیرت نے قبول نہیں کی۔ اس لئے کہ دکن میں "بی" کا لفظ مالکن کے لئے آتا ہے اس طرح ہماری حیثیت ان کے خادم کی ہوجائے گی اس طرح ایک اصطلاح کو انھوں نے رد کر دیا اور ایک اصطلاح کو ہم نے قبول نہیں کیا .... چنانچہ ہم نے اس مسئلے کا کوئی آسان حل تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنا آسان کام نہیں ہے۔ حکومت کے زیر غور کئی مسائل حل طلب ہیں اور حکومت ان کا مناسب حل تلاش کرنا چاہتی ہے لیکن برسوں گذرنے کے بعد بھی جب حل تلاش نہیں کیا جا سکتا حالانکہ دن میں چراغ لے کر بھی تلاش کیا جاتا ہے تو آخر مسئلہ تنگ آکر حل ہونے

کے بجائے تحلیل ہوکر نظروں سے غائب ہوجاتا ہے۔ اس دوران میں کئی دوسرے نئے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں جن کے حل کی تلاش میں حکومت سرگرداں ہوجاتی ہے غرض ہم ممبئی کے مسافر خانے میں تاریخ مقررہ کے انتظار میں زندگی کے دن کاٹنے میں مصروف تھے۔ دو یا تین دن گذرے تھے کہ ہمارے کمرہ نمبر ۱۰ میں دو تین برقعہ پوش خواتین آئیں۔ اور ہماری بیوی سے مخاطب ہوکر کہنے لگیں "حجن۔ تعلیم کے لئے آؤ" ـــ یہ کہہ کر چلی گئیں۔ بیوی حیران کہ میرا نام تو "اچھن" ہے ان خواتین نے مجھے "حجن" کیوں کہا؟ پھر خیال کیا کہ کسی سے ان ان لوگوں نے ان کا نام دریافت کیا ہوگا تو کسی نے بتایا ہوگا کہ نام "اچھن" ہے۔ لیکن ان خواتین کے ہمارے کمرے تک پہنچنے کے دوران نام "اچھن" بھول کر "حجن" یاد کر لیا ہوگا۔ چنانچہ اہلیہ نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ دوسرے دن بھی وہی خواتین پھر آئیں اور کہا "حجن۔ چلو تعلیم کے لئے چلو ـــ" اور کھڑی ہوگئیں۔ اب یہ حیران۔ دونوں باتیں ان کی سمجھ سے باہر تھیں ایک تو "حجن" اور دوسرے "تعلیم" ـــ تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا۔ "بی بیو میرا نام "اچھن" ہے۔ "حجن" نہیں اور تعلیم جہاں تک سوال ہے وہ تو شادی سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔ اب اس عمر میں کیا خاک تعلیم حاصل کروں گی ـــ آپ لوگوں کو ابھی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہے تو حاصل کیجئے۔ مجھے مزید کسی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔" اس پوری گفتگو کو ان خواتین نے غور سے سنا اور ہل کر ہنس دیں۔ ہم دو روز سے یہ تماشہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ اب ہمیں بھی بے ساختہ ہنسی آگئی ـــ اس پر اہلیہ چراغ پا ہوگئیں اور کہنے لگیں "یہ لوگ تو میرا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن رنج اس بات کا ہے کہ آپ بھی مجھ پر ہنس رہے ہیں۔" اتنا سن کر وہ خواتین چلی گئیں تو ہم نے اہلیہ کو بتایا کہ یہ خواتین گلبرگہ کی تھیں جہاں آپ جیسی خواتین کو "حجن" کہا جاتا ہے۔ تب انھوں نے کہا کہ "آخر حجن کہنا بلا ہے یہ بتلائیے ہمیں مذاق سوجھا کیونکہ ہم مسافر خانے میں عبادت میں وقت گذارنے کے بعد جو وقت بچتا تھا ہنسی مذاق میں ہی گذار رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے کہا "حجن کی بات یوں ہے شریمتی حجن۔ جیسے بچے حرمت تجو تجو" اس پر انھیں کچھ غصہ آگیا تو ہم بھی سنجیدہ ہوگئے اور بتایا کہ شمالی ہند میں حج کرنے والی خواتین کو "حجن" کہا جاتا ہے۔ اور تعلیم سے مراد یہ ہے

کہ یہاں مسافر خانے میں کچھ ایسی خواتین بھی ہیں جنھوں نے ہماری طرح ایک بار حج کیا ہے دوسری بار حج کرنے کی ہوس ہے" یہ خواتین آپ جیسی نئی زیلی حج کو جانے والی خواتین کو حج کے مناسک سے واقف کراتی ہیں اور پورے طور طریق سے آگاہی بخشتی ہیں۔ اس کے بعد تیسرے دن جب وہی خواتین آ دھمکیں اور کہنے لگیں کہ — "چلو حجن تعلیم کے لئے چلو" تو یہ چپ چاپ ان کے ساتھ ہو لیں۔ اور ہمیں سامان کی حفاظت اور عزیز از جان پوتی صادقہ سے کھیلنے کے لئے چھوڑ گئیں۔

نعتِ مقصودُ العاشقین

(فیروز نظامی)

وہ وقت ہی بخشش کا بس ایک سہارا ہے
جو یادِ محمدؐ میں رو رو کے گذارا ہے

انسان محبت کی نظروں سے اگر دیکھے
ہر منظرِ ظاہر میں طیبہ کا نظارا ہے

تم حشر کے مالک ہو جو چاہے جسے دے دو
جنت بھی تمہاری ہے دوزخ بھی تمہارا ہے

یہ خانۂ کعبہ ہے وہ روضۂ انور ہے
اک دل کی تمنا ہے اک آنکھ کا تارا ہے

شاید وہ ترس کھا کر آواز تری سن لیں
آنسو بھی ہیں آنکھوں میں دامن بھی پسارا ہے

سرمایۂ رحمت ہے ہر ایک نبی لیکن
اللہ کا پیارا پھر اللہ کا پیارا ہے

دنیا کے بدلنے سے عشاق نہیں بدلے
جب ذکر تمہارا تھا اب ذکر تمہارا ہے

بوجہل و عمرؓ دونوں انسان تو ہیں لیکن
اک خاک کا ذرہ ہے اک عرش کا تارا ہے

صدقے میں شہِ دیں کے یا رب تو مدد کرنا
فیروز نظامی کو بس تیرا سہارا ہے

لکھنؤ اپنی تہذیب و تمدن

کے لئے سارے ہندوستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں مشہور تھا، لیکن افسوس کہ انقلابات زمانہ نے لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کو خاک میں ملا دیا۔ آج اس تہذیب کا ذکر صرف کتابوں میں ہی پڑھا جا سکتا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس تہذیب و تمدن کو دیکھیں اور لکھنوی لوگوں کی شیریں زبانی سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن اب اس زبان کے بولنے والے بھی نظر نہیں آتے جو حضرت "پہلے آپ پہلے آپ" کہا کرتے تھے اور اس مٹتی ہوئی تہذیب و تمدن کے علمبردار کچھ رہ بھی گئے ہیں تو وہ گوشہ نشیں ہیں اور ان تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ اپنا سب کچھ کھو کر اب وہ باہر نکلتے بھی شرماتے ہیں۔ کیا عروج اور اب کیسا زوال ہے۔ لیکن لکھنؤ میں جو چیزیں فنا نہ ہو سکیں وہ ہیں شاہی امام باڑے اور وہ کاریگر اور ہنرمند جو آج بھی اپنی کاریگری اور سبک دستی کے ایسے شاہکار پیش کر رہے ہیں جو آپ اپنی مثال ہیں۔

چکن، زردوزی، کامدانی اور بادلے وغیرہ کے کام یہاں کے کاریگر ایسا کرتے ہیں کہ دیکھنے والے محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ لچکہ، گوٹہ، پٹھا، کرن اور ستارے وغیرہ کا کام بھی بیحد نفیس ہوتا ہے۔

مصنوعی جوانی

از عبدالمجیب صاحب سہالوی

آدمی کے لئے دانت بھی کتنی ضروری چیز ہیں۔ ان کے بغیر کھانے میں کوئی مزا ہی نہیں آتا۔ مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ بوڑھاپے کا اثر سب سے پہلے دانتوں ہی پر ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ نہ تو ان کے بال سفید ہوئے اور نہ بینائی پر کوئی خاص اثر پڑا اور قوت و توش میں بھی خدا کے فضل سے کوئی کمی نہیں آئی لیکن بتیسی صاف ہوگئی۔

اب تو ماشاءاللہ بوڑھاپے میں جوان نظر آنے کی بہت سی آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ بال سفید ہونے لگیں تو خضاب لگا لیجئے۔ دانت گر جائیں تو بتیسی لگوا لیجئے۔ ہمیں تو بعض خواتین اپنی رکھ رکھاؤ کی بنا پر ساٹھ سال کی عمر میں بھی جوان ہی نظر آتی ہیں اور جہاں کہیں وہ اپنی جوان لڑکیوں کے ساتھ جاتی ہیں تو ماں کے بجائے بڑی بہن معلوم ہوتی ہیں۔

یوں بھی خواتین اپنی عمر بتانے میں اتنی کفایت سے کام لیتی ہیں کہ ان کی عمر اور ان کی لڑکیوں کی عمر میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک سدا بہار صاحبہ کے شوہر بچارے سیدھے سادھے آدمی تھے۔ وہ خضاب اور مصنوعی دانتوں کے ذریعہ اپنے بوڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے وہ ریٹائر ہوتے ہوتے پوپلے ہونے کے ساتھ ساتھ سن سفید بھی ہوگئے تھے۔

ایک دن یہ باہر والے کمرے میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ ایک کھانے پکانے والی نوکری کی تلاش میں ادھر نکلی اس نے ان سے پوچھا کہ آپ کے یہاں کھانا پکانے والی کی تو ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے کہا ہاں ضرورت تو ہے تم اندر جاکر بات کرلو۔ وہ اندر گئی تو بیگم صاحبہ خضاب سے بال کالے کئے اور بتیسی لگائے بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔ اس نے سلام کیا اور کہا بیٹا آپ کے ابا میاں نے کہا ہے کہ آپ کے یہاں کھانا پکانے والی کی ضرورت ہے اندر جاکے بات کرلو۔

بیگم صاحبہ ابا میاں کی بات سن کر پہلے تو چکرائیں کیونکہ ان کے ابا میاں کو عرصہ ہوا۔ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ پھر اچانک انھیں اپنے شوہر صاحب کے سفید بالوں اور پوپلے منھ کا خیال آگیا اور وہ اس پر جھگڑنے کے بجائے دل ہی دل میں اپنی خضابی کمسنی پر خوش ہوئیں اور انھوں نے اسے نوکر رکھ لیا۔

ایک دن نوکرانی نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں بیگم صاحبہ سے کہا کہ آپ کے گھر والوں نے ان بوڑھے میاں سے آپ کی شادی کیسے کردی۔ بیگم صاحبہ نے یہ بتانا تو مناسب نہ سمجھا کہ ان کے بوڑھے میاں اور ان کی عمر میں صرف پانچ سال کا فرق ہے لیکن یہ خضاب۔ پوڈر، لپ اسٹک اور مصنوعی دانتوں سے اپنے بوڑھاپے کو سر اٹھانے نہیں دیتیں اور شوہر صاحب نے اپنی سادگی میں اسے بالکل چھوٹ دے رکھی ہے اس لئے شوہر کے بجائے باپ معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے شوہر صاحب سے بڑا اصرار کیا کہ دانت لگوالیں اور خضاب بھی استعمال کیا کریں۔ وہ خضاب لگانے پر تو کسی طرح تیار نہیں ہوئے لیکن دانت لگوانے پر رضامند ہوگئے تاکہ کھانے میں آسانی ہو۔ مگر مصنوعی دانت منھ میں رکھنے سے انھیں بڑی الجھن ہوتی تھی اسی لئے وہ کھانے کے وقت یا بیگم کے ساتھ باہر جاتے وقت لگا لیتے تھے۔

ایک دن انھیں سردی لگ کر سخت بخار آیا۔ بیگم انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں ڈاکٹر نے پوچھا کہ جب آپ کو سردی لگتی ہے تو دانت کٹ کٹ بولنے لگتے ہیں اس پر انھوں نے کہا کہ دانت تو میز پر رکھے رہتے ہیں وہ کٹ کٹ بولیں گے کیا۔ یہ سن کر بیگم کا موڈ خراب ہوگیا انھوں نے خیر دوا تو لے لی لیکن پھر ان کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں نہیں گئیں۔

آواز بازگشت

از

ناہید ظفر

ہلکی ہلکی پھوار پڑتے پڑتے مینہ برسنے لگا تھا۔ لگتا تھا برسوں کی پیاسی زمین پر آج یہ کھلا آسمان کچھ زیادہ ہی مہربان ہو چلا ہے۔ تمام سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ کہیں اِکا دُکا گاڑی نظر آ جاتی۔ حدِ نظر پانی ہی پانی بکھرا تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر کتنی دیر سے کھلے گیٹ کے باہر سنسان سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے اور ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ ٹکائے وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی "جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا ۔؟"

"یار آج تو تم اپنے انکل کی گاڑی لے ہی آتے تو اچھا تھا" فاروق کھڑکی کے باہر بارش کا نظارہ کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں آج ایسی کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے" حسن فائل پر جھکا دھیرے سے بولا۔

"اماں دیکھ رہے ہو کس غضب کا ساون بھادوں ہے۔ اس رحمتِ خدا میں بھلا اپنی یہ بابا آدم کے زمانے کی پھٹپھٹی کیا خاک ساتھ دے گی" فاروق برآمدے میں کھڑی خستہ حال موٹر سائیکل کو یاس بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"بھیا مجھے کچھ پسند نہیں ہے کہ چچا کے کاندھوں پر بلاوجہ بوجھ بنوں پھر یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے مجھے اس فرم میں نوکری دلوادی ہے ا" حسن فائل بند کرکے ایک طرف رکھتے ہوئے بولا "جانتے ہو ان کے گھر پر رہنا بھی مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا"

"ارے تو پھر چلے جاؤ کسی نیم دا تاریک سی کوٹھری میں، بیٹے جی آج کل کے دور میں تمھاری تنخواہ میں ایک تاریک کوٹھری ہی تمھیں کرائے پر مل سکتی ہے، جس کے محلے میں اگر کوئی خراٹے بھی لے تو بینڈ باجے کان میں گھس جائے" فاروق کی بات پر حسن زور سے ہنس دیا "اچھا اچھا اب زیادہ باتیں نہ بناؤ چلو بابا آدم کی کھٹ کھٹا اسٹارٹ کرو کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب گھر چلنا چاہیے"

فاروق نے موٹر سائیکل کی اسپیڈ بے حد آہستہ کر دی "چلیں جناب آپ کا دولت کدہ تو آ گیا مگر مجھ غریب کو اپنے غریب خانہ پہونچنا ہے اس لیے میں اس تحفے کو بند نہیں کروں گا ورنہ پھر تمھیں مجھے گھر چھوڑنے کے لیے اپنے انکل کی مرسڈیز نکلوانی پڑے گی"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟ یعنی میں چلتی اسکوٹر سے چھلانگ ماردوں؟" حسن چڑھ کر بولا۔

"بیٹے چلتی اسکوٹر سے ہی تو کہا ہے کوئی چلتی ریل سے تو چھلانگ مارنے کو نہیں کہا" فاروق مسکرا کر بولا "اور پھر یہ اسپیڈ دیکھ رہے ہو؟ چلو بس اب اترو" مجبوراً اسے چھلانگ مارنی ہی پڑی اور ایک چھپاکے سے سڑک پر پڑا کیچڑ بھرا پانی اس کی اُجلی سفید پتلون پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں ڈال گیا "خدا تیرا بیڑہ غرق کرے" وہ منہ چڑاتا بڑبڑاتا کپڑے صاف کرتا گیٹ میں داخل ہوا۔ مگر دوسرے ہی لمحے عینی کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔

"آپ آ گئے؟" وہ خوشی سے اٹھ کھڑی ہوئی

"جی!" وہ بے حد سنجیدگی سے جواب دیتا آگے بڑھ گیا۔

"آپ تو بری طرح بھیگ چکے ہیں" وہ پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا کپڑے تبدیل کرلوں گا"

"آپ کپڑے تبدیل کریں تب تک میں کھانا آپ کے کمرے ہی میں لے آتی ہوں، گیلے جسم پر ہوا لگی تو بیمار پڑ جائیں گے" وہ متفکر سی بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے میں نیچے آ کر ہی کھا لوں گا" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کتنا کٹھور تھا وہ کبھی سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔ لڑکیوں سے تو یوں کنارہ کرتا جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائیں گی

حسن کا آج آفس میں کام کرنے کو قطعی موڈ نہ تھا جبھی تو وہ اپنے آفس سے ملحقہ فاروق کے آفس میں چلا آیا تھا۔ چوکیدار کو چائے

کا آرڈر دے کر مزے سے میز پہ پیر پسارے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

"کیا بات ہے استاد یہ صورت پر بارہ کا گھنٹہ کیوں بجا ہوا ہے؟" فاروقی میز پر بکھرے کاغذات اکٹھے کرتے ہوئے بولا۔

"یار ایک الجھن آن پڑی ہے!" حسن کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔

"الجھن؟" فاروقی حیرت سے بولا "الجھن اور وہ بھی تمہیں؟ مذاق کر رہے ہو"

"کیوں کیا میری شکل الجھن کا شکار معلوم نہیں ہوتی؟" حسن دھیرے سے مسکرایا۔

"کیا گھر سے کوئی خط وغیرہ آیا ہے؟" فاروقی اب قدرے سنجیدہ ہو چلا تھا۔

"نہیں!"

"تو کیا کوئی یاد آنے لگا ہے۔؟"

"کون یاد آ سکتا ہے؟" حسن طویل سانس لے کر بولا۔

"ارے وہی جس کی تصویر بٹوے میں لیے لیے پھرتے ہو" فاروقی نے لمحہ بھر کو حسن کو چونکا دیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ سطح سمندر کی طرح پرسکون اور لہجہ مضبوط تھا "وہ اب یاد نہیں آتی"

"تو پھر الجھن کیسی؟" فاروقی جھنجھلا گیا۔

"یار میں اپنی کزن کی طرف سے فکرمند ہوں"

"کیوں کیا ہوا اسے؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا مگر ڈرتا ہوں بہت جلد کچھ ہو نہ جائے گا" حسن دھیرے سے ہنس دیا۔

"سیدھی طرح سے بتاتے کیوں نہیں کہ کس طوفان کی پیش گوئی کر رہے ہو؟"

"یار فاروقی مجھے لگتا ہے وہ مجھ میں دلچسپی ..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر فاروقی کو دیکھنے لگا۔

"اوہ سمجھا! تو اس میں الجھن کی کیا بات ہے؟ ایک بار پھر تختہ دار پر سوار ہو جاؤ" فاروقی مضحکہ خیز انداز میں قہقہہ لگا کر بولا "جب بھی آنکھ لگے فضول ہی ہانکو گے" چوکیدار چائے لے آیا تھا۔ ساتھ ساتھ ڈائریکٹر صاحب کا پیغام بھی۔ انھوں نے فاروقی کو اپنے آفس میں بلایا تھا "اچھا بیٹے جی تم تو چائے سے جی بہلاؤ میں چلا ڈائریکٹر صاحب کی طرف" پھر وہ دروازے پر ایک لمحہ کو رکا "تمہارے اس دلچسپ مسئلے پر بہت جلد گفتگو کریں گے" وہ مسکراتا باہر نکل گیا۔

"سنا ہے آپ اردو میں جواب نہیں رکھتے، ذرا مجھے اس نظم کی تشریح تو بتا دیجئے نا" حسن جو بڑے انہماک سے اخبار دیکھنے میں مصروف تھا، عینی کی آواز پر بری طرح چونک پڑا۔

"کون سی نظم ہے؟" عینی نے کتاب اس کے آگے کر دی چند لمحے وہ نظم کا مطالعہ کرتا رہا "اس میں ایسی کیا مشکل بات ہے جو آپ کو سمجھ میں نہیں آ رہی؟" وہ آہستگی سے بولا۔

"اس بند کا مطلب قطعی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ دو گھنٹوں سے متواتر کوشش کر رہی ہوں مگر ہر بار یہ بند میرے سر سے گذر جاتا ہے"

حسن نے پہلی بار آج اسے اس قدر قریب سے دیکھا تھا وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ سانولی کھلتی ہوئی رنگت خوبصورت تیکھے نقوش کی مالک عینی جو آج تک حسن کے لیے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ جس سے وہ اس قدر کتراتا تھا آج جانے کیوں اپنی اپنی سی لگ رہی تھی "کاش تم نورین سے پہلے مجھے ملی ہوتیں!" وہ ایک لمحہ کو سوچ کر رہ گیا۔

"نورین" یہ نام اپنے جلو میں کتنے درد اور زخم سمیٹے ہوئے تھا۔ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے آج بھی یہ نام حسن کو بے چین کر دیتا تھا نورین اس کی پہلی محبت تھی جس کا آغاز کالج کے دور میں ہوا۔ جسے آج تک سینے میں چھپائے وہ چپ چاپ سلگ رہا تھا۔ اس کی یہ محبت اجڑے ایک سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ مگر آج بھی یہ زخم روز اول کی طرح تازہ تھا نورین جو حسب دستور سماج کے بنائے ہوئے جھوٹے بندھنوں سے مجبور ہو کر ایک دن حسن کو چھوڑ کر کسی اور کی ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن حسن نے پھر کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بس چپ چاپ نورین کے دیے ہوئے درد کو سینے سے لگائے خاموش جیئے جا رہا تھا۔ پنڈی چھوڑ کر اب وہ یہاں کراچی اپنے چچا کے بے حد اصرار پر نوکری کی غرض سے چلا آیا تھا۔ وہ ان کے یہاں آٹھ سال کے طویل عرصے بعد آیا تھا۔ وہ چچی کی موت پر بھی نہ آ سکا۔ تب اس کے امتحان ہو رہے تھے۔ چچا الطاف سال میں ایک بار بھائی کے گھر کا چکر ضرور لگا آتے، تب وہ ہاسٹل میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عینی سے بھی اس کی ملاقات آٹھ سال بعد ہوئی تھی۔ وہ شروع دن سے حسن سے بے حد بے تکلف ہو گئی تھی۔ اس کی چیزوں کی دیکھ بھال کرنا، کمرے کی صفائی خود کروانا۔ غرض اس کی چھوٹی موٹی باتوں کا بے حد خیال رکھتی۔ ایک ہی اکلوتے چچا تھے عینی

کا ننھیال کزنوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر ددھیال میں صرف ایک اشفاق چچا تھے جن کی بس ایک ہی حسن اکلوتی اولاد تھی۔

آپ کن سوچوں میں غرق ہیں؟ پلیز مجھے یہ نظم سمجھا دیں: حسن بری طرح خیالات سے چونک پڑا: آں۔ ہاں، لائیے: کتاب دوبارہ لے کر وہ کتنی دیر اسے نظم کی تشریح بتاتا رہا اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر بےحد غور سے سنتی رہی بےحد شکریہ، آپ نے تو میرا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ دھیرے سے ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی: کوئی بات نہیں: پہلی بار اسے دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ بھی کوئی مانعت نہیں ہے؟" وہ شوخی سے بولی۔

"جی!" ایک لمحہ کو وہ اسے دیکھتا رہا پھر دھیرے سے بولا: جی نہیں کوئی مانعت نہیں ہے: وہ چلی گئی مگر پھر حسن کو الجھن میں مبتلا کر گئی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر اس کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ وہ عینی کی سوچوں سے جس قدر فرار چاہتا تھا فرار کی راہیں اتنی ہی تمام کی تمام مسدود ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

وہ عینی کے آگے ہار گیا تھا۔ اب مزید وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا شاید وہ عینی سے محبت کرنے لگا تھا۔ یہ محبت بھی کتنی عجب شے ہے، ایک بار دھوکہ ملے مگر پھر بھی دل اس کے آگے بےبس ہو جاتا ہے۔

"ارے خیریت تو ہے یہ آپ کی صورت کو کیا ہو گیا ہے؟" حسن نہا دھو کر لان میں چلا آیا تھا۔ جہاں عینی پہلے سے چائے پر اس کی منتظر تھی۔ کچھ روز سے حسن کا معمول بن گیا تھا، عینی کے کہنے پر وہ ہر روز شام کو چائے اس کے ساتھ باہر لان میں بیٹھ کر پیتا تھا۔ اب نہ تو اس کے رویے میں وہ جھنجلاہٹ تھی نہ وہ سنجیدہ بنا رہا پاتا تھا عینی اسکی جھنجلاہٹ اور سنجیدگی کو ابتدائی جھجک سمجھ کر فراموش کر چکی تھی الطاف صاحب شام کو جلد ہی چائے پی کر ٹینس کھیلنے کلب جاتے تھے صرف رات کے کھانے پر ہی ان سے ملاقات ہوتی

"میں نے کہا طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" حسن نے قریب آ کر اسے دوبارہ پوچھا۔

"ذرا بخار ہے!" عینی کا زرد چہرہ حسن کو پریشان کر گیا تھا۔ "تو کوئی دوا دیکھ لی؟" "نہیں!"

"کیا بات ہے ہوئی طبیعت اگر زیادہ بگڑ گئی پھر؟" وہ پیار بھری جھنجلاہٹ سے بولا۔

"ارے بابا معمولی سا بخار ہے، رات تک ٹھیک ہو جائے گا:" وہ چائے بنانے لگی۔

"رہنے دیں چائے کو:" وہ پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آج کہیں باہر چلتے ہیں:"

"کہاں:" وہ مسکرا کر سوالیہ نظروں سے حسن کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں حسن کے دل میں گہرائیوں تک اتر گئیں: "ارے یہ ڈائنگ ڈسٹنٹ پر جو اپنا کانی ہاؤس ہے، بس وہیں تک چلتے ہیں:" وہ پیار سے مسکرا دیا: "چلیں" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر ایک شرط پر!" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ کیا؟"

"پہلے کوئی ٹیبلٹ لے لیں۔"

"ارے بابا میں بالکل ٹھیک ہوں:" وہ یقین دلاتے ہوئے بولی۔

"کوئی ٹھیک ویک نہیں ہیں آپ، صورت دیکھی ہے اپنی لگتا ہے ابھی ابھی پٹ کر آئی ہیں:" اس کے ڈانٹنے پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی "اچھا جناب اگر یہی آپ کی ضد ہے تو ٹھیک ہے" وہ اندر کی جانب بڑھ گئی "آپ یہیں رکیں میں ابھی ٹیبلٹ کھا کر اور بابا کو بتا کر آتی ہوں:"

"یہ ہوئی نا بات" وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔

"ہائے میرا چاٹ کھانے کا موڈ ہو رہا ہے، کانی ہاؤس کے باہر چاٹ والے کو دیکھ کر عینی کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"ارے سارے دماغ تو ٹھیک ہے۔ اتنی طبیعت خراب ہے اور چاٹ کھاؤ گی:؟"

"تو کیا ہوا ذرا بخار ہی تو ہے:" وہ بسورتی صورت بنا کر بولی۔

قسم سے بڑی ضدی ہیں آپ" پھر مصنوعی رعب لہجے میں پیدا کر کے بولا: سیدھی طرح سے اندر چلیں اور خاموشی کے ساتھ کافی کا ایک گرما گرم مگ پئیں:

کتنا رعب جھاڑتے ہیں آپ؟ وہ جھلا گئی۔

"آپ کا اکلوتا چچازاد جو ٹھہرا:" وہ شوخی سے بولا: ہاں اسی لیے تو سعادت مندی کا مظاہرہ کر رہی ہوں۔ جب سے:۔ وہ بےحد معصومیت سے بولی۔ حسن ہنس دیا۔ اچھا اچھا اب اندر چلیں لوگ دیدے پھاڑ پھاڑ کر ہم دونوں کی جانب دیکھ رہے ہیں: حسن اسے کلائی سے پکڑ کر

اندر لے جاتے ہوئے بولا۔

"اللہ میاں نے آخر آنکھیں آنکھیں دی ہیں تو کچھ تو کام لیں گے ہی نا اپنی آنکھوں سے" وہ یہ کہتے ہوئے کھلکھلا پڑی۔ حسن بھی ہنس دیا۔ پھر دونوں کانفرنس میں داخل ہو گئے۔

دن بڑے پُرکیف اور حسین ہو چلے تھے۔ حسن عینی کی قربت میں اپنے دردناک ماضی کو کسی حد تک فراموش کر چکا تھا۔ نورین ماضی کے جانے کن پردوں کے پیچھے جا چھپی تھی۔ اس کے اور عینی کے درمیان کوئی عہد و پیمان بھی نہ ہوئے تھے۔ مگر قسموں، عہدوں کا کیا ہے۔ پھر نورین نے بھی کتنے وعدے کیے تھے کتنے پیمان نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں؟ مگر حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا۔ زمانہ اور وقت کی سرد ہواؤں کے ساتھ وہ عہد و پیمان، وہ جذبات، وہ احساسات سبھی سرد پڑ گئے تھے وہ بہت جلد بابا اور ماں کو اپنی پسند کے بارے میں مطلع کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ہر ماں باپ کی یہ دلی آرزو ہوتی ہے کہ جب بیٹا کمانے لگے تو گھر میں ایک چاند سی بہو بھی آئے۔ پھر جب بہو آ جائے تو یہ انتظار رہتا ہے کہ کب وہ ننھا منا سا وجود آئے گا جو اپنی توتلی زبان میں "دادا" اور "دادی" پکارے گا۔ پوتا ہر دادا دادی کی محبت کا ثمرہ ہوتا ہے اور بڑھاپے میں تفریح کا سامان۔ اسی لیے تو پوتے کی آرزو کی جاتی ہے۔ جس کی ہر ہر ادا پر دادی و دادا، ممی ڈیڈی خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ حسن کے والدین نے بھی بیٹے کے لیے اسی قسم کے خواب دیکھے تھے۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ وہ بوڑھے والدین کی اس خواہش کو پورا کر دے۔

"سنیے! کل آپ آفس سے جلدی آ سکیں گے؟" رات کے کھانے پر عینی حسن سے مخاطب تھی۔

"کیوں جی؟ آپ کیا کوئی تماشا دکھانے والی ہیں؟" حسن کی بات پر الطاف صاحب بھی قہقہہ مار کر ہنس دیے اور وہ جھینپ سا گیا۔

"اچھا بھئی تم لوگ باتیں کرو۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ اس لیے میں اب چلا۔" حسن اور عینی احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شب بخیر۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔ "شب بخیر" الطاف صاحب ڈرائنگ روم سے نکل گئے تو وہ بولی۔ "کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کریں آپ۔" وہ مصنوعی جھلاہٹ سے بولی۔

"اچھا چلیں ہم سنجیدہ ہیں۔ اب آپ فرمایئے۔" عینی حسن کو واقعی اس قدر سنجیدہ صورت بنائے دیکھ کر ہنس پڑی۔ "کیوں اب کیا ہوا؟" وہ اسی سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کی صورت دیکھ کر ہنسی آ رہی ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"چلیں میری صورت اس قابل تو ہوئی کہ آپ چند لمحوں کو ہنس سکیں۔" "ارے نہیں آپ کی صورت تو لاکھوں میں ایک ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"بی بی! ویسے ہی بنا دیں کام کیا ہے؟ بلا وجہ غریب کو بڑھاوا دے کر کیا ملے گا آپ کو؟" وہ بے حد اطمینان سے بولا۔

"اللہ کتنے عقلمند ہو گئے ہیں آپ! مجھے واقعی آپ سے کام ہے" وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے کل شاپنگ کے لیے آپ کے ساتھ جانا ہے۔ دراصل... کچھ عادت سی ہو گئی ہے۔ آپ کے ساتھ باہر جانے کی۔" حسن خوش ہو گیا۔ جب وہ حسن کو اس طرح اہمیت دینے لگتی تو حسن خوش ہو جاتا تھا۔

"مگر یہ تو بتائیں یہ اتنی ڈھیر ساری شاپنگ آخر کس لیے؟" حسن ڈھیر سارے بنڈل سنبھالے عینی کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"ارے بابا مہمان آ رہے ہیں رات کو۔" "کون مہمان؟" وہ ورمیں ٹھٹھک گیا۔

"سنگاپور سے عقیل ماموں بمعہ اپنے بیوی بچوں کے رات تین بجے کی فلائٹ سے یہاں تشریف لا رہے ہیں۔"

"اوہ۔" وہ لفظ 'اوہ' کو طویل کھینچتا ہوا بولا۔ "بائی دی وے یہ آپ کے ماموں موصوف کتنے عرصے بعد یہاں تشریف لا رہے ہیں۔"

"تقریباً دس سال بعد۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اور بچے کتنے ہیں؟" وہ عینی کے برابر چلنے لگا۔

"دو بیٹے اور ایک بیٹی۔" دونوں گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیور نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔

"بچوں کی عمر کیا ہوگی۔" "یہ آپ سوال پر سوال کیوں کیے جا رہے ہیں؟ کچھ باقی کے لیے بھی تو چھوڑ دیں۔" وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔

"ارے بابا پھر آپ مصروف ہو جائیں گے، موقع کہاں ملے گا؟" وہ بھی ہنس دیا۔ "بس خود ہی دیکھ لیجئے گا بچوں کو بھی۔" وہ لفظ "بھی" پر زور دے کر بولی اور مسکراتی ہوئی گاڑی میں آ بیٹھی۔

گھر پہنچ کر عینی واقعی بے حد مصروف ہو گئی زور و شور سے تیاری

ہو رہی تھی۔ ایسے وقت وہ حسن کی بے حد شکر گزار تھی جو اس کے ہر کام میں اتنی مدد کر رہا تھا۔ ورنہ وہ تنہا اتنا انتظام کیونکر کر سکتی؟ آج سے دو سال قبل ممی اسے اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئی تھیں۔ اتنی ڈھیر ساری ذمہ داریاں اس کے ناتواں کندھوں پر آ پڑی تھیں۔ آج شدت سے اسے ممی یاد آ رہی تھیں۔ مگر حسن اسے تنہا کہاں چھوڑتا تھا ہر وقت اپنی باتوں سے ہنساتا رہتا۔ اس کی دلجوئی کرتا رہا، یہاں تک کہ فلائٹ کا ٹائم ہو گیا۔

عقیل ماموں کے آجانے سے گھر میں کچھ زیادہ ہی رونق آگئی تھی۔ عدیل، نجیب اور سائرہ بے حد دلچسپ لوگ تھے تینوں بھائی بہن لمحہ بھر کو نچلے نہ بیٹھتے۔ ہر وقت کبھی کوئی کھیل ہو رہا ہے، کبھی تفریح کے پروگرام مرتب ہو رہے ہیں۔ حسن تو کبھی کبھی جھلا اٹھتا۔ ایک ماہ کا عرصہ یونہی گزر گیا تھا تفریحیں کرتے۔ پھر علینی بھی ہر وقت ان لوگوں کی مدارات میں مصروف رہتی تھی۔ حسن کو یہ سب ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ جب عدیل اور علینی خوب خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے، ایک دوسرے کو چھیڑتے، قہقہے لگاتے تو اس کا دل اس وقت بہت جلتا اس کا جی چاہتا وہ ایک زوردار گھونسہ عدیل کے جبڑوں پر دے مارے اور ایک جھٹکے سے ساری کی ساری بتیسی باہر آ رہے۔ مگر وہ علینی کا عزیز کزن تھا۔ کوئی جواز بھی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ علینی کو اس سے دور رہنے کی تنبیہہ کرے۔ پھر وہ کیا کرے؟ یہی سوال اسے پریشان کر دیتا۔

"ارے آپ یہاں کہاں چھپے بیٹھے ہیں؟ دیکھئے تو موسم کس قدر خوبصورت ہو گیا ہے؟" اس نے چونک کر علینی کی آواز پر فائل سے نظریں ہٹا کر اوپر دیکھا۔ عدیل، نجیب اور سائرہ بھی علینی کے پیچھے کمرے میں چلے آئے۔ اس نے فائل بند کر کے سامنے ٹیبل پر رکھ دی۔

"ارے حسن بھائی کمال ہے یہ کیا حرکت ہے! ہم سب پکنک کے لیے جا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ایسے سہانے موسم میں بھی فائلوں میں غرق بیٹھے ہیں" نجیب شوخی سے بولا۔

"مجھے آفس کا بہت کام کرنا ہے تم لوگ چلے جاؤ" وہ جبراً مسکرا دیا۔ علینی عدیل کے ساتھ بے حد دھیمی آواز میں کسی بات پر بحث کر رہی تھی وہ سوائے سرگوشی کے کچھ بھی نہ سمجھ سکا "کس مسئلے پر اس قدر رازداری کا مظاہرہ کر رہی ہے؟" وہ دل میں سوچ کر رہ گیا۔

"سنا علینی جی! کیا فرما رہے ہیں حسن بھائی؟" وہ نجیب کی آواز پر چونکی اور ہڑبڑا کر بولی "آں... ہاں... کیا کہہ رہے ہیں!" عدیل بھی ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا "حسن صاحب اب چلیے بھی چلیئے۔ آفس کا کام تو ہوتے ہی رہیں گے مگر پھر ایسا سماں نصیب میں کہاں؟" عدیل نے مسکرا کر علینی کی جانب دیکھا اور حسن اسکے جملے پر اس انداز میں علینی کی طرف مسکرا کر دیکھنے پر کچھ اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ "اس کا جملہ معنی خیز تھا یا محض..." وہ کچھ بھی صحیح صورت حال کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ پھر سب کی موجودگی کا احساس کر کے خود کو ہشاش بشاش رکھنے کی سعی کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تم لوگ میرے ساتھ کو اتنا ہی ضروری اور اہم سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے مجھے چلنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے" وہ نجانے کیا سوچ کر ان کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گیا تھا۔ "گریٹ!" علینی نے نعرہ مار کر تالیاں بجاتے حسن کو دروازے سے باہر دھکیلتے ٹولے کی صورت سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئے۔ پکنک کے تمام انتظامات پہلے سے کیے جا چکے ہیں۔

"اللہ یہ کہاں صحرا میں لے آئے ہیں؟ یہاں تو دور دور تک قافلے کا نام و نشان نہیں ہے" سائرہ پھولی سانسوں کے درمیان حد نظر تک خشک پہاڑیوں کا سلسلہ دیکھ کر بولی۔ متواتر چلتے رہنے سے سبھی کی سانسیں پھول گئی تھیں "ایڈونچر مائی ڈیر۔ ایڈونچر" نجیب بولا۔

"خاک میں گیا ایسا ایڈونچر... مجھ سے تو... بس... اب نہیں... چلا جا رہا" علینی بھی ہانپتی ہوئی بولی حسن ابھی کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ عدیل بول پڑا "اگر اس قدر تھک گئی ہو تو کچھ دیر رک جائیں؟" حسن چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔

"اخوہ بھئی ان نازک... وجودوں کے... یہاں طانے کا کہا ہی کیا تھا؟" نجیب چڑ کر بولا "ذرا دو قدم چلیں... اور ہانپنے لگیں..." "تم چپ رہو جی۔ کون سا ہم ریسٹ کرنے کو رک گئے ہیں؟" سائرہ نے بھی چڑ کر بات کاٹی۔

"اخاہ! وہ دیکھو آبشار" علینی تمام تکان بھلا کر خوشی سے چہکی۔

"اوہ تو یہ تو بہت چھوٹا ہے" سائرہ مایوسی سے کہتی وہیں بیٹھ گئی جہاں پہاڑی کا اختتام ہوتا تھا اور جہاں سے نیچے اتر کر آبشار تک جاتے تھے۔

"اتنا اوپر سے دیکھ رہی ہو نا بھی یہ ننھا منا سا نظر آتا ہے"

حسن اس عرصہ میں پہلی بار بولا تھا۔ سبھی سامان اٹھائے ڈھلوان سے نیچے اترنے لگے۔ قریب جا کر پتہ چلا کہ آبشار اس قابل تو تھا ہی کہ سبھی اس کے نیچے جا کر خوب نہا سکتے تھے۔ نجیب سائرہ اور عینی سامان تقریباً پھینکتے اس آبشار تلے جا کھڑے ہوئے۔ روانی سے بہتا پانی انھیں سر سے پیر تک بھگو گیا۔

"ارے تم لوگ بھی آؤ نا؟" عینی نے عدیل اور حسن کو پکارا۔ عدیل بھی مسکراتا ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

"میں تو ابھی کچھ دیر سستانے اور سگریٹ پینے کے موڈ میں ہوں۔" حسن ٹال گیا۔ وہ ان لوگوں کی طرف پیٹھ کیے سگریٹ سلگا کر چاروں طرف بکھرے ہوئے اس پہاڑی سلسلے کا معائنہ کرنے لگا۔ "کتنی مضبوط چٹانیں ہیں۔" وہ سوچ رہا تھا۔ "بالکل میری طرح۔ میں بھی تو پتھر کی ایک چٹان ہوں جس پر کوئی وار کوئی ضرب کچھ اثر نہیں کرتا۔ اپنے اندر کے طلاطم کو کس بلا کی خود اعتمادی اور ضبط سے روکے کھڑا ہوں ورنہ۔۔۔ میری روح میں بھی تو ایسے کتنے گھاؤ ہیں جن سے خون کے آبشار رواں ہیں۔ مگر ان چٹانوں کی طرح بظاہر میں بھی کتنا مطمئن اور پر سکون ہوں۔"

"افوہ بھئی پلیز بس کیجیے نا۔" وہ عینی کی ہنستی کھنکتی آواز پر چونک پڑا گردن موڑ کر دیکھا تو چند لمحوں کو سکتے میں آ گیا۔ عدیل عینی کو زبردستی ہاتھ سے پکڑے آبشار کے اس حصے میں کھڑا تھا جہاں پانی کے دھارے کا دباؤ قدرے تیز تھا۔ وہ خود کو عدیل کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش میں بار بار پانی میں غوطے کھا چکی تھی۔ عدیل خوب ہنس رہا تھا۔ عینی بھی اسے روکتے روکتے ہنستی چلی جا رہی تھی۔ چند لمحے یہ کھیل جاری رہا۔ پھر جب عینی کی سانس متواتر پانی کے بہاؤ سے پھولنے لگی تو عدیل نے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ دوڑتی ہوئی پانی سے باہر نکل آئی۔ "میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں۔۔۔ بدلہ۔۔۔ ضرور لوں گی۔" وہ چلا کر پھولی سانسوں کے درمیان بولی اور ہنسنے لگی۔ نجیب اور سائرہ بھی ان کی اس دلچسپ چھیڑ چھاڑ پر ہنس رہے تھے۔ مگر حسن بے حد سنجیدہ تھا۔ آج کے واقعے نے اس کے دل پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔ وہ تمام وقت اک عجیب کیفیت سے دوچار رہا۔ زندگی کا ایک اور دھوکا! زندگی جو کر و فریب سے پُر ہے ہم لوگ اپنے احساسات اور جذبات کی چتا میں کس خاموشی سے سلگتے رہتے ہیں۔ زندگی کی راحتوں اور مسرتوں سے خود تو تہی دامن ہوتے ہیں مگر دوسروں کے دامن یہاں وہاں سے سمیٹی ہوئی مسرتوں سے بھر دیتے ہیں۔ زندگی بھی عجب شے ہے کس کس طرح جلاتی ہے۔

پکنک کے بعد سے حسن نے ان لوگوں سے دور دور رہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ آفس سے دیر سے لوٹتا اور پھر نہا دھو کر کبھی فاروق کے گھر چلا جاتا یا کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھ جاتا اور گپ شپ باتیں اور یادیں تازہ کرتا رہتا۔ جب پہلی بار وہ عینی کو لے کر یہاں آیا تھا عینی کو بخار کی وجہ سے ایئرکنڈیشنڈ کافی ہاؤس میں کپکپی سی ہونے لگی تھی تبھی اس نے اپنا جیکٹ اتار کر احتیاط سے عینی کے کاندھوں پر ڈالا تھا۔ وہ بال کھولے گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتی کتنی حسین نظر آ رہی تھی۔ سارا ماحول اس کی موجودگی سے معطر اور دلفریب ہو گیا تھا۔ مگر آج وہی ماحول حسن کو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ یادیں اسے سلگائے دے رہی تھیں۔ وہ روزانہ رات گئے گھر میں گھستا۔ ایک نظر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کی سمت دیکھتا جہاں سے روشنی چھن چھن کر برآمدے کے ایک گوشہ کو جگمگائے دے رہی تھی۔ یہ وہی گوشہ تھا کہ جہاں اس روز موسلادھار بارش میں عینی سیڑھیوں پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کرب سے سوچ کر رہ جاتا ڈرائنگ روم میں اب تک روشنی ہونے کا مطلب یہ تھا کہ محفل ابھی برخاست نہیں ہوئی ہے۔ وہ تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں پھلانگتا کمرے میں گھس کر وہ دروازہ بند کیے کتنی دیر آنکھیں اور مٹھیاں بھینچے اپنی متواتر ہانپتی کانپتی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا تب ضبط جذبات سے اس کی پیشانی عرق آلود ہو جاتی اور آنکھوں میں ننھے آنسو ٹپ ٹپ قالین میں جذب ہو جاتے۔ اسے کیا ہو گیا تھا وہ تو نورین کے بچھڑنے پر بھی یوں سسک سسک کر نہ رویا تھا۔ اس قدر بے قرار تو وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ پھر یہ کیسا انوکھا درد ہے؟ اپنے ذہن کی اس پراگندہ سوچ سے وہ گھبرا گیا تھا۔ آج بھی حسب دستور وہ خود پر قابو پانے کی کوشش میں گھٹنوں کے بل زمین پر ٹک گیا مٹھیاں اور آنکھیں اسی طرح بھینچی تھیں۔ عینی کا چہرہ کہیں دھند میں کھو رہا تھا، وہ طوفان اور گرد میں کہیں کھو رہی تھیں وہ اس کے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے تھک سا گیا تھا۔ کتنے لمحے یوں ہی بے کراں سے گزر گئے تبھی اس نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں کھول دیں۔ خود تالو چوٹ کھا تھا۔ سانسوں کی رفتار نارمل تھی۔ کمرہ بے حد پرسکون تھا۔ وہ پسینے میں تر

پھر میلے دھیرے سے اٹھا اور تھکے تھکے قدموں سے چلتا باتھ روم میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹا چھت کو تکے جا رہا تھا۔ وہ کسی اہم فیصلے تک پہنچنا چاہتا تھا

گھر کے سبھی افراد رات کے کھانے پر کہیں مدعو تھے۔ عینی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی چنانچہ اس نے گھر پر رہنا بہتر سمجھا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو وہ حسن کے کمرے میں چلی آئی اور بک شیلف سے ایک کتاب جو انگریزی لطیفوں پر مشتمل تھی۔ نکال کر پڑھنے لگی۔ حسن کو بھانت بھانت کی کتابیں جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کی یہ عادت عینی کو بہت پسند تھی وہ خود بھی تو مطالعے کی بے حد رسیا تھی۔

وہ خلاف معمول گھر میں سناٹا دیکھ کر ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ برآمدہ پار کر کے وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مجھے کیا! گئے ہوں گے کہیں تفریح کرنے۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ آج وہ پکا عہد کر کے آیا تھا کہ عینی سے صاف صاف بات کرے گا۔ بریف کیس میز پر رکھ کر جونہی مڑا چونک پڑا عینی کمرے کے دریچے کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھی لطیفے پڑھنے میں مصروف تھی۔

"آپ آگئے!" کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر وہ بولی۔

"جی!" وہ مختصراً بولا۔

"شکر ہے ان غریب آنکھوں کو آج آپ کے درشن تو نصیب ہوئے ورنہ ...."

"پلیز خدا کے لیے عینی" وہ جھنجلا گیا۔ عینی حیرت زدہ سی اسے کس قدر غصے میں بپھرا دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے حسن، آپ ناراض ہیں کیا"؟ وہ خود بھی حسن کی اس تبدیلی کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ آخر وہ کیوں ان لوگوں میں نہیں بیٹھتا تھا اور کیوں اس طرح دیر سے گھر آنے لگا تھا۔ مگر اسے موقع نہ مل رہا تھا یہ سب پوچھنے کا۔

"آپ کو اس سے کیا۔ آپ کی بلا سے کوئی جیے یا مرے" وہ تلخی سے بولا۔

"آخر پتہ بھی تو چلے کہ یہ برہمی کیوں؟" وہ سر جھکا کر بولی۔

"مجھے برہم ہونے کا کیا حق حاصل ہے مس عینی" وہ اس کے بے حد قریب آ کر ذرا جھک کر بولا۔ عینی اس کے کرخت اور کڑوے لہجے پر بری طرح چونک اٹھی۔ "میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہی ہیں" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں ... ہاں ... کیوں سمجھ میں آئیں گی" وہ تیزی سے بولا "عدیل جو آ گیا ہے"

"حسن تو" وہ حیران سی کھڑی ہو گئی۔ "یہ کیا بکواس ہے"

"ہاں۔ مجھے عدیل سے کیا مطلب" وہ پھر اس کے قریب چلا آیا۔ "مجھے تو افسوس صرف اس بات کا ہے کہ تم عورت ذات کتنی بے اعتبار قوم ہو"

"حسن!" وہ بھی لہجے میں سختی پیدا کر کے تقریباً چلا اٹھی "مجھے آپ کی باتیں بہت کچھ بتا رہی ہیں۔ میں" وہ چند لمحوں کو رکی پھر دوبارہ بولی "میں.. حسن میں سمجھ رہی ہوں آپ کی باتوں کا مفہوم" وہ یکلخت نرم پڑ گئی تھی "حسن میں نہ جانتی تھی کہ آپ میرے خلوص کو اس قدر غلط رنگ دے دیں گے" وہ دریچے سے باہر نظر کیے بولی "عورت کی ذات پر الزام دینے سے پہلے اپنے گریبان میں تو جھانک لیا ہوتا۔ کیا آپ سب مرد ایک ہی مقصد کے پیچھے نہیں پھرتے" وہ تیزی سے حسن کی طرف رخ کر کے بولی "کیا آپ نے بھی عام مردوں کی طرح ایسا ہی انداز میں نہیں سوچا؟"

"اگر تم ... تم مجھ سے" جملے اب اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے "تم میرے .... ہر حکم کی تعمیل کیوں کرتی رہیں؟" وہ چند لمحے رکا پھر دھیرے سے بولا "میری ہر بات کا خیال رکھنا... عینی عینی وہ سب کیا تھا! اور ... اور اب یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ بیڈ پر گر سا گیا "عینی جانتی ہو پہلے پہل۔ میں نے اس دل کو بہت روکا، بہت سمجھایا۔ تم سے کتراتا رہا۔ مگر تمہاری بڑھتی ہوئی توجہ کو ٹال نہ سکا... میں.. میں۔ عینی میں.. تم سے محبت کرتا ہوں"

"پلیز حسن۔ بہت زیادہ ہو گیا" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولی اسے حسن کی حالت پر جانے کیوں ترس بھی آ رہا تھا۔ افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس نے عینی کی دوستی کو کتنے غلط انداز سے سوچا تھا، وہ تو آج تک حسن کو محض ایک اچھا دوست اور ہمدرد سمجھتی تھی "عدیل کو یہ سب جان کر کتنا افسوس ہو گا" اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر ذرا تحمل سے اور دھیرے دھیرے بولنے لگی "عدیل اور میں دو صرف ایک دوسرے کو ایک عرصے سے ... پسند ہی کرتے

ہیں بلکہ... بہت جلد ہم... میرا مطلب ہے انکل کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں، وہ جلد از جلد عدیل کی شادی کرکے سنگاپور واپس جانا چاہتے ہیں؟ عینی نے گویا ایک اور بم اس کے دے مارا۔ اسے عینی کی آواز بہت دور خلاؤں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

چلی جاؤ۔ خدا کے واسطے مجھے... مجھے تنہا چھوڑ دو؟ حسن نے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ وہ چند ساعتیں خاموش کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ حسن ہاتھوں میں منہ چھپائے خاموش ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ عینی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سر جھکائے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی آواز کی بازگشت اب بھی حسن کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ شکستہ دل لیے بے چارہ دل شانے چت بیڈ پر لیٹ گیا دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے دل میں برپا طوفان کو آنکھوں کی راہ بہہ نکلنے سے روکنے کی سعی کرتا رہا۔ شام دھیرے دھیرے سسکتی رہی اس کی بے بسی پر آنسو بہاتے لمحے ہولے ہولے گزر رہے تھے۔ وہ عینی کی بازگشت میں ڈوبتا چلا گیا: عدیل اور میں نہ صرف ایک دوسرے کو ایک عرصے سے... پسند ہی کرتے ہیں بلکہ....: عدیل اور میں...: انکل کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ وہ بہت جلد...: اس نے دھیرے سے کانپتے ہاتھ آنکھوں سے ہٹائے: اس کے ہر سمت تاریکی پھیلی ہوئی تھی وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ روح کے آبشار آج آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

سن سائن اور آپ کا کردار

مصنف :۔ لنڈا گوڈ مین
مترجم :۔ فہیم انہولوی

سن سائن (SUN SIGN) اگر میں کہوں کہ آپ کا سن سائن "جدی" ہے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ جس دن آپ کی پیدائش ہوئی اس روز سورج منطقۃ البروج کے اس حصّے میں تھا جس کو "جدی" کہتے ہیں۔ سن سائن بارہ (۱۲) ہوتے ہیں :۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان عقرب، قوس۔ جدی، دلو، اور حوت۔ یہ بارہ حصّے تقریباً ایک ماہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی سن سائن کے آخری یا شروع دن پیدا ہوئی ہوں تو ممکن ہے دونوں کے اثرات موجود ہوں آپ میں۔

مختلف سن سائن میں پیدا ہونے والے مختلف شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ حالانکہ ایک انسان کا کردار اس کا مزاج اور اس کی اپنی خصوصیات صرف سن سائن پر ہی منحصر نہیں ہوتیں۔ تمام اور اثرات اس کو وہ بناتے ہیں جو وہ ہوتا ہے مگر پھر بھی کچھ بنیادی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو خواہ نمایاں نہ ہوں مگر غور کرنے پر مختلف سن سائن والوں میں نظر آئیں گی۔ آپ ان خصوصیات کو اپنے گھر والوں اپنے احبا اور اعزا میں تلاش کریں جس سائن کے وہ ہوں گے ان میں اس سن سائن کی خصوصیات ضرور نظر آئیں گی یا آپ خود اپنا سن سائن پڑھیں اور دیکھیں کہ کہاں تک آپ میں یہ خصوصیات ہیں۔

پچھلے ماہ میں نے قوس کی خصوصیات بیان کی تھیں اس ماہ جدی کی باری ہے۔

جدی (۲۲ دسمبر سے ۲۰ جنوری تک)
(اس سن سائن کا نشان ہے۔ بھیڑ

"اس کا وقت نہ برباد کرو۔ کیوں
کیونکہ اس کا ایک ایک منٹ بیحد قیمتی ہوتا ہے
اور زیادہ بولنا بھی نہیں
کیونکہ اس کا ایک ایک لفظ بیش بہا ہوتا ہے"
(لورس کیرال)

کسی جدی کی شناخت کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے مشق چاہیئے۔ کونے میں اس مکڑی کو غور سے دیکھئے بادی النظر میں تیز اڑتے ہوئے پتنگوں کا وہ کیا بگاڑ سکتی ہے لیکن وہ اس کے جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور جیت مکڑی کی ہی ہوتی ہے۔ اب ذرا یاد کیجئے کچھوے اور خرگوش کی دوڑ کا قصہ۔ سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ رینگنے والا کچھوا خرگوش سے دوڑ لگائے گا بھلا اس تیز طرار خرگوش سے اس کا کیا مقابلہ مگر میاں خرگوش سیدھے منزل کی جانب دوڑنے کے بجائے بھاگتے ہیں اور جیت کچھوے کی ہی ہوتی ہے۔ اب ذرا اس بھیڑ کو دیکھیے جو پہاڑی پر چڑھ رہی ہے۔ اور جس کا پیچھا شکاری کر رہے ہیں وہ ضرور پکڑی جائے گی مگر بھیڑ اپنے مخصوص کھروں کی مدد اور اپنی قوت ارادی کے ساتھ پہاڑی پر چڑھتی چلی جاتی ہے۔ شکاری تھک کر واپس ہو جاتے ہیں اور جیت بھیڑ کی ہی ہوتی ہے۔

آئیے اب کسی جدی کی شناخت کرنے چلیں۔

گو جدی محفلوں میں شرکت سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے — لیکن جدی صرف پہاڑ ہی نہیں بلکہ سماجی پہاڑ پر بھی چڑھتا ہے لہٰذا وہ وہاں مل سکتا ہے۔ کوئی ایسا اجتماع تلاش کیجئے جس میں بڑے لوگ ہوں۔ جدی اپنے سر پر لیمپ سٹینڈ لگائے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر رہا ہوگا بلکہ وہ چپ چاپ کھڑا تماشا دیکھ رہا ہوگا۔ آپ شاید اس کی طرف متوجہ بھی نہ ہو پائیں گے۔ تمام اور چمکتے دمکتے لوگوں کے آگے وہ بالکل سادہ اور معمولی لگے گا۔ ان تمام لوگوں میں زندگی کی کسی دوڑ کو جیتنے کے لئے زیادہ صلاحیتیں موجود معلوم دیں گی۔ مگر آپ یقین مانیں جیت جدی کی ہی ہوگی۔

جدی دیکھنے اور کام کرنے میں بڑے سیدھے اور بے ضرر نظر آئیں گے حالانکہ وہ لوہے کی طرح مضبوط ہوتے ہیں اور اپنی مستقل مزاجی بلند حوصلوں اور کڑی محنت کے باعث وہ زندگی کی تمام دشواریوں کو جھیلتے ہوئے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ وہ کبھی

[illegible] نہیں جاتے بلکہ سیدھے سادے اور آزمودہ راستوں پر پورے اعتماد کے ساتھ چلتے چلے جاتے ہیں اور وہ ان لوگوں کی بڑی عزت کرتے ہیں جو ان سے پہلے انہیں راستوں پر چل کے کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ کامیابی کی خدمت کرتے ہیں۔ اس سے علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ان کی عزت کرتے ہیں اور ماہرین فن کی قدر کرتے ہیں اور [illegible] کا احترام کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں اور وقت پڑنے پر مصلحت سے کام لیتے ہیں۔ وہ دوسروں کو آگے نکل جانے دیں گے لیکن پھر بھی ان کے خلاف منزل پر پہلے وہی پہنچیں گے۔ [illegible] راستے میں پڑے پتھروں سے بچ کر گزرتے ہیں اس لئے ٹھوکر نہیں کھاتے۔ ان کی نظر سامنے بھی رہتی ہے اور پیر زمین پر رہتے ہیں۔ حسد، جوش، بے ساختگی، غصہ، کاہلی، غیر سنجیدگی، اتلاف [illegible] زندگی کی راہ میں آنے والے پتھروں سے وہ ہمیشہ بچ کر نکل جاتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ "جدی" آپ کی عزت کرے تو آپ بھی روایات اور سماجی اصولوں کی مخالفت نہ کریں۔ وہ جدی بھی جو ذرا بیباک ہوتے ہیں کم سے کم ظاہری طور پر انکا خیال ضرور رکھتے ہیں۔ بعض جدی اپنے مالی حوصلوں کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے اور ایسے جدی بے حد خود غرض اور سنگ دل ہو جاتے ہیں۔ "جدی" کے ارد گرد ہمیشہ ہی عزت وقار اور سنجیدگی کا ہالہ سا بنا رہتا ہے، ان کا ستارہ زحل ہوتا ہے اس لئے وہ اسکے سخت نظم و ضبط اور خود محرومی کے [illegible] سے کبھی بچ نہیں پاتے۔

عموماً کمسن "جدی" زیادہ عمر والے "جدی" لوگوں سے زیادہ سنجیدہ اور صابر ہوتے ہیں، جب عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ نئے زمانہ کی بیباکیوں سے گھبرا جاتے ہیں اور بوڑھے "جدی" عموماً یہ کہتے پائے جائیں گے "آہ ایک میرا زمانہ تھا" لیکن عمر کے ساتھ ہی ساتھ ان میں نرمی بھی آ جاتی ہے اور وہ ان مذاقوں سے بھی لطف اندوز ہونے لگتے ہیں جو ان کے لڑکے یا پوتے وغیرہ کرتے ہیں۔

جدی عموماً اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، دوسروں کے معاملات میں دخل دینے سے گریز کرتے ہیں، البتہ اگر آپ ان سے کوئی مشورہ طلب کریں تو وہ بلا تکلف اپنی رائے بے کم و کاست دے دیں گے لیکن یہ بھی چاہیں گے کہ آپ ان کے مشورہ پر عمل کریں۔

جدی شادی کرتے وقت فریق مخالف کی مالی اور سماجی حیثیت پر ضرور غور کرتے ہیں۔ وہ اس وقت تک شادی نہیں کرتے جب تک جذباتی طور پر اس کے لئے آمادہ نہ ہو جائیں۔ یہی صورت ان کی کاروبار کے سلسلہ میں بھی ہوتی ہے، جب تک وہ مالی اعتبار سے مطمئن نہ ہو جائیں کاروبار شروع نہیں کرتے، یہی سبب ہے کہ تقدیر کو بار بار ان کی راہ میں نہیں آنا پڑتا۔ ایسے "جدی" بھی ہوتے ہیں جو چاند کی عجیب روشنی کو سمجھتے ہیں اور تتلی کے پروں کی رنگینی اور دلکشی کو سراہتے ہیں، لیکن وہ ایسا نہیں کرتے کہ ان کے جذبات حقیقت پر چھا جائیں۔ اگر وہ کوئی نظم لکھیں گے تو اسمیں تصور بھی ہوگا اور جذبات بھی لیکن نظم کا سبحث حقیقت پر مبنی ہوگا۔

اکثر جدی بچپن میں کمزور ہوتے ہیں، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ ان میں قوت اور بیماری سے لڑنے کی طاقت بڑھتی جاتی ہے ان کی سنجیدگی اور اعتدال پسندی ان کو عمر طویل بخشتی ہے پھر بھی وہ امراض میں مبتلا رہ کر ڈاکٹروں کے چکر میں رہتے ہیں، خصوصیت سے بڑھاپے میں وہ کسی نہ کسی مرض میں ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں، کیونکہ افکار و آلام انسان کے لئے کسی بھی جرم سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ انھیں زندگی کے اچھے اور روشن پہلوؤں کو دیکھنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور رواداری کو اپنا مسلک بنا لینا چاہیئے، اس سے ان کی صحت بہتر ہو سکتی ہے۔

"جدی" بڑے صابر، متوازن ہوتے ہیں، وہ جس کام کو شروع کرتے ہیں، اس کو انجام تک پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔ ایمانداری ان کا پہلا اصول ہوتا ہے، اس لئے آپ ان پر ہمیشہ اعتبار کر سکتے ہیں۔ اپنی زندگی وہ بیحد سنجیدگی سے گذارتے ہیں۔

"جدی" کے ذہن کاروبار کے لئے زیادہ موزوں ہوتا ہے ان کی محنت، لگن اور احتیاط ان کی معاونت کرتی ہے۔ وہ پیسے کی قیمت جانتے ہیں، اس لئے اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔

ان میں سخاوت کا جذبہ بھی ہوتا ہے اس لئے وہ دوسروں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کا احسان نہیں بھولتے اور احسانات کا بدلہ چکانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے فرائض اور اپنی ذمہ داریوں کو کبھی نہیں ٹالتے۔ عموماً وہ خود اعتماد

اور فوجدار ہوتے ہیں۔

"جدی" کی تمنا ہوتی ہے کہ دنیا ان کی تعریف کرے اور وہ دنیا کی محفل کے درخشاں ستارے ہوں، لیکن ان کا ستارہ زحل انھیں ہمیشہ سنجیدہ اور خاموش مزاج بنائے رکھتا ہے۔ آپ کبھی ان کی تعریف کریں تو بظاہر خوش نہ ہوں گے۔ جس کی وجہ سے اکثر دوسروں کو یہ خیال ہوتا ہے ان پر تعریف کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس لئے ان کی تعریف بھی کم ہوتی ہے۔ ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ زیادہ تر جدی اپنی زندگی میں چاہے انھوں نے کتنا ہی بڑا کارنامہ انجام کیوں نہ دیا ہو، شہرت اور مقبولیت عام نہیں پاتے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر وہ خشک مزاج ہو جاتے ہیں اور کبھی مذاق کرتے بھی ہیں تو اس میں طنز شامل ہوتا ہے۔

اگر آپ جدی" کے محبوب کو دیکھیں گے تو یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ وہ عاشق سے زیادہ اچھا کسی اسکول کا ماسٹر بن سکتا تھا۔ اس کا دل سردیوں کی آگ کے مانند گرم اور راحت بخش ہوتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ مرد شادی کے ابتدائی دور میں زیادہ جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں، اس کے بعد ان کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے، لیکن اس کے برخلاف "جدی" شاید ابتدا میں رومانی دلچسپی نہ لے، شاید وہ اپنی شریک حیات کو عام فطرت کے مطابق تفریحی مقامات کی سیر نہ کرا سکے۔ لیکن بعد شاید ہی کوئی سال ایسا گذرے کہ وہ اپنی بیوی کو کسی پہاڑی مقام یا تفریحی سنٹر میں نہ لے جائے اور یہ سلسلہ عمر کے ڈھلنے تک قائم رہتا ہے۔ جدی دلی گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں، شاید ان سے زیادہ وفا شعار شوہر عورتوں کو ملتے ہوں۔

"جدی" کے لئے اس کا گھر اس کی عبادت گاہ کے مثل ہوتا ہے، وہ اپنی بیوی بچوں سے بیحد پیار کرتے ہیں۔ گھریلو رشتے ان کے لئے بڑے مقدس ہوتے ہیں۔ لوگوں کو چاہیئے کہ جدی کی طرح ہی والدین اور بہن بھائیوں سے محبت کرنا سیکھیں۔ جدی اپنے خاندان کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتا ہے، اپنے متعلقین کی تمام ضروریات کی تکمیل کرنا اپنا فرض گردانتا ہے۔

باپ کی حیثیت سے جدی مکمل باپ ہوتا ہے۔ وہ گھر کا سربراہ رہتا ہے، اپنی اولادوں سے مکمل فرمانبرداری اور عزت حاصل کرنے کی توقع رکھتا ہے۔ وہ انھیں قاعدوں اور اصولوں پر گامزن رہنے کے لئے اصرار کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ اس کی اور بچوں کی عمروں میں کتنا فرق ہے اور بچے صرف اسی لئے تو نہیں ہوتے کہ انھیں بس تربیت ہی دی جاتی رہے، ان سے دلچسپی نہ لی جائے۔ لیکن اپنی ان سختیوں کا نعم البدل وہ اپنی بے پناہ محبت اور ان کی خواہشات کی تکمیل کر کے دیتا ہے اور ثابت کر دیتا ہے اس سے اچھے باپ اور کوئی نہیں ہوتے "جدی" اکثر جنس مخالف کی صحبت سے ذرا گھبراتے ہیں اور کمتر ہی اپنی محبت کا اظہار کر پاتے ہیں۔ "جدی" عورتیں بھی انہی خصوصیات کی مالک ہوتی ہیں۔

ہر عورت کی تمنا ہوتی ہے کہ اسے شوہر ملے۔ لیکن "جدی" عورت میں شوہر کی خواہش نسبتاً زیادہ ہی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شوہر کی معاشی حالت اور سماجی پوزیشن اس کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ رومان لڑانے سے زیادہ شادی کر لینا ہی بہتر سمجھتی ہے۔ "جدی" خواتین کی چال ڈھال میں ایک طرح کا قدرتی جمال ہوتا ہے، چاہے وہ کیسے ہی گھر اور ماحول میں پیدا ہوئی ہوں ان میں آداب زندگی موجود ہوں گے۔ وہ اپنے خیالات اور طور طریقوں میں، اپنے پہناوے اور اخلاق و عادات میں عموماً دقیانوسی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے ہر چیز آداب زندگی اور سماجی روایات کے مطابق ہونی چاہیئے۔

عموماً "جدی" خاتون قدرتی خوبصورتی کی مالک ہوتی ہے اور عمر سے کم نظر آتی ہے۔ صحت اچھی رہتی ہے، اس لئے انہیں تازگی نظر آتی ہے لیکن اسے اپنے حسن پر اعتماد نہیں ہوتا، اسی لئے وہ اپنے تئیں سنوارنے کے سلسلے کافی وقت صرف کرتی ہے۔

جدی عورتیں ظاہری طور پر مردوں ہی کی طرح سنجیدہ نظر آتی ہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے وہ کافی رومانی اور جذباتی ہوتی ہیں۔ ان کے دلوں میں موسیقی ہوتی ہے اور تخیل میں شاعری، مگر آپ یقین فرمائیے کہ وہ ان شاعروں اور مصوروں سے دلچسپی نہیں رکھتیں،

کرتے ہیں۔ عموماً وہ ایسے خواب دیکھا کرتی ہیں، جو حقیقت اور صداقت میں ڈھل سکیں۔

"جدی" خواتین کی محبت گہری اور پرتاثیر ہی نہیں دوسری عورتوں کی شعلہ فشاں محبت سے زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ خدمت گزاری میں بھی ان کا جواب نہیں ہوتا۔ کبھی "جدی" لڑکی سے شادی کرلینے کے بعد مرد کی متاہل زندگی بڑی ہی خوشگوار گذرتی ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ "جدی" کسی ذمہ داری کی کرسی پر فائز ہوتے ہیں، لیکن آپ انھیں دیکھکر کبھی یہ اندازہ نہ کرپائیں گے کہ وہ کسی بڑے کاروباری ادارے کے مہتمم اعلیٰ یا مالک ہیں۔ ان کا نام کہیں نمایاں نہیں ہوتا۔ ان کا تذکرہ اخبارات میں بھی شاید ہی کبھی نظر آجائے۔ اسی طرح محفلوں میں بھی شاید ہی آپ انھیں خصوصی کی حیثیت سے دیکھ سکیں گے۔

اور وہی اصلی آقا ہوں گے

وہ مستقل مزاجی کے ساتھ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اُلجھے ہوئے مسائل کو بڑی آسانی سے سلجھاتے ہیں۔ ان کا دن کبھی ختم نہیں ہوا ہوتا۔ وہ اس بات کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ کسی کام میں تاخیر نہ ہو۔ ہر آرڈر کی تعمیل فوری ہوتی ان کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ان کی انتظامی سوجھ بوجھ لاجواب ہوتی ہے۔

"جدی" کام کی دھن میں اکثر دفتر ہی کو گھر بنالیتے ہیں۔ کھانا بھی وہیں کھاتے ہیں اور آرام بھی، اگر ممکن ہوا تو وہیں کرلیتے ہیں اور اس طرح وہ دفتر میں بھی گھر ہی کا سا ماحول بنا لیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے باوجود گھر بھی انکا دفتر بنا رہتا ہے یعنی وہاں بھی وہ دفتر کے کام کرنے سے باز نہیں آتے۔

"جدی" آقا یا منیجر اپنے ملازمین یا ماتحتوں کے ساتھ باپ جیسا رویہ رکھتے ہیں۔ وہ سخت گیر ہوتے ہیں، لیکن یہ سخت گیری اس لئے ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام چاہتے ہیں اور وقت کی پابندی۔ ہدایت دیتے وقت ان کا لہجہ سخت لیکن نپا تلا ہوتا ہے اور یہ بھی اس وقت جب ضرورت سے زیادہ حماقت یا لاپروائی برتی جائے۔

جدی کے دفاتر میں آنے جانے والے ان کی سنجیدگی اور باقاعدگی سے گھبراتے ہیں، لیکن ان کے ملازمین یا ماتحتوں کو ان کی سخت گیری کے ساتھ ہی، ان کی نرم دلی کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔ وہ خود آپس میں چاہے ان کی سخت مزاجی کا اظہار کرلیں، لیکن دوسرے سے ان کی برائی نہیں سن سکتے۔ ملازمین یا ماتحت لوگ غلطی کرتے ہیں تو انھیں ان کی گھڑکی سننا پڑتی ہے، لیکن انھیں اڈوانس یا کسی اور طرح کی امداد درکار ہو تو انھیں فوراً مل جاتی ہے۔ وہ اپنے ملازمین یا ماتحتین کی تنخواہوں میں ان کی ضروریات کے مطابق اضافہ کرتے رہتے ہیں اور انھیں اپنے خاندان کے افراد ہی کی طرح مانتے ہیں۔

جدی کسی چیز کو کبھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے، خصوصیت سے وقت کو اسی لئے وہ ان سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں، ان کے پاس کام کم ہو وہ انھیں فائلوں کی درستی کا حکم دے دیں گے تاکہ کام کا سلسلہ جاری رہے اور وقت بیکار نہ جائے۔ ایسے لوگوں کو اپنے فرائض کو بدرجہ اتم پورا کرتے، جدی بہت اچھے انسان سمجھتے ہیں۔

ایک بار ایک تجربہ کار سیل ایجنٹ ایک جدی کے آفس میں خوشبودار ٹائپ ربن فروخت کرنے آیا ربن کی قیمت پندرہ روپیہ فی عدد تھی۔ دس منٹ کی گفتگو کے بعد وہ اپنا سا منھ لئے واپس چلا گیا لیکن دوبارہ وہی ایجنٹ ایسے وقت آیا جب جدی منیجر چھٹی پر گیا ہوا تھا تو وہ دو درجن ربن فروخت کرگیا۔

چند ضروری باتیں نوٹ فرمالیں

- پرچہ نہ ملنے کی شکایت۔ مہ تاریخ تک انتظار کرنے کے بعد لکھے بھیجیں تو اپنا نمبر خریداری اس پر ضرور تحریر فرمائیں۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع اس طرح دیں کہ ہر تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت ہماری بہنوں کی مرسلہ ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی اور انتقال پُر ملال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھ کر اس طرح روانا کی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے، ورنہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوگی۔ خبر کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کی ترسیل ضروری ہوتی ہے۔ خبر کی اشاعت میں کتابت کی غلطی کی ذمہ داری دفتر پر نہیں ہوتی، البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

- پروین فاطمہ لاری (حاجمئو۔ کانپور) میری سہیلی فاطمہ اور بہنوئی، ظفر اللہ کے چمن حیات میں دوسری بار ایک دلکش پھول ۸ار نومبر ۸۰ء کو ۶ بجے صبح کھلا۔ ننھے شہزادے کا نام شاداب ظفر قرار پایا۔ خدائے قدوس سے دعا ہے کہ سورج کی کرنوں کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہے اور صاحب نصیب بنے۔
- ثریا شریف (دعاز۔ بلڈانہ) میری آپی عقیلہ بانو صاحبہ اور بہنوئی حبیب صاحب کے چمن حیات میں پہلی بار ۱۰ر اکتوبر ۸۰ء بروز جمعہ دن کے پانچ بجکر دس منٹ پر ایک غنچہ تبسم ہوا۔ نام شکیب انور رکھا گیا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاندان کا نام روشن کرے۔
- عابدہ مصباح (اجاجمئو کانپور) میری ہمشیرہ محترمہ رخشندہ مصباح اور بہنوئی صغیر احمد صاحب کے گلشن حیات میں خداوند تعالے نے پہلی بار ۱۲ر دسمبر ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۸ بجکر ۱۰ منٹ پر شب میں ایک چاند سی گڑیا عطا فرمائی۔ پیار کا نام شبو قرار پایا۔ خداوند تعالی سے دعا ہے کہ اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔
- راحیلہ انجم غزل (لاہور) میری خالہ رضیہ سلطانہ صاحبہ و خالو صلاح الدین کے گلشن حیات میں دوسری بار ۵ر نومبر ۸۰ء بروز چہار شنبہ بوقت ۳ بجے ایک چاند سا پھول کھلا۔ نام عاصم ظفر قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ خدا اس معصوم کو عمر خضر عطا فرمائے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- بیگم معین الدین (سیتاپور) میرے بہنوئی محترم ضیاء الدین اور بہن عصمہ بانو کے گلشن حیات میں ۵ر نومبر ۸۰ء بروز چہار شنبہ بوقت ڈیڑھ بجے دن ایک پھول کھلا۔ دعا ہے کہ اس کی زندگی سدا بہار رہے، عمر دراز پائے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- کشور مصباح (کانپور) میری چھوٹی بہن رخشندہ مصباح اور بہنوئی صغیر احمد کے چمن حیات میں ۱۲ر دسمبر ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۸ بجے شب اللہ پاک نے ایک مسکراتی گڑیا عطا فرمائی۔ پروردگار عالم اسے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے اور صالح بنائے۔
- درشہوار پیش امام (باندہ) میرے دیور سلیم احمد اور دیورانی زبیدہ بیگم کے گلشن حیات میں ۱۵ر ستمبر ۸۰ء بروز پیر اللہ پاک نے دوسری بار ایک ننھا منا پھول کھلایا۔ نام ذکی احمد قرار پایا۔ خدائے تعالی سے دعا ہے کہ نومولود کو صاحب نصیب کرے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔
- رضیہ فرحت (ناچن گاؤں) اللہ پاک نے میرے شوہر محترم سید ارون صاحب سپروائزر اور میری اپنی زندگی کو پربہار بناتے ہوئے ۲۸ر دسمبر ۸۰ء بروز اتوار بوقت ۶ بجے شام ہمیں ایک ننھا فرزند عطا فرمایا۔ نام زاہد کامل رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے عمر نوح عطا فرمائے اور صاحب نصیب کرے۔
- خریداری نمبر ۲۱۹ اور شمیمہ ناز صاحبہ بلا نمبر خریداری کی مرسلہ خبروں کے ساتھ ٹکٹ نہیں ملے۔ دوبارہ خبریں ٹکٹ کے ساتھ روانا کریں۔

پیغامات نشاط

- رفعت شیخ عثمان (بمبئی) میری پیاری باجی عشرت دختر شیخ عثمان صاحب کی شادی نجیب (فرزند جناب بشیر مرحوم) کے ساتھ ۲۴ر نومبر ۸۰ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ تعالے اس جوڑی کو دنیا کی ساری مسرتوں سے نوازے۔

- میرے مرحوم دوست عبد الحق خاں صاحب کے فرزند اکبر عزیزی انعام الحق خاں سلمہ کی دختر شاہینہ سلمہا کی شادی محمد خالد ایڈوکیٹ (فرزند محمد نور صاحب۔ لکھنؤ) کے ساتھ ۲۵؍جنوری [illegible] بروز اتوار بمقام اوناؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس موقع پر اکثر معززین اور حکام نے شرکت فرمائی۔ افسوس کہ میں اپنی خرابیٔ صحت کے باعث شرکت نہ کر سکا۔ بہر حال میری دعا ہے کہ اللہ پاک شاہینہ سلمہا اور خالد کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ (نسیم انہولوی)
- حاجی محمد یامین خاں صاحب، تاروالے (دہلی) کے فرزند محمد دین سلمہ کی شادی زرینہ بیگم (دختر نیک اختر حاجی محمد احمد خاں صاحب، تاروالے کے ساتھ ۱۱؍جنوری [illegible] کو بارہ دری بلی ماران دہلی میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہولوی)
- محمد خالد صاحب (آمبور) کے بھتیجے ابن محمد ناثر الدین سلمہ بی۔ایس۔سی (فرزند بنگلور محمد زبیر صاحب) کا عقد سعید کاکا عبید اللہ صاحب کی دختر نیک اختر کے ساتھ [illegible] جنوری [illegible] بروز اتوار بوقت صبح ۱۱ بجے، چوک مسجد آمبور میں بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہولوی)
- امرناتھ سمن صاحب (اشار پبلیکیشن پرائیوٹ لمیٹڈ، نیو دہلی) کے فرزند دلبند "انل" سلمہ کی شادی کی افتتاحیہ تقریب ۲۰؍جنوری [illegible] کی شام کو ۶ بجے دہلی کے عظیم الشان موریا شیرٹن ہوٹل میں شروع ہوئی اور ۲۵؍جنوری کو بی۔ڈی نارنگ صاحب کی دختر نیک اختر سنگیتا سلمہا کے ساتھ گریٹر کیلاش میں امرناتھ صاحب کی رہائش گاہ پر شادی کی رسم بحسن و خوبی انجام پائی۔ ۲۶؍جنوری کو ہوٹل اوبرائے انٹرکانٹیننٹل میں ۸ بجے خیر مقدمی تقریب منائی گئی، جس میں سربراہان مملکت، معززین، شعرا اور ادیبوں نے شرکت کی۔ افسوس کہ میں شرکت نہ کر سکا، بہر حال میری دعا ہے کہ انل اور سنگیتا سلمہا باہم شیر و شکر بن کر زندگی گزاریں۔

استقبال ہر سال کی [illegible]

- [illegible]

- میرا بھتیجا اعجاز احمد (فرزند شفیع احمد ڈاکٹر صاحب) [illegible] کو اللہ کو پیارا ہو گیا۔ مرحوم کی عمر صرف سولہ سال کی تھی۔ تجہیز و تکفین ۲ر نومبر کو بمبئی میں ہوئی۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اللہ پاک سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور والدین و متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

- شہلا پروین (بھٹکل) افسوس صد افسوس کہ میرے والد جناب ظفر احمد مرزائی کے تایا جناب محمود صاحب مرزائی ایک طویل علالت کے بعد ۱۲؍دسمبر [illegible] بوقت ۲ بجے شب بعمر ۷۵ سال، بمقام اندھیلی اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر و استقلال عطا فرمائے۔

نہ کھائیے

کھانا زیادہ — نہ کھائیے۔
کھانا ہر کسی کے سامنے۔ نہ کھائیے۔
بازار میں کھڑے ہو کر۔ نہ کھائیے
بھوک لگے بغیر کھانا۔ نہ کھائیے
بات بات پر قسم۔ نہ کھائیے
بخیل کے یہاں دعوت۔ نہ کھائیے
حرام مال — نہ کھائیے۔

ظاہر نہ کیجیے

کسی کا عیب۔ ظاہر نہ کیجیے
دل کا بھید — ظاہر نہ کیجیے
سفر کرنے کا مقام۔ ظاہر نہ کیجیے
امانت کی بات۔ ظاہر نہ کیجیے
تجارت کا فائدہ نقصان۔ ظاہر نہ کیجیے۔

مرسلہ: پی۔آر۔ تبسم بیگم (دھانباڈی)

- [illegible]
- [illegible]

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو اور موزوں، پاکیزہ اور سنجیدہ ہو۔ شعر کے ساتھ نمبر خریداری لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو اشعار مقررہ تاریخ کے بعد دفتر میں وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں کیے جاتے۔ ہر ماہ کا شعر علٰحدہ علٰحدہ کاغذ پر لکھیں اور اس پر کوئی بات نہ لکھیں۔ مارچ کے لئے عنوان ہے "تغافل" اور اپریل کے لئے "خیال"۔

اے سراپا حسن اے معصومیت کے شاہکار
تجھکو قدرت نے بنایا ہے ذہین و ہوشیار

مرسلہ:۔ ساجدہ بیگم، شہناز بیگم (بنگارا پیٹ)

پسیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفل قدرت اگر خورشید کے ماتم میں ہے

مرسلہ:۔ آر۔ پی نجم آرا اقبال۔ (مدراس)

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مرسلہ:۔ نجم السحر (کرنول)

مرسلہ:۔ نیلوفر منصوری (بدلاپور)

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (جمشید پور)

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
قدرت نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لکھنؤ)

ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

مرسلہ:۔ فرح ناز خانم۔ شاہدہ خانم (وجے واڑہ)

سیلاب سمٹ کر دین کے مرکز پہ آجاؤ
یہی قدرت کو تم سے خدمت اسلام لینا ہے

مرسلہ:۔ صواتی صبیحہ عاشی (آمبور)

تدبیر کے دست زریں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مدد فرماتی ہے جب کوشش کامل ہوتی ہے

مرسلہ:۔ امتہ المقیت جعفری (میسور)

بے فیض جنون دنیا ادراک کو کھو بیٹھی
قدرت کو خرد والے اک شعبدہ گر سمجھے

مرسلہ:۔ نجم النساء مٹا (بھٹکل)

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

مرسلہ:۔ عصمت آرا (بانکا)

ہے میرے گناہوں پر رحمت کی گھٹا چھائی
کیا جانئے قدرت کو کیا بات پسند آئی

مرسلہ۔ ماجدہ نسرین لاری (اٹوناتھ بھنجن)

اقوال زرّیں

۱۔ بہت سی اخلاقی خوبیاں جھونپڑوں میں پائی جاتی ہیں مگر محلوں میں نہیں۔

۲۔ آدمی کی گفتگو اس کی عقل و ادراک کی فہرست ہوتی ہے۔

۳۔ دانا وہ نہیں جو ایک روپیہ کمائے، دانا وہ ہے جو ایک روپیہ پس انداز کر سکے۔

۴۔ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح ہے، سب سے آسان دوسروں پر نکتہ چینی۔

۵۔ شرمیلا پن انسانیت کی زینت ہے، لیکن کاروبار کے لیے عیب۔

۶۔ جس طرح دریا اپنا پانی نہیں پیتا، درخت اپنے پھل نہیں کھاتے اسی طرح اچھے آدمیوں کی کمائی بھی دوسروں کے کام زیادہ آتی ہے۔

مرسلہ:۔ صواتی صبیحہ عاشی (آمبور)

۱۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی طرف قیامت کے روز رحمت کی نظر سے نہیں دیکھے گا، جنھوں نے ماں باپ سے نافرمانی کی۔

۲۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ شرک کرنے والوں کو اور والدین کی حق تلفی کرنے والوں کو خدا معاف نہیں کرتا۔ زاہدہ حسین (کرنول)

میں پکا کر اس نے دو تین حصے کھائے ! اور بڑی تلخ و گرم کافی پی۔ جس نے
اس کو کھانے کی بجائے پیٹ اور سینے میں آگ سی لگا دی !۔
ایک طویل سانس لے کر وہ ہوٹل سے نکلا۔ ! ایک رکشہ کرایہ کا کیا اور رکشے
والے سے کہا کہ وہ اسے کسی کالج میں پہنچا دے !۔
رکشے والے نے اس کا جغرافیہ اور شجرہ پوچھنا مناسب سمجھا۔ بولا :
کیا آپ اس شہر میں نئے آئے ہیں صاحب ؟۔
ہاں ! کیوں ۔ تمہیں کیسے پتہ چلا ! ؟ :
صاحب ۔ وہ آپ کی زبان کچھ اجنبی لگی نا ۔ اس لیے پوچھ لیا۔ بُرا مت
مانیے گا جناب ۔ !
کوئی بات نہیں بھائی :
کالج میں آپ پڑھتے ہیں یا پڑھاتے ہیں ؟ :
نہ پڑھتا ہوں نہ پڑھاتا ہوں ۔ میں ملازمت ڈھونڈنے جا رہا ہوں :
اچھا اچھا ۔ خدا کرے آپ کو ملازمت مل جائے ۔ جناب ۔ ویسے امکان کم
ہے !۔
کیوں ؟ ۔
اب صاحب کس کس کو ملے ملازمت ۔ یہ آپ کے بے شمار کالج اور یونیورسٹی
ہر سال سینکڑوں ہزاروں بی ۔ اے ۔ ایم ۔ اے ، اور نجانے کون کون سے ڈگری
رکھنے والوں کو اگل دیتی ہے ۔ ہر سند یافتہ یہ سمجھتا ہے کہ بس یونیورسٹی سے نکلتے
ہی اسے ایک بہترین ملازمت مل جائے گی ۔ لیکن ہوتا یہ ہے نا صاحب کہ نوکری
صرف ایک اور امیدوار ایک ہزار ۔ ایک انار سو بیمار کا معاملہ ہو جاتا ہے ۔

وقت پر کبھی نہیں آتے ۔ ان کو تاکید کرنی پڑے گی ! :
باپ سے اجازت مل گئی ۔ انھوں نے نئے ڈرائیور سے کہہ دیا کہ ان کی
تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے گا ۔ وہ سبین کو کار چلانا سکھا دیں ۔
صبح ناشتے کے بعد وہ باہر نکلی ۔ سب لوگ اپنے آفس اور کالج جا چکے تھے
بیگم اور فیضان صاحب کی بیوی صحن میں دھوپ کے رخ بیٹھی گھریلو باتیں کر
رہی تھیں ۔ بیگم کی گود میں ننھا تھا ! ۔ دونوں کے چہروں پر طمانیت جھلک
رہی تھی ۔
سبین اپنے کمرے سے نکلی ! ۔
کالج جا رہی ہو بیٹی ؟ : بیگم فیضان نے پوچھا ۔
جی ۔ !
بیٹی تم جانتی ہو ۔ میں بڑی وہمی ہوں : انھوں نے کہا : کوئی خلاف
معمول بات مجھے بیمار ڈال دیتی ہے ۔ دیر نہ کرنا ۔ جلدی چلی آنا :
جی بہت اچھا : وہ مسکرائی اور پرس جھلاتی باہر چل دی ۔
بیگم نے ٹھنڈی سانس لی : میں کہتی ہوں ۔ آپا ۔ وہ زمانہ بہت اچھا
تھا ۔ جب ماں باپ بے خبر معصوم لڑکیوں کو جلد سے جلد گھر بار کا کر دیتے تھے
کم از کم ایک بڑا فرض اور بوجھ سر سے اترتا تھا اب تو لڑکیوں کے ماں باپ
کہلانا بھی ایک گناہ ہے ۔ ہر وقت جان سولی پر رہتی ہے :
سچ تو ہے : بیگم فیضان نے ہاں میں ہاں ملائی : اوپر سے نگوڑا یہ کالج
کی پڑھائی نکلی ہے ۔ مار کے پیار اور آفت ہے ۔ مرد عورت ساتھ مل کے پڑھتے
ہیں ۔ بس بھوسہ اور آگ اور تیل کا پیالہ ۔ مجھے استاد ساحر کو دیکھ کر ہی ڈر

تالاب کی تہہ میں منہ چھپا لیا۔!

"لاکھ کہتی ہوں تمہارے بھائی سے۔" بیگم نے کہا: "اب لڑکی کو آگے نہ پڑھاؤ وہ پہلے ہی سے خود سر اور تیز ہے۔ مگر وہ میری سنیں تب نا!"

"اور میں اگر وصیہ کا نام لوں تو وہ کہتے ہیں۔ اس کی عمر ہی کیا ہے۔ کہو بہن۔ کیا سترہ سال کی عمر کوئی عمر ہی نہ ہوئی!"

"ممی زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔" نازیہ ان کے پاس آ بیٹھیں: "اب اگر کوئی زمانے کا ساتھ نہ دے تو اسے ترقی پسند انسانوں کی صف میں جگہ نہیں مل سکتی۔ لڑکیوں کو بھی ہمیشہ آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آپ نے مجھے بس انٹر کرایا۔ آج میں ایم۔ اے ہوتی تو ضرور کالج میں لیکچرر ہوتی۔ آخر میرے ساتھ کی کس طرح مزے کر رہی ہیں کہ بس!"

"بیوی اللہ کی ناشکری نہ کرو۔" بیگم فیضان نے کہا: "عورت کی زندگی کا پہلا مقصد گرہستی کرنا اور اپنے بچوں کی تربیت کرنا ہے۔ عورت پیدا ہی اسی لیے ہوئی ہے کہ۔"

"کہ وہ بچے پیدا کرے۔" نازیہ ہنس دیں۔

"گھرداری، اللہ کی عبادت، شوہر کی خدمت، بچوں سے محبت، بس یہ ہے عورت کے جنم کا مقصد۔ یوں چاہے وہ گورنر ہو کر منسٹر۔ وہ بات الگ ہے۔"

بیگم فیضان نے فتویٰ دے دیا: "جاکے پوچھ لو مسز راج سے۔ منھی بھر کی ماں کی گود میں جھاڑ دیتی ہیں۔ صبح سے شام تک محنت کرتی ہیں۔ پل بھر کا سکون میسّر نہیں۔ بال سفید ہو رہے ہیں۔ ان کی تمام آرزوئیں بس لڑکیوں کو اپنا دماغ کھلا کھلا کے خاک بسر ہوگئیں ہیں۔!"

[illegible] اور بیگم [illegible]

بین کے منظورِ نظر کی حیثیت سے قطعی برداشت نہ کرتے۔ اور اس طرح سوچتے سوچتے اسے اندازہ ہوا کہ سچ مچ بین اس کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ کیا اسے پتہ نہ تھا کہ وہ اپنے ملازم شوفر سے بے تکلف ہو رہی تھی۔!!

اس نے پختہ ارادہ کرلیا۔ وہ حتی الامکان بین سے دور رہے گا۔ چاہے وہ اسے بیوقوف بنایا کرے۔!!

اس ارادے نے اس کے دل و دماغ سے ایک بوجھ سا سرکا دیا... اس نے یہ بھی تہیہ کیا کہ اگر اسے کہیں ایک چھوٹی سی ملازمت بھی نصیب ہوگئی تو وہ اقبال صاحب کی کوٹھی کی رہائش بھی ترک کر دے گا۔!

ابھی کالج اور مدرسوں کا وقت نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک کیفے میں بیٹھا اخبار دیکھ کر وقت گزارتا رہا۔ پھر جب گھڑی نے دس بجائے وہ اپنا نائیں احتیاط سے سنبھالے کالجوں اور مدرسوں کی خاک چھاننے پر آمادہ ہوگیا!

اور پھر۔ اپنے زمانہ قیام میں یا تقریباً گشت کرتے ہوئے۔ اس نے جتنے بڑے اسکول دیکھے تھے۔ وہاں قسمت آزمائی کی! ہر جگہ اس کے سے تعلیم یافتہ آدمی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بڑی خوش اخلاقی سے اس سے اس کی تعریف پوچھی گئی اور پھر بے انتہا معذرت کے ساتھ اپنے مدرسہ میں جگہ خالی نہ ہونے کی بنا پر اس کو رخصت کر دیا گیا!

چار پانچ جگہوں کی ناکامی نے اس کے حوصلے پانی کر دیے۔! دوپہر ہو چلی تھی۔ اس نے صبح کو یونہی ناشتہ کیا تھا۔ تب انتیس جوان اور حوصلے بلند تھے۔ بھوک پیاس کا احساس مٹ گیا تھا۔ مگر ناکامی نے اس جھنجھلاہٹ اور شدید بھوک کی صورت میں اضافہ کر دیا۔ اس کی جیب میں دو تین روپے پڑے تھے۔ بہرحال ان کا خرچ کرنا ضروری تھا [illegible]

کہہ کر تمہیں اس سلسلے میں کامیابی نصیب ہو۔ تمہاری سندیں۔ میری الماری میں
دیکھو شاید کہیں ادھر ہی رکھی ہوں گی:
اکرم نے الماری سے اپنی تینوں سندیں نکال کر ایاز چچا کے سے بولا چچا جان اگر آپ
کے ذہن پر بار نہ پڑے تو اجازت دیجئے کہ ہم اکرم صاحب سے پڑھ لیا کریں:
"ردّ ٹین؟" انھوں نے آنکھیں نکالیں: "کیا بک رہے ہو؟"
"جی میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ کی دل شکنی نہ ہو تو" ایاز بولا۔ اقبال صاحب
چونکہ لڑکوں سے بڑا مشفقانہ سلوک کرتے تھے اس لیے کم و بیش سب چھوٹے بڑے
ان کی خدمت میں گستاخ ہو گئے تھے!۔ وہ مسکرائے۔ اور ہاتھ ہلا کر بولے: "میں تو خدا
سے چاہتا ہوں۔ تم سے اپنا بھیجہ کس صورت سے محفوظ رکھوں!:"
"تو پھر چھٹی؟" ایاز خوش ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے دن وہ ناشتہ کے بعد ہی گھر سے چلا گیا۔ اسے سبین کا خوف بھی تھا۔
یقیناً وہ آج بھی اسی کے ساتھ کالج چلتی۔ اکرم نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے اس قدر
بے تکلف ہو اور قابل اعتراض حد تک اس کے پاس آئے۔ اسے اپنی پوزیشن کا اچھی
طرح احساس تھا!۔ اقبال صاحب کی نظروں سے گرنا، اعزا کے سامنے خفیف ہونا
اور سارے خاندانوں میں بدنام ہونا اسے کسی حال میں گوارا نہ تھا۔ سبین ان کی
اپنی تھی۔ شاید وہ لوگ اسے معاف کر دیتے۔ لیکن اکرم کو کسی حال میں معافی کے
قابل نہ سمجھتے۔ اور پھر۔ اکرم کو خوب پتہ تھا۔ متمول اور صاحب ثروت لڑکیوں کی
یہ تفریح ہوتی ہے کہ کسی غریب کے احساسات سے کھیل چکیں اور دوسری دلچسپی تلاش
کرتی۔ بے شک یہ سبین کی تفریح تھی۔ لیکن اکرم کسی طرف کا بھی نہ رہتا!۔ اسے سبین
کے احساسات کچلے اور کچلے ہی گئے۔ وہ جانتی تھی کہ اکرم ان کے یہاں بطور ڈرائیور
ملازم رہا تھا۔ [illegible]

تبصرہ کرتی رہیں!۔
سبین باہر نکلی۔ اس کے انتظار میں کار زینوں کے پاس کھڑی تھی۔
مڈگارڈ سے ٹیک لگائے نئے ڈرائیور صاحب سگریٹ پی رہے تھے۔ سبین
کو دیکھ کر انھوں نے تازہ سلگایا ہوا سگریٹ گلاب کے تھالے میں پھینک دیا!
اور جلدی سے گھوم کر پچھلی نشست کا پٹ کھولا!۔
اپنے کمرے کے سامنے دھوپ میں کرسی بچھائے بیٹھا اکرم تازہ اخبار
دیکھ رہا تھا اسے سبین کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی!۔
سبین نے دفعتہً جھپٹا مار کر اخبار اس کے ہاتھ سے گرا دیا۔ اور اپنی بے تکی
حرکت پر ہنس پڑی!۔
اکرم نے کچھ کہے بغیر جھک کر اخبار اٹھایا! اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا!۔
"آپ نے ابھی تک کپڑے بھی نہیں بدلے؟" سبین نے کہا۔
"کیوں؟"
"میرے ساتھ چلنا ہے۔!"
"کہاں؟!"
"اب یہ جاسوسی رہنے دیجئے۔ جائیے کپڑے بدل کر آئیے!"
"لیکن۔ آپ مجھے کیوں ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔ دین محمد صاحب آپ
کو چھوڑ آئیں گے!"
"مجھے معلوم ہے" اس نے ہونٹ سکوڑ لیے "مگر میں ان کے ساتھ جانا نہیں
چاہتی!۔"
"محترمہ سبین آپ ۔۔۔!"
دین محمد صاحب نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سبین نے ان کی طرف

مجھے بغیر ہاتھ ہلا کر کہا۔

"آپ جا سکتے ہیں"

انھوں نے آہستگی سے پٹ بند کیا۔ چوکیدار کے کمرے سے اپنی سائیکل نکالی
اور چپ چاپ چلے گئے!۔

"بجانے ابا جانی نے اس آثار قدیمہ ڈرائیور کو کہاں سے کھود کے نکالا ہے"
وہ بڑبڑائی: "صورت ہی دیکھ کے وحشت ہونے لگتی ہے"

طوعاً و کرہاً مکرم اس کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا۔

ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی اس کے پاس سامنے کی نشست پر بیٹھ گئی! گیٹ
سے گاڑی نکالتے ہوئے اس نے سنجیدہ آہستہ سے پوچھا۔

"کالج جانا ہے"

"کالج!" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا: "کیسے معلوم ہوا کہ مجھے کالج
جانا ہے!"

اس نے کچھ سوچ کر نچلا لب دانتوں میں جکڑ لیا۔

"کیا بھول گئے۔ آپ نے کار سکھا دینے کا وعدہ کیا تھا!"

"لیکن جب تک میں احراز صاحب سے اجازت نہ لے لوں۔ آپ کو ہرگز
نہیں سکھا سکتا!"

"میں خود سیکھ لوں گی آپ صرف بتاتے جائیے" میں بولی۔ اور دفعتہً
مکرم کا ہاتھ وھیل سے ہٹا کر خود وھیل تھام لیا۔ گاڑی یکبارگی لہرائی۔ اگر
فوری طور پر مکرم اسے قابو میں نہ کرتا تو وہ فٹ پاتھ پر چڑھ جاتی!۔

"ابھی آپ سیکھے گا!" مکرم نے طنز سے پوچھا۔
[illegible] اور گاڑی کل پرزوں کو سمجھ کی

ڈیسٹ بریک ہے۔ ابا جانی: "اعزاز صاحب صورت بنا کر کہا
آپ ان سے باتیں کر لیجئے۔ تب تک ہم بھی فرض [illegible] کر
لیں"

انھوں نے مکرم کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "ہاں۔ بیٹے۔ کہو۔ کیا کہنا چاہتے
ہو" "جی وہ" مکرم نے سر جھکا کر کہا: "آپ کو۔ زحمت نہ ہو تو کسی وقت میری
سندیں نکال دیکھئے!"

"سندیں۔ اوہ۔ ہاں۔ شاید تم نے مجھے دی تھیں۔!"

"جی ہاں!"

"کیا ضرورت پیش آ گئی سندوں کی!"

"سنا ہے چچا جان کہ جعلی سندیں لوگ معقول داموں پر خرید لیتے ہیں" ابا جان
بولا: "میرے پاس کوئی ڈگری ہوتی تو میں دس ہزار میں بیچ کر مزے میں گھی
تیل کی دکان کھول لیتا"

"تم نے کانفیشن میں فارسی لی ہے سیدھا بھی تیل ہی بیچو گے" یاسر بولا۔

"مکرم بھیا۔ آپ میرا ٹیوشن لے لیجئے" اعزاز نے کہا: "ابا جانی کا وقت بھی بچ جائے گا
اور آپ کی تعلیم بھی تازہ ہو جائے گی۔ کیوں!"

ان کی بکواس نظر انداز کر کے اقبال صاحب نے مکرم سے پوچھا: "بیٹے کیا کہیں
سروس ڈھونڈ لی ہے"

مکرم کے سینے سے بوجھ ہٹ گیا۔ وہ اظہار خیال کا پیرایہ سوچ رہا تھا
مجوب ہو کر اس نے کہا: "جی۔ اگر آپ۔ اجازت دیں گا!"

"میں خود اسی فکر میں تھا۔ یہاں۔ لیکن [illegible]
[illegible]

اقبال حسین صاحب اور اعزاز ہر طرح مکرم کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن خود اسے یہ گوارہ نہیں تھا کہ معذوروں کی طرح ہاتھ پاؤں توڑے بیٹھا رہا۔ اقبال صاحب کے پاس نیا ڈرائیور آ گیا تھا۔ اور سوائے اس کے کہ مکرم گھر کی معمر خواتین کے پاس بیٹھا باتیں بنائے یا پھر اعزاز اور ایاز کے ساتھ خوش گپیاں کرتا رہا۔ اس کا کوئی خاص کام کہاں رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ فی الحال وہ اپنے پرانے مقصد میں کامیابی حاصل نہ کی تو کیا۔ اس شہر میں کہیں نہ کہیں اسے ملازمت ضرور تلاش کرنی چاہیئے۔!

تعلیمی سال کو شروع ہوئے ایک ہی ہفتہ گزر رہا تھا! اسے امید تھی۔ وہ کسی اسکول یا جونیر کالج میں ضرور نوکری تلاش کر سکے گا!۔

قسمت آزمائی کے فیصلے کے بعد وہ ایک رات اقبال حسین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اکثر راتوں کو وہ اپنے بچوں کو کسی مضمون میں کوچ کر دیا کرتے تھے۔ جب مکرم ان کے پاس پہنچا وہ اعزاز، ایاز اور یاسر کو الگ الگ مضامین پر لیکچر دے رہے تھے۔ مکرم کو دیکھ کر مسکرائے!۔ اور اسے اپنے پاس بیٹھنے کی دعوت دی!۔ پھر بڑے اخلاق سے اس کی آمد کا مدعا دریافت کیا۔ لمحہ بھر کے لیے لڑکوں کی جان چھوٹی۔

ایاز شرارت سے اپنی انگلیاں رہا تھا۔ اعزاز نے مختصر سی انگڑائی لی۔

[illegible]

کوشش میں اس کے بالکل قریب آ گئی!۔

اور اپنی ہانپتی ہوئی سانسوں کو قابو میں کر کے بالآخر مکرم نے کہا۔ الگ آ۔ آپ۔ یہی ہے۔ چاہتی ہیں۔ تب تو۔ پھر۔ کل پر رکھیئے۔ آباد سڑکیں بالکل مناسب نہیں ہیں۔ اگر کوئی حادثہ ہو جائے تو خواہ مخواہ۔

اور اس نے اس طرح دھیمی پر ہاتھ جکڑے جیسے وہ اس کی گرفت سے نکلا جا رہا تھا۔ یکبارگی اس نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

آپ بہت ڈرتے ہیں۔ آخر آپ نے خود کیسے سیکھا تھا! حسین پر کوئی اثر ہی نہ تھا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی جیسے مکرم کی کمزوری پر استہزا کرتی ہو۔ مکرم سمجھ چکا تھا کہ اس کی زندگی میں حادثوں کی ابتدا ہو چکی تھی محبت کے انداز خاموش زبان میں بولتے رہے۔

وہ اتنا بدحواس تھا کہ بے مقصد ادھر ادھر سڑکوں پر گاڑی گھما رہا تھا۔ دفعتاً ایک پارک کے قریب سے گاڑی گزری اور حسین نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ روک دیجئے۔

یہاں؟۔

ہاں۔ آپ دیکھتے نہیں۔ کتنا چمکیلا موسم ہے۔ سورج کی تیز کرنیں درختوں کو جگمگا رہی ہیں۔ پشمینے کی گھاس کیسی اچھی لگ رہی ہے۔ آئیے نا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جائیں گے آدمی کو خدا نے اتنی مختصر سی زندگی اس لیے تو نہیں دی کہ بس کمرے کی تاریک فضا میں کتاب پر سر اوندھائے گزار دی جائے [illegible] اور بھی بہت کچھ ہے۔ کیا اسے پانا ہمارا حق نہیں ہے؟

[illegible]

میں اس کی جرأت نہیں کرسکتا" مکرم نے ایک بار اس کے چہرے پر سرسری
نظر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا: "محترمہ سبین۔ میری سمجھ میں اب تک نہیں آیا۔ آپ
مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟"
"کچھ بھی تو نہیں" سبین کی آواز مدھم تھی "آدمی جو کچھ سوچتا ہے۔ وہ
حاصل تو نہیں کرسکتا!"
"تو پھر محترمہ۔ براہ کرم۔ آپ اپنی تفریحوں میں مجھے شامل نہ کیجئے۔ میرے
غم اور دکھ بہت زیادہ ہیں۔ میں تقدیر کا کوئی نیا مذاق برداشت نہیں کرسکتا"
"غم اور دکھ بانٹے بھی تو جاتے ہیں!"
"جو دکھ اپنی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ وہ بے آبرو نہیں ہوتے!"
"میں یہ فلسفہ نہیں سمجھ سکتی۔ مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ آدمی ہمیشہ آدمی کے
کام آتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے دکھ پریشان رکھتے ہیں تو تھوڑے سے کسی اور کو
دے کر ان کا بار ہلکا کرلیجئے!"
"آپ کا بہت بہت ــــ"
مکرم کے پرجوش اور طنزیہ اظہار احساس کو وہ درمیان ہی سے لے
اڑی!
"اتریئے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جائیں گے!"
مکرم نے گاڑی روک لی اور وہ اتر کر پارک کی طرف قدم بڑھا دیے۔
دن کے گیارہ بجے یہاں ہو کا عالم طاری تھا۔ باغبان اپنا کام کر کے جاچکے تھے
سناٹا، اجڑا خیال، الگ اور جذبات خیز تھا۔ سناٹا، سکون، تنہائی۔
[illegible]

اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر حفظ مراتب کا خیال اس کا دامن گیر
تھا تو کیا۔ اس کے جذبات اور محسوسات بہرحال بلند تھے۔ بظاہر وہ مہر بلب تھا
مگر بباطن وہ اسی مقام کا انسان تھا جس مقام پر سبین کھڑی تھی!
دوپہر کو موسم گرم ہونے لگا! اور آس پاس کے مدرسوں میں لنچ بریک
ہو گیا بہت سے بچے ان کے لازم پارک میں آگئے!
مکرم اٹھ کھڑا ہوا: "آئیے چلیں۔ بہت دیر ہو چکی!"
"اتنا یاد رکھیے گا۔ کل نو بجے مجھے آپ ہی کالج پہنچائیں گے۔"
"مگر وہ۔ دین محمد صاحب!؟"
"ہاں۔ وہ لے جائیں گے۔ ابا جانی اور بھائی جان کو۔"
"اگر انہوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ ان کے ساتھ جانا کیوں نہیں چاہتیں؟"
"تو کیا۔ وہ جانتے ہیں۔ جو شخص ایک قیمتی زندگی کو بچانے کا ذریعہ بنا تھا وہ
کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتا!"
مکرم کے سر سے پاؤں تک ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ عجیب لڑکی تھی۔ اسے اظہار
محبت پر بھی آمادہ کر رہی تھی اور اس کی تمنی بھی تھی کہ وہ کسی کے نازک و
ارفع جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائے!
جب وہ گھر پہنچے تو ٹھیک دوپہر ہو چکی تھی! بیگم اقبال طعام خانے
میں تھیں۔ احتشام بیٹھے بیگم فیضان سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک
دفعہ سر اٹھا کر سبین کو دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے ان کی نظریں اس کے دل کے
آر پار ہو گئی ہیں۔ یک بارگی اس کی پنڈلیاں کانپ گئیں۔ لیکن
احتشام نے دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا اور [illegible]
[illegible] باتیں کرنے لگے!

"اس لیے کہ میں ایک آوارہ وطن اجنبی ہوں۔ اتفاق سے اعزاز صاحب کے یہاں آ نکلا ہوں۔ آپ نہیں جانتی ہیں کون ہوں کیا ہوں۔ سچ کہیے کیا ایسے گمنام آدمی سے ہمدردی کرنا اپنے قیمتی محسوسات کو ضائع کرنا نہیں ہے؟"

"آپ انسان تو ہیں نا؟" سبین نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"اتفاق سے" مکرم کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"آپ میرا مضحکہ اُڑا رہے ہیں!" سبین کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ کی ہمدردی میری ذات سے تمسخر ہے۔ محترمہ سبین۔" مکرم سنجیدہ ہو گیا "مجھے آپ کے محسوسات کا بہت اچھی طرح ادراک ہو گیا ہے لیکن میری التجا ہے کہ آپ اپنے خیالوں میں جتنی دور پہنچ چکی ہے۔ وہ منزل آپ کے شایانِ شان نہیں۔ اس لیے براہ کرم واپس آئیے۔ آپ ایک عالی مرتبت خاندان کی فرد ہیں۔ آپ کا مستقبل محفوظ ہے۔ اور آپ بھی جانتی ہیں کہ ایسی ناعاقبت اندیشی جو آپ سے سرزد ہو رہی ہے نہ صرف آپ کو بدنام و رسوا کر دے گی بلکہ میرے لیے بھی ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ میں شاید اعزاز صاحب کو منہ نہ دکھا سکوں گا! خودکشی میری تقدیر بن جائے گی۔ جب بھی آپ کے خاندان میں میرا نام لیا جائے گا۔ لعنت کے ساتھ! محترمہ سبین۔ کیا یہ سب کچھ آپ کو پسند ہے؟"

سبین پر اس کی ناصحانہ بلکہ جرگانہ تقریر کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ ایک ترقی پسند آزاد خیال گھرانے کی بے باک خودسر اور ضدی لڑکی تھی۔ اس کے خاندانی حلقوں میں محبت کے چرچے محبت کے کھیل عام تھے۔ وہ دل کی لگی کو ادنیٰ جذبہ سمجھتی تھی۔! جہاں اگر صنفِ مخالف سمجھے کہ وہ خود کھنچ جائے! اس لیے بھی کیا بھی تھا۔

[illegible]

یہ وہ کنجیوں کا گچھا ایک ہتھیلی سے دوسری ہتھیلی پر اچھالتا رہا!۔

"میں ایک خاص بات پوچھنے کے لیے آپ کو یہاں لائی ہوں" سبین بولی۔

"پوچھیے:" اس نے بے پروائی سے کہا۔ ہرگز ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس سے متاثر و مرعوب ہے!۔

آپ دل سے کہتے ہوں گے کہ آخر مجھے آپ سے کچھ کہنے سننے کا حق ہی کیا ہے۔!۔ ہے نا!۔

میں نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں سوچی!:

کبھی سوچیے گا بھی نہیں!" بھولپن سے سبین نے تاکید کی۔

مکرم کو ہنسی آ گئی "بہت اچھا:"

"تو پھر بتائیے۔ آپ کی اس اداسی افسردگی اور خاموشی کا کیا مطلب ہے کبھی میں نے آپ کو بے فکری سے ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا!:

بڑا مخلصانہ اور محبت پاش استفسار تھا۔ مکرم کے دل میں گونا گوں جذبوں کے لاوے پھیلنے لگے! کیا جواب دے۔ اس کے دکھوں کا مداوا کون کر سکے گا؟ کیا وہ غم جو اس کی ذات سے چمٹے ہوئے ہیں کبھی خوشیوں میں بھی تبدیل ہوں گے۔ وہ ہمیشہ گمنام، اجنبی، آوارہ گرد، محتاج اور اسی طرح سرگرداں رہے گا اپنی تلاش وجستجو میں ناکام۔؟

"آپ تو خاموش ہو گئے؟:"

میری ذات کو آپ نے بڑی اہمیت دی ہے:" مکرم نے جواب دیا: میری اداسی اتنی خاص تو نہیں ہے۔ جس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے آپ کو یہ

"کیا کرتی": سبین نے کسی تاثر اور احساس کے بغیر کہا: "نجانے میرا دل کیوں اتنا حساس ہے۔ میں کسی کا غم دیکھ نہیں سکتی۔ کسی کی اداسی مجھے پہروں بے چین رکھتی ہے میں سوچتی ہوں کہ کاش ایسا ہو سکتا میں کسی کا دکھ بانٹ سکتی"

اور پھر مکرم کے خیالوں میں طوفان سا آگیا۔ برسوں پہلے کی بوڑھی آواز جو تیرگی تنہائیوں میں کھو چکی تھی۔ ابھر کر اس کے پاس گونجنے لگی۔

"مکرم بیٹے! مجھے بھول جانا مگر میری باتیں یاد رکھنا۔ ان لوگوں کو تلاش کرنا جو تم سے زبردستی جدا کر دیے گئے ہیں! میں تجھے اٹھا لائی بیٹا تیری ماں کی گود اجاڑ کے۔ وہ سب بڑے آدمی تھے۔ نجانے اب بھی ہیں کہ ختم ہو چکے!"

اس کے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ بڑے آدمی! ہو سکتا ہے کہ سبین کو کسی ایسے آدمی کا پتہ معلوم ہو جو معاشرے میں "بڑا" سمجھا جاتا ہو۔ وہ واقعی اس کے مسائل کا حل پیش کر سکے۔ لیکن نہیں۔ پچیس سال پرانی بات ہے۔ اور سبین شاید پورے بیس برس کی بھی نہیں۔ وہ اتنے پرانے مذاق کو کیا جانے ۔۔! کھلنڈری سی جذباتی سی لڑکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سب میں کہہ دے۔! بات نہ بنے اور بات بگڑ بھی جائے!

اس نے ایک طویل سانس لی اور سبین کی طرف دیکھنے لگا! وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ نگاہوں کے ملاپ نے سبین کے رخساروں پر لالے کھلا دیے۔ اس نے مضطربانہ انداز میں بے ساختہ پلکیں جھکا لیں۔ مگر مکرم کی نظریں اس کے بھولے بھالے معصوم گلابی چہرے کی بلائیں لیتی رہیں۔ اس کا جی چاہنے لگا۔ آقا خادم [illegible]

[illegible]

گھبرا گئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی! پھر اپنا اضطراب چھپانے کو [illegible] جنگلی گلاب کے آنے کے قریب کھڑی ہو گئی! جھک کر ان کی [illegible] اپنا سانس میں سمیٹتی اور پھر جیسے سانس پھول شاخ سے توڑ لیے۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا! اس کا اضطراب مکرم سے پوشیدہ نہ رہ سکا! وہ مسکرایا اور "واپس آئیے! کسی کی اداسی بانٹ لینے کا دعویٰ ایسا مگر یا نہ تو نہیں آئے [illegible] جائیے۔ میں بتائے دیتا ہوں۔!"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بنچ کی طرف واپس آتے ہوئے اس نے سارے پھول مکرم پر پھینک دیے۔ اس نے ہنستے ہنستے سارے پھول دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیے۔

"بے نصیب": وہ زیر لب بولا۔

"بتائیے": اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہا۔

"کیا بتاؤں": مکرم نے مسکرا کر کہا: "میں تو بالکل اداس نہیں ہوں۔ اس وقت تو بالکل نہیں۔"

"اور ہمیشہ؟": اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"وہ بھی آپ کی آنکھوں کا قصور ہوگا!"

"اچھی بات ہے۔ جب کبھی آپ کو منہ بسورے دیکھوں گی تب بدلہ لوں گی!"

"یہ کرم آپ کو مجھ سے اتنی ہمدردی ہے!"

"آپ کو یقین نہیں؟"

"نہیں!"

"کیسے کہہ دیا کہ نہیں!"

THE HAREEM

Mar. 81

Rs. 1.20

اتحاد و اتفاق کو مذہبی حیثیت سے نہ پرکھیئے تو بھی اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اتحاد و اتفاق ہر شعبۂ زندگی میں ایک معجزہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ایک گلاس کھولتا ہوا پانی لیں اور دیکھیں کہ اس کی حرارت کتنی دیر تک قائم رہتی ہے اور پھر اتنا ہی کھولتا ہوا پانی دوسرے گلاس میں ڈال کر کسی چمچے سے اسے نکال نکال کر متعدد پیالوں میں ڈالدیں اور پھر دیکھیں کہ اس پانی کی حرارت پیالیوں میں نکلنے کے بعد کتنی جلد ختم ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ ہے پھوٹ کا۔

وہ نصیحت خیز قصہ آپ نے بھی ضرور پڑھا یا سنا ہوگا کہ کسی شخص کے چار بیٹے تھے۔ مرتے وقت اس نے انھیں اپنے پاس بلا کر کہا ایک رسّی لے آؤ۔ لڑکے رسّی لے آئے۔ باپ نے ان سے فرداً فرداً اس رسّی کو توڑنے کے لئے کہا۔ لڑکوں نے سمجھا کہ باپ ان کی طاقت کی آزمائش کرنا چاہتا ہے ہر ایک نے پوری پوری قوت لگا کر رسّی کو توڑنے کی کوشش کی لیکن سب ہی ناکام رہے۔ انھیں ناکام دیکھ کر باپ نے کہا تم سب مل کر متفقہ اسے توڑ دو۔ لڑکوں نے کوشش کی لیکن نہ توڑ سکے تب لب گور باپ نے ان سے کہا کہ رسّی کے چار ٹکڑے کرو۔ لڑکوں نے ہدایت پر عمل کیا۔ پھر باپ نے کہا کہ رسّی کے ٹکڑوں کے بل نکال کر اس کے ریشے علٰحدہ علٰحدہ کر کے توڑو۔ شاید تم ایسا کر سکو۔ لڑکوں نے ایسا ہی کیا اور بڑی آسانی کے ساتھ رسّی کے پچاسوں ٹکڑے ہو گئے۔ تب بوڑھے باپ نے کہا میرے بچو! تم نے دیکھا کہ پہلے تم نے ہر طرح کوشش کی، لیکن رسّی کو نہ توڑ سکے اور اب جبکہ تم نے رسّی کے ریشوں کا اتحاد ختم کر دیا تو اس کی ساری قوت ضائع ہو گئی اور تم سب نے آسانی سے اسے توڑ لیا۔ میرے بچو! یہی ہے اتحاد کی قوت۔ اگر میرے مرنے کے بعد تم چاروں بھائی متحد ہو کر رہو گے تو تمہاری قوت رسّی ہی کی طرح ہوگی اور تمہیں نقصان پہنچانا کسی کے لئے آسان نہ ہوگا لیکن اگر تم میں پھوٹ پڑ گئی تو تمہاری حیثیت اسی کھلی ہوئی رسّی کی طرح ہوگی۔ بچوں کو بڑی عبرت ہوئی اور انھوں نے یہ بات گرہ میں باندھ لی کہ ہمیشہ متحد ہو کر رہیں گے۔

تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو کم ہی انقلابات ایسے آئے ہوں گے جو اسی پھوٹ کا نتیجہ نہ ہوں۔ یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ سمندر سب ہی ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ان کی ہمہ گیری اور طاقت کا ماخذ ان کے اجزائی اتحاد سے ہی قائم ہے پھر بھی ہم ان سے سبق نہیں لیتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ خاندانوں کی حالتیں ابتر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ پہلے یہ صورت ہوتی تھی کہ اگر چار بھائی ہوتے تھے تو صرف بڑا ہی بھائی خاندان کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھ کر بڑے اتفاق کے ساتھ سارے کام انجام دیا کرتا تھا اور اسی لئے ان خاندانوں میں خوشحالی کا دور دورہ رہا کرتا تھا۔ لیکن اب تو یہ حالت ہے کہ اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ چار بھائی ہوئے تو باپ کے مرتے ہی ترکے کی تقسیم ہونے لگتی ہے۔ گھروں اور مکانوں میں دیواریں اٹھنے لگتی ہیں، برتن، فرنیچر اور دیگر اثاثے تقسیم ہونے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ۔ ۔ ۔ ایک عظیم خاندان ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر تباہی کی جانب چلا جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ چاروں بھائی علٰحدہ رہ کر ہی ایک دوسرے کے بھائی بنے رہیں، ایک دوسرے کے بنے رہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس ایک دوسرے سے جلنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

ایک زمانہ تھا جب لڑکی والے شادی کرنے سے پہلے معلومات کرتے تھے کہ گھر بھرا پڑا ہے یا نہیں، ایسے لڑکوں سے بچی بیاہنا انھیں پسند نہ ہوتا تھا جن کی ساس، بہنیں اور بھائی بہن نہ ہوں، کیونکہ سسرال میں لڑکی کو جاتے ہی تنہا

جہاں بڑے، چھوٹے سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت نئی دلہن کی جھلک دیکھنے ہوتی تھی، چلّے تک اسے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے خوان یا سینی میں کھانا لاکر پیش کیا جاتا تھا۔ اسے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ چالیس دن گزر جانے پر دلہن باورچی خانے میں جاتی تھی اور اس کے ہاتھ سے کوئی میٹھی چیز پکوا کر محلہ، برادری میں تقسیم کی جاتی تھی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگتی تھی۔ ضرورت ہوتی تو ساس نندیں اور بھاوجیں ہر طرح کی مدد کرتی تھیں۔ دلہن کو ہر طرح کا آرام پہنچاتی تھیں۔ شادی کا سا سماں بندھا رہتا تھا۔ دلہن کو اسپتال جانا پڑتا تو نند بھاوجیں وہاں کی ذمہ داریاں سنبھال لیتیں۔ غرض یہ طرز معاشرت نہایت پر بہار ہوتا تھا۔ دلہن بھاری بھرکم معلوم ہوتی تھی اور شادی کا ابتدائی دور اس کا بے حد خوشگوار ہوا کرتا تھا۔

میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ اس پر بہار فضا میں کبھی کبھی کانٹوں کی چبھن بھی محسوس ہو جایا کرتی تھی۔ ساس نندوں اور بھاوجوں کا طرز عمل کبھی کبھی دلہن کے لئے کسی حد تک تکلیف دہ بھی ہوا کرتا تھا، اس لئے کہ ان رشتوں میں جو نزاکت ہے وہ ہمیشہ سے محسوس کی جاتی رہی ہے، جہاں نند بھاوجوں اور ساس کا برتاؤ پھولوں کی سیج کی طرح نرم و نازک اور معطر ہو سکتا ہے۔ وہیں کبھی کبھی اس میں خار کی چبھن سے بھی واسطہ پڑتا ہے لیکن مقابلۃً کلفت کے مقابلہ میں آرام زیادہ ہوتا ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ لڑکی والے ایسا گھر تلاش کرتے ہیں جہاں صرف دولہا میاں ہی ہوں، یا زیادہ سے زیادہ ساس صاحبہ ہوں۔ یا پھر ایسے گھرانے ہوں جہاں نندوں کی شادیاں ہو چکی ہوں۔ بھائی بھاوجیں علاحدہ رہتی ہوں، تاکہ دلہن جاتے ہی خود مختار بن کر راج کرے۔ ایسی شادیوں کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے، ان میں کوئی لطف زندگی نہیں ہوتا اور کبھی کبھی دلہن کو سخت ترین دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اگر لڑکیاں، ایسے گھروں میں بیاہ کر آتی ہیں جہاں ساس کے ساتھ ہی نند بھاوجیں بھی ہوتی ہیں تو چند دنوں کے بعد وہ انہیں شوہر کو قابو میں کر کے ایسی صورت پیدا کر دیتی ہیں کہ علاحدہ اپنا گھر بسالیں، جہاں نہ ساس کا ڈر ہو، نہ نند بھاوجوں کا عذاب، لیکن ایسی بیویاں بظاہر آزاد ہو جاتی ہیں، اس لئے کہ ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ لیکن یہ آزادی کبھی کبھی قید کے مترادف بھی ہو جاتی ہے۔ نئی نویلی دلہن کو کہیں باہر جانا ہوتا ہے تو گھر کا جنجال راہ میں در آتا ہے۔ کس پر گھر چھوڑیں۔ طفل شیرخوار گود میں ہے تو محفلوں وغیرہ میں اسے لے کر جانا آسان نہیں ہوتا۔ ساس نندوں والے گھر میں یہ دشواریاں نہیں ہوتیں ساس نندیں بچہ کو دیکھتی رہتی ہیں اور دلہن سکون کے ساتھ تفریح وغیرہ کے لئے چلی جاتی ہے۔ زچگی کے سلسلہ میں ساس نندیں وغیرہ جس طرح مدد کرتی ہیں، کوئی نہیں کر سکتا۔ بچہ کو رات برات کوئی شدید تکلیف ہو جاتی ہے تو تجربہ کار ساس اس کا گھریلو علاج کر لیتی ہے۔ نندیں معاونت کرتی ہیں اور دلہن کو کوئی خاص پریشانی محسوس نہیں ہو پاتی۔ لیکن جب دلہن گھر میں بس خود ہی خود ہو تو قدم قدم پر دقتیں ہوتی ہیں۔ ایسی دلہنوں سے میری عرض ہے کہ وہ متحد ہو کر رہنے کی کوشش کریں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ انھیں ہر طرح کا آرام ملے گا، ساس نندوں کے دل بھی نہ دکھیں گے جو علاحدگی کی صورت میں ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کتنی بری بات ہے یہ کہ کسی کے بیٹے کو اس سے جدا کر دیا جائے، کسی کے بھائی کو اس سے علاحدہ کر دیا جائے۔

ایک صاحب نے بیوی کے انتقال پر دوسری شادی کر لی، اس سے اولادیں ہوئیں، لیکن پہلی بیوی کا لڑکا ان سب سے بڑا تھا۔ باپ نے اس کی شادی بڑے حوصلوں کے ساتھ کی، لیکن بہو نے پہلی ہی رات میں شوہر سے کہہ دیا کہ وہ اس چھوٹے سے گھر میں سب کے ساتھ نہ رہ سکے گی، اور دوسرے دن میکے گئی تو واپس ہی نہیں آئی۔ صاحبزادے نے ایک روز جبکہ والدین اور سوتیلے بہن بھائی کسی تقریب میں گئے ہوئے تھے، ان کا سارا سامان مکان سے نکال کر باہر کیا اور مکان میں اپنا قفل لگا دیا۔ والدین واپس ہوئے تو یہ سین دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئے لیکن جوان اولاد سے کیا لڑتے شریف انسان تھے، خاموشی کے ساتھ کسی عزیز کے یہاں چلے گئے اور پھر کسی صورت کوئی گھر حاصل کر کے رہنے لگے۔ بے غیرت صاحبزادے اور خود غرض دلہن اب چین کی بنسی بجاتے آرام سے رہ رہے ہیں۔

ایک بیوہ ماں جنکی گزر بسر بیٹے ہی کی تنخواہ پر تھی، بہو لانے کے بعد اپنے ہی المیہ کا شکار ہوگئیں۔ صاحبزادے بیوی کے اشاروں پر چل کر اپنا سسرال جا بسے۔ کچھ دن ماں کو خرچ کے لئے کچھ دیتے رہے۔ ملنے ملانے بھی آتے رہے، پھر ان کا تبادلہ دوسری جگہ ہوگیا اور اس کے بعد جو کچھ دیتے تھے وہ بھی دینا بند کردیا۔ بیوی کا پیر بھاری ہوا۔ شوہر دورے پر گئے ہوئے تھے، تکلیف ہوئی۔ کوئی اپنا پاس نہ تھا، ایک رحم دل پڑوسن نے ترس کھاکر اسپتال میں داخل کرا دیا، لیکن پاس کون رہتا۔ رات میں ایسی طبیعت ہوئی کہ زندگی ہی کا خاتمہ ہوگیا۔ لاش مردہ خانے میں رکھدی گئی۔ دوسرے دن وہی ہمدرد پڑوسن گئی تو اسے علم ہوا۔ اپنے شوہر کی مدد سے لاش لاکر شوہر کو تار دیا۔ غرض بیچارے کرم ہوگئے۔ ساس پاس ہوتیں تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔

غرض اس طرح کے نہ جانے کتنے واقعات میرے علم میں ہیں۔ کہاں تک درج کروں۔ بس اتنا ہی کہوں گا کہ خاندانی اتحاد کے خلاف انفرادی زندگی کچھ بھلی نہیں ہوتی، اسمیں پھولوں سے زیادہ کانٹوں کی چبھن سہنا پڑتی ہے اور جو بھاری پن ساس نندوں اور بھاوجوں کی معیت میں نظر آتا ہے وہ تنہائی کی زندگی میں نہیں ہوتا۔

مجھے بہنیں معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ خاندانی اتحاد کو توڑنے میں خواتین کا ہاتھ زیادہ ہوتا رہا ہے۔ میں نے سیکڑوں ایسے گھرانے دیکھے ہیں۔ جن کا شیرازہ اسی وقت منتشر ہوا جب لڑکوں کی شادیاں ہوگئیں۔ اس سلسلہ میں ایک ضرب المثل بھی پرانی ہے کہ چار مرد ایک ساتھ ایک ہی گھر میں دس برس تک اس طرح رہ سکتے ہیں کہ ان میں تفرقہ نہ پیدا ہو، لیکن دو عورتیں، خواہ وہ سگی بہنیں ہی کیوں نہ ہوں دس ماہ بھی ایک ساتھ خوشگواری کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ میں نے ایسے گھرانے بھی دیکھے ہیں جہاں دو سگی بہنیں دو سگے بھائیوں کو بیاہی گئیں، لیکن ان میں اتفاق قائم نہ رہ سکا۔ بہن سے زیادہ بہن سے محبت کرنے والا اور کوئی کم ہی ہوتا ہے، لیکن ایسی صورتوں میں کہ دو بہنیں ایک ہی گھر میں بہو بن کر جائیں اور اتفاق قائم رہے کمتر ہی دیکھا جاتا ہے۔

مانتا ہوں کہ اس کے کچھ اسباب بھی ہوسکتے ہیں، لیکن ان اسباب پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ مل کر رہنے میں گھر و خاندان کی جو شان اور حسن ان قائم رہتی ہے، وہ علیحدہ علیحدہ رہنے میں نہیں ہوتی۔

یہ بھی نہیں کہتا کہ ایسے خاندان اب نہیں رہے جہاں اتحاد و اتفاق کے ساتھ لوگ رہتے ہوں۔ کم از کم ایک گھر تو میں نے اپنی نظروں سے دیکھا ہے جہاں دیورانی جٹھانی اس طرح رہتی ہیں کہ کسی آنے جانے والے کو یہ تمیز بھی نہیں ہو سکتی کہ کون بچے کس کے ہیں۔

بچوں کو دونوں سے اس طرح کا پیار ملتا ہے کہ وہ خود یہ نہیں سمجھ پاتے کہ وہ کس کے بچے ہیں۔ اس گھر میں مسرت و شادمانی کا جو دور دورہ نظر آتا ہے وہ ان گھرانوں میں کہاں مل سکتا ہے، جہاں جوڑے علیحدہ ہو گئے ہوں جہاں ماں صرف اپنے ہی بچوں کو منہ لگاتی ہو، جہاں تنہائی میں شوہروں سے دکھڑے روئے جاتے ہوں۔

یہ تو رہی گھریلو معاشرت کے اتحاد و اتفاق اور [illegible] کی باتیں، اب ذرا اس کو ہمہ گیری بخش کر یہ دیکھئے کہ ہم اس ملک میں کس طرح رہتے ہیں۔ برادران وطن سے ہم جو [illegible] ادا نہ کر سکیں تو خیر کسی حد تک اسے درگزر کیا جا سکتا ہے [illegible] اسلامی تعلیم تو یہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے بہتر سلوک کیا جائے۔ ان کے درد دکھ میں شریک ہوا جائے۔ اور اس کے لئے [illegible] ملت کی کسی پابندی کا ذکر نہیں ہے، پڑوسی ہندو ہو یا سکھ، عیسائی ہو یا پارسی۔ برہمن ہو یا اچھوت، پڑوسی ہی ہے [illegible] کے ساتھ ہمیں بہتر سلوک کرنا چاہئے۔ کاش ہم ایسا کر سکیں تو ملک میں جو یہ آئے دن فسادات ہوتے ہیں [illegible] ضرور کمی ہو جائے گی۔ لیکن دوسرے مذہب و ملت کے لوگوں سے ہم حسن اخلاق کا کیا مظاہرہ کر سکیں گے جبکہ ہم خود اپنی ملت میں پھوٹ ڈالے رہتے ہیں۔ ہماری ملت میں [illegible] بھی چلتا ہے۔ ایک عرصہ سے شیعہ سنی منافقات [illegible] ہر کوشش کے باوجود کوئی مفاہمت نہیں ہو پا رہی [illegible] لئے کہ ہم خود اپنا [illegible] نہیں کرتے [illegible]

کیا یہ واقعہ ایسا نہیں جس کے لئے یہ کہا جا سکے کہ بھائی [illegible] کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔

کاش ہم اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کریں۔ کاش ہم اپنے [illegible] میں اتحاد و اتفاق کی روشنی پھیلا کر اپنی ملت کا شیرازہ [illegible] ہونے سے بچا سکیں اور پھر ملک میں بسنے والے دوسرے [illegible] کے بھائیوں کو بھی اپنا ہی سمجھ کر اچھا سلوک کر کے ان کے دل موہ سکیں۔

نسیم انہونوی

مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کے شہرۂ آفاق ہفتہ وار
صدق جدید میں موجودہ اڈیٹر
حکیم عبد القوی صاحب دریابادی کی رائے

اسلامیت اور شرقیت پر ثابت قدم رسالہ

رسالہ حریم لکھنؤ جو ملک کے اردو نسوانی رسائل میں معمر ترین اور ساتھ ہی اسلامیت اور شرقیت پر ثابت قدمی میں اپنی نظیر آپ ہے کا جو سالنامہ ۱۹۸۰ء کا معمول کے مطابق ماہ جنوری میں نکلا ہے۔ اس کے مدیر محترم جناب سید نسیم انہونوی نے اس امر پر بجا طور پر خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ ان کے رسالے نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کرنے کے بعد اکاونویں سال کا پہلا پرچہ نکالا ہے آگے چل کر انھوں نے اپنے رسالہ کی خصوصیت لکھی ہے۔

کسی اردو ماہنامے کے لئے خصوصاً حریم جیسے رسالہ کے لئے جو دقیانوسی کہلاتا ہے اور پردہ کی موافقت میں شائع ہوتا ہے جو مغربی تہذیب کے زیر اثر کم ہوجاتا ہے۔ حریم نہ دوسرے رسائل کی طرح [illegible] مضامین پیش کرتا ہے نہ اس کے کور پر کبھی عریاں قسم کی کوئی نسوانی تصویر شائع ہوتی ہے پھر بھی وہ ہندوستان میں اردو کا سب سے معمر ماہنامہ ہے۔

یہ امتیازی خصوصیت اس دور میں بلاشبہ قابل رشک ہونے کے ساتھ حیرت انگیز بھی ہے۔ بے حجابی بلکہ عریانی کے اس دور میں یہ رسالہ خدا کے فضل سے ملک کی اردو خواں پبلک خصوصاً طبقہ [illegible] میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ اسلام کے [illegible] کی منادی اور تبلیغ برابر ہوتی رہتی ہے۔

بنگلور کا المیہ

یہ خبر شاید ہی کسی نے دیکھی ہو کہ گذشتہ ماہ اوائل فروری میں بنگلور ایک ایسے حادثہ سے دوچار ہوا، جس کی نظیر کم ہی مل سکے گی۔ ایک سرکس کے شامیانے میں اچانک آگ لگ گئی ہوا تیز تھی شامیانہ جلتا ہوا اس طرح گرا کہ اندر تماشائیوں کا ہجوم ایک قیامت خیز المیہ سے دوچار ہوگیا۔ عورتیں، مرد، بوڑھے اور بچے اس ناگہانی آگ کے طوفان میں کس طرح پھنس گئے ہوں گے۔ کس طرح نکلنے کی کوشش میں جلتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کی ہوگی۔ سوچ کر ہی کلیجہ منھ کو آنے لگتا ہے۔ اسکولوں کے معصوم بچے اور بچیاں بھی سرکس دیکھنے آئی تھیں۔ ان والدین کا کیا حال ہوا ہوگا جن کے بچے اس دنیاوی جہنم میں پھنس گئے ہوں گے۔ جل کر مر گئے ہوں گے۔ نہ جانے کتنے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی ہوگی۔

حادثات ہماری زندگی کا جزو ہیں، ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اتنا بڑا حادثہ یاد نہیں آتا کہ کبھی ہندوستان میں ہوا ہو۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا کرے جن کے متعلقین اس حادثہ میں ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے ہوں۔

اقوال زریں

۱۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہوتا ہے۔
۲۔ صاف گوئی تنقید کا بہترین اصول ہے۔
۳۔ غریب وہ ہے جس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہو۔
۴۔ آج کا عمل کل کا مقدر بن جاتا ہے۔
۵۔ بھلائی کا بدلہ چاہنا خود ایک برائی ہے
۶۔ سچی محبت بدلہ نہیں چاہتی۔
۷۔ مصیبت کا شکوہ کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ ورنہ اللہ ناراض ہوتا ہے۔ دشمن خوش ہوتے ہیں اور دوست بیزار ہو جاتے ہیں۔
۸۔ وہ انسان حیوان سے کم نہیں جو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔
۹۔ بزدل ہمیشہ نصیب کی آڑ لیتے ہیں۔

مرسلہ: [illegible]

آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ ماہ و سال کے آئینے میں

ولادت باسعادت۔ ۲۰ اپریل ۵۷۱ء مطابق ۹ ربیع الاول عام الفیل۔

والدین۔ حضرت عبداللہ اور بی بی آمنہ، والد آپؐ کی ولادت سے قبل ہی وفات پا گئے۔

والدہ کی وفات۔ ۵۷۶ء

دادا۔ عبدالمطلب جنھوں نے آپؐ کا نام محمد رکھا۔

دادا کی وفات۔ ۵۷۸ء

چچا۔ ابوطالب جنھوں نے عبدالمطلب کی وفات کے بعد آپؐ کی پرورش کی۔

رضاعی ماں۔ قبیلہ بنی سعد کی دایہ حلیمہ سعدیہ جنھوں نے آپؐ کو دودھ پلایا اور اپنے قبیلے میں پرورش کی۔

شام کا تجارتی سفر۔ ۵۹۵ء

نکاح۔ ۵۹۵ء میں آپؐ کی حضرت خدیجہ سے شادی ہوئی۔ خدیجہ مکہ معظمہ کی ایک نیک خاتون تھیں ان کی عمر ۴۰ سال کی اور آپؐ کی عمر ۲۵ سال تھی۔ شعب ابی طالب میں محصور رہنے کے بعد جب آپؐ باہر آئے تو ۶۲۰ء میں خدیجہ کا انتقال ہوا۔

اولاد۔ حضرت خدیجہ کے بطن سے قاسم پہلے فرزند تولد ہوئے چار صاحبزادیاں زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ، اور سب سے چھوٹی فاطمہؓ تھیں۔

بعثت۔ ۱۷ رمضان المبارک مطابق ۱۰ اگست ۶۱۰ء

معراج۔ ۲۷ رجب، ہجرت سے ڈیڑھ سال قبل۔

چچا کی وفات۔ ۶۲۰ء

ہجرت۔ ۶۲۲ء

غزوہ بدر۔ ۱۳ مارچ ۶۲۴ء

فتح مکہ۔ رمضان المبارک ۸ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء

وفات [illegible] ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری

مدینہ منورہ

دیارِ رسولِ انام اللہ اللہ — بہارِ درود و سلام اللہ اللہ
منور نظارے مہکتی فضائیں — مدینے کی یہ صبح و شام اللہ اللہ
ملائک کے پہرے ہیں ہر ہر قدم پر — یہ دربارِ خیرالانام اللہ اللہ
یہیں کسریٰ و حشمت کے سر بھی جھکے ہیں — یہی ہے ہما و مقام اللہ اللہ
طریقت کے واقف شریعت کے پیرو — مدینے کے ہر خاص و عام اللہ اللہ
نہ کوئی پریشاں نہ رنجور کوئی — مدینے میں سب شادکام اللہ اللہ
نچھاور ہیں گنبد پہ سورج کی کرنیں — مؤدب ہے ماہِ تمام اللہ اللہ
یہ حبِّ محمدؐ کی سرشاریاں ہیں — نہ مینا نہ ساغر نہ جام اللہ اللہ

مجھے خود بخود لوگ کہنے لگے ہیں
امین اور ان کا غلام اللہ اللہ

امین سلونی

نعتِ سرورِ کائناتؐ

ایک ایسی تمنا بھی سینے میں ہے — جس تمنا کا حاصل مدینے میں ہے
یہ بھی جینا بھلا کوئی جینے میں ہے — میں یہاں ہوں مرا دل مدینے میں ہے
اک غلافت بھی اک غبار بھی — ایک طوفاں بھی ہے اک سفینے میں ہے
وجد کرتی ہیں فردوس کی جنتیں — جانے کیا بات ان کے پسینے میں ہے
عاشقوں کو سکوں کس طرح سے ملے — جان کعبے میں ہے دل مدینے میں ہے
اس سے طوفان خود مانگتا ہے پناہ — جو رسولِ خدا کے سفینے میں ہے
دیکھ کر ان کے در کی کرم باریاں — ہم تو سمجھا کہ جنت مدینے میں ہے

مجھ کو فیروز مرقد کا کیوں خوف ہو
ان کی تصویر دل کے نگینے میں ہے

فیروز نظامی

درونِ خانہ سے بیرونِ خانہ تک

الحاج برق آشیانوی

لڑکیاں: کسی نے ملا نصیر الدین سے دریافت کیا کہ لڑکی کی تعریف کیا ہے؟ تو انھوں نے بہت ہی متانت عالمانہ کے ساتھ فرمایا "لڑکی وہ ہے جو عورت نہیں ہوتی" ـــ دوسرا سوال کیا گیا کہ عورت کی کیا تعریف ہے تو فرمایا "جو لڑکی نہیں ہوتی ہے" مزید وضاحت طلب کی گئی تو ارشاد ہوا کہ میاں تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جب کسی صنف نازک کو عورت کہا جاتا ہے تو اسکو کوئی لڑکی نہیں کہتا اور جب اسکو لڑکی کہا جاتا ہے تو اسکو عورت نہیں کہتے اس لئے کہ جب لڑکی عورت کی تعریف میں آجاتی ہے تو وہ لڑکی نہیں ہوتی ـــ مزید وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ جب کسی لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ عورت بن جاتی ہے اس لئے اس کو پھر کوئی لڑکی نہیں کہتا۔ ملا صاحب کے اس عالمانہ نکتے کو سن لینے کے بعد ہم نے غور کیا تو پتہ چلا کہ اگر کسی کی لڑکی کی شادی سولہ یا اٹھارہ سال میں ہو جائے تو وہ عورت بن جاتی ہے اور کسی لڑکی کی شادی تیس چالیس تک بھی نہ ہو تو وہ عورت نہیں لڑکی ہی کہلاتی ہے چنانچہ لڑکی یا عورت کے معاملے میں عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ البتہ شادی کی قید ضروری ہے۔ قید پر یاد آیا کہ کسی لڑکی کی شادی در اصل اس کے لئے قید با مشقت ہوتی ہے۔ مشقت کا انحصار حالات پر ہوتا ہے۔ ویسے آجکل کے لڑکے بھی شادی کو اپنے لئے ایک قید ہی تصور کرتے ہیں۔

لڑکیوں اور لڑکوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لڑکیاں چپل پہنتی ہیں اور لڑکے جوتے پہنتے ہیں۔ جتنی دیر میں لڑکا اپنے جوتے کی ڈوریاں کھولے اتنی دیر میں یا اس سے پہلے لڑکی چپل کے استعمال سے فارغ ہو کر بس میں سوار ہو جاتی ہے یہ تو روزانہ کی ایک معمولی مثال ہے۔ اس کے علاوہ لڑکیاں [illegible] محنت کرکے کامیاب ہوتی ہیں اور لڑکے چالاکی دکھا کر اس [illegible] ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل ملازمتوں کے لئے مقابلوں میں لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں کامیاب ہو رہی ہیں اور وہ دن دور نہیں جب کہ آفسوں میں لڑکیاں ہی لڑکیاں کام کرتی ہوئی دکھائی دیں گی اور لڑکوں کو امور خانہ داری انجام دینا پڑیں گے۔

لڑکیاں لڑکوں کے دوش بدوش چلنے لگی ہیں بلکہ بعض وجوہ بالا مثال سے دو لڑکوں سے آگے نکل گئی ہیں اب ایک لباس کے مسئلے کو ہی لیجئے تو معلوم ہوگا کہ لڑکوں کے لئے لباس کی تیاری میں جتنا کپڑا ضروری ہے اس سے کم کپڑے میں لڑکیوں کا لباس تیار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ کسی زمانے میں لڑکیوں کے لباس پر لڑکوں کے لباس سے زیادہ خرچ آتا تھا۔ لڑکیوں کا لباس اختصار کے لحاظ سے ابھی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ معلوم نہیں اسکی منزل کیا ہوگی۔

ہم نے آفسوں کا سروے کرکے افسروں سے یہ بات معلوم کرلی ہے کہ لڑکوں کے نانا، نانی، دادا، دادی یا مرحوم والد یا والدہ کے انتقال کی بنا پر لڑکے جتنی رخصتیں حاصل کرتے ہیں اس سے نہایت ہی کم بلکہ صفر کے برابر بھی لڑکیاں رخصت نہیں لیتیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ لڑکیاں بے حد رحم دل ہوتی ہیں اس لئے وہ مرحوم بزرگوں کے مکرر انتقال کے صدمے کو بھی برداشت نہیں کرسکتیں چہ جائیکہ بعض لڑکے تو زندہ بزرگوں کو بھی مار کر رخصت لینے سے دریغ نہیں کرتے۔

کھیل کے میدان میں بھی لڑکیاں بڑی مستعدی کے ساتھ اتر گئی ہیں۔ پہلے بیڈمنٹن اور ٹینس ہی کھیلا کرتی تھیں لیکن اب کرکٹ بھی کھیل رہی ہیں جس کی وجہ سے انھوں نے چوڑی دار پہننا چھوڑ دیا ہے تاکہ اب اسے وہ لڑکے پہننا شروع کردیں جو کرکٹ کھیلنے کے بھی قابل بھی نہیں ہوتے۔ فٹ بال اور ہاکی کے میدان میں لڑکیوں نے زیادہ قدم نہیں جمائے ہیں غالباً اس لئے کہ اس میں سر ٹکرانے [illegible] تصادم کے زخمی ہو جانے کے امکانات

وہ [illegible] چکا ہیں۔

اے ہیں الماریوں کا پوچھ رہی ہوں بی بی کہ کدھر ہیں، اگر وہاں ہو تو پھر چابیاں تو تمہارے پاس ہوں گی۔ ساس نے اسے گھورتے ہوئے پھر کہا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ سسک پڑی آنکھوں میں برسات کی جھڑی لگ گئی۔

تجھے تو کچھ پتہ نہیں بہو۔ وہ ہاتھ نچا کے بولیں تو تو بڑی معصوم ہے گلی گلی میں اس بات کا ڈھنڈورا ہے کہ میاں کو زہر دینے والی تو تھی یا کوئی اور:

پل میں سارا گھر اس کے سر آ پڑا اسے اپنا وجود گھر کی ایک ایک اینٹ کے نیچے کچلتا ہوا نظر آیا۔ دولتوں کی موت مر گئی۔ ذہن کے کونا ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ "میاں کو زہر دینے والی تو تھی یا کوئی اور" قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑتی مگر دفعتاً اس کی نظر قالین پر کھیلتی ہوئی بیلی پر پڑی جو اب زور زور سے رونے لگی تھی۔ طلعت نے پھر سامنے دیوار سے لگے ہوئے سرہد کو دیکھا اس کے قریب گئے تو ایک [illegible] ملبوس کھڑی ہوئی سہمی سہمی سی لڑکی کو دیکھا اس نے جھک کر قالین پر سے روتی ہوئی بیلی کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور بچوں کو اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے بولی اماں جان! لرمان تمام عمر اسی خوش فہمی میں رہے کہ ایک نہ ایک دن آپ ہم سب کو گلے سے لگا لیں گی۔ مگر ان کا اندازہ غلط تھا کاش میں آپ کی ان باتوں کو سننے سے پہلے ہی مر جاتی مگر اب مجھے زندہ رہنا ہے اپنے لئے نہ سہی ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے جن کا اب میں واحد سہارا ہوں:

اور حیران حیران سی شمسہ بیگم بہو کو اندر جاتے ہوئے دیکھتی رہیں جس کی چال میں ایک عجیب قسم کی خود اعتمادی تھی۔

شعلے

• بیوی وہ بل ہے جس کی ادائیگی ہمیں مسلسل اور باقاعدہ کرنی پڑتی ہے۔

• اس وسیع و عریض دنیا میں حیرت انگیز چیزوں کی کمی نہیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز انسان ہے۔

• تم جس کے ساتھ ہنسے ہو اسے بھول سکتے ہو، لیکن جس کے ساتھ روئے ہو اسے نہیں بھول سکتے۔

(خلیل جبران)

• اخبار ایک دن کی تاریخ ہے۔ اس کائنات کی جس میں ہم رہتے ہیں۔

• حسین عورت وہ ہے جو ہمیشہ خوش و خرم ہے۔

(فلر)

• صرف صلاحیت ادیب کو نہیں بناتی۔ کتاب کے پیچھے ایک انسان ہونا چاہئے۔ (ایمرسن)

• ہر صحت مند چہرہ ایک صحت مند دماغ سے بہتر ہے۔

(کہاوت)

• آنکھیں گھورتی ہیں لیکن یہ دماغ ہے جو دیکھتا ہے۔

(ایلس)

• بغیر دیکھے کوئی چیز نہ پیو، بغیر پڑھے کسی کاغذ پر دستخط نہ کرو۔

• جوانی میں ہر عورت بیوقوف ہے اور ہر مرد [illegible]۔

• مصور پھول کی تصویر اتار سکتا ہے لیکن اس کو خوشبودار نہیں بنا سکتا۔

ماہر نفسیات بیوی

غزالہ لطیف

کچھ عرصہ پہلے تک میں اپنا شمار دنیا کے انتہائی بدقسمت لوگوں میں کرتا تھا۔ یوں تو ہر وہ شخص جس کی شادی کو چار پانچ سال کا عرصہ گذر چکا ہو خوش قسمتی کو اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ سمجھ کر آہیں بھرتا ہے مگر میری بدقسمتی یوں انتہا کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ صرف بیوی بلکہ ایک ماہر نفسیات بیوی ہر وقت میرے سینے پر مونگ دلنے کو موجود رہتی تھی۔

گھر میں آتے ہی بیوی نے نفسیاتی کل پرزے نکالے گھر میں رد و بدل کے درپے ہوئے تو تمام بوسیدہ چیزوں کو باہر نکال مارا جن میں کہ میری ماں اور بہن بھی شامل تھیں۔ بقول ان کے ایسی بھولی بھالی صورتیں دیکھ کر خواہ مخواہ ڈپریشن ہونے لگتا ہے۔ میرا نا تمام فرنیچر بدل دیا گیا کہ اس سے بھی ڈپریشن ہونے کا اندیشہ تھا اور فرنیچر کے ساتھ ساتھ پردوں کا بدلا جانا بہت ضروری تھا کہ فضا میں خوبصورتی طبیعت کو شاداں رکھتی ہے اور ایک مرتبہ پھر ڈپریشن سے بچاتی ہے۔ گویا اس موذی مرض سے دفاع کی تدابیر پوری طرح اختیار کی تھیں کیونکہ ہماری ماہر نفسیات بیوی نے بتایا تھا کہ ڈپریشن ہی سے ہر بیماری کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ساری کی ساری تنخواہ ان احتیاطی تدابیر کی نذر ہو گئی۔ دفتر سے ایڈوانس رقم لینی پڑی۔ اور باقی سارا مہینہ اسی پریشانی میں گذرا کہ اب کیا ہو گا، ساری ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی کہ بجٹ کیسے برابر ہو گا۔ سوچ سوچ کر دماغ خراب ہو گیا اگر نفسیات کی ابتدا یہ ہے تو انتہا کیا ہو گی۔ مگر ان سب کے باوجود شکر ہے ڈپریشن سے بچے رہے۔

نیا نیا کتا بھی پالیں تو اس کے ہزار نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔ یہاں تو پھر بیوی کا معاملہ تھا۔ شروع شروع میں دل ہتھیلی پہ لئے نگہ نیچی رکھ کر بیگم صاحبہ کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ گھر کے ماحول کو پرسکون اور خوشگوار بنانے کے لئے حتی المقدور انھیں خوش و خرم

---------- رکھنے کی سعی کرتا اور ہر شے میں میں ان کی پسند کو اولیت دیتا۔ اور ان کی پسند۔!

دراصل یہ تو بتانا میں بھول ہی گیا۔ ابھی ہماری شادی کو بمشکل چند روز ہی گذرے ہوں گے کہ میرے رقیبوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ یقین کیجئے میں حاسد نہیں ہوں اور نہ ہی تھا۔ مگر وہ ان کا ذکر کچھ اس کثرت اور پیار سے کرتیں کہ خواہ مخواہ دل میں شکوک و شبہات جنم لینے لگتے۔ پیار کی بات ہو غصے کی بات یا کوئی سیاسی اور ادبی موضوع، ان کے حوالوں کے بغیر بات مکمل ہو ہی نہیں پاتی تھی۔ کثرت استعمال سے یہ نام ان کی زبان سے اس قدر بدنام ہو گئے تھے کہ کبھی کبھی ہم اور ہمارا نوکر بھی تختہ مشق بن جاتے۔ ایک دن کہنے لگیں، خرائیڈ (فرید کی بجائے) کو بازار بوتلیں لینے بھیجا ہے ابھی تک آیا نہیں۔ اور سنو عرام (اکرام) آج تم دفتر سے جلدی آجانا۔ اور ہم ہکا بکا ان کی جسارت پر دیدے پھاڑے دیکھتے رہے مگر مجال ہے جو انھوں نے اس بھول پر معذرت کی ہو۔

آہستہ آہستہ یہ بات ذہن نشین کر لی کہ اگر کوچہ یار میں مقام بنانا ہے تو پھر ان رقیبوں سے یارانہ گانٹھنا ہو گا حتی کہ ان کا موڈ برقرار رکھنے کے لئے مجھے ان رقیبوں کو اپنی گفتگو میں ضرور شریک کرنا پڑتا اور جہاں گفتگو میں کہیں ان کا نام آجاتا ان کا چہرہ یوں کھل اٹھتا جیسے میں نے ان کے کسی میکے والے کو عزت بخشی ہو۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ انھیں ہنسانے کے لئے مجھے لطیفوں کے تار و پود بھی انہی ماہر نفسیات کے گرد بننے پڑتے مثلاً ایک روز ایڈلر رات گئے تک چھت پر کھڑا رہا آخر اس کی والدہ نے پوچھا۔ بیٹا بات بہت بھیگ چکی ہے اب تک یہاں کیا کر رہے ہو؟

امی جان! میں چاند دیکھ رہا ہوں۔ بیٹے نے کہا۔

اب جاکر سو جاؤ بیٹا ورنہ چاند سے [illegible] جائے

پبلک مینڈ زنگ اور فرائڈ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک لنگڑاتا ہوا نظر آیا۔ ژونگ نے کہا میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ فرائڈ نے کہا نہیں پیر کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔ دونوں آپس میں بحث کرنے لگے۔ جب وہ آدمی نزدیک آیا تو انھوں نے پوچھا کیوں بھئی تمہاری ٹخنے کی ہڈی ٹوٹی ہے یا پیر کی ؟ ۔

وہ آدمی غصے سے بولا میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی، میری تو چپل ٹوٹی ہے۔

خیر اب تک آپ کو بیگم صاحبہ کی پسند کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ حضرات میرے لئے ایک زبردست سفارش بن گئے جن کی بات کبھی ٹھکرائی نہیں جا سکتی۔ وہی الفاظ جو میری ناقص زبان سے استعمال ہونے کے بعد اپنا اثر کھو دیتے تھے جب ان حضرات کی وساطت سے پہنچائے جانے لگے تو ان کی تاثیر دوچند ہوتی چلی گئی۔ ایک اس مقام پر میں ان حضرات کا بہت شکر گزار تھا۔

بیگم البرٹ ایلس کا خیال تھا کہ گوشت کے پسندے کھانے سے یادداشت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایڈلر کہتا تھا کہ سری پائے کھانے سے میاں بیوی میں محبت بڑھتی ہے۔ اور پیاجے کا کہنا تھا کہ سویٹ ڈش کا استعمال، انسانی شخصیت میں شگفتگی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ وغیرہ ..... وغیرہ

مگر وہ باسی سبزی کی طرح بیوی بھی دن گزرنے کے ساتھ ساتھ کچھ بے مزہ ہوتی جاتی ہے۔ شروع شروع میں تو ان کے اور ان کی نفسیات کے خوب چونچلے اٹھا لیتے مگر آہستہ آہستہ یہ بات برداشت سے باہر ہوتی جاتی رہی تھی۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو بھی گوارا تھی مگر جب ان کی نفسیات نے اُچک اُچک کر میرے روزمرہ میں دخل دینا شروع کیا تو پھر بات بس سے باہر ہو گئی۔

یہ ہمارا دوست۔ یہ تو چال سے ہی لا اُبالی لگتا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کا بچپن شامت کمسنی کے عالم میں بیتا ہے اور اس وقت بھی اس کی شخصیت کئی طرح کے کمپلکس کا شکار ہے۔

فرحت کی ان آنکھوں کی چمک صاف بتاتی ہے کہ اسے نور رتوں آ چکا ہے اور وہ خواب محبت کو پسند کرتا ہے۔ شیراز کے بے ڈھنگے پن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شخصیت میں انتشار ہے اور اس کا

تحت الشعور آلودگیوں سے بری طرح آلودہ ہے۔ ویسے مجھے تو یہ کلیپٹومینیاک بھی لگتا ہے۔

خدا کے لئے بیگم جو کہنا ہو، مجھے کہہ لیا کرو۔ میں بے چارہ شوہر جو ہوں۔ آخر ایک روز میں نے زچ ہو کر کہا۔

بھئی کمال کرتے ہو۔ اگر ان کی شخصیت تندرست نہیں ہوگی تو کل یہ سب خرابیاں تم میں بھی آ سکتی ہیں۔ کوئی چھوت کا مریض ہو اس سے تو بچتے ہو، ایسی کرداری خامی والے لوگوں سے بھی بچا کرو۔ اور اب تم ان میں سے کسی کے ساتھ تاش نہیں کھیلو گے۔

اور میں جو بڑے صبر و تحمل سے یہ برداشت کر رہا تھا یکدم بھڑک اٹھا۔ نہیں کوئی حق نہیں، یہ پابندیاں لگانے کا۔ تم۔ تم کون ہوتی ہو ——— میں بار بار غصے سے اس کی جسارت پر مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور دل یہی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت بیگم کو اس کی نفسیات سمیت اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دوں اور پھر ان تمام دوستوں کو گھر بلا کر خوب تاش کھیلوں۔ مگر میں کچھ بھی نہ کر سکا اتنا بھی نہیں کہ اب باسی سبزی کی طرح تمہارا مزہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اب تم اپنی اوقات پہچان کر رہو۔ مگر میں کتنا مجبور تھا۔ کیونکہ میری بیگم ابھی تک یہ سمجھتی تھی کہ مجھے اس سے محبت ہے۔

خرید۔ اوہ۔ فرید۔

میں نے قمیض کے بٹن بند کرتے فرید کو جوتا پالش کرنے کے لئے آواز دی تو اس کی بجائے بیگم صاحبہ کی باورچی خانے سے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح لگنے والی آواز آئی۔

فرید کو میں نے نکال دیا ہے اور مجھے جیسے کسی بچھو نے کاٹ ڈالا ہو۔ ایک دم اچھلتے ہوئے میں نے پوچھا۔

کیوں ؟ کیا تمہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ کتنا پرانا اور وفادار نوکر تھا۔ کاش اس کی بجائے تم نکل گئی ہوتیں۔ میں نے انتہائی غصے سے کہا۔

اوہ ہو۔ بھئی ناراض کیوں ہوتے ہو۔ دوسری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولیں اور کہا کرتی تھیں کہ غصے میں کہی گئی بات کا برا نہیں مانتی۔ اور میں احتمال کر رہ جاتا کہ آخر وہ غصے میں کہی گئی بات کا برا کیوں نہیں مانتیں۔ اب دیکھو نا اس کا معیاس

ذہانت بہت کم تھا اور جو آزمائش اس کی صلاحیتوں کی جانچ کے
لئے میں نے کی تھیں وہ ان سب میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ اب
اگر ہمارا بچہ ہوتا وہ زیادہ وقت اس کے پاس ہی گزارتا اور اس
طرح اس کی تربیت ٹھیک نہ ہو پاتی۔ اب ہم کسی معیاری مقیاس
ذہانت کا لڑکا رکھیں گے۔

اور میں پیر پٹختے اور میز پر سے ایک پیالی اٹھا کر زور سے فرش
پر مارنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا اور دفتر چلا گیا۔ تو اب میں آپ کو وہ واقعہ
بتاتا ہوں جس نے میری زندگی پر چھائے ہوئے عجیب گہرے کالے مایوسی
کے بادل کو ہٹایا اور مجھے بھی وہ دن دکھایا کہ میں روشنی صبح میں کھل کر
آزادانہ سانس لے سکوں۔

ہوا یوں کہ ایک روز میں دفتر سے اٹھا تو میرے ساتھ فائلوں
کا انبار تھا۔ شام تک ان میں سر کھپائے بیٹھا رہا کہ اچانک غیر متوقع
طور پر بیگم صاحبہ اٹھلاتی بل کھاتی نئی ساڑھی باندھ کر اپنی طرف سے بہت
خوبصورت بنی چلی آ رہی تھیں۔ آتے ہی گلے میں باہیں ڈال دیں اور
بڑی ادا سے بولیں۔

چلو اکی (کبھی کبھی وہ پیار سے اکرم کو بگاڑ کر اکی کہتی تھیں)
آج فلم دیکھنے چلیں میرا بہت جی چاہ رہا ہے۔

ابھی فائلوں میں اس وقت ان کی یہ ادا زہر سے بھی کڑوی لگی۔
مگر ضبط کرتے ہوئے زبان سے میں نے کہا۔

دیکھو بیگم خواہشات پر کنٹرول کرنا بھی سیکھو۔

مگر فرائڈ تو کہتا ہے کہ خواہشات کی فوری تسکین نارمل شخصیت
کے لئے ضروری ہے۔

فرائڈ۔ فرائڈ۔ فرائڈ۔ بھاڑ میں گیا فرائڈ، اور تم۔

فرائڈ کے لئے ایسے گستاخانہ الفاظ کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی
تھیں۔ کچھ دیر تو ان کی سٹی گم رہی پھر زخم کھائی ہوئی ناگن کی طرح
بل کھا کر بولیں۔ تم کون ہوتے ہو میرے جبلی تقاضوں پر پابندی لگانے
والے۔ کیوں نہیں جانا کوئی مناسب وجہ بتاؤ۔

میں نے آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے ذرا اکڑ کر کہا وہ ـــ وہ
باہر موسم خراب ہے۔ بارش ہوئی ہے۔ کیچڑ زیادہ ہوگا۔ کہیں
کوئی حادثہ ہی نہ ہو جائے۔

دیکھا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ تم تو علمی عصابیت کے
شکار ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی سر میں درد بھی ہوتا ہے۔

ہاں۔ میں نے جل کر کہا۔

کسی کو مارنے کو بھی جی چاہتا ہے۔

ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ میں زور سے چلایا اور پھر بڑی مشکل
سے اس مکے کو نیچے گرایا جو ذرا بھی بے قابو ہو جاتا تو اس وقت بیگم کے
سر پر ہوتا۔

اوہ۔ تم تو ہیجانی اضمحلال کا بھی شکار ہو۔ اس نے مایوسی
سے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ تمہارا تو باقاعدہ علاج ہونا چاہئے اور
علاج کے نام سے ہی میں نے حسرت سے ان فائلوں کو دیکھا جو
مجھ سے بھی زیادہ حسرت سے مجھے تک رہی تھیں کہ
اب ہم ایسے ہی رہیں گے۔ اور پھر مجھے تنویم زدہ کر کے میرا علاج کیا
جانے لگا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ مجھے ہپناٹائز کر کے میرے لاشعور کو
جگایا گیا تھا مگر مجھے صرف اتنا احساس ہے کہ اس رات جیسی
پرسکون نیند آئی اس کے لئے مدت سے ترس گیا تھا۔ یوں لگتا تھا
جیسے کوئی بھاری پتھر سینے سے ہٹ گیا ہو۔

صبح میں بڑے خوشگوار اور ہلکے پھلکے موڈ میں سو کر اٹھا تو
کمرہ گھٹی گھٹی آہوں سے گونج رہا تھا۔ ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو بیگم صاحبہ
الماری میں سے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھنے میں مصروف تھیں۔

بھئی یہ آپ صبح صبح نیر بہاتی کہاں جا رہی ہیں؟ میں نے اسی
خوشگوار انداز سے پوچھا تو انھوں نے جس کھا جانے والی اور نفرت سے
بھرپور شعلے برساتی آنکھوں سے دیکھا وہ کیفیت بیان سے باہر ہے۔

یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ وہ بات جو شعور اتنے برسوں میں نہ کہہ سکا تھا۔
لاشعور نے اتنی سی دیر میں اتنے مؤثر انداز میں بیان کر دی تھی۔ کبھی
کبھی سوچتا ہوں کہ کہیں لاشعور نے تین بار طلاق ہی تو نہیں کہہ دیا
تھا جو اس روز کی گئیں وہ کبھی واپس ہی نہیں آئیں۔ ورنہ شعور کی
باتوں کا تو وہ کوئی نوٹس ہی نہ دیتی تھیں۔

بہرحال میں اس لاشعور کا بہت مشکور ہوں کہ اس نے مجھے
دوبارہ خوش صحت لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ خدا کرے میرے
جیسے باقی سب مصیبت زدہ بھائیوں کا لاشعور آڑے وقت میں
اسی طرح کام آتا رہے۔

افسانہ

بیگم سلطانہ جلیل - آمبور - تامل ناڈو

کھوئی ہوئی دولت

ممّی... ممی.... کہتے ہوئے ریشماں اپنی ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر پیار سے بولی۔

"آج نازلی کے بیٹے گڈو کی سالگرہ ہے۔ کوئی تحفہ خریدنا چاہتی ہوں۔ روپئے کی ضرورت ہے ممّی۔"

"نازلی کے بیٹے کی سالگرہ..." ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں ممّی گڈو کی پہلی سالگرہ ہے۔" ریشماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"کتنے روپیے کی ضرورت ہے" ماں نے پوچھا۔

"بس پچاس روپیے دے دیجیے۔"

"ارے پگلی پچاس روپیوں میں اس گرانی کے زمانہ میں بھلا کیا ملے گا۔" یہ لے نظو روپیے کوئی بڑھیا سا تحفہ خرید کر لے جانا۔"

ریشماں خوش ہو کر روپیے لیتے ہوئے بولی "میری اچھی ممی... آپ کتنی پیاری ہیں۔ اللہ ہر ایک کو ایسی ہی پیاری ممی نصیب کرے۔"

"ختم ہوتے ہی جلد گھر لوٹ آنا۔"

"اچھا ممی جلد آجاؤں گی۔ آپ بے فکر رہیے۔" یہ کہتے ہوئے ریشماں چلی گئی۔

ریشماں کی ماں سعدیہ سوچنے لگی۔ کاش میرے نصیب میں بھی ایسا ہی سہانا، حسین اور خوبصورت دن ہوتا۔ میں بھی اپنے بچوں کی سالگرہ اسی طرح دھوم دھام سے مناتی! کاش بچپن کے گزرے ہوئے حسین لمحوں کو پھر ایک بار پا سکوں۔ وہ لمحے کتنے پیارے، کتنے حسین، اور کتنے دلکش تھے۔ چہکتے، دمکتے، روشن، پُرمسرت لمحے... وقت کی تیز آندھیوں نے جن کی ساری درخشندگی اور تابانی چھین لی۔ ماضی ایک حسین تاج محل تھا۔ یہ تاج محل حالات و واقعات کے گہرے ساگر میں ڈوب گیا۔

سعدیہ جب دس سال کی تھی۔ اس کے آس پاس تین چار بچوں کا ایک خوبصورت جھگھٹا لگا رہتا تھا۔ سعدیہ کو کم عمری ہی سے بچوں سے بے حد پیار تھا۔ محلے کے تمام بچے اسی کے پاس رہتے تھے۔ بچوں کو نہلانا دھلانا اور سنوارنا اس کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ بچوں کو اپنے پاس بٹھا کر ننھی منی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے چاند کے چاروں طرف ستارے جھلملا رہے ہوں۔ جب کبھی کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تو بڑی لگن کے ساتھ اس کی تیمارداری میں لگی رہتی۔ بچے کے صحت مند ہونے پر مٹھائی تقسیم کرتی تھی۔ سعدیہ کا پیار اور چاہت دیکھ کر محلے کا کوئی بچہ اپنے گھر میں نہ ٹھہرتا تھا۔ بچوں کی تاریخ معلوم کر کے اپنے ہی گھر میں بچوں کی سالگرہ منانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ سعدیہ کا شوق دیکھ کر بچوں کے والدین سالگرہ کا انتظام سعدیہ ہی کے سپرد کرتے تھے۔ ننھے بچوں کے ساتھ اس کا وقت نہایت ہی ہنسی خوشی سے گزر رہا تھا۔

جب بچے کانونٹ جانے لگے تو وہ اسکول جانے لگی۔ سعدیہ کو اسکول سے اور بچوں کو کانونٹ سے چھٹی ملتے ہی پھر سعدیہ کا سارا وقت بچوں کے ساتھ گزرتا۔ اسکول کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد سعدیہ نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ بچے بھی بڑے ہو گئے تھے اس لیے سعدیہ کے گھر نہ آتے۔

کچھ عرصہ بعد سعدیہ کی پھوپھی کا لڑکا ریحان اسے پڑھانے کے لیے ہر روز سعدیہ کے گھر آنے لگا۔ عمر کا تقاضا تھا کہ وہ سعدیہ سے دلچسپی لینے لگا۔ سعدیہ کے والد کی خواہش بھی تھی کہ ریحان سے سعدیہ کی شادی کر دیں اور اسی وجہ سے انھوں نے یہ سلسلہ شروع کروایا تھا تاکہ وہ یہ بھی اندازہ کر لیں دونوں ایک دوسرے سے دلچسپی رکھتے ہیں یا نہیں۔ اور جب انھوں نے محسوس کر لیا کہ ان کا رشتہ مناسب رہے گا تو انھوں نے بہن سے ریحان کو مانگ لیا اور شادی کی بات طے ہو گئی۔

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سعدیہ غم انگیز لہجے میں بولی: "میں سوچ رہی تھی۔ دنیا میں مجھ جیسا غمزدہ، بدنصیب شاید کوئی نہ ہوگا۔ لیکن آپ کو دیکھ کر مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ غم نصیب اور پریشان حال ہیں۔"

نوجوان نے کہا: "میں صرف غم نصیب ہی نہیں۔ ایک بدنصیب باپ بھی ہوں۔ ایک ماہ پہلے میری پیاری صاعقہ، مجھے بے انتہا چاہنے والی، بچوں سے پیار کرنے والی، میری شریک حیات ہمیشہ کے لیے مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔" اتنا کہہ کر وہ سسک اٹھا۔ سعدیہ کو اس پر ترس آگیا۔ تسلی دیتے ہوئے سعدیہ بولی: "خدا کی یہی مرضی تھی۔ اچھا بتائیے آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

نوجوان کہنے لگا: "رازی سات برس کا، شازی چھ برس کا اور ریشما چار برس کی ہے۔ وہی برابر ضد کرتی ہے کہ جب میں آؤں تو ضرور اس کی ممی کو ساتھ لیتا آؤں۔ دن بھر اپنی ممی کو ڈھونڈتی رہتی ہے نہ ملنے پر روتی، چلاتی ہے پھر وہ چپ سو جاتی ہے۔ صاعقہ کی جدائی کا غم، پھر ریشاں کا تڑپنا.... شازی اور رازی کی اداسی... آہ مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔"

سعدیہ تڑپ کر بول اٹھی: "بس کیجئے جناب... آپ کی آہ و زاری سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔" اور وہ دل ہی دل میں عزم کر بیٹھی ضرور وہ ریشاں کی ممی بن جائے گی۔

طارق سنبھلتے ہوئے بولا: "ویسے آپ مجھے جناب کے بجائے طارق کہہ سکتی ہیں۔ آپ نے تو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

سعدیہ بولی: "سن کر کرو گے بھی کیا۔؟"

"تاکہ دکھ بٹ سکے" طارق نے کہا۔

سعدیہ مسکراتے ہوئے بولی: "سچ! اگر دکھ بٹتا ہے تو کہتی ہوں سنو۔" وہ آپ بیتی سنانے لگی۔

طارق اس کی آپ بیتی سننے کے بعد ہچکچاتے ہوئے بولا: "کیا واقعی آپ ریشاں کی ممی بن سکتی ہیں؟"

سعدیہ نے خاموشی کے ساتھ گردن نیچی کر لی۔

طارق نے پھر پوچھا: "کیا میں آپ کو پسند نہیں؟ دیکھو سعدیہ میں پہلے ہی زمانے کا ستایا ہوا ہوں۔ خدا کے واسطے میرا دل مزید نہ دکھایئے۔"

سعدیہ کچھ سوچتے ہوئے بولی: "میں پہلے بچوں سے مل لوں۔ اس کے بعد جواب دوں گی۔"

طارق خوش ہو کر بولا: "چلو میرے ساتھ ابھی اسی وقت بچے آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ قریب ہی میری کوٹھی ہے۔"

سعدیہ طارق کے ساتھ 'طارق منزل' چلی گئی۔

طارق خوشی سے جھومتے ہوئے ریشاں کو پکارنے لگا: "ریشاں بیٹی ریشاں بیٹی۔" وہ کمرے سے ہی بولی: "جی کیا ہے ڈیڈی.... کیا آپ میری ممی کو لائے ہیں؟" طارق نے کہا: "آؤ تو سہی۔"

ریشاں دوڑ کر آئی اور سعدیہ کو دیکھتے ہی "... ممی ... ممی" کہہ کر لپٹ گئی۔

اتنے میں رازی اور شازی اپنا کھیلنا چھوڑ کر سعدیہ کے قریب آکر حسرت بھری نگاہوں سے سعدیہ کو گھورنے لگے۔

ریشاں کہنے لگی: "ممی.... ممی... اب مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جایئے گا۔ میری پیاری ممی۔" اور گلے میں باہیں ڈال کر جھومنے لگی۔

سعدیہ کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے سچ مچ اس کی کھوئی ہوئی دولت مل گئی ہو۔ طارق بھی محسوس کرنے لگا۔

اس نے اپنی صاعقہ ڈھونڈھ لی ہے۔ یعنی اس کی کھوئی ہوئی دولت، اس کو مل گئی ہے... بچوں کو بھی ان کی ماں دوبارہ مل گئی ہو۔

فارم نمبر چار	دیکھئے قاعدہ نمبر ۸
مقام اشاعت	۵ مولانو شس رو ڈ لکھنؤ
وقفہ اشاعت	ماہوار
پبلشر کا نام	ایس ایم فہیم انہونوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	کاشانہ فہیم گیٹ ملک گنتی لکھنؤ
پرنٹر کا نام	سید انصار حسین
قومیت	ہندوستانی
پتہ	سرفراز قومی پریس۔ نادان محل روڈ لکھنؤ
ایڈیٹر کا نام	نسیم انہونوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	کاشانہ فہیم گیٹ ملک گنتی لکھنؤ
مالکان	ایس، ایم فہیم انہونوی و شوکت جہاں بیگم

میں ایس ایم فہیم انہونوی اقرار کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں درست ہیں۔ ایس ایم فہیم انہونوی

شادی کو ابھی ایک ماہ باقی تھا اور وہ دن کالج کا بھی آخری دن تھا۔ وہ اپنی چند ساتھیوں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیل رہی تھی اچانک اس طرح گر پڑی کہ نات کے نیچے شدید چوٹ آنے سے بیہوش ہوگئی۔ باپ کو اطلاع ہوئی۔ اسے اسپتال داخل کر دیا گیا۔ چوٹ نے ایسی پیچیدگی اختیار کرلی تھی کہ آپریشن کے بعد رحم کا نکالنا ضروری ہوگیا۔ بات ایسی نہ تھی کہ سعدیہ کے والد اسے منظور کرسکتے۔ لیکن جان بچانے کے لیے تو ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے۔

آپریشن ہوا۔ سعدیہ کی جان بچ گئی، لیکن وہ کبھی ماں نہ بن سکتی تھی۔ یہ بات سعدیہ کی پھوپھی سے بھی پوشیدہ نہ رہ سکی۔ انھوں نے بیٹے کی شادی سے انکار کر دیا۔ جب سعدیہ نے یہ اندوہناک اور دلخراش خبر سنی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کو دہکتی ہوئی آگ میں جھلسنے کے لیے چھوڑ دیا ہو اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کے حسین محل کو بے دردی سے منہدم کر دیا گیا ہو۔ بچوں کی سالگرہ منانے کی اس کو کتنی آرزو تھی۔ اس کے اپنے بچے ممی... ممی کہہ کر گلے میں بانہیں ڈال کر پیار کریں گے۔ نہ جانے کتنے سپنے اس نے اپنے دل میں سجا رکھے تھے لیکن اب یہ تمام سپنے چور ہوکر دھڑام سے ڈھے گئے۔ اب وہ اداس اداس رہنے لگی۔ اس کے دل میں جینے کی تمنا ہی نہ رہی۔ اس کی اداسی دیکھ کر سعدیہ کے ابّو نے ایک کانونٹ کھول کر سعدیہ کو اس کا نگراں بنا دیا صرف سماج کے خوف اور وقت گزاری کے لیے وہ اس خدمت کے لیے راضی ہوگئی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ اس کو اپنے کانونٹ سے انس ہوتا گیا۔ ابّو کی سعی کے باوجود سعدیہ کا رشتہ کہیں نہ ہوسکا۔ اس طرح پانچ سال بیت گئے۔ اب سعدیہ کو اپنے غم سے زیادہ والدین کی اداسی کا دکھ تھا۔ اکثر وہ یہ سوچ کر دل ہی دل میں آنسو بہاتی اور سوچتی۔ مجھ بدنصیب کی وجہ سے میرے والدین دن بدن فکرمند ہوتے چلے جارہے ہیں۔

ایک بار وہ اپنے کانونٹ میں بچوں سے باتیں کر رہی تھی۔ تو ایک چار سالہ لڑکی کو اس کی ممی داخلہ کے لیے لائی۔ سعدیہ کو وہ بچی اتنی پیاری لگی کہ اس نے دوڑ کر بچی کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو بچی بے تحاشہ رونے لگی: "ممّا رمی" کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔ بچی ماں سے التجا کرنے لگی .... ممی.... میری اچھی ممی....

مجھے اپنے سے جدا نہ کرو۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میری پیاری ممی" کہتے ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔ ماں سے بچی کا بے انتہا پیار دیکھ کر سعدیہ کا دل تڑپ اٹھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چلّا چلّا کر کہہ رہا ہو۔ کبھی... تو بھی ماں بنتی تو تیرے بھی بچے تجھے اسی طرح پیار کرتے۔ تو... تو بدنصیب ہے"

سعدیہ کو شدت غم نے بے قابو کر دیا۔ وہ ذرا دیر کے لیے بھی وہاں نہ ٹھہر سکی۔ بچی کی ممی سے معذرت چاہتے ہوئے۔ بچوں کی ٹیوٹر کو کانونٹ سنبھالنے کا حکم دے کر اپنے گھر چلی آئی۔ یہاں بھی اس کو کسی پہلو قرار نہ ملا۔ ایک ہی جملہ اس کے دل و دماغ میں تیر کی طرح چبھ رہا تھا۔ آہ.... آہ.... تو بھی ماں بنتی تو تیرے بچے بھی اسی طرح پیار کرتے۔

ایک دن بے قراری اور بے چینی کے عالم میں ٹہلتے ٹہلتے وہ دریا پر پہونچ کر نظارۂ دل سے لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھ گئی۔ تاکہ رنج و غم سے کچھ چھٹکارا پاسکے۔ یہاں اس کو بیٹھے ہوئے بمشکل تمام پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دردبھری آواز میں کہا: "صاعقہ... صاعقہ... تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ دیکھو میں تمھیں کہاں کہاں تلاش کرتا رہا ہوں۔ تم مجھ سے کیوں روٹھ گئی ہو۔ بچے تمھارے بنا کتنے اداس اور پریشان ہیں۔ آج ریشاں ممّی سے وعدہ لے کر آیا ہوں۔ تمھاری ممی کو ضرور ڈھونڈھ کر لاؤں گا۔ میری خاطر نہ سہی۔ بچوں کی خاطر ہی چلو۔ میں اکیلا ہرگز نہ جاؤں گا اٹھو صاعقہ اٹھو.... کیوں خاموش ہو.... صاعقہ.... صاعقہ...."

جب وہ خاموش ہوگیا تو سعدیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تقریباً تیس سالہ نوجوان غم کا مجسمہ بنا حسرت بھری نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔ سعدیہ پریشان ہوکر بولی: "آپ کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ میں صاعقہ نہیں... سعدیہ ہوں"

نوجوان نے آہ بھرتے ہوئے کہا: "کاش آپ سعدیہ کی جگہ صاعقہ ہوتیں۔ آپ میں اور صاعقہ میں کتنی مشابہت ہے۔ وہی قد، وہی چہرہ وہی آنکھیں..."

شدت غم کی وجہ سے وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ سعدیہ خود دکھیاری تھی اس مجسم غم کو دیکھ کر اس کا دل لرز اٹھا۔ (باقی صفحہ ... پر)

بحث کے درمیان میں بات کاٹ کر پادری بلتار بولے: شوہر اور بیوی کا جوڑا ایسا ہی ہے جیسے قینچی ہوتی ہے۔"

قینچی: ایک شخص بولا۔ فادر! آج آپ نے تو ایک بالکل نئی تشبیہ دی ہے۔"

نئی نہیں: پادری نے کہا: بلکہ ایک مناسب اور موزوں تشبیہ کہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ قینچی کے دو پھل ہوتے ہیں، بالکل ایک جیسے دونوں کو ایک کیل سے جوڑ دیا جاتا ہے حالانکہ دونوں پھل اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن اگر کیل نہ ہو تو دونوں بے کار ہیں۔ کیل سے جڑ جانے کے بعد دونوں اپنے اپنے فرائض بخوبی انجام دینے لگتے ہیں"۔

ایک اور شخص نے کہا: میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ میاں بیوی ایک قینچی کی طرح ہوتے ہیں لیکن اچھی قینچیاں تو ہر جگہ مل جاتی ہیں مگر اچھے شوہر اور بیوی جنھیں ہم معیاری کہہ کر نمونے کے طور پر پیش کر سکیں کہاں ملیں گے۔؟"

معیاری اور مثالی چیزیں گو ہمیشہ کمیاب ہوتی ہیں اگر ہوتی ضرور ہیں: پادری نے کہا: اس میں شک نہیں کہ شادی ایک ایسی ہی کیل ہے جس سے دونوں پھل جوڑے جاتے ہیں لیکن اپنی اپنی جگہ دونوں پھلوں کا بھی اچھا ہونا بے حد ضروری ہے۔ آپ کسی قینچی کی دکان پر جائیں۔ دکان دار آپ کو درجنوں قینچیاں دکھائے گا۔ جو بظاہر سبھی اچھی معلوم ہوں گی لیکن جب آپ ان سے کام لیں گے تو مشکل سے ان میں کوئی ایک ایسی ہوگی جو اچھی طرح کام کر سکے یہی وجہ ہے کہ جب کسی درزی کو کوئی اچھی قینچی مل جاتی ہے تو وہ اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو اسی طرح میں نے اس دنیا کے انسانوں میں بھی کچھ ایسے جوڑے دیکھے ہیں جن میں بے انتہا محبت اور رفاقت پائی جاتی ہے۔ میں آپ لوگوں کو ایک واقعہ سناتا ہوں جس نے مجھ پر بڑا اثر چھوڑا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر پادری نے کہنا شروع کیا: میں ایک خانقاہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں ایک شوہر اور بیوی بھی شامل تھے جو گرجا کے برآمدے میں کپڑے کی دکان کرتے تھے۔ شوہر کا نام ڈان اینڈ ریز اور بیوی کا ڈونا کنسو لوتھا۔ ان کا ایک ہی لڑکا تھا جو آوارہ اور بدچلن نکل گیا۔ ماں باپ اس کی حرکتوں سے بہت پریشان تھے۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی ایسا کام کر دیتا تھا کہ ان دونوں کی گردنیں شرم سے جھک جاتی تھیں۔ کون سا عیب تھا جو اس میں موجود نہ تھا۔ ماں کے آنسو، باپ کی ملامت یا میرا سمجھانا کسی چیز کا اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کی اصلاح کا کوئی امکان نہیں ہے تو میں نے اس کے والدین کو رائے دی کہ اسے کسی دوسرے شہر بھیج دیا جائے۔ اس طرح وہ یہاں کی بری صحبت سے بچ جائے گا اور وہاں کسی کام دھندے سے لگ کر اتنا مصروف ہو جائے گا کہ اسے آوارگی کے لیے وقت ہی نہیں مل سکے گا۔ باپ کو یہ رائے بہت پسند آئی اور ماں نے بھی جب دیکھا کہ اس کی درستی کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے تو وہ بھی اسے باہر بھیجنے پر رضامند ہو گئی۔

ہم نے اسے منیلا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جگہ خود لڑکے کو بھی پسند تھی۔ میں نے اپنی جماعت کے ایک پادری کے نام خط دے کر لڑکے کو منیلا روانہ کر دیا۔ منیلا پہنچنے کے چھ ماہ بعد سے اس کے خطوط آنا شروع ہوئے کہ اب وہ بہت سدھر گیا ہے اور اپنے فرائض بڑی محنت سے انجام دیتا ہے۔ اس کی والدین کو یہ معلوم ہوا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔

کچھ دنوں بعد وہاں کے پادری کا ایک خط میرے پاس آیا جس میں یہ المناک اطلاع دی گئی تھی کہ ڈان اینڈ ریز کے لڑکے کو جب وہ بدمعاشوں کے ایک اڈے سے باہر آ رہا تھا کسی نے چھرا مار کر ہلاک کر دیا۔ پادری نے اس خط کے ذریعہ مجھ سے استدعا کی تھی کہ یہ خبر اس کے والدین کو پہنچا دوں۔

یہ بڑا اندوہ ناک فرض تھا جس کی ادائیگی میرے ذمے ڈال دی گئی تھی۔ انسان کی زندگی میں ایسے ناخوشگوار لمحے کثرت سے آتے رہتے ہیں چنانچہ میں نے یہ سوچ کر کہ ڈان اس کا باپ ہے وہ زیادہ ہمت اور تحمل سے کام لے گا۔ اسے اپنے کمرے میں بلا کر محتاط الفاظ

اور بھرائی ہوئی آواز میں یہ بری خبر سنا دی۔ میری تمہید سے پہلے ہی وہ جان گیا تھا کہ اس کے بیٹے کے متعلق کوئی خبر ہے لہٰذا اس نے خبر نہایت اطمینان سے سنی۔ زبان سے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی۔ مگر اس کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔ میں نے یہ مثال اس لیے دی ہے کہ متعدد موقعوں پر میں نے پھانسی کے تختے کی طرف لے جائے جانے والے لوگوں کو دیکھا ہے۔

جب ڈان نے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور وہ بات کرنے کے قابل ہوا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے استدعا کی۔ فادر! میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ یہ المناک خبر صرف ہم دونوں تک محدود رہے کنسولو کو اس کی بالکل اطلاع نہ ہو۔ آپ تو جانتے ہیں کہ چند سال پہلے تک وہ ایک اچھی خاصی صحت مند اور گداز جسم والی عورت تھی لیکن بیٹے کی حرکتوں نے اس کی صحت تباہ کر دی۔ اس کی عمر اب ساٹھ سال کے قریب ہے اور مجھے شبہ ہے کہ اسے ٹی بی ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر اسے بیٹے کی موت کی اطلاع دی گئی تو اس کا بچنا مشکل ہو جائے گا اس کے کفن دفن اور مقدمے وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوگا وہ سب میں برداشت کروں گا۔ بس میری آپ سے یہی التجا ہے کہ کنسولو کو اس کی بالکل خبر نہ ہو۔"

میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ اس کی بیوی کو خبر نہ ہوگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ٹھیک کیا یا نہیں۔ مجھے اس پر بڑا ترس آ رہا تھا اور میں بمشکل اپنے آنسو روکے ہوئے تھا۔ میں حسب معمول ہر پندرھویں بیسویں دن ان کی دکان پر جاتا اور کنسولو کو وہ جعلی خط دکھاتا جن میں اس کے لڑکے کی تعریفیں ہوتیں۔

ڈونا کنسولو بیمار تھی اور روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کھانسی بہت شدید تھی، نقاہت برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر جب میں اسے خط پڑھ کر سناتا تو وہ کسی نہ کسی طرح اٹھ کر بیٹھ جاتی اور بے حد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے شوہر کو آواز دے کر کہتی "ڈان! سن رہے ہو؟ نیلا کے پادری ہم پر کتنے مہربان ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ہمارا لڑکا سدھر گیا ہے اور کس قدر محنت سے دل لگا کر کام کر رہا ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ یہاں آ کر ہمارا کاروبار سنبھال لے گا۔" پھر مجھ سے کہتی "فادر! میں آپ کو کچھ رقم دے جاؤں گی وہ آپ اسے بھیج دیجیے۔"

ڈان بےچارہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک کر کہتا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ تو یہ پیسے ڈالر فادر کو دے دو مگر تم اپنی صحت کا بھی خیال رکھو بیماری میں جذبات پر قابو رکھنا بے حد ضروری ہے۔ تم تو خود کافی سمجھدار ہو۔ جب کبھی ماں اپنے بیٹے کے پاس بھیجنے کے لیے مجھے روپے دیتی۔ باپ تنہائی میں آ کر مجھ سے کہتا "یہ روپے خیرات کر دیجیے تاکہ مرنے والے کو ثواب پہنچے۔"

میں بہت احتیاط سے کام لیتا رہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ڈونا کنسولو کی حالت تیزی سے خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں اگر اسے اپنے لڑکے کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تو اس کا بچنا مشکل ہوگا۔ جب کبھی میں اس کے پاس جاتا، ڈان ہمارے قریب ہی موجود رہتا۔ شاید اسے یہ خوف تھا کہ کہیں غیر ارادی طور پر میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل جائے یا شاید اس کا خیال ہو کہ جب میں اس کی بیوی کو جعلی خط سناؤں تو وہ میری مدد کرتا رہے۔

وہ دونوں ہمیشہ اس طرح پاس پاس بیٹھتے تھے جیسے کسی شاخ پر چڑیوں کا جوڑا بیٹھتا ہے۔ ڈونا کنسولو کھانستی جاتی اور اپنے شوہر کو تسلی دیتی جاتی کہ میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔

دمے کا مارا ہوا نحیف و نزار شوہر سنبھل کر بیٹھ جاتا اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگتا تاکہ بیوی کا دل بہلا رہے۔

خط کا پُر فریب سلسلہ جاری رہا۔ بیوی سن سن کر خوش ہوتی رہتی کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کر رہی ہو کہ میں خاص طور پر اس کے شوہر کو یہ یقین دلا دوں کہ ان کا لڑکا اب بالکل فرشتہ بن گیا ہے۔ چاہے حقیقت کچھ بھی ہو۔

ایک رات ڈان میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں رک رک کر بولا "فادر! میری بیوی کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ وہ چند گھڑیوں کی مہمان ہے اور آپ کو بلا رہی ہے تاکہ آپ کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کر سکے۔ آپ اس وقت اس سے لڑکے کے تازہ خط کا ذکر ضرور کیجیے اسے بتائیے کہ وہ آ رہا ہے، یہ خبر سن کر شاید کچھ دن اور زندہ رہ جائے۔"

اس نے کچھ ایسے انداز میں مجھ سے یہ بات کہی کہ میں انکار نہ کر سکا ہم ڈونا کنسولو کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا ڈان اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ کر کمرے سے باہر جانے لگا۔ جاتے ہوئے

اس نے مجھ پر کچھ ایسی نگاہ ڈالی جس میں منت، سماجت، احتیاط اور تنبیہہ سب کچھ بیک وقت موجود تھا۔

میں بیمار کنسو لو کے بستر کے قریب پہنچا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ دعا کر رہی ہو۔ میں اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور ہمت بڑھانے اور تسلی دینے کے لیے ایسے موقعوں پر کہے جانے والے وہ الفاظ دہرائے جو اہل کلیسا اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کسی کی روح دنیا سے رخصت ہو رہی ہو مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈونا کنسو لو نے مجھے احسان مندی سے بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر بوسہ دیا اور کہنے لگی: "فادر بلتار! میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔ آپ نے اتنے عرصے تک میرے شوہر سے وہ روح فرسا خبر چھپائے رکھی۔ خدا کے لیے میرے مرنے کے بعد بھی اسے اصل حقیقت مت بتائیے گا۔"

میں نے اس خیال سے کہ شاید بخار کی وجہ سے اس کے حواس درست نہیں ہیں کہا: "کیسی خبر کنسو لو! تم آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟"

اس نے میری بات پر دھیان دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی: "اگر تم ہمارے بچے کی موت کی خبر نہ چھپاتے تو خدا جانے ڈان کا کیا حال ہوتا میرے بعد بھی اس کا خیال رکھنا کہ یہ راز اس پر ظاہر نہ ہو سکے۔"

مجھے ڈان سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا اور میں نے کنسو لو کی بات کاٹ کر کہا: "اوہ، تم اپنے بیٹے کی بات کر رہی ہو۔ وہ تو اب منیلا سے روانہ ہو چکا ہے اور بہت جلد یہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ بھی تمہارے پاس آکر تم سے بغل گیر ہوگا۔"

وہ نہایت کمزور آواز میں بولی: "میری فکر مت کیجیے فادر! میں تو اب دوسری دنیا میں جاکر اس سے بغلگیر ہو جاؤں گی۔ مجھ سے کچھ مت چھپائیے، میں سب کچھ جانتی ہوں۔ اس کے قتل کے دن ہی میرے دل نے مجھے بتا دیا تھا اس کے علاوہ میں نے اس کے منیلا جاتے ہی اس بات کا انتظام کر لیا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں ہر بات کی اطلاع ملتی رہے وہاں سے میری ایک سہیلی کے پاس خطوط آتے تھے جو مجھے ہر بات سے باخبر رکھتی تھی۔ میں اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ کوئی بری خبر ڈان تک نہ پہنچ سکے۔ میں نے اس المناک واقعے کی اطلاع ملتے ہی منیلا میں فادر ایگرز کو خط لکھ کر التجا کی تھی کہ وہ آپ کے پاس میرے شوہر تک پہنچانے کے لیے اچھی خبریں بھیجتے رہیں اور اس کی موت کی اطلاع اسے نہ ہونے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ وہ جعلی خطوط لاتے تھے اور یہ بتاتے تھے کہ لڑکا بہت اچھی حالت میں ہے اور پوری پوری دیانتداری سے اپنا کام کر رہا ہے تو غریب ڈان کو دھوکا دینے میں، میں آپ کی مدد کرتی تھی۔ ڈان کی صحت اچھی نہیں رہتی اور کوئی بھی بری خبر خصوصاً میری موت کے بعد اس کے لیے مہلک ثابت ہوگی۔ اس تکلیف دہ راز کو پوشیدہ رکھنے میں مجھ پر جو کچھ بیتتی ہے اسے بس میں ہی جانتی ہوں فادر! جب سے ہماری شادی ہوئی ہے ڈان سے میں نے کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔"

پادری کے خاموش ہوتے ہی ایک شخص نے کہا: "فادر! آپ یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پینٹی خالص سونے کی تھی اور جس کیل کے ذریعہ اس پینٹی کے پھل متحد کیے گئے تھے وہ بڑے بیش قیمت جواہرات سے بنائی گئی تھی۔" (بشکریہ پاکیزہ۔ کراچی)

تین

بیوہ • یتیم اور پاگل پر رحم کرو

خدا • وطن اور مذہب پر یقین کرو

کھانا • عبادت اور ورزش کی پابندی کرو۔

بدن • مکان اور لباس کی صفائی پر دھیان دو

پھولوں سے ہنسنا، چڑیوں سے گانا، چیونٹیوں سے محنت کرنا سیکھو

ماں، باپ اور استاد کی عزت کرنا سیکھو۔

غیبت، چوری اور جھوٹ سے ہمیشہ گریز کرو

علم، محبت اور ہمدردی کو تقسیم کرو۔

پاگل، معذور اور ضعیف کا مذاق نہ اڑاؤ۔

مرسلہ: فرزانہ جعفری (سیتا پور)

ضرورت رشتہ

کسی اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار نکلا۔ لڑکی کی دیگر خوبیوں کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ لڑکے کے خاندان کے سبھی افراد جنت نصیب ہو چکے ہیں۔ جواب میں جو خطوط ملے ان میں سے ایک میں پوچھا گیا تھا کہ آپ کب تک جنت نصیب ہوں گے۔

مرسلہ: فرزانہ جعفری۔ سیتا پور

بریزیر (محرم یا انگیا) اور سرطان

شیخ حبیب اللہ
گنڈی پور کٹک - ۳

ڈاکٹر پرسنت کمار نے لکھا ہے کہ بازار میں فروخت ہونے والے بریزیر کا استعمال سرطان کا باعث ہو سکتا ہے۔ طلوع تہذیب کے ہوتے ہی عورتوں میں خود کو حسین سے حسین تر بنانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے انھوں نے مصنوعی آرائش و جمال کی شاطگی سے کام لینا شروع کر دیا تھا۔ قدیم کتب سے پتہ چلتا ہے کہ طلعت آرائی کے صرف دو ہی ذرائع تھے۔ زیورات اور پھول۔

مگر اب یہ عالم ہے کہ یہ ذرائع متنوع اور لامحدود ہیں اور وہ ہے کاس میٹک۔ مزید برآں مختلف النوع ملبوسات کی ایجاد بھی ہو چکی ہے۔ زرق برق لباس کے علاوہ ہر موسم، ہر آن اور ہر موقعہ کے لیے مخصوص پوششیں مہیا ہیں۔ شب و روز نئے نئے فیشن ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔

متمول اور اعلیٰ طبقہ کی مستورات قیمتی کاس میٹک کے علاوہ خصوصی ملبوسات کا بھی استعمال کرتی ہیں۔ اور اس طرح شوہر کی اور اپنی کمائی کا زیادہ حصہ انھیں چیزوں پر صرف کر دیتی ہیں۔ بریزیر یعنی انگیا کا مرتبہ تمام ملبوسات میں فوجداری کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اسے غریب سے لے کر امیر عورتیں تک استعمال کرتی ہیں۔

یہ کسی کو معلوم نہیں کہ انگیا یا بریزیر کس قدر مضر صحت ہے۔ موجودہ طبی تحقیق سے یہ ظاہر ہوا کہ قیمتی گدی (پیڈ) لگی ہوئی انگیا، جو بہت گراں ہوتی ہے اور جسے زیادہ تر مالدار خواتین پہنتی ہیں۔ بے حد مضر ہے اس کے مسلسل استعمال سے سرطان پستان ہو سکتا ہے۔

یہ انکشاف امریکی ڈاکٹر جان ایم۔ ڈگلس، ڈیپارٹمنٹ آف انٹرنل میڈیسن کیلی فورنیا پرمننٹ میڈیکل گروپ لاس اینجلس یو۔ ایس۔ اے نے کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنگ انگیا کا استعمال سرطان کا باعث ہے وہ کافی تحقیق و تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ یہ تحقیق سویڈن کے دو سائنسدانوں اوامی اوردی موٹرن کے مضمون کی رہین منت ہے اس مضمون میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ:۔

۱۔ اعلیٰ طبقہ کی خواتین بہ نسبت ادنیٰ طبقہ کے سرطان کا جلد شکار ہو جاتی ہیں۔

۲۔ وہ عورتیں جن کے پستان زیادہ بڑے ہوتے ہیں، بہ نسبت چھوٹے پستانوں والی خواتین کے سرطان میں جلد مبتلا ہو جاتی ہیں۔

۳۔ جو خواتین بچوں کو صرف ایک ہی پستان سے دودھ پلاتی ہیں، ان کا پستان سرطان سے محفوظ رہتا ہے مگر وہ پستان جس سے دودھ نہیں پلایا جاتا سرطان کے عارضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۴۔ ننوں کو بہ نسبت دوسری عورتوں کے پستان کا سرطان جلد لاحق ہو جاتا ہے۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر ڈاکٹر ڈگلس اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سرطان کا سبب ہے پستانوں کے غدود اور عروق میں حدت کی زیادہ پیدائش کا واقع ہو جانا۔ اور یہ گرمی پستانوں کو کس کر باندھنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا انھوں نے تجربہ شروع کر دیا۔ انھوں نے پانچ سو پچاس عورتوں کو جو معاشرہ کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتی تھیں جائزے کے لیے منتخب کیا۔ انگیا پہننے کے تیس سکنڈ بعد انھوں نے پستانوں کی حدت کی جانچ کی تو جو گرمی انگیا پہننے کے بعد پیدا ہوتی ہے وہ سرطان کے مرض سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے اس تجربہ اور مشاہدہ کو ایک مضمون کے ذریعہ ثابت کیا۔ بعد ازاں انھوں نے مزید معلومات فراہم کیں اور یہ انکشاف ہوا کہ متمول عورتیں زیادہ قیمتی اور دبیز بریزیر کا وافر استعمال کرتی ہیں۔ اس لیے غریب عورتوں کی بہ نسبت ان کے پستانوں میں زیادہ گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تنگ انڈر ویر پہننے والے مردوں کے تناسلی غدود میں سرطان ہو جاتا ہے۔ اوامی اور دی موٹرن کے نظریہ کی مزید وضاحت کے بعد معلوم ہوا کہ جو عورتیں

بیگم نے نوکرانی رکھی

عبدالمجیب سہالوی

بیگم نے ایک نوکرانی رکھی اس نے صبح آکر جھاڑو تو دے دی لیکن جب اس سے بیگم نے اگالدان دھونے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا بیگم صاحبہ یہ ہمارا کام نہیں اس کے بعد باورچی خانے میں جاکر فوراً چائے کا پانی چڑھا دیا اور ناشتے کے لیے آٹا گوندھنے لگی آٹا گوندھتے گوندھتے چائے کا پانی تیار ہو گیا اور اس نے چائے ڈال کر ایک پیالی چائے بطور بڑی کے نوش جاں کی پھر پکار کر کہا بیگم صاحبہ چائے لے آؤں۔ ہمارے یہاں بڑی کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے بیگم نے کہا ہمارے یہاں ناشتے کے بعد چائے پی جاتی ہے۔ اتنے سویرے تم نے چائے کیوں بنالی۔ اس نے کہا بیگم صاحبہ میں تو بغیر چائے پیے کوئی کام ہی نہیں کر سکتی۔

یہ سنتے ہی بیگم کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ کچھ کہہ نہ سکیں۔

میں نے چپکے سے کہا بیگم صاحبہ ابھی کیا ہے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ "عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا" اسی طرح نوکرانی رکھنا آسان ہے لیکن اس کے نخرے سہنا آسان کام نہیں۔

ناشتہ تیار ہوتے ہوتے بیگم بھی باورچی خانہ پہنچ گئیں اور انھوں نے گھر والوں کے لیے ناشتہ نکالنا شروع کیا ابھی وہ نکال بھی نہ پائی تھیں کہ نوکرانی صاحبہ اس طرح بے چین ہونے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ بیگم صاحبہ میرے ناشتے کا وقت تو نکلا جا رہا ہے۔ بیگم نے ان کی بے چینی کا اندازہ کر کے ان کے لیے بھی ناشتہ نکال دیا۔ بیگم نے کیتلی میں ان کے لیے چائے چھوڑ دی تھی۔ انھوں نے ناشتہ کرنے کے بعد جب چائے انڈیلی تو وہ ایک ہی پیالی نکلی جو ان کے لیے بالکل ناکافی تھی۔ اس لیے انھوں نے کیتلی ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر پٹخنے کے انداز میں رکھ دی۔

ناشتے کے بعد ان کی نظریں پاندان تلاش کرنے لگیں اور بیگم کو پان کھاتے دیکھ کر ان کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی اور وہ فوراً پٹاری کے پاس پہنچ گئیں۔ بیگم نے ان کو بھی پان لگا کر دیا جسے انھوں نے بڑی بے تکلفی سے منہ میں رکھ لیا اور بیگم کی طرف ہاتھ پھیلا کر مزید ڈلی کی فرمائش کی اور زبان حال سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہوئیں کہ اونٹ کے منہ میں زیرہ اتنے میں میرا کیا بھلا ہوگا۔

اسی درمیان بیگم کی نواسی آبدست کرانے کے لیے ٹھنکی بیگم نے کہا بوا ذرا لڑکی کو دھلا دو بیگم کا یہ کہنا تھا کہ وہ چڑھ گئیں اور کہا بیگم صاحبہ کہے دیتی ہوں یہ کام مجھ سے نہ ہوں گے۔ بیگم پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا اور وہ خاموشی سے اٹھیں اور نواسی کو دھلا دیا۔

جیسے ہی کھانا تیار ہوا نوکرانی صاحبہ کھانا لے کر گھر جانے کے لیے پر تولنے لگیں۔ بیگم نے تین چپاتیاں، چاول، شوربہ اور دال ان کے ناشتے دان میں نکال دی اس پر انھوں نے کہا بیگم صاحبہ ہم تو ناشتے پر دو اور کھانے پر چار چپاتیوں سے کم نہیں لیتے بیگم نے ایک چپاتی اور نکال کر رکھ دی اور وہ ہم لوگوں کے کھانا شروع کرنے سے پہلے روانہ ہو گئیں۔

میں نے کہا بیگم اگر جلدی پیچھا نہ چھڑاؤ گی تو مہینہ پورا ہوتے ہوتے تمہیں دق ہو جائے گی۔ نوکرانی گھر میں رہے گی اور تم قبرستان پہنچ جاؤ گی۔

بقیہ بریزیر صفحہ ۳ کے بعد کا سلسلہ

بریزیر کا استعمال نہیں کرتیں انھیں سرطان نہیں ہوتا۔ کیونکہ پستانوں کے غدود و عروق میں یہ گرمی پیدا نہیں ہو پاتی ہے

چنانچہ ڈاکٹر ڈگلس کہتے ہیں کہ پستانوں کو گرمی سے بچایا جائے ورنہ سرطان ناگزیر ہے۔ عورتوں میں سرطان کا مرض عام ہے۔ ایک اعداد کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ انگلینڈ میں گیارہ ہزار عورتیں سالانہ سرطان کے ذریعہ لقمۂ اجل بن جاتی ہیں۔

باوجود کثیر تحقیق و تحلیل سرطان کے حقیقی وجوہ کا کوئی انکشاف تا ایں دم نہیں ہو پایا ہے۔ بایں ہمہ اس میں کیا قباحت ہے کہ مستورات ڈاکٹر ڈگلس کے انکشاف سے فائدہ اٹھائیں علاوہ ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہوں۔

ضروری باتیں: ۲۰ تاریخ تک ماہ حریم کا انتظار فرمائیں نہ ملے تو شکایت لکھیں۔ تبدیلی پتہ کی اطلاع اس طرح دیں کی ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ ہر خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

اس دیس میں

از شاہدہ بانو بلگرامی

اس دیس سے گومتی نازک اندامی سے اٹھلاتی۔ بل کھاتی۔ ہنومان سیتو کے نیچے چھپتی۔ مسکراتی بہت دور تک چلی جاتی ہے۔ ایک طرف چھتر منزل کی برجیاں کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی ماضی کی شاندار روایتوں کو زیر لب دہرا رہی ہیں۔ دوسری طرف بہت دور فضاؤں میں تیرتے ہوئے ڈالی گنج کے پل پر انسانی کھلونے بھاگ رہے ہیں پتہ نہیں کتنی پرانی روایتوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے۔ کتنی نئی تہذیبوں کی تلاش میں۔ نئے ہنومان سیتو کی تہہ میں گومتی کی لہروں کی آغوش میں پرانے منکی برج کے نشانات ہیں اس سال جب یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹ اور پولیس میں جھڑپ ہوئی تھی، اسی منکی برج پر جا بجا اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر جمع ہو گئے تھے اور وہ چھوٹی سی کالے رنگ کی کار جو روزانہ کرامت حسین گرلز کالج کی طرف اس راستے سے ہو کر جاتی تھی اس دن اپنا راستہ بدل کر نشاط گنج کراسنگ پر جا کر رک گئی تھی ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر کار کا دروازہ کھولا۔ سفید شلوار۔ سفید قمیص اور گلابی دوپٹوں میں ملبوس چاروں لڑکیاں جلدی سے کار کے اندر بیٹھ گئیں۔

بیگم صاحبہ نے گھبرا دیا: "جلدی گاڑی لے چلو شہر میں گڑبڑ ہے"

نظام الدین ڈرائیور نے کار کا دروازہ بند کرتے ہوئے پھولی ہوئی سانس میں کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔ جلد ہی گھر کا گیٹ آ گیا۔ اماں جانماز پر بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

شام کا جھٹ پٹا ہو رہا تھا مگر اماں کو چوک جانا ضروری تھا بڑی آپا کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے مگر لکھن لکھن جی کے یہاں سے زیورات بن کر نہیں آئے تھے۔ جہانگیری۔ بیلچے۔ جھومر میں کندن کی جڑائی ہونا تھی لکھن لکھن جی کے یہاں زیورات لیے ہوئے مہینہ بھر ہو گیا تھا کار جب شاہ مینا صاحبؒ کے مزار کے قریب سے گذری تو ہم نے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا؟ [illegible] رنگ برنگے کپڑوں والا [illegible]

عورتیں اپنے بچوں کی ایک بھیڑ سمیٹے جوق در جوق مزار شریف کی طرف بڑھ رہی تھیں جگہ جگہ اینٹوں کے چولھوں پر کڑھاؤ چڑھے تھے اور گرم گرم پکوڑیاں تلی جا رہی تھیں رنگ برنگے غباروں کے جھنڈ سب کے سروں کے اوپر سے نمایاں فضا میں ڈول رہے تھے۔ مٹی کے کھلونوں کی دوکانیں دور تک چلی گئی تھیں دو پہیلے اور چلمن کے کرتے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دور مزار شریف پر سے قوالیوں کی آواز آ رہی تھی "یہ ہما ہمی دیکھ کر اماں نے کہا آج شاید نوچندی جمعرات ہے" اور کار رکوا لی۔

انھوں نے وہاں سے گرم گرم پکوڑیاں خریدیں اور ریوڑی [illegible] دونا اور کچھ پھول خرید کر بڑی عقیدت مندی سے مزار شریف کے پاس گئیں اور فاتحہ پڑھنے لگیں۔ میں نے بھی دعا مانگی "اے پیر بزرگ دعا کیجئے کہ میں پڑھ لکھ کر ایک بہت بڑی مصلح قوم اور لیڈر بنوں تاکہ رہتی دنیا تک میرا نام رہے"

دعا مانگ کر میں نے آنکھ کھولی تو ایک پل کے لئے آنکھیں جھپکنا بھول گئیں۔ ڈوبتے سورج کی بڑی سی سرخ تھالی سامنے تھی اور اس کی لالی چھلک کر چوک کے بازاروں پر پھیل گئی تھی۔ سرمئی اور سرخ رنگوں کی آمیزش میں ڈوب کر میڈیکل کالج کی برجیاں اور بڑے امام باڑے کا گنبد چلتے پھرتے ہیولوں کو اپنے آپ میں جذب کر کے ایک سرخی مائل دھندلی تصویر پیش کر رہا تھا۔ آہ یہ شام اودھ ———

اس دیس کا ایک ایک ذرہ سونے کا ہے۔

نیا دیہا آیا تو اس دیس کی پرسکون اور روح پرور فضا دیکھ کر اپنا دیس بھول گیا۔ چھٹیاں بڑھائی گئیں اور تفریح کے پروگرام بننے لگے۔ سکندر باغ میں پکنک منائی گئی۔ شہیدوں کی یادگار پر پکنک کی گئی۔ حضرت گنج میں [illegible] شاپنگ کے بعد سب نے اپنی اپنی جیبیں جھاڑ کر پیسے اکٹھے کئے اور آئس کریم

کہانی گئی۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب محرم کی نویں تاریخ کو امام باڑوں کی روشنی دیکھنا تھی۔ کنبہ بڑا تھا اور کار میں جگہ کم تھی۔ کوئی بھی گھر پر رکنے کو تیار نہ تھا۔ پورے ایک سال کے بعد یہ روشنیاں ہوتی تھیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے تو پھر زندگی میں رہ ہی کیا گیا اس لئے کسی کا بھی دل نہیں توڑا گیا اور سب اوپر تلے ٹھنس پھنس کر بیٹھ گئے ــــ بجلی کے قمقموں سے کیا کیا ڈیزائن بنائے گئے تھے ہرے پیلے اور لال قمقموں کی ٹھنڈی روشنی میں ٹہلتے ہوئے مجھے کسی پرستان کا احساس ہو رہا تھا۔ کھوئے کھوئے سے قدم بہکے جا رہے تھے کہ بڑے بھیا نے میری چوٹی گھسیٹ لی پھر کار میں بیٹھنے کا وقت آیا تو دم نکل گیا کہ چھوٹی آپا کو گود میں بٹھانے سے پھر ٹانگیں سن ہو جائیں گی۔

"پتہ نہیں وہ ڈائننگ کیوں نہیں کرتیں۔"

خدا خدا کر کے کار پھر ایک جگہ جا کر رک گئی۔

"یہ سب سے بڑا امام باڑہ ہے یہاں ہمیشہ دئے کی روشنی

ہوتی ہے۔"

"کیوں۔"

میں نے اپنی بے جان ٹانگوں کو بڑی مشکل سے زمین پر

ٹکایا۔

"کیونکہ یہ امام باڑہ قحط سالی کے زمانے میں بنا تھا لوگ فاقوں سے مر رہے تھے۔ بادشاہ وقت نے رعایا کی مدد پیسے سے کرنی چاہی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ تب انھوں نے اس امام باڑے کی تعمیر شروع کرادی تاکہ غیرت مند لوگ مزدوری سے انکار نہ کر سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ دن بھر غریب مزدور کام کرتے تھے پھر عمارت گرادی جاتی تھی اور رات میں شرفاء کام کرتے تھے اس طرح کئی سال میں عمارت تیار ہوئی تھی۔"

اس کہانی کو میں بارہا بی جان کے منھ سے سن چکی تھی

اس دیس کے لوگ کتنے خوددار اور غیور تھے۔

اچانک پھر آپا جو ننھی باجی کی چھوٹی بچی کو گود میں لئے ہوئے تھیں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں۔ گھبراہٹ اور ہنسی کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ ان کو سنبھالا گیا پیر مڑ گیا تھا اور چلنا مشکل تھا۔ واپسی کا ارادہ کر لیا گیا میں نے حسرت سے اس عمارت کو دیکھا جو دور تک پھیلی ہوئی دئے کی روشنی میں بھی اداس نظر آ رہی تھی۔ کہیں دیئے ٹمٹما کر بجھنے بھی لگے تھے ــــ کسی نے کہا نو بج گئے ہیں بہت دیر ہو گئی تھی۔

گھر پر اماں جانماز پر بیٹھی سب کی عافیت کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

سب ہی کو احساس تھا کہ دیر میں گھر واپس آنے کی خطا مشکل ہی سے معاف کی جاتی تھی ایک دن اپنی کچھ دوستوں کے یہاں چلی گئی تھی گپیں ہانکنے میں وقت کا احساس نہ رہا واپسی تک اندھیرا ہو چکا تھا ڈرتے ڈرتے گھر میں داخل ہوئی تو بالکل سناٹا تھا اماں دوپٹوں پر کامدانی اور غراروں پر کارچوبی کا کام کرانے والے مدن لال کے یہاں گئی ہوئی تھیں بنو کو بہت دور رخصت کرنے کے دن جو قریب آ رہے تھے۔ بھائیوں کا دور دور پتہ نہ تھا میں نے موقع غنیمت جانا اور قلم اور کاغذ لے کر طبع آزمائی شروع کردی اچانک ایک جھپاکا ہوا اور کاغذ نظروں کے سامنے سے غائب۔ گھبرا کر پلٹی تو بڑے بھیا کاغذ لئے بھاگے جا رہے تھے انھوں نے زور سے ایک ہانک لگائی۔

"سنو لوگو، سنو اس مکان کے مکینو سنو!۔ ایک ادیبہ نامور لکھتی ہیں "لکھنؤ سے کلکتہ جاتے ہوئے اسے کشمیر کے پہاڑ ــــ"

ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور میں کھسیا کر ان کے پیچھے بھاگی صحن اور دالان کے چار چکر لگا کر میں رو پڑی تب وہ کاغذ بمشکل پر مشکل سے دو چار جملے لکھے گئے تھے واپس دیا گیا۔ یہ وہی صحن تھا جس میں بڑے زور شور سے کرکٹ میچ ہوا کرتے تھے۔

احمد بھائی جان زبردستی سب بہنوں کو پکڑ کر لاتے اور فیلڈنگ کرواتے۔ بیچ بیچ میں چھوڑنے پر سخت ڈانٹ پڑتی اور جو مارا نہ پردہ زبردست شور اٹھتا کہ الفت بوا باورچی خانہ سے گھبرا کر باہر نکل آتیں اور پھر بڑے ماہرانہ انداز میں اپنے چار سفید بالوں کا جوڑا لپیٹتی بڑبڑاتی واپس چلی جاتیں۔

اس دیس میں میرے جیالے بھائی رہتے ہیں۔

چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں۔ بھائیوں کو واپس علی گڑھ جانا تھا۔ باورچی خانہ سے حلوے کی خوشبو میں اٹھنے لگیں بہنیں بھیا جب بجو رہیں اور ٹک پارے کاٹنے میں کھوئی

تھیں۔ اماں آنکھ پر عینک چڑھائے سوئی اور دھاگے کے ساتھ الجھی ہوئی، چھوٹے موٹے پارسل بنانے میں مشغول رہتی تھیں۔ سامان بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ بھائی جان خفا ہوتے مگر کیا کیا جائے سردیاں ہو رہی تھیں گرم کپڑے اور بستر کم نہیں کئے جا سکتے تھے۔ پڑھائی لکھائی میں دماغی محنت ہوتی ہے حلوے مانڈے ساتھ جانا ضروری تھے۔ احمد بھائی جان اپنا سارا سامان لے کر ایک دن پہلے ہی فیض آباد سے آ گئے تھے۔ پھر وہ بھی دن آ گیا جب دونوں بھائیوں کو اسٹیشن چھوڑنے کے لئے سات آٹھ آدمیوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ تیار ہونے لگا۔ اماں نے امام ضامن سنبھالے۔ سب لوگ ان دونوں کو رخصت کرنے باہر نکلے۔ سب کی نظریں بچا کر احمد بھائی جان نے ایک چھوٹی سی ڈبیا مجھلی آپا کے ہاتھوں میں دبا دی انھوں نے گھبرا کر اس کو دوپٹہ کے آنچل میں چھپا لیا اور میں نے نظریں بچا لیں۔ اماں نے دعائیں پڑھ کر دونوں کے اوپر پھونک ماری اور امام ضامن باندھتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے وہ بولیں۔

"بھیا اس کو وہاں پہونچ کر کسی غریب سید کو دے دینا"

احمد بھائی جان نے مسکرا کر معنی خیز نظروں سے شبو بھائی کو دیکھ کر شرارت سے آنکھ ماری اور بولے۔

"جی ہاں دو سید بانٹ لیں گے"۔

اماں بہت دور تک ہم سب کو جاتے دیکھتی رہیں انکی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی تھیں۔

اس دلیس کے ذرّے ذرّے میں ممتا کی بھینی خوشبو ہے۔
اس دلیس میں اب مجھے نہیں جانا ہے کیونکہ ماں اب تم وہاں نہیں ہو۔

بجلی اور ککنگ گیس

یہ دونوں بھی چیزیں ان گھر والوں کے لیے اشد ضروری ہو گئی ہیں جو اس افیون کے عادی ہو گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب بجلی نہیں ہوتی تو دنیا اندھیری محسوس ہونے لگتی ہے۔ دم گھٹنے لگتا ہے اور ایک ایک منٹ گذارنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب ککنگ گیس کا سلنڈر خالی ہو جاتا ہے تو ان خواتین کو جو اس کی عادی ہو چکی ہیں، کھانا پکانا دشوار ہو جاتا ہے اور ان کی پریشانی ناقابل بیان ہو جاتی ہے۔ جس طرح بجلی کی سہولتوں اور روشنی نے ہمیں اس کا غلام بنا دیا ہے اور اب لیمپ، لالٹین، شمع کی روشنی میں کچھ نظر ہی نہیں آتا، اسی طرح گیس ختم ہو جانے پر لکڑی، کوئلہ یا اسٹوو سب ایک زحمت نظر آتے ہیں اور خواتین گیس کے لیے بے قرار ہو جاتی ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ بجلی کا کوئی اعتبار نہیں رہتا اور گیس جو دو گھنٹے کے اندر مل جایا کرتی تھی اب مہینے ڈیڑھ مہینے میں ملتی ہے اور اتنے دنوں تک خواتین ایک مصیبت میں مبتلا رہتی ہیں۔

سپلائی کی اس کمی سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ خرچ کے مقابلہ میں بجلی اور گیس حکومت مہیا نہیں کر سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ خبر بھی حیرت میں ڈال دیتی ہیں کہ بجلی کے کنکشن شہروں کیا دیہاتوں میں بھی برابر بڑھائے جا رہے ہیں اور اسی طرح گیس کے لیے بھی اعلان ہوا ہے بہت زیادہ تعداد میں نئے کنکشن دے جانے کا انتظام ہو گیا ہے اس کا واضح مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جو گھرانے بجلی کی روشنی اور گیس کے عادی نہیں ہوتے ہیں اور اب تک لالٹین اور لکڑی کوئلے کا ہی استعمال کرتے آتے ہیں وہ بھی اس مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔

ایک زمانہ تھا کہ بجلی اور گیس کا تصور بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا اور ان کے بغیر بھی پرسکون زندگی بسر ہوتی تھی، لیکن ان ایجادوں کے بعد جو بہر شکل اور آسانیاں ہوئیں انھوں نے لوگوں کو ان کا ایسا عادی بنا دیا کہ اب ان کے بغیر وہ سخت پریشانی میں رہتے ہیں۔ قابل رشک تھے وہ گھرانے جو اب تک پرانی روش پر ہی چل رہے تھے۔ انکی زندگی بڑی حد تک پرسکون تھی، اس لیے کہ عادت ہی تکلیف کا باعث ہوا کرتی ہے اب وہ بھی عادی بنا کر مشکلات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ویسے تو حکومت کا مقصد نیک ہی ہے لیکن ہماری ناقص رائے میں پیداوار بڑھانے کے بعد ہی سپلائی میں وسعت دینا مناسب ہو گا۔۔۔

آزمایا جاتا ہے

مرسلہ تسنیم بیگم (دو نیمبا ڈی)

۱- بہادر سپاہی کے وقت
۲- دوست مصیبت کے وقت
۳- [illegible] مفلسی کے وقت
۴- دوست ضرورت کے وقت
۵- بردبار غصہ کے وقت

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی ہر ماہ صرف ایک ہی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا منگنی سے متعلق ہو۔ عبارات اور مختصر ترین الفاظ میں لکھی جاسکتی ہیں۔ لفافہ پر خبر لکھی جائے اس پر اور کچھ نہ لکھا جائے۔ خبر کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کا لکھنا ضروری ہے۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر میں کتابت کی غلطی کی ذمہ داری ادارے پر نہ ہوگی۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادتِ اطفال کی خبریں

- آمنہ خاتون زیدی (دہلی) میری بھانجی ڈاکٹر سیدہ فاطمہ و ڈاکٹر سید حیدر کے گلشنِ حیات میں ۷ر فروری [illegible] بروز سنیچر شام کو ڈفرن اسپتال لکھنؤ میں پہلی بار ایک پھول کھلا۔ پروردگارِ عالم سے دعا ہے کہ آفتاب کی طرح جگمگاتا رہے۔
- نمونہ روحی (حیدر آباد) میری پیاری آنٹی شہناز نادرہ اور میرے انکل فیروز ہاشمی صاحب کے گلشنِ حیات میں بمقام کراچی ۳۰ر جنوری [illegible] بروز جمعہ سات بجکر ۵ منٹ پر اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ایک ننھی منی کلی کھلائی۔ نام لبنیٰ فیروز رکھا گیا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ سورج کی کرنوں کی طرح سدا جگمگاتی رہے اور اپنے والدین کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔
- عصمت النساء (میسور) میری دخترِ نیک اختر مومنہ مختار اور عزیزی اصغر پاشا کے گلشنِ حیات میں بفضلِ مولیٰ پہلی بار ۲۰ر جنوری [illegible] بروز سہ شنبہ بوقت نو بجے صبح ایک ننھی کلی مسکرائی۔ تاریخی نام ثریا ترنم رکھا گیا۔ دعا ہے کہ یہ کلی اپنے بزرگوں کے زیرِ سایہ پروان چڑھے اور پھول بنکر اپنی مہک سے سارے خاندان کو معطر کر دے۔
- درخشندہ افروز (لکھنؤ) میری پیاری آپا سیدہ تبسم اور دولہا بھائی محمد فیض علی خاں صاحب (مالک رائل زردہ فیکٹری لکھنؤ) کے گلشنِ حیات کو پر بہار بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ۱۱ر جنوری [illegible] بروز اتوار بوقت ۲ بجے دن ایک ننھا منا پھول کھلایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ زیرِ سایۂ والدین پروان چڑھے اور عمرِ طویل پائے۔
- شیریں مظفر (مظفر پور) میری خالہ امی رفعت انور عباسی (بی۔ اے۔ آنرز) اور مشہور ناول نگار نجم اعزاز صاحب کے چھوٹے دیور انور حسین عباسی (لا افیسر بھوپال) کو اللہ پاک نے ۱۹ر جنوری [illegible] مطابق ۱۲ر ربیع الاول بروز جمعرات صبح ۹ بجکر تین منٹ پر ایک حسین پھول عطا فرمایا۔ نام محمد راس ابہام عباسی اور عرفیت گلوں قرار پایا۔ خدا اسے دونوں عالم میں سربلند فرمائے۔
- حسن آرا (راجہ پور سکرور، سرائے میر) میرے منجھلے بیٹے شجاع الدین اور بہو شاہین کے گلشنِ حیات میں پہلی بار ۲۳ر دسمبر [illegible] بوقت صبح ۱ بجے، اللہ تعالیٰ نے ایک دلکش پھول کھلایا اور مجھے پہلی بار دادی بننے کا شرف حاصل ہوا۔ پیار کا نام عرفی جمال رکھا گیا۔ خدا سے دعا ہے کہ سورج کی کرنوں کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہے اور صاحبِ نصیب بنے۔

پیغاماتِ نشاط

- بہن فاطمہ عمر صاحبہ (لناشیا۔ افریقہ) کے لختِ جگر محمد فضل سلمہٗ کی شادی خانہ آبادی نصرت سلمہا (دخترِ نیک اختر محمد حسین پلوکار صاحب، لناشیا) کے ساتھ یکم فروری [illegible] ایل۔ ایم۔ اے ہال میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ دونوں باہم شیر و شکر ہو کر زندگی گذاریں۔ بہن فاطمہ عمر صاحبہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نسیم انہونوی
- سمی نیرہ شاہین و نہالہ نسرین (آمبور) میرے بھیا مختار بی۔ اے (ابن بچکار محمد یعقوب صاحب مرحوم) کی شادی خانہ آبادی کوثر بیدین (بنت چچا منور حسن صاحب) کی کام کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ بھیا و بھابی جان کی زندگی ہمیشہ خوشیوں سے بھرپور رہے۔ (آمین)

- شائستہ انجم (وانمباڑی) میری پیاری باجی ذاکر النسا بی۔ اے، بی ایڈ کی شادی شمس الدین صاحب بی ایس سی کے ساتھ ۲۶ جنوری کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

- صوانی صبیحہ عاشی (آمبور) میرے بھیا نعیم الرحمٰن صواتی (فرزند دلبند، مجاہد آزادی حضرت مولانا حکیم فضل الرحمٰن صواتی علیہ الرحمہ آمبور) کا نکاح باگلزار سلطانہ (بنت سید ابیح میر ایرانی خلد آشیاں یکم فروری ۱۹۸۱ء بروز یکشنبہ بمقام بنگلور بحسن و خوبی عمل میں آیا۔ دعا ہے کہ بھابی اور بھیا ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

- ریشماں قمر سلمہا، دختر قمر الدین صاحب مرحوم۔ لکھنؤ کا عقد مسنون محمد شاہد سلمہ (پسر محمد شاکر صاحب مرحوم کے ساتھ ۱۵ فروری ۱۹۸۱ء بروز اتوار نہایت سادگی کے ساتھ مسجد ملکہ گیتی گیٹ میں ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- عالیہ نشا سلمہا بی۔ ایس۔ سی (خریدار حریم) (بنت سیف الدین صاحب۔ بنا بنور) کا عقد سید خلیل احمد سلمہ (ابن علی احمد صاحب بڑودہ) کے ساتھ ۲۲ جنوری ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے دلہا دلہن ہمیشہ ایک جان دو قالب ہو کر پر مسرت زندگی گذاریں۔
نسیم انہونوی

- عزیز الاسلام کریمی صاحب (کالوپور۔ احمد آباد) نے اپنی شادی کے سلسلہ میں ۲۵ جنوری ۱۹۸۱ء بروز اتوار باواہر ہال سپاردت دریا پور احمد آباد میں دعوت ولیمہ کی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- حاجی عبد الکریم صاحب کی پوتی رضوانہ جہاں سلمہا (بنت محمد سلیم سلمہ) کی شادی ممتاز علی (پسر مہربان علی صاحب) کے ساتھ ۱۱ فروری ۱۹۸۱ء بمقام گولہ گنج گیٹ لکھنؤ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- علی جواد زیدی صاحب کی دختر نیک اختر تبسم سلمہا کا عقد نکاح سید عمار حسین رضوی سلمہ سے ۲۹ جنوری ۱۹۸۱ء کی شب میں بمقام جامعہ اردو ہال۔ علی گڑھ۔ بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- سید رفیق احمد صاحب کے فرزند دلبند سید احمد حسن سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں ۲۵ جنوری ۱۹۸۱ء بروز شنبہ بمقام نا بینا کنید ہال۔ لکھنؤ، رفیق احمد صاحب نے اپنے اعزا و اقربا اور معززین شہر کو دعوت ولیمہ دی۔
نسیم انہونوی

- سوکار سید عبد القادر صاحب کی صاحبزادی عظیمہ یاسمین عرف سلمہ کا عقد نکاح۔ اسے وزیر احمد کے ساتھ ۵ مارچ ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بمقام سوکار بنگلو، چتور، بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- مشہور ادیب و صحافی جناب رحم علی الہاشمی کی نواسی صبا ناہید سلمہا دختر نیک اختر قاضی معز الدین احمد صاحب کی شادی عاصم ارشد سلمہ (فرزند محمد ارشد صاحب) سے ۹ مارچ ۱۹۸۱ء بروز دوشنبہ بمقام ۹۔ شبلی روڈ علی گڑھ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

انتقال پر ملال کی خبریں

- ڈاکٹر زین العابدین (عنڈیار۔ اعظم گڈھ) افسوس صد افسوس کہ ہمارے دادا صاحب ۲۰ جنوری ۱۹۸۱ء کو صبح ۱۰ بجے اس دار فانی سے راہی ملک جاودانی ہو گئے۔ قالو انا للہ وانا الیہ راجعون مرحوم کی عمر ایک سو دس سال تھی۔ مرحوم کے چالیس بیٹے بیٹیاں، پوتے اور نواسیاں ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

- سی امتیاز احمد (آمبور) نہایت ہی افسوس کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کہ میرے دادا جناب چورائی عبد الغفور صاحب بروز ہفتہ بتاریخ ۲۴ جنوری ۱۹۸۱ء کو صبح چار بجکر پینتالیس منٹ پر رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور دادی اماں، پھپھیوں اور ہم سب کو صبر جمیل دے۔ آمین
یہی خبر احمدی فرہاد صاحبہ نے بھی روانہ کی ہے۔ مرحوم ان کے خسر تھے۔

- عظیمہ ماہناز دختر قمر لطیف (آمبور) بڑے رنج و الم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے پھوپھی زاد بھائی پی انیس احمد (فرزند پی عبد السبحان صاحب۔ بنگلور) ۱۲ فروری ۱۹۸۱ء کو

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، موزوں و پاکیزہ ہو۔ اپریل کے لیے عنوان ہے "خیال" اور مئی کے لیے "نظارہ"۔

اک طرز تغافل ہے سو ہو ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے، سو ہم کہتے رہیں گے

مرسلہ نازش ہردئی (دھنباد)

کرنے گئے تھے ان سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ ہم خاک ہو گئے

مرسلہ مس زاہدہ حسین (کرنول)

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مرسلہ نورینہ حبیب (رائے بریلی)
" کشور سلطانہ (لکھنؤ)
" نوشابہ عامر (ہزاری باغ)
" سلمیٰ رامپور
" زبیدہ بتول رشیدہ بتول (رامپور)
" پیش امام تسنیم گوہر (رامپور)
" مسز ثریا ہادی (پٹنہ)
" رخسانہ پروین قریشی (بمبئی)

نفس موج محیط بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلہ کیا

مرسلہ۔ ساجدہ بیگم۔ شہناز بیگم (دبگا راپیٹ)

تماشے والو! یہ انداز تغافل کیا
ترے زمانہ وقت کے تیروں کا نشانہ ہم بھی ہیں

مرسلہ
روحی اختر (آرہ)

بنا دی جان پہ جو کچھ تری خوئے تغافل نے
وہ سن لے اور مرے غفلت مآب اول سے آخر تک

مرسلہ۔ بی۔ آر نجم الاقبال (مدراس)

گو دل شکن ہیں ان کی تغافل شعاریاں
اس پر بھی مجھ کو ان سے محبت ہے کیا کروں

مرسلہ۔ قمر لطیف نگار سلطانہ جلیل (رامپور)

خوش جو آئے تھے پشیمان گئے
اے تغافل تجھے پہچان گئے

مرسلہ۔ امۃ المقیت جعفری (میسور)۔

کچھ اپنے متعلق

حریمی بہنوں اور بھائیوں کو یہ معلوم کر کے یقیناً خوشی ہوگی کہ میں ۱۰ر جنوری سے برابر دفتر آ رہا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اس نے اس قابل کیا۔ تقریباً ڈیڑھ ماہ سے کوئی تکلیف سانس کی نہیں رہی۔ اب چند روز سے پھر کچھ تکلیف ہے، لیکن ایسی نہیں کہ دفتر نہ آ سکوں۔

گذشتہ دو سال میں کبھی ایسا سکون مجھے نہیں ملا۔ دواؤں اور انجکشن کسی نے بھی اس طرح فائدہ نہیں پہنچایا جیسا اس عرصہ میں ہوا اور اس سکون کا باعث یقیناً عجوہ کھجور، آب زمزم اور وہ دعائیں ہو سکتی ہیں جو خوالہ نے خانۂ کعبہ اور دیار رسول میں میری صحت کے لیے مانگی ہوں گی۔

مدینہ منورہ سے عین روانگی کے وقت خوالہ کو علم ہوا کہ عجوہ کھجور ہر مرض میں شفا دیتی ہے۔ روایت یہ ہے کہ اس کا تخم رسول مقبول صلعم نے بویا تھا۔ اسی کی نسل چل رہی ہے۔ وقت نہ تھا کہ خوالہ اس کی تلاش کرتیں، لیکن مکہ معظمہ میں ان کی ملاقات بہن تہذیب خانم صاحبہ سے ہوئی اور معلوم ہوا کہ وہ حج کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے جائیں گی۔ خوالہ نے ان سے فرمائش کی اور انھیں اتنا خیال رہا کہ عجوہ کھجوریں لا کر کرم اسحر کو پہنچائیں اور پھر مجھے ملیں، جنھیں میں نے اللہ کا نام لے کر کھایا اور اسی سے سکون ہوا۔ اس سلسلہ میں بہن تہذیب خانم صاحبہ (پنج گنج) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اللہ پاک انھیں جزائے خیر دے گا۔ — نسیم انہونوی

حضرت خنساؓ رضی اللہ عنہا

سید فضل الرحمٰن جعفری

اسلام ایثار و قربانی کی لافانی تاریخ کا نام ہے۔ وہ سرفروشی جانبازی کی تابناک داستان سے عبارت ہے۔ وہ صبر و استقلال کی ایک قیمتی دستاویز ہے۔ وہ بڑی دلکش اور روح پرور کہانی ہے اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام کی آغوش جس خوش نصیب ہستی نے اپنے لیے پسند کی۔ اس نے اپنی قیمت پہچان لی۔ اس نے عقل و خرد کا صحیح استعمال کیا یہی وجہ ہے کہ جب وہ آغوش اسلام میں پہونچی تو اس نے اپنی زبان حال سے یہ اعلان بھی کیا کہ

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تاریخ اسلام کا ہر ورق ایسی تصویروں کا آئینہ دار ہے جو عزیمت و حوصلے کا مرقع۔ ایثار و سرفروشی کا پیکر اور صبر و علم کا نمونہ ہیں۔ اسلام کی ان دلآویز۔ باعرہ نواز تصویروں میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں جن کی ایمانی قوت اور دینی ولولہ کا سراغ ان کی سرفروشی اور جانبازی سے ملتا ہے۔ اسلام کی تاریخ... نامور اور سرفروش خواتین سے بھری پڑی ہے۔ ان خواتین میں حضرت خنساؓ کا شمار بہت ممتاز خواتین میں ہے وہ عرب کی مشہور و معروف شاعرہ تھیں اور ابن اثیر نے لکھا ہے کہ اہل علم اس امر پر متفق ہیں کہ کسی عورت نے ان سے بہتر شعر نہیں کہے۔ حضرت خنساؓ بہت جری اور بہادر تھیں رجز یہ اور مرثیہ دونوں طرح کے اشعار کہنے پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ ان کی آغوش میں تربیت والی ہستیوں نے شجاعت اور ہمت اور سرفروشی کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے ان کی زندگی [illegible] تفسیر تھی۔ حق گوئی ان کا شعار تھا اور حق کی خاطر جان دے دینا ان کا مطمح نظر تھا۔ وہ حق کے معاملے میں کبھی کسی مصلحت کا خیال نہ کرتی تھیں۔ وہ سراپا ایثار تھیں اور جہاں حق

پر وہ بیٹا حق پر جان دے دینے میں ایثار و وفا کی تسکین اور اپنی خواہش کی تکمیل سمجھتی تھیں۔ یوں تو ان کی ان امتیازی صفات سے ان کی تاریخ زندگی کا ہر ورق منور و تابناک لیکن جنگ قادسیہ میں ان کی غازیانہ اور سرفروشانہ صفات کا بڑا تاریخ ساز مظاہرہ ہوا۔ یہ جنگ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ۱۴ھ میں لڑی گئی۔ اس میں حضرت خنساؓ نے شرکت کی اور اپنے چار جواں سال اور جواں بخت فرزندوں کو بھی شریک کیا۔ شرکت سے پہلے لڑکوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے بڑے خطیبانہ اور ساحرانہ انداز میں جہاد کی فضیلت بیان کی اسلام کی عظمت و بلندی کا ذکر کیا۔ قرآن کی تعلیمات کو کھول کھول کر بیان کیا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا نورانی نقشہ بھی پیش کیا۔ انھوں نے جو خطبہ دیا تھا۔ اس میں یہ کلمات بڑے پرسوز اور دلنشین تھے۔

میرے بیٹو! تم نے اپنی خوشی سے اسلام کی آغوش پسند کی اور تم نے اپنی ہی خوشی سے ہجرت بھی کی ہے قسم اس ذات بے ہمتا کی قسم، جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں کہ جس طرح تم ایک ماں کی پیٹ سے پیدا ہوئے ہو۔ اسی طرح تم ایک باپ کی بھی اولاد ہو۔ میں نے تمہارے باپ سے خیانت کی، نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا۔ نہ میں نے تمہاری شرافت میں کوئی دھبہ لگایا۔ تمہارے نسب کو میں نے خراب کیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ جلیل و قدیر نے مسلمانوں کے لیے کفار سے جنگ کرنے میں کتنا ثواب رکھا ہے۔ تمہیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ آخرت کی زندگی باقی ہے اور دنیا کی زندگی فانی۔ پس فانی کے مقابلے باقی کو ترجیح دو کہ یہی عقل کا تقاضا ہے۔ اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"اے ایمان والو! تکالیف پر صبر کرو کفار کے مقابلے میں، صبر کرو اور مقابلے کے لیے تیار رہو تاکہ تم پورے کامیاب ہو۔" (قرآن)

لہٰذا کل صبح جب تم اٹھو تو لڑائی میں شریک ہو لیکن بڑی ہمت کے ساتھ۔ جب تم دشمن کے مقابلے کے لیے آگے بڑھو تو تمہارے دل میں اللہ کی یاد ہو۔ زبان پہ

[illegible] اور ان کی آنکھوں میں جنت کا نقشہ ہو۔ تم اللہ تعالیٰ سے نصرت کی بھیک مانگتے ہوئے بڑھو اور جب تم دیکھو کہ گھمسان کا رن پڑ رہا ہے اور اس کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے ہیں تو اس کی لپیٹ میں تم آ جانا اور بے خطر گھس جانا اور کفار کے سردار کا مقابلہ کرنا۔ تم ایسا کرو گے تو ان شاء اللہ تم دیکھو گے اللہ تعالیٰ۔۔ تم کو جنت میں بڑے اکرام کے ساتھ رکھے گا۔"

اس عظیم ماں کی یہ ولولہ انگیز تقریر چاروں بیٹوں نے پوری توجہ سے سنی اور پھر دوسری صبح کو جب سورج کی شہابی شعاعیں زمین پر پھیلنے لگیں اور لڑائی کے شعلے بھڑکنے لگے تو خنساء کے بیٹوں کو چشم فلک نے اس حال میں دیکھا کہ وہ سراپا جہاد بنے ہوئے تھے۔ وہ عشق الہٰی میں غرق تھے۔ وہ رزمیہ اشعار پڑھ رہے تھے۔ وہ اشعار جن میں ماں کی نصیحت کی روح تھی۔ عطر تھا۔ وہ ایک ایک کر کے میدان کارزار میں لڑتے رہے ایک جام شہادت پیتا تو دوسرا اس کی جگہ لیتا۔ اس طرح چاروں نے اللہ کی راہ میں اپنی جانیں نثار کر دیں۔ یہ خبر جب حضرت خنساءؓ کو ملی تو وہ بارگاہ ایزدی میں سربسجود ہو گئیں اور عرض کیا کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ بیٹوں کی شہادت کا مجھے شرف بخشا۔ حضرت خنساءؓ کی زبان حال اس خیال کی ترجمان تھی کہ:۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

(بقیہ بزم حریم صفحہ ۲۹ کا)

کم سنی ہی میں دو سال نامعلوم بیماری میں مبتلا رہ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ماں باپ کا لاڈلا بھائی بہن کی آنکھوں کا تارا نانی کا دلارا ہر ممکن علاج کے باوجود ہم سب سے بچھڑ گیا۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت پھوپھا اور پھوپھی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● مسز کلیمہ قلندر۔ (بلاری) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے چھوٹے دیور عبدالواحد جن کی عمر پچاس سال تھی۔ فالج میں مبتلا ہو کر تین سال فراش رہے اور ۲۹ دسمبر کی دوپہر میں ڈھائی بجے اپنی بیوی اور بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر اس دارفانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نمک پارے

● ایک حلوائی دودھ میں بہت ملاوٹ کیا کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اعلیٰ حکام سے اس کی شکایت کی تو ایک ٹیم دودھ کے معائنے کے لیے آئی۔ حلوائی نے اپنے نوکر سے پھٹکری لانے کو کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پھٹکری ڈالنے سے دودھ پھٹ جاتا ہے اس طرح معائنہ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ پھٹکری ڈال کر ٹیم کا انتظار کرنے لگا جب ٹیم آگئی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دودھ نہیں پھٹا اس لیے کہ پھٹکری میں بھی ملاوٹ تھی۔

● ایک قصاب :۔ میرے گھر آج بچہ پیدا ہوا ہے سات پونڈ کا، ہڈیوں سمیت۔

● اگر ایک کتا، اسٹامپ پیپر پر یہ لکھ دے کہ "آئندہ سے میں اپنی دم سیدھی رکھوں گا" تو کیا آپ یقین کر لیں گے؟

● ایک امیدوار کو صرف تین ووٹ ملے۔ چنانچہ جب انتخاب کا نتیجہ شائع ہوا۔ اور اس کی بیوی کو یہ معلوم ہوا۔ تو اس نے امیدوار شوہر کو غصے بھرے لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی شک تھا۔ کہ تم نے ضرور ایک شادی اور کر رکھی ہے"

● وکیل (ملزم سے) میرے خیال میں اس سازش میں تمہارا بھی ہاتھ ہے۔"

ملزم۔ لیکن جب یہ واقعہ ہوا تھا تو اس وقت میرا ہاتھ جیب میں تھا۔"

● مشہور بیرسٹر علی امام سے ایک تقریب میں کسی خاتون نے پوچھا: طلاق لینے کے لیے قانونی طور پر کیا کیا شرائط لازمی ہیں؟ مسٹر علی امام نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا:

طلاق لینے کے لیے آپ کا شادی شدہ ہونا لازمی ہے۔

● استاد: خربوزے کے فوائد بیان کرو؟

شاگرد: جناب یہ ایک ایسا پھل ہے جسے کھا بھی سکتے ہیں پی بھی سکتے ہیں اور اس سے ہاتھ منہ دھو سکتے ہیں۔

کہنے کے بعد سے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ چلا گیا۔!

دمیہ بیگم کی نازمحبت کی امین تھی۔ مگر وہ اتنی حوصلہ مند بھی نہیں تھی کہ اس کی یہ بات بچوں سے کہہ دیتی۔ وہ عجیب سے خلفشار اور ذہنی الجھن میں مبتلا اپنی ماں کے ساتھ چلی گئی۔

رات ہیبت ناک اور تاریک تھی۔ کبھی کبھی گہرے سیاہ ابر میں بجلی آتشی تلوار کے زوردار تڑاکے کی طرح تڑپتی اور ایک لمحہ بعد رعد کی گرج کا ایک ہولناک دھماکہ عمارتوں کی بنیادوں تک کو ہلا کر رکھ دیتا۔ بادِ باراں کے مہیب طوفان کی آمد آمد سے قبل ہوا بند ہو چکی تھی۔ ایک سناٹا ہوا سناٹا ہر طرف طاری تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی جب ہوا کے تیز جھکڑوں کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔

چونکہ موسم ناخوشگوار تھا۔ اس لیے اقبال صاحب کے گھر کے لوگ بند ڈرائنگ روم میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر کے خائف احساسات کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔!

"بے موسم کی یہ بارش تھمے گی بھی؟" نازیہ نے جھرجھری لے کر کہا۔

"سردی بڑھ گئی ہے۔" اقبال صاحب نے کہا۔ "نیند نہیں آ رہی۔ کیا خیال ہے۔ ایک دور کافی کا اور ہو جائے۔!

رہی سہی نیند بھی اڑ جائے گی!" بیگم نے کہا۔

"آ ہی کہاں رہی ہے امی" احمد نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے جیسے چھت پر اولے گر رہے ہیں۔ کیسی عجیب آوازیں آ رہی ہیں۔! (باقی [illegible])

باتی یوں ہی سڑکیں بغل میں دابے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ برا تو نہیں مان رہے صاحب آپ؟"

"بھائی جان! تم نے تو ایسا حوصلہ شکن نقشہ کھینچا ہے کہ میرے رہے سہے حوصلے کی بھی جان نکال لی ہے۔" مکرم خوفزدہ سی ہنسی ہنسنے لگا۔ "لیکن اس میں شک نہیں کہ تم نے جو کچھ کہا ہے۔ سب صحیح کہا ہے ... تم کہاں تک پڑھے ہو؟"

"کیا پوچھتے ہو صاحب" رکشے والے نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "میٹرک کیا تھا بڑے بڑے ارمان تھے۔ سوچتا تھا کہ خوب پڑھوں گا۔ اونچا درجہ حاصل کروں گا۔ عمدہ نوکری ملے گی۔ پروفیسری تو کم سے کم کہیں نہیں گئی۔ مگر تقدیر کالی بلی کی طرح راستہ کاٹ گئی۔ انٹر میں تھا کہ ابا کا انتقال ہو گیا۔ ذاتی مکان چچا نے ہتھیا لیا۔! بیوہ ماں تین بہنوں اور دو چھوٹے بھائیوں کی پرورش کا بار سر پر پڑا۔ سارے اونچے اونچے خواب خاک بسر ہو گئے۔ کسی نے آڑے گاڑھے وقت تنگ کے تنکے یا کھوٹے پیسے سے مدد نہ کی۔ مرتا نہ کیا کرتا رکشا سنبھالنا پڑا صاحب۔!"

مکرم نے مجھ ملال افسوس ظاہر کیا۔ نصف راستہ اسی طرح ایک دوسرے کا دکھ کہتے سنتے کٹ گیا۔ پھر مکرم نے بڑی امیدوں سے پوچھا۔

"بھائی لکھنؤ تو تمہارا وطن ہے۔ تم یہاں کے بڑے آدمیوں کو بھی پہچانتے ہو گے"

"کیوں نہیں میاں صاحب!"

"مجھے ایک صاحب کی تلاش ہے" مکرم بولا۔ "چونکہ میں یہاں نیا ہوں اس لیے یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ ویسے میں ان کا نام بھی بھول رہا ہوں صرف اسی قدر معلوم ہے کہ ان کا نام احمد پر ختم ہوتا ہے۔"

[illegible]

بڑے آدمیوں تک مجھ غریب کی رسائی کہاں۔ ویسے ایک ڈاکٹر صاحب کو جانتا ہوں۔ بشیر احمد ان کا نام ہے۔

"رہتے کہاں ہیں" مکرم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"آپ جانا چاہیں تو میں کالج سے واپسی پر پہنچا دوں گا"

"تمہارا بہت بہت شکریہ بھائی"

مکرم ایک جونیئر کالج میں پہنچا۔ وہاں مددگار پرنسپل سے دیر تک باتیں ہوا کیں۔ مگر عملی نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ مایوس و ناکام وہ واپس ہوا اور یہ سوچ کر کہ شاید مجھے کالج میں کوئی جگہ مل جائے۔ وہاں پہنچا۔ ارادہ کر لیا تھا کہ بس آخر دم تک کوشش کرتا رہے گا!

چپراسی نے اسے چانسلر صاحب کے چیمبر میں پہنچا دیا۔ تین چار افراد وہاں موجود تھے۔ دفعتہً مکرم کی نظر احتشام پر پڑی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھنے لگے تھے۔ مکرم نروس ہو گیا۔

چانسلر صاحب نے اس کے سلام کا جواب دے کر کہا: "آپ تشریف رکھیے۔ میں ابھی آپ سے باتیں کرتا ہوں!"

"جی" اس نے ہاتھ ڈور کے پاس کرسی سنبھالی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد انہیں فرصت ہوئی۔ ان کے ملاقاتی رخصت ہو گئے ان کے ساتھ احتشام بھی چیمبر سے رخصت ہوئے۔ تب چانسلر صاحب مکرم کی طرف متوجہ ہوئے۔ بڑی ہمدردی اور اپنائیت سے اس کی درخواست سنی! مکرم کو اس امید تھی شاید وہ اس کے لیے کچھ کر سکیں۔ مگر اس کی مایوسی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ [illegible] کے احتشام انھوں نے [illegible] معذرت سے کہا۔ فی الحال [illegible]

مکرم ادھر آیا۔ اور احتشام کو اس طرح سکتے کی حالت میں کھڑے دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ سمجھا شاید کتے کے رونے کی آواز نے ان پر ایسا غلط ردِ عمل کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات حیرت انگیز تھی۔ احتشام کا سا اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور خوش عقیدہ سمجھدار آدمی بچوں کی طرح اس آواز سے خوفزدہ ہو جائے! بہر حال وہ سمجھتا تھا کہ بعض لوگ کسی نہ کسی چیز سے الرجک ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی سبز رنگ سے الرجک تھا۔ اگر کبھی کسی سبز چیز یا لباس پر نظر پڑتی فوراً سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگتیں!

"آئیے اندر چلیں" اس نے کہا اور ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ایک طویل سانس آہ کی صورت میں احتشام کے لبوں سے نکلی! مگر وہ کچھ نہ بولے۔ اندر سے انھیں نازیہ نے آواز دی۔

شاید بزرگوں میں سنگنی اور ناریوں کے تصفیے طے ہو چکے تھے۔ کیونکہ سب اپنے اپنے گھر جانے کے لیے تیار تھے!

دالان میں تیز روشنی ہو رہی تھی! جیسے ہی یہ دونوں اندر پہنچے۔ کئی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں!

احتشام کی والدہ نے حیرت سے انھیں دیکھا اور بولیں: "خواہ مخواہ اتنی دیر سردی میں کھڑے رہے ہو۔ چہرہ مارے سفید نیلا ہو رہا ہے۔ آج کل کی ٹھنڈ اچھی نہیں ہوتی۔ انگیٹھی دہک رہی ہے۔ ہاتھ تاپ لو"

"جی نہیں۔ اب چلیے۔ چلیں!" احتشام نے کہا۔ اور کسی سے ملے بغیر تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف ہو لیے۔

مہینے دو مہینے [illegible] اس نے ایک [illegible]

لیے اور پھر اسے پینگ کو ایسی کے لیے پلٹنے ہی تھے کہ کوئی نازک سا ہاتھ ان
کے بازو پر آ گرا۔ ایک مانوس خوشبو اڑی۔ دوسرے لمحے ایک سسکی سی سرگوشی
میں گھل مل ان کے دھڑکتے دل سے آ ٹکرائی۔

"مکرم۔ میں جانتی ہوں۔ گھر میں ہونے والے تذکرے نے تمہیں مجھ سے
دور کر دیا ہے۔ مگر۔ وہ تذکرہ۔ وہ فیصلہ سب کچھ بڑوں کا ہے۔ میں انہیں کاش
تم نے مجھے اپنے احساسات واضح کرنے کا بیدردانہ موقع نہ دیا ہوتا۔ قصور میرا
ہے تمہارا نہیں۔ اگر تم مجھے پسند ہو۔ کاش مکرم۔ مجھ میں اتنی جسارت ہوتی
کہ میں یہ سب کچھ احتشام صاحب سے کہہ سکتی۔ اللہ۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں
وہ میرے جذبات کو سمجھ سکتے۔ مگر اب ۔۔"

احتشام کے جسم میں سردی سمانے لگی!۔ وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش کھڑے
اندھیرے خلا میں گھورتے رہے۔ پھر ایک تپتی ہوئی پیشانی ان کی پیٹھ سے آ لگی۔

"تم مصروف رہتے ہو۔ مجھ سے ملتے نہیں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں اپنی
ضرورتوں کے لیے نوکری کرنی پڑی۔ سنو۔ یہ جو کچھ میں تمہیں دے رہی ہوں میرا
اپنا روپیہ ہے اسے رکھ لو۔ خدا کے واسطے انکار کر کے میرا دل نہ دکھانا میں
پھر ملوں گی تم سے۔ شاید کوئی آرہا ہے:"

مکرم کی چاپ اندھیرے زینوں پر سنائی دی۔ بیبن نے جلدی سے کوئی
چیز زبردستی احتشام کے ہاتھ میں دے کر اپنے ہاتھوں سے ان کی مٹھی بند کر دی
اور سائے کی طرح وہاں سے غائب ہو گئی!۔

احتشام کے سارے جسم سے ٹھنڈے پسینے کی دھاریاں بہہ رہی تھیں ۔!
[illegible]

کوشش کی جائے گی!۔

مکرم کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ بڑی امیدیں لے کر آیا تھا۔!
بات کا در کھول کر باہر نکلا، تب چپراسی نے کہا کہ اسے احتشام نے اپنے سیمنار
میں بلایا ہے۔

وہ ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن طوعاً و کرہاً جانا پڑا۔
چپراسی انہیں ان کے سیمنار تک پہنچا کر چلا گیا۔!

احتشام نے بے حد خندہ پیشانی اور خلوص سے اس کا استقبال کیا جیسے وہ
انہیں کوئی اعزاز بخشنے آیا ہے۔! وہ اداس، پژمردہ اور مضمحل سا کرسی پر ٹک گیا۔

"کسی خاص کام سے آپ یہاں آئے ہیں:" احتشام نے پوچھا: "کوئی حرج نہ ہو تو
بتائیے۔ شاید میں کوئی مدد کر سکوں!:"

ایک طویل سانس لے کر مکرم نے اپنی دن بھر کی تگ و دو اور ناکامی کی کہانی
سنا دی۔

"بڑے افسوس کی بات ہے:" احتشام نے کہا: "ضرورت مند زیادہ اسامیاں
کم۔ لیکن آپ کو ملازمت کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔!:"

"آپ کمال کرتے ہیں۔ وہی ایک بڑا احسان ہے مجھ پر۔ لیکن میں آخر کب
تک اسی طرح ہاتھ پاؤں توڑے ان کے سہارے پر بیٹھا رہوں گا۔ یہ تو سچ ہے
کہ وہ نہیں چاہتے میں ملازمت کر لوں لیکن یہ ناممکن ہے۔ مجھے اپنی روزی کا ذریعہ
تلاش کرنا ہی ہے:"

"بالکل ٹھیک ہے:" احتشام نے جواب دیا: "خیر آپ اس قدر پریشان نہ
ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ ایک جگہ ابھی اسکول میں خالی ہے۔ آج تو وقت

"جی ۔!"

"لائیے مجھے دے دیجئے!"

مکرم نے اپنا پورا فائیل ان کے حوالہ کر دیا۔

احتشام مسکرائے "بس یہ سمجھئے کہ آپ کو ملازمت مل چکی۔ اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ جناب۔ میں تو واقعی دن بھر کی ناکامی کے بعد بے حد دل برداشتہ ہو رہا تھا!"

احتشام نے باہر نکل کر پیون کو چائے اور لوازمات لانے کی تاکید کی اور پھر اندر آ بیٹھے۔ مکرم کے چہرے پر اب پھر تازگی نظر آنے لگی تھی۔ اپژمردگی اور اداسی کافور ہو چکی تھی۔ احتشام شاید ذہین تھے۔ اس سے باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں پیون چائے اور بہت سی لوازمات لے آیا۔!

"لیجئے!" انھوں نے مسکرا کر مکرم کو دعوت دی۔

"اس قسم کے تکلف سے مجھے بے حد غیریت کا احساس ہوتا ہے۔ احتشام صاحب کیا ضروری ہے کہ آپ میری مہمانداری کریں" مکرم نے احتجاج کیا۔ اور اٹھنے لگا۔

مگر احتشام نے ہنس کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بیٹھے بیٹھے!" وہ ہنسنے لگے "نہ یہ تکلف ہے نہ مہمانداری۔ بس، ایک رسم سی پڑگئی ہے۔ خوب یاد آیا۔ آپ کی ملازمت کی خوشی میں معمولی سا ٹریٹ منٹ۔"

وہ بڑے اخلاق سے چیزیں اٹھا کر اس کے سامنے رکھتے رہے۔ پھر دفعتہً انھوں نے کہا "اچھا ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ تو اعزاز کے گھر [illegible] ... " وہ چپ ہو گئے

[illegible]

پیش فرمائیں گے!"

"مٹھائی۔؟" وہ خوشدلی سے ہنسے۔ اور ایک طویل کش لے کر سگریٹ نیچے پھینک دیا "ہاں۔ اس کے طلب گار تو بہت سے ہیں!۔ ابھی ابا نے فرمائش کی تھی" یکایک احتشام نے ایک جھرجھری لی اور بولے "مکرم۔ سن رہے ہو منحوس کتا۔ اس آواز کے تعلق سے میرا تجربہ بہت بھیانک ہے۔ خدا رحم کرے!"

"جی ہاں۔ سنا میں نے بھی ہے کہ جب کوئی کتا ایسی آواز میں روتا ہے تو۔"

"جب بھی کتا روتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ناگہانی صدمہ میرے دل کو پہونچا ہے میں نہیں سمجھتا کہ یہ اتفاق ہے کہ واقعی کوئی نحوست کتے کے رونے میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ شاید مالی کا کتا ہے!"

"جی ہاں۔ اکثر راہ چلتے بچے مالی کی غیر موجودگی میں یہاں آ جاتے ہیں پھول نوچ لے جاتے ہیں۔ پیڑ خراب کرتے ہیں۔ اسی لیے مالی کو مجبوراً یہ چوکیدار کتا پالنا پڑا۔ مگر احتشام صاحب آپ۔ اس کی نحوست کے بہت قائل معلوم ہوتے ہیں۔!"

"ہاں بھائی۔ میں اس سے الرجک ہوں۔ گھنٹوں اعصاب کو قابو میں نہیں کر سکتا! نجانے یہ کیسی کمزوری ہے مجھ میں!"

مالی کا خوفناک چتکبرا کتا گیٹ کے پاس کھڑا بھیانک آواز میں رو رہا تھا۔ "میں اسے بھگا کے ابھی آتا ہوں۔ یہ لیجئے سگریٹ کیس اور لائٹر۔ تم نے یہ عادت بری اختیار کی" احتشام نے کہا۔

"اب چھوڑ دوں گا" یہ کہہ کر مکرم باغ کے چکر دار زینے اترتا ہوا چلا گیا ہوا سے میں تاریکی تھی [illegible] تاریکی تھی کہ [illegible]

[illegible] پیکر کو [illegible]

امیر کی کمپنی میں نہیں بیٹھوں گا۔ تم دونوں نے نیک سیرت اعزاز کو بھی ڈبو دیا
کہ وہ گروہ برآمدے میں نکل گئے! یہاں انھیں مکرم مل گیا!۔

"تم یہاں ہو۔ مکرم؟" احتشام نے تعجب سے کہا: "اندر کیوں نہیں چلے آئے؟"
"بس کچھ وہاں آپ سے:" وہ ہنس دیا: "سگریٹ پینے آ گیا تھا:" احتشام بھی
بیٹھ گئے: "اچھا تو لاؤ۔ ایک مجھے بھی دو۔!"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد احتشام نے پوچھا: "تمھیں نئی ملازمت کے سلسلے
میں کوئی دشواری تو نہیں پیش آ رہی؟"۔

"جی نہیں:" مکرم کا نوجوان کے احسان اور خلوص کے تاثر سے بوجھل ہو رہا تھا
"صبح چار گھنٹوں کی تو بات ہے۔ پڑھاتا ہوں اور چلا آتا ہوں۔ مگر میں یہ سوچ
رہا ہوں کہ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں گا!:"

"سوچ لو۔ سوچ لو:" احتشام نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا: "جب اچھے
الفاظ سمجھ میں آ جائیں تو ادا کر دینا:" انھوں نے بے انتہا شفقت سے اپنا ہاتھ
اس کے شانے پر رکھ دیا: "بھائی، جس قدر میرے امکان میں ہوتا ہے۔ میں
دوسروں کے کام آتا ہوں۔ اور شکریہ وغیرہ قبول کرنا پسند نہیں کرتا!:"
"یہ آپ کا ۔۔"

"ہاں یہ میری ذرہ نوازی، بندہ پروری ہے:" احتشام نے ہنس کر کہا:
"لیکن اب اس کا تذکرہ نہ کرو تو اچھا ہے۔"

"پھر جانے دیجیے:" مکرم نے کہا "ان کے خلوص نے اسے بے حد بے تکلف کر
دیا تھا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا: "آپ شکریہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں نا۔ لیکن
مگر بار کیا تو بہرحال قبول کرنی پڑے گی!۔ میں نے محترمہ بیگم صاحبہ کی سالگرہ
[illegible]

"آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ ببین مجھ سے منسوب ہے۔!"
"جی ہاں:" مکرم کے ہاتھ میں چائے کی پیالی کانپ گئی۔
"لیکن وہ عجیب فطرت رکھتی ہے!" احتشام مسکرائے: "کبھی میں اندازہ نہ لگا
سکا کہ اسے مجھ سے کچھ بھی لگاؤ ہے کہ وہ اپنے دل میں کوئی جذبہ ہی نہیں رکھتی۔ اسی
سلسلے میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کبھی بزرگوں میں نسبت یا رسم کا
کوئی تذکرہ ہوا؟"

ایک نشتر سا اس کے دل میں تیر گیا۔ مگر دوسرے لمحے اس نے سوچا۔ ان لوگوں
کے معاملوں سے کیا سروکار، وہ تو ببین سے دور رہنے کا ارادہ کر چکا ہے
اس نے کہا۔

"ایسی باتیں میرے سامنے کون کرتا ہے جناب عالی۔ اور محترمہ ببین کے
خیالات کا اندازہ بھی میں کیا کر سکتا ہوں۔! یہ آپ سب کی مروت اور خلوص ہے
کہ آپ نے مجھے اپنے کنبہ کا ایک فرد سمجھا ہے۔ لیکن حقیقت میں میں غیر اور اجنبی ہوں"
احتشام نے اس کی باتیں نہیں سنیں۔ ان کے چہرے پر کچھ افسردگی سی چھا
گئی۔ بڑی مدھم ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔

"سچ تو ہے۔ تمھیں کیا خبر۔ ان لوگوں میں کیا باتیں ہوا کرتی ہیں!:" کچھ
دیر کی خاموشی کے بعد مکرم نے اجازت چاہی۔
"تو پھر میں کل دس بجے آ جاؤں۔؟"
"ضرور ضرور۔!"

رکشے والا اس کا منتظر تھا۔ مکرم نے اس سے فرمائش کی۔ وہ اسے ڈاکٹر
نیر احمد کے جگہ پر لے چلے!
[illegible]

طغیانی بن کر اس کے سینے کی دستوں میں ابلی پڑتی تھیں۔ کبھی اسے یقین آجاتا کہ وہ بے شک اپنوں میں پہنچے گا اور کبھی ڈر لگتا، کیا خبر۔ ہمیشہ کی طرح تقدیر اب بھی اس کا منہ چڑا کر بھاگ نکلے!

خدا خدا کر کے رکشا ایک خوبصورت کوٹھی نما مکان پر پہنچ کر رکا۔ بکرم نے اتر کر گیٹ پر لگی نیم پلیٹ پر نام پڑھا۔ ڈاکٹر منیر احمد۔ اور نیچے ان کی ڈگریوں کی فوج آراستہ تھی۔ امید و بیم کا ایک محشر سینے میں لیے وہ اندر گیا۔ لازم سے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ دس پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر صاحب اندر سے نکلے۔ بکرم کی امیدیں جو عرش ہفتم پر پہونچی ہوئی تھیں۔ سرکے بل تحت الثریٰ میں آرہیں۔ ڈاکٹر صاحب اسی کی عمر کے ایک خوش رو خوش مزاج نوجوان تھے۔!

فرمایئے صاحب: انھوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور بیحد دلپذیر انداز میں مسکرائے!

معاف کیجئے گا جناب: بکرم نے بمشکل آواز ابھاری: اس شہر میں نو وارد ہوں۔ کسی اور صاحب کی تلاش میں آپ سے آٹکرایا:

اچھا اچھا کوئی بات نہیں: وہ بے چارے ہنسنے لگے!

بکرم نے سوچا ان سے پوچھے کیا وہ کسی ایسے آدمی کو جانتے ہیں جن کا نام انہی کی طرح احمد پر ہو۔ پھر اس نے خیال کیا کہ ڈاکٹر اسے پاگل سمجھے گا۔ پاگل پن کی تو بات ہی تھی۔ ہزاروں آدمی ایسے ناموں کے ہوں گے۔ کیا وہ ان سب کو اپنا باپ چچا کہے گا۔ ایک دفعہ در معافی مانگ کر وہ ان سے رخصت ہو گیا!!

گھر پہنچا تو اعزاز نے اس سے دن بھر کی غیر حاضری کی وجہ پوچھی۔ اس نے کچھ صاف صاف نہ بتایا! کیا فائدہ ہوتا کہ انھیں احتشام کے فیصلے معلوم ہوتا۔ کہ کہا: ... اچھا ہوا ... تو سمجھ گئیں

لمبے بازو ہے؟: دھیہ زیر لب بڑبڑائی۔

میں تو مجبور نہیں ہوں کہ ان سے زبردستی محبت کروں: بسین کا حال عجیب تھا۔ بدن میں لرزش، ہاتھ پاؤں میں رعشہ، سانس پھول رہی تھی، اور لب کانپ رہے تھے۔

مجھے ان کی کسی اچھائی سے پیار نہیں: بسین از خود رفتہ سی بول رہی تھی: وہ مجھ پر رحم کریں۔ میرا خیال دل سے نکال دیں۔ دھیہ۔ میں ان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی!:

"یہ سب آپ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہیں۔ بسین باجی: وہ خوفزدہ ہو گئی" میں۔ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں:

دھیہ۔ جو کچھ میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ تم کہہ دو۔ میں کہہ دوں۔ ہائے اللہ۔ کیا کسی کے سامنے میری زبان اٹھ سکے گی:

مجھے معلوم ہے: بسین نے یکایک برافروختہ ہو کر آپ ہی آپ کہا: کسی نے سازش کی ہے میرے خلاف۔ ورنہ۔ اس طرح۔ دفعتہ۔ اس کا تغافل اور لاپرواہی کیسی۔ ابھی کل تک تو وہ ـــ"

آپ کس کے متعلق کہہ رہی ہیں!: دھیہ متحیر تھی۔ ایسا لگا جیسا بسین کو ان الفاظ نے جگا دیا۔ یکبارگی وہ چپ ہو گئی!۔

باہر احتشام، اعزاز اور لڑکوں نے اپنے دبے ہوئے قہقہوں اور گرمجوشانہ لہجوں سے فضا بوجھل کر رکھی تھی!۔

احتشام جو اعزاز اور ایاز کے لطیفوں سے ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے تھے۔ اٹھتے ہوئے بولے۔

میں ... دیر ہونے لگا۔ ... کرتا ہوں ...

بڑے بیگ : اچانک سبین نے دانت پیس کر کہا : جب اپنے مستقبل سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں تو چھوٹوں کے احساسات کا پوسٹ مارٹم کرنے لگتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے پاس بھی دل و دماغ نام کی کوئی چیز ہے۔ اپنے لیے کچھ ہم بھی سوچتے ہیں! کچھ ہمارا بھی دل چاہتا ہے۔! یہ کیسا انصاف ہے۔

کیا آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ سبین باجی!:

ارے ہاں۔ تمہارا قتل بھی تو ہوا ہے چچا میاں کے مقتل میں: سبین بولی۔

وصیہ نے اسے حیرت سے دیکھا: تو کیا آپ۔ آپ چچا میاں اور ممی کے فیصلے پر راضی نہیں ہیں!:

چچا میاں کو اپنے صاحبزادے پر اختیار ہے: سبین بولی: مگر انہیں میری قسمت کا فیصلہ کرنے کا کیا حق ہے:

سبین باجی۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے: وصیہ ابھی تک حیران تھی: آپ کی بات تو احتشام بھائی سے بہت دنوں پہلے سے طے ہو چکی ہے۔ آپ اپنی قسمت کے فیصلے سے بے خبر نہیں ہو سکتیں۔ تب تو آپ نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اب آپ اس طرح اچانک برگشتہ ہو گئی ہیں۔ سبین باجی۔ مجھے معلوم ہے۔ احتشام بھائی آپ کو بے حد چاہتے ہیں:

یکطرفہ!:

کیا مطلب؟:

مطلب یہ کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ نیک ہیں۔ محبت کرنا جانتے ہیں تعلیم یافتہ ہیں۔ [illegible] ہیں۔ تو پھر وہ اپنے لیے بہت اچھی لڑکی کیوں نہیں تلاش کر لیتے [illegible]

جائے گا ساری تنخواہ بیگم صاحب کے آنچل میں جھاڑ دیتا ہوں۔!

بیگم فیضان اب کچھ اچھی تھیں۔ ان کے گھر جانے سے پہلے احتشام کے والدین ان سے ملنے آئے! گفتگو کے دوران میں انہوں نے احتشام کی والدہ سے پوچھا۔

آپ کا ارادہ کب تک لڑکے کی رسم کرنے کا ہے۔! میں چاہتی تھی کہ جتنی جلدی یہ کام ہو جاتا اچھا تھا۔ انسان کی زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ بہن۔ پہلے کے لوگوں نے جو زندگی کو پانی کے حباب ہوائے جھونکے اور خزاں کے پتے سے تشبیہ دی ہے وہ غلط نہیں ہے۔ کون جان سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ مرنے جینے کے عروج و زوال کے تماشے انسان کے ساتھ لگے رہتے ہیں:

تم دکھی بہت ہو اور کچھ نہیں: چچا میاں نے بات کاٹ دی: جو کچھ تم نے کہا ہے۔ وہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایک بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ماں مر جاتی ہے کیا بچہ پل نہیں جاتا۔ ایک جوان بیٹے کو موت آ جاتی ہے ضعیف ماں زندہ رہتی ہے۔ لہذا انسانی زندگی کے نشیب و فراز پر غور مت کرو۔ جس قدر سوچو گی، پریشان ہو گی موت کو برحق اور اٹل سمجھ کے جتنی زندگی خداوند کریم نے عطا کی ہے اسی میں حتی الامکان خوشیاں سمیٹنے کی کوشش کرو۔! اور ہونے دو تمہارے اطراف جو کچھ ہو رہا ہے!:

بھائی صاحب آپ نے بھی تقریر کر دی: فیضان صاحب نے ہنس کر کہا۔ آپ بھی یہ فرمایئے کہ کب تک آپ کا ارادہ احتشام کی منگنی کرنے کا ہے۔ اس کے [illegible]

وصیہ کا مسئلہ : چچا میاں نے حیرت سے کہا ۔ بھائی اس کا مسئلہ ؟ بالشت بھر کی بچی ہے ۔ میں تو اپنے خاندان میں کسی لڑکے کو اس قابل نہیں سمجھتا ! :

ارے بھائی صاحب : بیگم اقبال نے تڑپ کر شکوہ کیا : ہمیں کسی قابل ہی نہ سمجھا آپ نے ! کیا وصیہ کے لیے اعزاز مناسب نہیں ہے ۔ ماشاءاللہ وہ انیس بیس کا ہے ۔ کیا اس کی عمر شادی کے قابل نہیں ہے آپ کو یاد ہوگا کہ مرحوم سید بھائی نے اپنے سترہ برس کے لڑکے کی شادی گیارہ برس کی بھانجی سے کر دی تھی اب کیسے خوش ہیں دونوں میاں بیوی ۔ نظر لگتی ہے ان میں :

مرضی تم سب کی : چچا میاں نے کہا : وہ مجبوری کا سودا تھا ۔ گڑیا گڈے کا بیاہ محض ایک موہوم اندیشے کی بنا پر میری نظر میں ٹھیک نہیں ۔ اعزاز کو ابھی عقل کہاں ہے ۔ وصیہ کو تو میں نے دیکھا ابھی جیسے کل ہی جامن کے نیچے رسی لیے اچک رہی تھی : وہ یہ کہہ کر کچھ ہنسے ۔ !

میرا تو جی بے حد چاہتا ہے ۔ بھیا ۔ اپنی حالت جیسی کچھ ہے میں خود سمجھتی ہوں : بیگم فیضان بولیں ۔

بسم اللہ ! : چچا میاں نے کہا : مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔ یہ مہینہ تو رجب لگا ہے ۔ کر دو منگنی ۔ اس کے بعد ۔ وصیہ کی بھی اعزاز کے ساتھ ۔ اچھا ہے دونوں بہنیں اقبال میاں ہی کے گھر میں رہیں ! :

وصیہ سب کچھ سن رہی تھی ۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی ۔

مارے مسرت سے اس کے رخسار تمتما رہے تھے ۔ اس نے اپنے ننھے سے [illegible]

[illegible]

اس طرح چوری چوری گردن میں جھانکنا مجھے پسند نہیں کہہ گئے ۔ باجی سے ۔ آمنہ ۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا ؟ :

پرائیویٹ چیز دل کو تھوڑی گھور رہا ہوں :

آپ جاتے ہیں یا میں باجی کو آواز دوں ! :

آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا نازک حلق دکھائیں گی ۔ بھائی کو آواز میں دیتا ہوں اتنی دھاندلی ؟ : وہ ہانپ کر رہ گئی ۔

کہوں گا ۔ خود ہی اس طرف بلایا ۔ ورنہ میں بے چارہ تو اپنی تقدیر کا [illegible] فیصلہ سن کر آٹھ آٹھ آنسو بہانے کے لیے اپنے کمرے میں جا رہا تھا ! :

کیا ؟ :

اور کیا ۔ اعزاز نے اسے چڑایا : ابھی شادی سے پہلے آپ کی تیزی طراری کا یہ عالم ہے کہ آپ سیدھے منہ بولتیں نہیں ۔ تب تو شاید کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرائیں گی ۔ میں کہے دیتا ہوں ۔ ایک ہاتھ میں پیسے دوسرے میں تھیلی لے کر بازار سے سودا لانے ہرگز نہیں جاؤں گا ! اور اگر راتوں کو منا سوتے سوتے اٹھا تو تھپکا بنا کے بھی نہیں لاؤں گا ! :

وصیہ کا چہرہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ ہو گیا ۔ ہکلا کر بولی ۔ [illegible]

یہ کیا واہی تباہی بکنے لگے ۔ ہوش میں ہیں کہ نہیں ! :

دفعتاً ادھر کسی کی چاپ سنائی دی ۔ اعزاز جھکا اور رکوع کی حالت میں بھاگ چلا گیا ! ۔

سمیہ آ گئی ! ۔ اور چپ چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گئی ! [illegible]

[illegible]

کا اصلاحی ناول
نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ

THE HAREEM

Apr. 81

Rs. 1.30

ایک بہن نے سوال کیا ہے کہ آج کل لڑکیوں کی شادیوں میں اتنی دشواریاں کیوں پیدا ہوتی ہیں کہ اکثر لڑکیوں کے بال سفید ہونے لگتے ہیں، لیکن رشتہ نہیں ملتا آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں، حریم کے ذریعہ روشنی ڈالیں تو بہتر ہوگا۔

بہن! اپنے جو کچھ لکھا ہے وہ بلاشبہ درست ہے، میں بھی عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ لڑکیوں کی شادیوں میں اب بڑی دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔ جو والدین ان دشواریوں پر قابو پالیتے ہیں، ان کی لڑکیوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں، جو حالات پر فتح نہیں پاتے، ان کی لڑکیاں کنواری بیٹھی رہتی ہیں۔

اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس کے کئی اسباب ہیں اول تو یہ کہ تعلیم کا رواج لڑکیوں میں دن بدن زور پکڑتا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ لڑکیوں کو تعلیم نہ حاصل کرنا چاہئے، لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں بہت سی باتیں قابل غور ہیں۔ سونا خواتین کو کتنا عزیز ہوتا ہے سب ہی جانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ضرب المثل بھی مشہور ہے کہ بھاڑ میں جائے ایسا سونا جس سے پھٹیں کان۔ میں اس جگہ اس سے بحث نہ کروں گا کہ لڑکیوں کو کیسی تعلیم حاصل کرنا چاہئے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم میں اس کا لحاظ تو ہونا ہی چاہئے جو مردوں اور عورتوں کے فرائض میں ہے۔ دونوں کی ایکساں تعلیم میرے خیال سے درست نہیں۔ تعلیمی معیار فرائض کا خیال رکھکر قائم کیا جائے تو یقیناً انسب ہوگا۔ مرد اور عورت ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں، یہ بالکل درست ہے، لیکن اس کا یہ مطلب سمجھنا کہ دونوں ایک ساں ہی گردش کریں اور ان میں فرق نہ ہو یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ آج بھی نکاح کے وقت نکاح پڑھانے والے مولوی صاحبان ایسی تقریریں کرتے ہیں، جن میں شوہر اور بیوی پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا بیان ہوتا ہے اور یہ فرائض مختلف ہوتے ہیں شوہر کے فرائض یہ ہیں کہ وہ بیوی کو شریک زندگی سمجھکر اس کے نان نفقے کی ذمہ داریاں لے، اس کے ساتھ بہترین سلوک کرے۔ اسے شیشے کی طرح نازک سمجھے اور کبھی سختی سے پیش نہ آئے۔ اس کے سوا کسی دوسری عورت سے (بشرطیکہ وہ بھی اس کے نکاح میں نہ ہو) ایسی محبت نہ کرے جیسی بیوی سے کی جاتی ہے۔ اپنے دکھ درد بیوی سے بیان کرے اور اس کی تکلیفوں کو معلوم کرکے اس کا مداوا کرے۔ اسی طرح بیوی کے بھی فرائض ہیں وہ شوہر کی وفادار رہے، اپنے تئیں اس کی امانت سمجھے اس کے گھر کو اپنا گھر اور اس کی ماں کو اپنی ماں، اس کی بہنوں کو اپنی بہنیں تصور کرے۔ اس کے بچوں کی پرورش کرے اور اس کی مرضی و منشا کے خلاف کوئی عمل نہ کرے وغیرہ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرد و عورت کے فرائض مختلف ہیں، اس لئے تعلیم بھی اسی اعتبار و لحاظ سے ہو تو بہتر ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔

تعلیم کے سلسلہ میں ہر سال نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ لڑکیاں تعلیم میں لڑکوں سے آگے نکلی جا رہی ہیں۔ لڑکوں کے اخلاق دن بدن گرتے جاتے ہیں۔ اسی لئے پڑھنے لکھنے میں ان کے دل نہیں لگتے۔ اس کے برخلاف لڑکیاں دل لگا کر پڑھتی اور اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہیں۔

اونچے طبقے کے لوگ تو خیر اعلیٰ تعلیم دلاتے ہی تھے، لیکن اب متوسط اور نچلے طبقے کے والدین بھی لڑکیوں کو حتی المقدور اعلیٰ تعلیم دلاتے ہیں۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ان کی آمدنی کا ایک معتدبہ حصہ اسی مد میں صرف ہو جاتا ہے اور انھیں بیٹیوں کے جہیز کے لئے کچھ پس انداز کرنا دشوار ہو جاتا ہے، جس کی اہمیت اس دور میں کسی سے پوشیدہ نہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین اس سلسلہ میں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ لڑکی کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا

ہے تو اس کے لئے موزوں رشتہ بھی ملے۔ لڑکا کم از کم اتنا تعلیم یافتہ ضرور ہو جتنی لڑکی ہے۔ اور یہی مسئلہ سب سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ جس ترازو پر لڑکی کے والدین لڑکوں کو تولتے ہیں اس پر مشکل ہی سے لڑکے پورے اترتے ہیں تعلیم ہی نہیں دیکھی جاتی، یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ لڑکا ڈاکٹر، انجینیر یا وکیل ہو، یا پھر کسی اچھی سرکاری ملازمت میں ہو۔ ایسے لڑکے عنقا نہیں، ملتے ہیں، لیکن ان کے نرخ بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ انھیں صرف وہی والدین خرید پاتے ہیں جو خاندانی رئیس ہوں کوئی بڑا منافع بخش کاروبار کرتے ہوں یا پھر بلیک کا کام کرتے ہوں۔ ایسے والدین جو لڑکی تو ہیرا رکھتے ہیں، لیکن صاحب زر نہیں ہوتے، وہ شاید ہی کبھی کامیاب ہوتے ہوں۔ برسوں رشتہ کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور لڑکی کی عمر بڑھتی جاتی ہے اکثر لڑکیاں یہ دیکھکر کہ ان کا رشتہ طے نہیں پا رہا ہے تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھتی ہیں۔ اور اس طرح ان کا معیار اور بڑھتا جاتا ہے اکثر لڑکیاں پریشان ہوکر ملازمت کر لیتی ہیں اور اس کے بعد صورت حال کبھی کبھی اور زیادہ خراب ہوجاتی ہے۔

ایک دوسرا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں، روشن خیالی کے تحت شوہر کے سلسلہ میں کوئی آئیڈیل دلمیں بسا لیتی ہیں اور جو رشتے آتے ہیں، وہ اگر بتائے نہیں جاتے تو ٹن گن پاکر وہ خود انکار کردیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ آئیڈیل آسانی سے نہیں ملتے اس لئے آئیڈیل کی تلاش میں بھی دن گذرتے جاتے ہیں۔ ایسی لڑکیوں کے سلسلہ میں والدین کی کوششیں بھی بارآور نہیں ہو پاتیں۔ مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں لڑکیوں کی عمریں زیادہ ہوجاتی ہیں اور کبرسنی کے باعث پھر تھک ہار کر جو بھی میسر آتا ہے اسی سے شادی رچالی جاتی ہے۔

اکثر شادیاں خاندانی چھان بین کے سلسلہ میں ٹلتی رہتی ہیں۔ گو اسلام میں ذات برادری کی کوئی تخصیص نہیں لیکن کچھ گھرانے ایسے ہیں جو اس کا بہت زیادہ خیال کرتے ہیں۔ اور اس کے لئے شجرے کی کھوج کرتے ہیں اور دور تک پتہ لگاتے ہیں کہ کہیں کوئی [illegible] نہیں ہے۔ اس خیال کے لوگوں کو بھی رشتے کے سلسلے میں بڑی دشواریاں [illegible]۔ ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی ایسی [illegible] ہے کہ وہ رشتہ پسند نہیں کرتے۔ لڑکیوں کی عمریں بڑھتی

جاتی ہیں کبھی کبھی اس کے خراب نتائج نکلتے ہیں یا پھر لڑکیاں عمر رسیدہ ہوتی چلی جاتی ہیں ایک اور سبب لڑکے والوں کی مانگ ہوتی ہے، جس کا اب کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہ گیا، بڑے بڑے مطالبات ہوتے ہیں۔ جن کی تکمیل ہر لڑکی والے کے لئے آسان نہیں ہوتی۔ گرانی دن بہ دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ سونے کا بھاؤ چڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایک سیٹ بھی کوئی دینا چاہے تو ہزاروں میں ملتا ہے۔ پھر سلائی کی مشین بجلی کا پنکھا ٹرانسسٹر ٹی وی فرج اور ایسی ہی چیزیں ہر جہیز میں لوگ چاہتے ہیں۔ کپڑے، برتن اور دوسرے سامان کی لسٹ تو بہت لمبی ہوتی ہے۔ ہر آدمی یہ سب کہاں سے لائے۔ یہی نہیں، موٹر سائیکل اور موٹر کار تک کا مطالبہ ہوتا ہے۔ غرض لڑکے والوں کے نامعقول مطالبات کم ہی والدین پورے کرپاتے ہیں اس لئے لڑکیاں عرصہ تک کنواری بیٹھی رہتی ہیں اور جب جوانی ڈھلنے لگتی ہے تو پھر جیسا بھی مرد میسر آجاتا ہے اسی سے شادی ہوجاتی ہے یا پھر شادی ہوتی ہی نہیں۔ محکمہ تعلیم میں پچاس فی صدی عورتیں ایسی نظر آتی ہیں، جو شادی شدہ نہیں ہیں۔ ایک اور بھی سبب ہوتا ہے جو طلب جہیز سے بھی زیادہ شرمناک ہے۔ یہ ہے صورت شکل کا مسئلہ خدا بناتا ہے اور جس کو جیسا بنا دیتا ہے وہ ویسا ہی رہتا ہے۔ مسلمانوں میں خصوصیت سے صورت بھی دیکھی جاتی ہے اور جو لڑکیاں حسین نہیں ہوتیں انھیں عرصہ تک لڑکے والوں کی پرکھ کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ جہیز انسان قرض لے کر بھی دے سکتا ہے، زمین جائداد بیچ کر بھی مہیا کرسکتا ہے، زیور تعلیم سے آراستہ کرسکتا ہے، امور خانہ داری میں طاق بنا سکتا ہے، لیکن بیٹی کو حسین کیسے بنادے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر گھرانوں میں جہاں کئی لڑکیاں ہوتی ہیں، حسین و جمیل لڑکیوں کی شادی پہلے ہوجاتی ہے، خواہ وہ عمر میں چھوٹی ہی کیوں نہ ہوں۔ والدین کو ایسا کرنے شاق گذرتا ہے مگر وہ سوچتے ہیں کہ جس کی بھی ہو جائے۔ اسی سے سبکدوش ہو جائیں۔ یہ ڈر رہتا ہے کہ کم صورت بڑی بیٹی کے چکر میں کہیں چھوٹی بھی عمر رسیدہ ہو جائے کہ کس کے پیغامات آتا بھی بند ہو جائیں۔ [illegible] زیادہ ہوتا ہے، لیکن صورت کی کوئی خاص [illegible] ہوتی۔ [illegible] خاندانوں میں [illegible] مطالبہ [illegible] ہے، حسن کی قید۔ [illegible] سلسلہ میں وہ لوگ قابل ستائش ہیں۔ کاش ہم [illegible] سکیں۔

معذرت

حریم کی گزشتہ پچاس سالہ زندگی میں سب سے بڑے فخر کی بات یہی تھی کہ اس نے کبھی اس کی معذرت شائع نہیں کی جاتی تھی کہ پرچہ شائع نہیں ہو سکا، یا بتاخیر شائع ہوا، وقت کی پابندی کا میں ہمیشہ سے پابند رہا، تقریبات کم تر ہی وقت پر عمل میں آتی ہیں، لیکن میں ہر تقریب میں مقررہ وقت پر پہنچ جاتا تھا ـــ اور بیوقوف بنکر اپنا وقت عزیز گنواتا تھا، لیکن تلخ تجربات کے باوجود میں اپنی اس عادت کو ترک نہیں کر سکا۔ دفتر آنے کا بھی میرا ہمیشہ وقت مقرر رہا، شوکت تھانوی نے شیش محل میں میرا ذکر کرتے وقت لکھا تھا کہ جب میں سڑک سے گذرتا تھا تو لوگ اپنی گھڑیوں کا وقت ملا لیتے تھے۔ اسے تو خیر میں مبالغہ ہی کہوں گا، لیکن وقت کی پابندی کا مجھے ہر شعبہ زندگی میں خبط کی حد تک خیال رہتا تھا۔ شمیم سلمہٗ کی شادی کی تو بارات میں صرف پانچ منٹ کی تاخیر ہوئی تھی، میں نے کسی کے آنے نہ آنے کا خیال نہیں کیا تھا۔ نجم اختر سلمہا کی شادی میں ۶ بجے نکاح کا وقت تھا، پانچ منٹ پہلے مولانا ناصر میاں صاحب مرحوم و مغفور تشریف لائے تو [illegible] نکل گئے۔ میں نے وکیل و شاہدوں کو اپنی بیٹی سے اس کی منشا معلوم کرالی تھی، اس لئے ٹھیک چھ بجے نکاح شروع ہو گیا۔ آنے والے حسب عادت آئے اور یہ سنکر حیران ہوتے رہے کہ نکاح ہو گیا ـــ لیکن آج میں حریم کی بہنوں اور بھائیوں سے بیحد شرمندہ ہوں کہ کئی ماہ سے حریم وقت مقررہ پر نہیں نکل سکا حالانکہ میری جانب سے ہر ماہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ ایک روز کی بھی تاخیر نہ ہونے پائے، لیکن لکھنؤ کے مغربی حصے میں بجلی بس برائے نام ہی آتی ہے پریس چلتا ہیں ۸-۱۰ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر پاتے اور اس طرح میری ہر کوشش رائگاں جاتی ہے۔ سالنامہ ۹ کے بجائے ۱۵ کو روانہ ہو سکا تھا، فروری کا پرچہ ۱۰ کو تیار ہوا تھا اور مارچ کا ۱۴ مارچ کو پوسٹ کیا جا سکا۔ مجھے بیحد افسوس ہے کہ حریم کی خریدار بہنوں کو بلا وجہ خطوط لکھنا پڑتے ہیں اور انتظار کی زحمت گوارا کرنا پڑتی ہے۔ لیکن بجلی کی کمیابی کے باعث میں بالکل مجبور ہو جاتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حکومت شہروں کو بجلی نہیں دے پاتی تو دیہاتوں تک اسے پہنچانے کی کوشش کیوں کرتی ہے۔

اگر عزیز بہنیں [illegible] اور میں یہ وضاحت کرتا ہوں، لیکن افسوس کہ میری مجبوریوں [illegible] پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے [illegible]

میری کوشش ہے کہ اپریل کا حریم وقت مقررہ ہی پر شائع ہو۔ میں نے اپنا کام ۲۲ مارچ تک ختم کر دیا ہے لیکن پھر بھی مطمئن نہیں کہ یہ وقت پر شائع ہو سکے گا۔ گرمی کا موسم آتے ہی بجلی کی کٹوتی ہونے لگی ہے اور خیال ہے کہ دشواریاں اور بڑھیں گی۔

نسیم انہونوی

شکوؤں کا رباب

ڈاکٹر سلام سندیلوی

گلستاں کی ننھی کلیوں سے میں کرتا ہوں خطاب
چھیڑتا ہوں میں قلم سے آج شکوؤں کا رباب

سن کے میری تلخ باتیں، مجھ کو کر دینا معاف
لکھ رہا ہوں آج میں فیشن پرستی کے خلاف

تم کو رکھنا چاہئیے ہر حال میں عزت کا پاس
زیب دیتا ہی نہیں ہے تم کو یہ عریاں لباس

وضع داری ہو رہی ہے ختم [illegible]
جو نیا فیشن ہے وہ تہذیب کا قاتل ہے [illegible]

دورِ حاضر میں شرافت کی قبا ہے تار تار
گل کے دامن میں چھپا ہے نفس کی خواہش کا خار

آبروئے زندگی بے تاب ہونے اب کو ہے
کشتیِ انسانیت غرقاب ہونے اب کو ہے

رک نہیں سکتی ہے ہرگز ریت کے دامن میں دوب
جلد ہی ہو جائے گا تہذیب کا سورج غروب

ہیں تمہارے طرزِ عریانی سے کلیاں مضمحل
اللہ اللہ، ہیں جناتِ گلشن گردوں بھی خجل

یہ نیا فیشن نہ آئے گا تمہیں دنیا میں راس
اب اتارو اپنے تن سے بے حیائی کا لباس

دہر میں تہذیب شکنی کی ہے اب رفتار تیز
تم کو کرنا چاہئیے فیشن پرستی سے گریز

واپسی

عفت موہانی

"لیکن میں جاؤں گی کہاں ؟"

اسٹیشن کے پرشور ماحول میں ایک سناٹا سا اُسے نگل رہا تھا۔ جگمگاتی روشنیاں عفریت کی متعدد خونی آنکھوں کی طرح سے گھور رہی تھیں۔ لوگ اس کے پاس سے اِدھر اُدھر گزر رہے تھے۔ لیکن وہ خود سے بے خبر۔ ماحول سے بے خبر اس طرح گم صم خود فراموش بیٹھی تھی جیسے اس کی روح نکل چکی تھی وہ محض ایک ڈمی تھی۔ ہاتھ لگایا کہ ڈھیر ہوئی۔

ننھا اس کا گھٹنا تھامے کھڑا بے حد توجہ اور دلچسپی سے اس نئی دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی ریل آئے گی چھک چھک کرتی سچ مچ کی اتی بڑی ریل۔ اس کے ماتھے پر بڑی سی آنکھ روشن ہوگی۔ اور وہ ریل اسے اور ممی کو دور لے جائے گی۔ دور۔ پتہ نہیں کہاں۔ دور کا لفظ بچے کے لئے بڑا پرکشش تھا۔ وہاں نجانے کون سی طلسماتی چیزیں ہوں گی جو وہ دیکھے گا! مگر ریل کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ مسافر بینچوں یا اپنے بندھے بستروں پر بیٹھے مزے سے گپیں ہانک رہے تھے اور ٹھیلے والوں سے اول جلول چیزیں خرید کے کھا پی رہے تھے۔

سلمٰی نے پُر وحشت انداز سے دور تک پٹڑیوں پر نظریں دوڑائیں۔ اور اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ بے شک ٹرین آرہی ہوگی۔ وہ اسے کہیں لے جائے گی۔ مگر کہاں ؟۔

اس کی رگ رگ میں دھماکے شروع ہوگئے۔

شوہر کی بے رخی، بے اعتنائی اور بیوفائی کے بعد کیا جینا۔ اگر شرافت سے علیحدگی نہ ہوئی تو پھر یہی راہ مناسب ہے۔!

سلمٰی یقین کرنے پر تیار نہ تھی کہ جو کچھ اس نے دیکھا وہ حقیقت تھی۔ یا فریب تخیل تھا۔ اس کا دماغ سُن تھا اور سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں اپاہج ہورہی تھیں۔

شروع ہی سے وہ بے حد جذباتی، زود رنج اور حساس تھی۔ بات بات پر بیربل سوجھتی اور خون جلاتی۔ جب تک ماں باپ زندہ رہے تھے اسے بڑی محبت سے سمجھاتے رہتے تھے کہ اتنی بھی زود حسی ٹھیک نہیں۔ بے سوچے سمجھے قدم اٹھانے کا نتیجہ پشیمانی ہے۔ مگر وہ اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ ماں باپ مرچکے تھے۔ اب وہ ریاض کی زندگی میں آچکی تھی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ریاض بھی دنیا میں تنہا تھا۔ ایک بڑا بھائی بے شک تھا مگر اس کی گرہستی الگ تھی۔ دونوں بھائی بس کبھی کبھار ہی ملتے تھے۔ اپنی دنیا کی سلمٰی خود مختار ملکہ تھی۔ ریاض بڑا پُرمحبت، بے نفس اور بے لوث آدمی تھا۔ اسے سچ مچ سلمٰی سے محبت تھی۔! اور یہ محبت وہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ اب کبھی نہ پالنے کے لئے۔ اسے یقین ہی نہ تھا کہ واقعی ریاض نے اس سے محبت کی تھی یا وہ محض ڈھونگ ہی کر رہا تھا۔ آخر کار مرد کی فطرت پر چلا گیا تھا۔ پُرفریب دُلار بیوی سے محبت کسی اور سے۔ وہ ہستی بھی کون۔ گھر کی ملازمہ۔ ارے یہ مرد کس بُری طرح سڑی گلی چیزوں پر گرتے ہیں۔ فاقہ زدہ آدمی کی طرح۔ پیاسے کی طرح جس کے لب سوکھے ہوتے ہیں جو نالی کی کیچڑ چاٹنے لگتا ہے۔ سلمٰی کی حلق میں زہر بھرنے لگا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ریاض گھر کی ملازمہ پر بُری نظر رکھے گا۔ وہ بہت شریف، بہت مہذب، اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ بے حد سنجیدہ بھی تھا۔ کبھی وہ کوئی فضول اور مہمل بات منھ سے نہ نکالتا۔ اونچا قہقہہ نہ لگاتا۔ بیوی سے بات کرتا تب بھی اس کے لب و لہجہ سے شائستگی اور تہذیب ٹپکتی اور یہ تو خواب میں بھی نہ سوچا جاسکتا کہ وہ خود کو ابھی تک پوز کرتا رہا تھا!۔

اُف۔ سلمٰی نے چکراتا ہوا سر تھام لیا۔

ممی ؛ ننھا ٹھنایا ؛ ٹرین کب آئے گی۔

آئے گی۔ بیٹے ؛ وہ اندھے کنوئیں سے بولی۔

ممی۔ وہ کہاں جائے گی۔

اس سوال کا جواب سلمٰی کے پاس نہ تھا۔

ممی ؟ ؟۔

ہوں۔

ڈیڈی کیوں نہیں آئے ؟۔

سلمٰی اب بھی چپ رہی۔ ڈیڈی۔ ہُنہ۔ اسے کیا خبر۔

ممی ہم کہاں جا رہے ہیں ؟۔"

ننھا اس کے دماغ کے پرخچے اڑانے پر تلا ہوا تھا۔ ۹۲

اسے کیا بتاتی۔ اس کی کوئی منزل ہی نہ تھی۔ بس ریل رُکے گی۔
اسے ہضم کرے گی اور نہ جانے کہاں اُگل دے گی!۔

سلمیٰ زود رنج متلون مزاج اور زود حس تو تھی ہی۔ ساتھ ہی
غصہ ور بھی تھی۔ ریاض اس کا بے جا غصہ اور تلون ہنس کر سہہ لیتا۔
اور اس طرح اسی نے سلمیٰ کو مزید مغلوب الغضب، اور تیز بنا دیا تھا۔
جس پر اسے اب دکھ تھا۔ مگر ہمیشہ کی طرح وہ خاموش ہی رہا۔
اسے پسند نہ تھا کہ تو تو میں میں کر کے گھر کی فضا کو مکدر کر دیا جائے۔!

نغمہ پھر خاموش ہو گیا۔

"آپ کہاں جا رہی ہیں" ایک محترمہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"بمبئی" غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکل گیا۔

"اچھا اچھا۔ شاید سسرال آپ کی بمبئی میں ہے" ہم سفروں کی
کی طرح انھوں نے پھر پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"تو پھر میکے جا رہی ہیں"

"جی نہیں" اس نے جھلا کر کہا اور رخ پھیر لیا۔ مگر وہ اپنے دل
سے سوالوں کے جواب چاہنے لگی۔ سچ تو ہے وہ آخر کہاں جا رہی تھی؟۔
بمبئی۔ ایک پرشور اجنبی شہر۔ اور وہ تنہا۔ سرمایہ ساتھ نہیں۔ وہ وہاں
کیا کرے گی۔ اس نے مارے غیظ و غضب کے اپنی گریجوئیشن کی سند
بھی تو ساتھ نہیں لی تھی۔ شائد کسی چھوٹے موٹے اسکول ہی میں جگہ
مل جاتی۔ وہ اپنا اور ننھے ایاز کا پیٹ پال سکتی۔ اب واپس ریاض
کے پاس جانا تو ناممکن ہے۔ جھوٹی رکابی میں وہ کھانا نہیں کھا سکتی۔
اس کے نزدیک عصمت صرف عورت کی ہی نہیں مرد کی بھی ہوتی تھی۔
اگر ریاض اسے اپنے ملازم کے ساتھ دیکھ لیتا تو کیا وہ اسے معاف کر دیتا؟۔
ہرگز نہیں۔ تو پھر وہ ریاض کو اپنی ملازمہ کے ساتھ دیکھ کر کیوں معاف کر دیتی!
اسے اپنی دربدری کے ساتھ ریاض کی بدکرداری کا نہایت شدید
صدمہ تھا۔ اے خدا یہ کیا ہو گیا تھا۔

اسی صبح کو اس نے ریاض سے کہا تھا۔

"رات کو ہمیں شکیلہ کی سالگرہ میں جانا ہے۔ ذرا جلدی آجائیے
گا!"

"مشکل ہے۔"

"کیوں؟" سلمیٰ کا پارہ گرم ہونے لگا تھا۔

"سنا ہے کہ میری ترقی کے احکام آنے والے ہیں ایسی صورت
میں میرے لئے آفس سے جلدی آجانا، چھٹی لینا بہت خطرناک ہے۔
میں نہیں آسکتا!"

"تو پھر کیا میں اکیلی جاؤں گی؟"

"چلی جانا بھئی۔ میری طرف سے معذرت کر دینا۔ بہت مجبور ہوں۔
ورنہ ضرور چلتا"

"میں نے کوئی تحفہ بھی تو نہیں خریدا"

"خرید لاؤ۔ سارا دن پڑا ہے" پھر وہ مسکرایا "تحفے کی قیمت
چاہئیے!؟"

"ہاں" اس کے گال پھولے ہی رہے۔

"الماری میں کچھ رقم ہے۔ ضرورت کے مطابق لے لینا۔ اب مجھے جانے
دو۔ شام کو میں جلدی آسکوں گا۔ بہت کام ہے۔ تم ضرور چلی جاؤ۔
شکیلہ کو شکایت نہ ہو کہ اس کی سالگرہ میں ہم نے شرکت نہ کی۔
ریاض نے اسے سمجھایا۔ چمکارا اور پھر بڑی جلدی تیار ہو کر چلا گیا۔

سلمیٰ کا بہت بڑا وقت اپنے لباس کے سلکشن اور ننھے کی
تیاری میں لگ گیا تھا۔ تین بجے اسے فرصت مل سکی اور وہ ملازمہ
کے سپرد گھر کی نگرانی کر کے تحفہ خریدنے بازار چلی گئی۔ ملازمہ بیوہ تھی لیکن
بوڑھی نہ تھی۔ ابھی تک سلمیٰ نے اسے وفادار، محنتی اور خاموش طبع دیکھا
تھا وہ اس پر اعتماد کرتی تھی۔

سلمیٰ کو خریداری میں کچھ دیر لگی۔ لیکن اسے تو سالگرہ میں تقریباً
سات بجے شام کو جانا تھا لہٰذا وہ اطمینان سے تحفہ خرید کے گھر واپس آئی
تھی۔

گیٹ میں داخل ہوتے ہی اسے مسرت کا احساس ہوا۔ ریاض کا
اسکوٹر دور ہی سے نظر آ گیا تھا۔ وہ خوش ہو گئی۔ ریاض نے اس کی
بات مان لی۔ جلدی آ گیا تھا۔ وہ آپ ہی آپ مسکراتی اوپر پہونچی۔ مگر ریاض
نظر نہ آیا۔ نہ گھر کی ملازمہ ہی دکھائی دی۔ یکبارگی اس کا دل قلابازی
سی کھا کر رہ گیا!۔

وہ دبے پاؤں ریاض کے کمرے کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند
تھا۔ مگر کھول بند نہ تھا۔ سلمیٰ کا دل اپنی دھڑکنیں بھولنے لگا!۔
اس نے دروازے سے جھانکا اور بس۔ اس پر بجلی گری۔
ریاض اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ نیم وا تھے۔

اس کے سرہانے تکیے کے پاس بیوہ ملازمہ بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ ریاض کی پیشانی پر تھا!۔

پاس ہی میز پر چائے کی پیالی رکھی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ریاض بہت پہلے آگیا تھا۔ یہ اس کا سوچا سمجھا پروگرام تھا۔ وہ آفس سے آیا۔ چائے بنوا کر پی۔ ملازمہ کے ساتھ رنگ رلیاں کیں اور اب وہ دونوں ——

سر سے پاؤں تک سلمیٰ دہک اٹھی۔ یہ بہانہ کیا تھا ریاض نے؟۔ اس جیسے نیک مہذب اور شریف انسان نے یہ گری ہوئی حرکت کی تھی۔ نجانے کب سے ملازمہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اور وہ خادمہ وہ خود۔ حرافہ، کمینی، ذلیل۔ اس کی یہ جرأت۔ وہ اپنے مالک کے سر پر چڑھ بیٹھے ——
سلمیٰ پلٹی۔ اندھا دھند۔ غصے کے مارے ہانپتی ہوئی۔ فوراً اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ نہیں اب اسے یہاں نہیں رہنا ہے۔ نجانے اس کا شوہر اسے کب سے دھوکے دے رہا ہے۔ کب سے وہ خادمہ سے کھل کھیل رہا ہے۔ اسے کیا پتہ۔

اور تب۔ اس نے چھوٹے سے سوٹ کیس میں چند کپڑے اپنے اور بچے کے رکھے، تھوڑی سی نقدی ساتھ لی اور گھر پر گھر والے پر لعنت بھیج کر چل دی۔ سالگرہ کیسی، پارٹی کا ہے کی۔ سب پر لعنت، وہ تو اندھے کنوئیں میں گری جا رہی تھی۔ اس کی دنیا تباہ ہو چکی تھی۔ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس پر طوفان کی طرح غصہ چڑھا تھا۔ دانت پیس کر اس نے کہا تھا۔ تم پر تمہاری اوقات پر پھٹکار، دو ٹکے کی ماما کے ساتھ گلچھرے اڑاؤ۔ میں نکل رہی ہوں تمہارے درمیان سے —— اور ننھے ایاز کا ہاتھ تھام کر چلی گئی۔ اسٹیشن، پڑوس کے لڑکے کریم سے سواری منگوائی تھی۔ وہ حیرت سے اسے تکتا رہ گیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو کیا ہو گیا ہے۔ کیوں رو رہی ہیں۔ کیا ان کے کسی عزیز کے یہاں سے بری خبر آئی ہے۔ کریم کے مخلصانہ استفسار پر اسے اس نے بری طرح جھڑک دیا تھا! اور ایاز کو گود میں لے کر رکشے میں جا بیٹھی تھی!۔

اور اب ——
تھی۔ ننھا بسورنے لگا تھا
مسافروں میں بے چینی پھیلنے لگی تھی۔
سگنل گر چکا۔
ٹرین آنے ہی والی تھی!۔

وہ نیم بیہوشی کی کیفیت سے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔
"اسٹیشن پر ٹرین آ رہی ہے"۔ اس کے پاس بیٹھی محترمہ کہہ رہی تھیں۔ "آپ کا سامان کہاں ہے۔ کیا آپ کے ساتھ کوئی اور نہیں۔ صرف یہی بچہ ہے؟"
وہ بدحواسی میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلا قدم کون سا اٹھائے۔ اتنے میں بھگدڑ مچ گئی۔ ریل آ رہی تھی۔
دفعتہً ننھا ایاز چیخ اٹھا: "ڈیڈی آ گئے"۔
اور وہ گرنے سے بچتے ہوئے ادھر دیکھنے لگی۔ جدھر ایاز بھاگا بھاگا گیا تھا۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے دیکھا۔ ریاض ایاز کی کلائی تھامے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ یکایک سلمیٰ کے دل سے ایک دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں آنسو بن کر چھا گیا۔
دوسرے لمحے ریاض نے اس کی بانہہ پکڑ لی۔ سلمیٰ کو یوں لگا، جیسے ہوئے آہنی شکنجہ میں اس کی بانہہ آ گئی ہو۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ وہ ریاض سے نظریں ملا سکتی۔ اب تو وہ خود مجرم تھی!۔
"یہ کیا حرکت تھی تمہاری؟" ریاض نے پوچھا۔ اور سلمیٰ کے دماغ میں سناٹا چھا گیا۔ پلیٹ فارم کا سارا شور کہیں جا سویا۔
"آپ کو اپنی حرکت نظر نہیں آتی"۔ وہ غم و صدمہ کے مارے رو پڑی۔ "مجھ سے اچھی آپ کو نوکرانی لگی۔ بہانہ کیا کہ دیر سے گھر آئیں گے۔ مگر وقت سے پہلے آئے اور —— بند کمرے میں۔ اس چڑیل کے ساتھ"۔
"میں سمجھتا ہی تھا تمہاری بد دماغی کوئی روز بد دکھائے گی"۔ ریاض کہہ رہا تھا۔ لیکن اس کی آواز میں استقلال کے ساتھ ساتھ اضمحلال بھی تھا۔ "مجھے آفس میں بہت تیز بخار آ گیا تھا۔ میں اسی لئے تو گھر جلدی آ گیا۔ تم گھر پر نہ ملیں۔ ملازمہ سے میں نے چائے بنوا کے پی۔ وہ غریب خود گھبرا گئی تھی۔ سر کے درد سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس سے میں نے کہا تھا کہ ذرا سر پر ہاتھ رکھ دے۔ سلمیٰ۔ گناہ تم نے کیا ہے۔ کیا تم نے کبھی نہیں سنا کہ میں اس بے چاری کو ہمیشہ بہن کہہ کے مخاطب کرتا رہا ہوں"۔

"ڈیڈی۔ ڈیڈی۔ چلیئے نا۔ ریل آ گئی ہے"۔ ننھا مچل رہا تھا۔
"آپ کو بخار ہے"۔ گرد و پیش سے بے خبر سلمیٰ رو پڑی تھی۔ اور اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس کے قدموں پہ گر پڑے۔
"نہیں اس سے کیا۔ جب کریم نے خبر دی کہ تم اس سے رکشا منگوا کے اسٹیشن چلی گئی ہو تو میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ اسی ہوا کا قصور ہے جس نے

حریمی دسترخوان

شربت تیار کیجئے

گرمی کے موسم میں شربت کا استعمال ہر گھر میں زیادہ ہوجاتا ہے اگر آپ شربت روح افزا استعمال کرتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ اس سے بہتر، سکون بخش، لذیذ اور مفرح شربت شاید ہی کوئی اور ہوتا ہو، لیکن اگر آپ کی مالی حیثیت اس کے مصارف برداشت نہیں کرسکتی تو آپ گھر میں شربت تیار کریں۔

کیوڑے یا گلاب کا شربت

اشیا۔ شکر ایک کیلو۔ پانی دو بڑے گلاس یا تقریباً ایک لٹر۔ سرخ پاؤڈر دو بڑے چمچے۔ روح کیوڑہ یا گلاب (اصلی ہو ایسنس کا نہیں) ۱۰ گرام۔

ترکیب:۔ پانی میں شکر کو ملا کر جوش دیں، جب قوام قدرے گاڑھا ہوجائے تو پوڈر ڈال کر پکائیں۔ قوام اور گاڑھا ہوجائے تو اتار کر چھان لیں اور جب قدرے ٹھنڈا ہوجائے تو روح کیوڑہ اور گلاب ڈال کر بالکل ٹھنڈا کرلیں اس کے بعد بوتل میں بھر کر رکھ لیں اور وقت ضرورت برف اور پانی میں چار کے دو چمچے شربت ڈال کر پئیں۔ مٹھاس کم ہو تو شکر ملالیں۔ شربت میں ڈالنے والا پوڈر اور ایسنس جنرل مرچنٹس کی دوکانوں پر ملتا ہے۔

اسی طرح لیمو یا سنترے کا شربت ایسنس سے تیار کرسکتی ہیں۔

شربت کا قوام بنا کر کھانے والا زرد رنگ لیمو کے لئے اور نارنجی رنگ سنترے کے لئے شامل کریں تاکہ شربت خوش رنگ ہوجائے۔ رنگ کی آمیزش قوام بناتے وقت ہی کریں۔ بعد میں قدرے ٹھنڈا ہونے پر ایسنس ملائیں اور بالکل ٹھنڈا کرکے بوتل میں بھر کر رکھ لیں اور استعمال کرتی رہیں۔

خس۔ فالسے۔ زعفران۔ انار اور دوسری چیزوں کے بھی ایسنس ملتے ہیں۔ جس چیز کا شربت تیار کرنا ہو اسی کا ایسنس شامل کریں۔ بازار میں لیمن اسکواش وغیرہ ملتے ہیں وہ سب ایسنس ہی سے تیار کئے جاتے ہیں۔

خیال رکھیں کہ قوام اتنا گاڑھا نہ ہوجائے کہ جمنے لگے۔

خالص سنترے فالسے یا لیمو کا شربت

ایسنس کے شربت پینے میں تو اچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن فائدہ مند نہیں ہوتے، اس لئے اگر آپ سنترے اور لیمو کا شربت تیار کرکے رکھ لیں تو لذیذ بھی ہوگا اور مفید بھی ویسے تو لیمو، فالسے، انار اور سنترے کا شربت یوں بھی بنایا جاتا ہے کہ شکر کا شربت بنایا برف ڈالی اور لیمو، سنترے، انار یا فالسے کا عرق نچوڑ کر شامل کرلیا۔ شربت تیار ہوجاتا ہے لیکن اول تو یہ چیزیں ہر وقت گھروں میں موجود نہیں رہتیں۔ دوسرے ان سے شربت تیار کرنے میں کچھ وقت صرف ہوگا۔ اگر بنا بنایا شربت ہو تو آپ دو منٹ میں مہمان کے سامنے پیش کرسکتی ہیں۔

ترکیب:۔ ایک کلو شکر کے لئے ۲۰۰ گرام عرق لیمو، سنترہ، فالسہ یا انار ہونا چاہیئے۔

شکر میں دو بڑے گلاس پانی ڈال کر ہلکا قوام بنالیں اور اسے تھوڑا ٹھنڈا کرنے کے بعد رس شامل کرکے پھر پکائیں اور جب کافی گاڑھا ہوجائے تو اتار کر ٹھنڈا کریں اور بوتلوں میں بھر لیں۔

لیمو کے شربت میں چار کے دو چمچے کھانے والا زرد رنگ سنترے کے لئے نارنجی انار کے لئے سرخ اور فالسے کے لئے فالسئی رنگ ڈالنے سے شربت خوشرنگ ہوجاتا ہے۔

انناس کا شربت

انناس کا شربت بھی بہت لذیذ ہوتا۔ ایک کلو شکر میں ایک کلو انناس کے ٹکڑے کاٹ کر جوش دیں کچھ دیر بعد قوام کو چھان کر پھر پکائیں اور گاڑھا ہوجانے پر ٹھنڈا کرکے بھر لیں۔ حسب پسند رنگ انہیں بھی پہلے ہی ملالیں۔

مرسلہ:۔ فیروزی تسیم اشرفی۔ لکھنؤ

بقیہ واپسی صفحہ ۸ کا

دروازہ بند کر دیا تھا: ریاض نے جواب دیا۔ اور ننھے کو گود میں لے لیا۔ بیٹے تم میرے ساتھ گھر چلو۔ ممی کہیں جا رہی ہیں انہیں جانے دو۔ اور وہ پلیٹ فارم سے باہر نکل گیا۔

سلمیٰ اس کے پیچھے تھی لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے شرم ندامت کے مارے اس کے پاؤں زمین میں دھنسے جا رہے ہوں۔

کیا پکے گا

از شوکت تھانوی

انھوں نے پوچھا۔ کیا پکے گا۔ ؟

میں نے کہا۔ میرا سر

کہنے لگیں۔ اے واہ۔ میں نے تو ایک بات پوچھی اور آپ بیکار بیکار کے لئے خفا ہو گئے میرا کیا ہے میں بھی بیٹھی رہتی ہوں۔

میں نے کہا۔ تو آپ کو بھی تو ضد ہے کہ یہ سوال ہمیشہ کریں گی ضرور جانتی ہیں مجھے یہ تک تو پتہ نہیں چلتا کہ کیا کھایا ہے۔ جو شخص یہ نہ جانتا ہو وہ کیا پکے گا کا کیا جواب دے آج تک کبھی بھی آپ کو آپ کے اس سوال کا جواب ملا ہے۔

اور بھی برہمی سے بولیں۔ بات پوچھ کر آدمی گناہگار ہو جاتا ہے۔ میں بھی کچھ نہیں پکاتی۔

میں بھی آخر آدمی ہوں کب تک کوئی خوشامد کر سکتا ہے میں نے بھی اکڑ کر کہہ دیا۔ تو آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ نہ پکائیں گی تو گویا کچھ پکے ہی گا نہیں۔ میں مرد ضرور ہوں اور ہانڈی چولہے سے کبھی سروکار بھی نہیں رکھا مگر خدا کے فضل سے اتنی صلاحیت رکھتا ہوں کہ اگر چاہوں تو پکا بھی سکتا ہوں اور آپ سے بہتر نہیں تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ برا بھی نہ ہوگا۔

وہ پھولی ہوئی بیٹھی رہیں گویا اپنے تیوروں سے یہ کہہ رہی تھیں کہ جاؤ بھی تم بھلا کیا پکا پاؤ گے مگر ہم مصمم ارادہ کر چکے تھے کہ آج ان کے اس غرور بیگمانہ کو ضرور شکست دیں گے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس معاملہ میں عورتیں مردوں کو بالکل ہی محتاج سمجھنے لگیں۔ مرد کسی معاملہ میں عورت کا محتاج بنکر رہے تو اس کے لئے ڈوب مرنے کی بات ہے نہ کہ معمولی سی بات کھانا پکانا۔ لاحول ولا قوۃ۔ دنیا کے بڑے باورچی جو گذرے ہیں ان میں سے کوئی بھی عورت نہ تھی سب کے سب مرد تھے۔ مگر اس کے باوجود عورتیں خدا جانے اپنے کو کیا سمجھتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ناکہ اگر پکانے رندھنے میں مصروف ہو گئے تو آج ٹینس نہ کھیل سکیں گے۔ مگر ایک دن نہ سہی ٹینس۔ بہرحال بیگم صاحبہ کو یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں ان کے محتاج نہیں ہیں ٹینس کا بلا اٹھا کر ٹانگ دیا۔ کوٹ اتارا اور پتلون اتار کر یا مذہبی تہبند اور ایک عزم صمیم اور ایک ہمت مردانہ کے ساتھ یہ شعر گنگناتے ہوئے باورچی خانہ میں ؎

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

تھی عورت اس سے فوراً کہا کہ باورچی خانہ خالی کردو البتہ چھوٹو کو اوپر کے کام کے لئے بلا لیا۔ مگر اب پھر یہ سوال تھا کہ کیا پکے گا۔ پیڑھے پر بیٹھ کر سنجیدگی سے غور کیا کہ کیا پکایا جائے۔ پلاؤ۔ مگر اس میں طوالت تھی دوسرے اس قسم کا کھانا پکانا جس میں اپنی جہالت فوراً کھل جائے قرین مصلحت بھی نہ تھا خیال آیا معمولی گوشت روٹی دال چاول کافی ہے۔ اور فوراً ہی خیال آیا کہ کیا پکے گا کا جواب بھی یہی ہے لہذا فوراً لڑکے سے کہا کہ وہ تو ما نجھے برتن دھوئے اور خود بیٹھ گئے چولھا جلانے۔ چولھے میں برابر برابر لکڑیاں جوڑ کر اگر مٹی کا تیل چھڑک دیا جائے اور پھر دیا سلائی دکھا دی جائے تو تھوڑی ہی دیر میں آگ سلگ جاتی ہے یہ نسخہ معلوم ہی تھا لہذا چولھا جلانے میں کوئی وقت ہی نہ تھی چٹکی بجاتے چولھا جل گیا اور ادھر لڑکے نے برتن مانجھ کر رکھ دیئے۔ مگر سوال یہ تھا کہ آخر کیا پکے۔ گوشت روٹی۔ دال چاول۔ یہ فہرست تو دماغ میں موجود تھی مگر اس کی ترتیب کیا ہونا چاہیئے۔ پہلے گوشت روٹی۔ یا ان دونوں سے پہلے دال یا سب سے پہلے چاول۔ آخر غور و فکر کے بعد اسی نتیجہ پر پہونچے کہ پہلے روٹی پکانا پڑے گی۔ وجہ یہ تھی کہ گوشت تو گھر میں تھا ہی نہیں۔ چنانچہ لڑکے کو آٹھ آنے کا گوشت لینے اور خود علی الحساب آٹا لے کر کچھ تقریباً نصف کا پانی اس میں ڈال دیا مگر اب جو گوندھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں گوندھنے کی کوئی ضرورت

ہی نہیں ہے۔ یہ تو بجائے خود کچھ حریرے کی قسم کا ہو گیا ہے۔ یعنی آٹا اوپر تیر رہا ہے اور لگن میں پانی اس طرح بھرا ہوا ہے گویا بحر الکاہل کی نسل کی کوئی چیز ہے۔ سوچا کہ اس پانی کو کم کیونکر کریں۔ اگر پانی پھینکتے ہیں تو آٹا بھی جاتا ہے اور نہیں پھینکتے تو گوندھیں کیونکر۔ ارادہ کیا کہ لاؤ لگن کو چولہے پر چڑھا دیں پانی خود ہی جل جائے گا مگر پھر خیال آیا کہ کہیں اس طرح اس لگن کا آٹا ایک عظیم الشان قسم کی روٹی بنکر نہ رہ جائے۔ جتنا جتنا غور کرتے اتنا ہی دماغ الجھتا جاتا تھا آخر خیال آیا بلاٹنگ پیپر کا اور واقعی یہ خیال اتفاق ہی سے آ گیا ورنہ باورچی خانہ میں بلاٹنگ پیپر کا کیا سوال مگر مرد اور عورت میں یہی تو فرق ہے کہ مرد کو سوجھتی خوب ہے اور پانی کا توازن اب صرف بلاٹنگ پیپر کی مدد سے قائم کیا جا سکتا تھا۔ مگر حساب جو لگایا تو اقتصادی نقطۂ نظر سے جتنا بلاٹنگ صرف ہو رہا تھا اس قیمت کا نہ آٹا تھا نہ پانی لہٰذا اس لاجواب ترکیب کو مالی اعتبار سے ناقابلِ قبول سمجھکر ہاتھوں پر سر رکھکر پھر غور کرنے لگے۔ یقین جانئے کہ اتنی دیر تک غور کیا ہے کہ دماغ میں دنیا کی سیاسیات سے لے کر مسلم لیگ اور کانگریس تک کے نکات اور رموز نے جگہ پائی اور آخر بین الاقوامی صورت حال ذہن پر طاری ہو کر رہ گئی مگر یہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہو سکا۔ بلکہ وہ تو شاید دماغ سے نکل ہی جاتا مگر خدا بھلا کرے چھوٹو کا کہ وہ گوشت لیکر واپس آ گیا اور اس نے آتے ہی لگن کو دیکھ کر پوچھا یہ کیا ہوا۔ اور ہم یکایک گویا چونک سے پڑے اور چھوٹو کو تمام قصہ بتایا۔ مگر داد دیجئے اس گنوار اور جاہل چھٹانک بھر کے لونڈے کو کہ اس نے بغیر کچھ سوچے ہوئے فوراً کہا کہ اس میں آٹا اور ملا دیجئے نا۔ یقین جانئے کہ چھوٹو کا منہ دیکھکر رہ گئے اور آخر اسی کی بتائی ترکیب سے ہماری مشکل آسان ہوئی تھوڑی ہی دیر میں آٹا گوندھ کر ہم نے چولہے پر توا چڑھا دیا۔ حالانکہ اتنی دیر ہو چکی تھی کہ چولہا سلگنے کے تمام مدارج طے کر کے بجھنے ہی والا تھا۔ مگر ہم نے بر وقت کچھ اور لکڑیاں لگا کر چولہے کو پھر سلگا دیا۔ اس موقع پر ذرا ہانڈی چولہے سے ہٹ کر ہم ایک بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کو طالب علمی کے زمانہ سے لے کر اب تک ڈرائنگ کا بڑا شوق ہے ایک سے ایک تصویر بنا کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اور طالب علمی کے زمانہ میں تو ڈرائنگ میں ہم کو ہمیشہ سو فی صدی یا اس کے لگ بھگ نمبر ملتے رہے ہیں اب بھی۔ قلم کی ایک جنبش سے جو گلدستہ ہم بنا دیں۔ اس کو بس دیکھا ہی کیجئے ایک سے ایک نقشہ۔ ایک سے ایک تصویر

مختصر یہ کہ عرض تو کیا کہ یہ اپنا خاص شوق ہے۔ اور اس میں ہاتھ بھی ذرا صاف ہو گیا۔ مگر صاحب یہ بات تجربہ کے بعد اب سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر یہ عورتیں بغیر پرکار اور بغیر کسی پیمائش کے یہ گول روٹیاں کیونکر پکاتی ہیں اور آٹا ان کے قابو میں کس طرح آ جاتا ہے۔ ہم نے بڑی کوشش کی روٹی بنائی اور بنا کر بگاڑی۔ پھر بنائی۔ مگر کبھی تو وہ لنکا کا نقشہ بنکر رہ گئی کبھی معلوم یہ ہوا کہ آٹے سے خرگوش کی تصویر بنائی ہے۔ کبھی بہت کوشش کی اور اپنا پورا آرٹ صرف کیا تو روٹی توے تک پہنچتے پہنچتے آدھی تو ہاتھ میں رہ گئی اور آدھی ٹپک کر چولہے میں جا رہی۔ آخر بمشکل تمام ایک روٹی گول بنی اور ہم نے پوری احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ ہاتھ اٹھا کر اس کو توے پر ڈالا ہے۔ تو وہ عین مین بالکل شیرمال بنی ہوئی توے پر پڑی تھی بلکہ شیرمال بھی اگلے زمانہ کی معلوم ہوتی تھی اگلے زمانہ سے ہماری مراد ہے اشوک بلکہ بدھ اعظم کے زمانہ سے مگر جو کچھ بھی تھی اب تو اس کو پکانا ہی تھا۔ مگر اب مرحلہ یہ تھا کہ اس کو الٹا کیسے جائے۔ یاد رکھئے کہ چولہے پر رکھا ہوا تھا توا اور توے پر پڑی ہوئی تھی وہ نام خدا روٹی اب اگر اس کو فوراً نہیں الٹتے تھے تو وہ جلی جاتی تھی اور اگر الٹتے تھے تو انگلیوں سے صبر کرنا پڑتا تھا۔ غور کیا کہ آخر یہ عورتیں اس قسم کے نازک موقعوں پر کیا کرتی ہیں۔ مگر جلدی میں کچھ یاد نہ آیا اور آخر ہمت کر کے ہاتھ ہی سے روٹی کو الٹنا پڑا مگر ہاتھ توے تک گیا ہی تھا کہ انگلیاں چپک کر رہ گئیں اور ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ ہم اچھلے ہیں تو آٹے کی لگن مع سینی کے ہمارے ہم رکاب تھی اور ادھر بیگم مع ملازمہ کے قہقہوں پر قہقہے لگاتی ہوئی باورچی خانہ میں موجود۔

بیچ کی انگلی میں ایک آبلہ پڑ چکا تھا۔ اور باقی دو انگلیاں سرخ تھیں۔ سوزش بحیثیت مجموعی تمام ہاتھ میں تھی۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ قہقہے تکلیف دے رہے تھے۔ آخر بیگم نے ہنسی کو بمشکل ضبط کر کے ہماری مرہم پٹی کی۔ ناریل کا تیل لگا کر انگلیوں پر دھجیاں باندھی گئیں اور ہم کو صحن میں بٹھا کر باقاعدہ عیادت کرنے کے بعد بیگم نے گھبرا کر پوچھا۔

کیا پکے گا۔

ہم نے کہا۔ ہمارا سر

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں اور جواب کے لئے جوابی کارڈ یا لفافہ روانہ کریں۔

افسانہ

مریم کی بلی

محمودہ مہربانو ادیب ماہر

سرفرید اپنی بیگم کے ہمراہ پنشن کے بعد دہلی میں سکونت پذیر ہوئے ان کا بنگلہ شہر سے دور ایک پُرفضا مقام پر تھا بنگلہ کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا جس کی رکھوالی ایک شخص کریم نامی کرتا تھا جو بہت ضعیف تھا گیٹ کے پاس مثلث نما ایک جگہ تھی جہاں بہت سے جنگلی درخت تھے گیٹ سے داخل ہوتے ہی اس کریہہ المنظر خطہ پر نظر پڑتی۔

ایک دن علی الصباح سرفرید اور ان کی بیگم باہر برآمدے میں اخبار پڑھ رہے تھے کریم باغ کے گملوں کی گھانس نکال رہا تھا کہ فرید نے کریم کو بلوایا اور کہا۔

"آخر تم گیٹ کے پاس کے کونہ کو کیوں نہیں صاف کرتے۔ دیکھو تو اسپر کتنی گھاس ہے"

کریم نے کہا سر مجھے معاف کیجئے۔ میں کیا کوئی دوسرا مالی اس کو صاف کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا"

سرفرید کو بہت غصہ آیا۔ انھوں نے تاکیدی حکم دیا کہ تمہیں صاف کرنا ہوگا۔

کریم نے متانت سے کہا۔ سر اس جگہ ایک قبر ہے! اور اس جگہ کیا دہلی میں تو قریب قریب ہر مکان میں آپ کو ایک نہ ایک قبر ضرور ملے گی۔ قبر متبرک چیز ہوتی ہے یہاں کئی سال سے ہے صاحب اسے نہ کھدوائیے"

سرفرید نے ترش لہجہ میں کہا۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ قبر کھودو۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ اس قبر کے اوپر کے جنگلی پودے اور گھانس نکال ڈالو۔ صاف ستھری قبر کیا بری لگے گی۔ علاوہ ازیں جس کی یہ قبر ہے اس کی روح بھی خوش ہوگی"

لیکن کریم نے پھر خوف زدہ ہوکر کہا۔ سرکار اس قبر پر ایک بھوت رہتا ہے اسی لئے لوگ قبر کے پاس نہیں جاتے جو کوئی اس قبر کو چھیڑتا ہے قبر کا بھوت اسے تکلیف دیتا ہے"

سرفرید جان گئے کہ لوگوں کی من گھڑت کہانی پر کریم کو یقین آگیا ہے انھوں نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ واقعی کریم کا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ سرفرید نے مالی سے کہا۔

"ذرو مت مجھے اور بیگم کو وہ کہانی تو سناؤ جو اس قبر کے متعلق مشہور ہے"

کریم نے کہا۔ سر وہی سناتا ہوں جو لوگوں سے میں نے سنا۔ عرصہ گزرا جب اس جگہ جہاں کہ اب آپ کا بنگلہ ہے ایک پرانا بنگلہ تھا جس میں ہارون نامی ایک دولت مند آدمی رہتا تھا اس کی بیوی کا نام مریم تھا۔ مریم اپنے حسن و جمال میں ثانی نہ رکھتی تھی اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ہارون سے پہلے وہ چار شخصوں سے شادی کرچکی ہے اور وہ چاروں شوہر شادی کے تھوڑے عرصہ بعد پراسرار طریقہ سے غائب ہوتے گئے۔ ہارون کو بھی اپنی بیوی پر شک تھا وہ بہت محتاط رہا کرتا تھا۔ شک کا جو نتیجہ ہونا تھا ہوا۔ دونوں میاں بیوی میں نا اتفاقی پیدا ہوگئی۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی ہوتی تھی۔ ایک دن مریم کہیں باہر گئی ہوئی تھی ہارون نے موقعہ کو غنیمت جان کر تمام گھر کا جائزہ لیا۔ مریم کے خاص کمرے میں جو مقفل رہا کرتا تھا اس نے چار لاشیں دیکھیں جو چار صندوقوں میں حنوط شدہ بند تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہارون کانپ گیا بیوی کے متعلق جو کچھ اس نے سنا تھا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ چار لاشیں مریم کے پہلے چار شوہروں کی تھیں جن کا یکے بعد دیگرے خاتمہ ہوا تھا اور مریم ان کی وفات کے بعد ان کی دولت کی مالک بن بیٹھی تھی یک لخت اسے یہ خیال گذرا کہ کہیں مجھے بھی اسی طرح نہ مار دیا جائے طرح طرح کے خیالات دل میں پیدا ہوئے۔ پولیس میں رپورٹ کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر بھی محض اپنی بیوی کی بدنامی کے خیال سے یہ ارادہ ترک کردیا۔ ہارون اب بالکل بدل گیا تھا۔ بیوی سے ایسا ڈرتا تھا جیسے ملک الموت سے۔ ایک دن ہمت کرکے اس نے مریم سے پوچھ ہی لیا اور اس کو اپنے گزشتہ شوہروں کا قاتل کہدیا۔ یہ لفظ سنتے ہی وہ چراغ پا ہوگئی اور صاف انکار کرنے لگی۔ اس سے دونوں ایک دوسرے کے خطرناک دشمن ہوگئے۔ مریم کو رات دن یہی فکر تھی کہ کسی طرح ہارون کو قتل کردے۔ ہارون سہما سہما رہنے لگا۔ اس نے اپنی جان کے خوف سے ایک دن یہ بھی کہدیا کہ اس نے اپنی تمام دولت مریم کے نام کردی ہے۔

اس کو خیال ہوا کہ شائد یہ جان کر مریم اس کی جان لینے کا ارادہ چھوڑ دے۔ مگر نہیں۔ مریم ہارون کو اس لئے مار دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کی گزشتہ باتوں کو جانتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ہارون کہیں پولیس میں رپورٹ نہ لکھوا دے۔ ایک دن خلاف معمول مریم شربت کا پیالہ لائی۔ اور نہایت محبت سے عاجزی سے ہارون کو پیش کیا۔ ہارون اس غیر معمولی بات کو تاڑ گئے اور فوراً کمرے سے پستول اٹھا لائے اور اس ناپاک ہستی کا خاتمہ کر دیا۔ جلدی میں مکان کے کمپاؤنڈ میں قبر کھود کر اسے دفن کر کے وطن چلے گئے۔"

اتنا کہنے کے بعد کریم رک گیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی وہ کھانسنے لگا۔ مسز فرید ڈر گئی تھیں۔ ایک دم کہا: کیسی خوفناک باتیں ہیں!"

سر فرید نے کہا، "کیا حماقت ہے بیگم! ایسی بے بنیاد باتوں پر اعتماد کرتی ہو" اور پھر کریم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں کیسے یقین کروں بھلا ایک شخص اپنی بیوی کے کمرے میں ایک نہ شد چار لاشیں دیکھے اور کچھ کارروائی نہ کرے۔ میں کل قبر کو صاف کر کے دیکھوں گا۔"

کریم نے بہتیرا منع کیا اور کہا اس خیال کو چھوڑ دو لیکن سر فرید نہ مانے۔ کریم نے کہا "سر اس قبر کے پاس ایک بلی بھی ہے جو اسی عورت کی تھی۔"

سر فرید نے کہا "کس کی مریم کی؟"

کریم نے کہا "جی ہاں۔ وہ بلی تقریباً سو سال سے ہے سفید رنگ کی بہت بڑی بلی ہے اس کی کمر پر اڑتی ہوئی چمگادڑ نما کالا دھبہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایسا ہی دھبہ مریم کی کمر پر پیدائشی تھا۔"

سر فرید مسکرائے اور کہا۔ "تمہاری کہی ہوئی باتیں من گھڑت ہیں۔ بھلا میں کس طرح یقین کروں کہ ایک بلی سو سال سے زندہ ہو تم بھی کیا دقیانوسی خیال کے آدمی ہو۔"

مگر بیگم فرید یہ باتیں سن کر خوف زدہ ہو گئی تھیں انھوں نے کہا "فرید مذاق نہ اڑاؤ۔ ہندوستان عجیب ملک ہے۔ یہاں پر عجیب عجیب واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے ایک مرتبہ ــــ"

"اوہو وہ دوسرا ہی معاملہ تھا" سر فرید نے ان کی بات کاٹ دی اور کہا۔ "میری عقل ایسے واقعہ کو قبول نہیں کرتی ایسے من گھڑت قصوں پر مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔ کل میں خود قبر کے اوپر گھاس صاف کروں گا۔"

مسز فرید نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ وہ بلی کہیں میری بلی کو نہ کھا جائے۔ میری بلی ایرانی ہے۔" کریم چلا گیا اور وہ لوگ اندر چلے گئے

رات کا وقت تھا سر فرید کمرے میں بیٹھے مطالعہ کر رہے تھے۔ مسز فرید صوفہ پر بیٹھی اون کا سوئٹر بن رہی تھیں۔ دونوں گھنٹے کی آواز سے چونکے۔ فرید نے دیکھا ساڑھے ۱۱ بج چکے تھے۔ انھوں نے کتاب میز پر رکھ دی اور کھنکار کر کہنے لگے۔

"ساڑھے ۱۱ بج گئے۔ چلو بیگم سونے کا وقت ہو گیا۔ دونوں سونے کے کمرے میں جا رہے تھے کہ یکایک بیگم فرید نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر زور سے چلا کر کہا۔ "فرید۔ وہ دیکھو بلی ــ"

سر فرید گھبرا گئے اور ان کی نظریں دروازہ کی طرف اٹھیں۔ دہلیز پر بہت ہی بڑی بلی کھڑی تھی جس کا تمام جسم تو سفید تھا لیکن کمر پر اڑتی ہوئی چمگادڑ نما دھبہ تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سر فرید نے بھاری ہوئی آواز میں ڈانٹ کر بلی کو بھگا دیا۔ بیگم فرید نے کہا۔ "کیسی ڈراؤنی بلی تھی۔"

سر فرید نے بیگم کو سمجھانے کے لئے کہا "جنگلی بلی تھی بیگم! ایسی بلیاں تو یہاں پر کئی ہیں۔ کیا تم نے مالی کی باتوں کو سچ مان لیا۔" تمام رات آرام سے گزری صبح سر فرید کی آنکھ بیگم کی چیخ سے کھلی۔ ڈرتے ہوئے دیکھا کہ بیگم کی بلی کا گلا اس بلی نے دبا دیا تھا اور وہ ایرانی بلی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔

یہ واقعہ سر فرید کے ارادے میں کسی قسم کا تغیر نہ کر سکا۔ صبح ہی کدالی لے کر وہ قبر کی طرف روانہ ہوئے اور قبر کے ارد گرد کے تمام پودے اور گھاس وغیرہ صاف کر دی۔ بیگم فرید ان کے پاس ہی کھڑی تھیں۔ وہ اگرچہ اپنے شوہر کی جانفشانی کی داد دے رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر لحظہ ان پر خوف طاری ہوتا جاتا تھا۔ قبر کھودنے پر ایک پتھر نکلا جو ٹکڑے ٹکڑے تھا۔ سر فرید نے موزوں الفاظ جا کر ان کو جوڑا تو یہ کتبہ تھا۔ انھوں نے بیگم کو سنایا۔

"نفرت آلود یادگار ــ مریم بیگم ہارون ــ وفات ۱۸۰ ــ ایک بدعورت جو کبھی زندہ تھی۔"

"افسوس ناپاک روح!" سر فرید نے بیگم سے کہا۔ "کریم سچ کہتا تھا اس قسم کا کتبہ میں نے آج تک نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔"

بیگم فرید کچھ نہ بولیں اندر اور خوف سے بیچاری کانپ رہی تھیں۔ انھوں نے اصرار کیا۔ "فرید اندر چلو۔"

دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ۱۲ رات بہت تک

ہیبتناک تھی بیگم فرید مارے ڈر کے رات بھر نہ سو سکیں۔ طرح طرح کے برُے خیالات ان کے صفحۂ دماغ پر حاوی تھے۔ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کی بلی کی طرح سر فرید بھی مر گئے وہ ڈر کر اٹھ بیٹھیں۔ لیمپ روشن کیا انھوں نے وہی دیکھا۔ جو وہ خواب میں دیکھ چکی تھیں۔ مریم کی بلی نے سر فرید کا گلا چبا ڈالا تھا۔ سر فرید مردہ تھے اور مریم کی بلی ان کے پائینتی بیٹھی اپنے پنجے صاف کر رہی تھی۔ ایک سکتہ کا عالم چھا گیا۔ وہ چلا بھی نہ سکیں۔ بیگم فرید ڈرائنگ روم کی طرف گئیں۔ میز کی دراز میں سے اپنے شوہر کا ریوالور اٹھا لائیں۔ مریم کی بلی ابھی تک پنجے صاف کر رہی تھی انتقام کی آگ ان کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ دو قدم آگے بڑھیں اور لبلبی دبا دی۔ تھوڑی دیر میں گولی بلی کے کالے دھبہ کو پھوڑ رہی تھی۔ فائر کی آواز سے خود چونک گئیں جیسے کوئی سوتا شخص چونکتا ہے۔ ان کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کی نالی سے دھواں نکل رہا تھا۔ سامنے پلنگ پر ان کے عزیز شوہر کی لاش تھی۔ گولی کا نشانہ عین دل پر لگا تھا۔ جس جگہ بلی بیٹھی تھی وہاں پر سیاہ اڑتی ہوئی چمگادڑ نما سیاہ دھواں تھا جو آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھ رہا تھا۔

نمک پارے

• ایک صاحب بغل میں کپڑوں کا پیکٹ دبائے بھاگے جا رہے تھے کہ پولیس کے سپاہی کو شبہ ہوا اس نے تعاقب کیا۔ اور انہیں گردن سے پکڑتے ہوئے پوچھا "کہاں سے چرا کے لائے ہو جلدی بتاؤ۔؟" "میں چور نہیں، شریف آدمی ہوں"

"کہیں شریف آدمی بھی دوسروں کا مال اڑا کر بھاگا کرتے ہیں۔ دکھاؤ اس پیکٹ میں کیا ہے" انہوں نے پیکٹ سپاہی کے حوالے کرتے ہوئے کہا "کھول کر دیکھ لیجئے۔ میری بیوی کا لباس ہے"

سپاہی نے پوچھا "اگر یہ تمہاری بیوی کا لباس ہے تو اسے لے کر تم بھاگ کیوں رہے تھے؟ کیا کوئی چھین رہا تھا۔؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں تو اس لیے بھاگ رہا تھا۔ کہ جلدی سے گھر پہنچ جاؤں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے گھر پہنچتے پہنچتے فیشن بدل جائے"

• ایک بچہ سڑک پر بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک بوڑھے نے کہا کہ تم کو شرم نہیں آتی۔ سڑک پر بھیک مانگ رہے ہو۔ اس عمر میں تو تمہیں اسکول جانا چاہیئے تھا۔ بچے نے جواب دیا وہاں بھی گیا تھا مگر کسی نے میری مدد نہیں کی"

• ایک پادری گرجا میں وعظ کہہ رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہو گئی اور کچھ راہ گیر بارش سے پناہ لینے کے لیے گرجا میں گھس آئے۔ پادری نے انہیں دیکھا اور کہنے لگا۔

"بعض لوگ مذہب کو اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں۔ بعض اسے اپنی سیاست کا لبادہ۔ لیکن میں نے مذہب کو چھتری کے طور پر استعمال ہوتے آج ہی دیکھا ہے"

خط و کتابت میں نمبر خریداری لکھنا کبھی نہ بھولیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ روانہ فرمائیں۔ ——— ادارہ

ملا وجہی کے عہد میں

سیاسی اور سماجی حالات

ڈاکٹر وقیرین باسلا صدر شعبۂ اردو شیلا بالا ویمنس کالج کٹک

دنیا پر مختلف تہذیبی دور آئے ہیں۔ اور سماجی نظام کی مختلف شکلیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ ملا وجہی کے عہد میں ہند اسلامی کلچر کا عروج تھا۔ دہلی کے دارالسلطنت سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے کچھ حصے پر شہنشاہ اکبر حکومت کر رہا تھا۔ اور جنوب میں محمد قلی قطب شاہ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بہمنی خاندان کے زمانے میں بالکل جنوبی حصہ میں وجے نگریوں کی بھی حکومت تھی۔ یہ دور مطلق العنان بادشاہوں کا دور تھا اور اس وقت تمام دنیا میں یا تو شہنشاہیتیں قائم تھیں یا چھوٹی بادشاہتیں۔ ان شہنشاہوں اور بادشاہوں کے ماتحت جاگیردار اور صوبیدار تھے جنھیں جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ ایسی نظام کو جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں۔ طبقۂ اعلیٰ کی حکومت تھی لیکن بادشاہ کے ماتحت۔ بادشاہ خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ طبقۂ وسطیٰ کے لوگ یا تو کارندے تھے یا پیشہ ور یا بیوپاری۔ طبقۂ ادنیٰ میں مزدور اور کسان شامل تھے۔

دونوں نچلے طبقے کی بہت کم اہمیت تھی۔ امیروں، رئیسوں اور جاگیرداروں کی دنیا تھی۔ اور ان کا تاج بادشاہ تھا۔ اسے سب طاقت حاصل تھی۔ اور اس کے سائے میں اعلیٰ طبقہ کے لوگ حکومت کیا کرتے تھے۔

سماجی نظام کا یہ حال تھا کہ ابھی تک زیادہ بڑے بڑے شہر نہیں بسے تھے شہر بہت کم اور گاؤں بہت زیادہ تھے۔ بعض بڑے بڑے قصبے بھی تھے۔ شہروں میں تہذیب کی کرن چمکتی تھی۔ سماج میں طبقاتی نظام قائم تھا۔ اور ہندوستان کی فضا میں پیشے عموماً ذات کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ جب بادشاہ اور امرا اچھے ہوتے تھے، تو سماجی حالت بڑی پر امن بن جاتی تھی۔ اور ملک میں فارغ البالی ہو جاتی تھی۔ معیار زندگی بلند نہ تھا۔ عوام کی تمنائیں بھی قناعت کی طرف مائل تھیں۔ امرا داد و دہش کرتے تھے۔ اور غربا ان کی خوشیوں میں شریک ہو کر خوش ہو لیا کرتے تھے۔ چونکہ زراعت کا نظام مستحکم تھا۔ اس لئے ملک میں فارغ البالی تھی۔ اور موسمی تہواروں ہولی، دیوالی، عید، شب برات، محرم وغیرہ میں خلق خدا خوب حصہ لیا کرتی تھی۔

اس عہد میں معاشی نظام زراعت پر ہی انحصار کرتا تھا۔ لیکن گھریلو صنعتیں اور چھوٹی چھوٹی صنعت و حرفت کے ادارے بھی قائم تھے۔ کوئی بیرونی حاکم ملک کو لوٹتا نہ تھا۔ اس لئے زراعت اور صنعت و حرفت کے سہارے ملک میں خوش حالی پھیلی ہوئی تھی۔ اور ایک ایسی معیشت رائج تھی جسے ہم خود کفیل کہہ سکتے ہیں۔ ان ساری باتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ رعایا عام طور پر خوش تھی۔ اور سماجی طبقوں میں اتنا اختلاف اور دوری نہ تھی۔ جتنی سرمایہ دارانہ نظام کے زمانہ میں ہوئی۔ ہر طبقے کے لوگ ایک دوسرے میں گھلے ملے ہوئے تھے۔ اور ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہوتے تھے۔ بادشاہ بھی رعیت سے اتنا دور نہ تھا۔ جتنا آج عوام سے پارلیامنٹ کے ممبر خصوصاً ہمارے ملک میں۔ بادشاہ بھی رعایا کے ساتھ مل کر خوشیاں مناتا تھا۔ اور خوب داد و دہش کرتا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ تو ہر طبقے کا محبوب فرمانروا تھا۔ وہ ہر دلعزیز تھا اور نہایت ملنسار۔ اس دور میں سلطنت گولکنڈہ میں من و سلویٰ برستا تھا۔ ہر طرف خوشحالی اور خوش باشی کا دور تھا۔ امرا اور روسا نشاط و سرور میں وقت گزارتے تھے۔ اور ہر طبقہ تھا اپنے دل کا رسیا تھا۔ مثنوی "قطب مشتری" میں اس عہد کی تصویر ہمیں ملتی ہے یہ داستان کا قصہ بھی محمد قلی قطب شاہ کی داستان محبت ہے۔ اسے ایک

معروف رقاصہ سے محبت ہو گئی تھی اور اس رقاصہ کے نام پر ایک شہر بسایا جس کا نام بھاگ نگر رکھا۔ بعد میں یہ حیدرآباد ہو گیا۔
ہندو مسلم کلچر کا امتزاج اس شعر سے ثابت ہوتا ہے۔

براہیم قطب شاہ راجا دھراج
شہنشاہ ہے شاہ شاہاں میں آج

ابراہیم قطب شاہ کو راجا دھراج بھی کہا گیا ہے۔ اور شہنشاہ بھی جاگیردارانہ نظام کی جھلک بھی اس نظام میں ملتی ہے۔ بادشاہ کی قصیدہ خوانی اس دور کی یادگار ہے۔ مثنوی "قطب مشتری" میں بادشاہ کے دربار کی محفل دعوت کا نقشہ پورے جاگیردارانہ ٹھسے کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

نوباں نعمتاں نو فلک بیچ بھر
لے کر آئے ذم کر ملک شہ کے گھر
کر شہ کوں خوشی یو بڑی آج ہے
انند پر انند کا ج پر کا ج ہے

طبقۂ اعلیٰ کو دنیا بھر کی نعمتیں حاصل تھیں: اور ان کے محل خانوں میں تقریبات کا ایک سلسلہ لگا رہتا تھا۔ محل کی سجاوٹ کا نقشہ وجہی نے خوب کھینچا ہے۔ بادشاہ کو لوگ خدا کا سایہ کہتے تھے۔ اور اس اعتبار سے اس کا محل کعبے کا بدل تھا۔

محل جیوں ہے کعبہ دھرے جوت صاف
تو آسماں کرتا ہے نس دن طواف

بادشاہ کی عطا و بخشش کی تصویر بھی وجہی نے خوب کھینچی ہے۔

کئے کوٹ بخشش ادک لاک نے
تو ارزاں ہوا یوں سنا خاک نے
جگت اب گھر یوں بھرنے لگیا
کہ خشکی میں نہیں آ کے چرنے لگیا

اسی طرح "مجلس طرب" کی عکاسی بھی خوب کی گئی جس سے اس عہد کے رسم و رواج اور سماج و سیاسی فضا کا پتہ چلتا ہے۔

شہنشہ مجالس کئے ایک رات
وزیراں کے فرزند سب سنگات
ندیم ہور مطرب سگھڑ فہم دار
اتھے شہ سوں مل کر دو سب یک ہزار

صراحی پیالے لے با تال منے
ندیماں لے مشغول با تال منے

شراب کا دور خوب چلا اور لوگ بے ہوش ہو کر گرنے لگے۔ دربار کی عشرت سامانیاں عام تھیں۔ اسی زمانے کی خوشحالی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

گھرے گھر انند سکھ سپنور تھا
خلق شاد سب ملک معمور تھا

دسیا محل انچا سو اس دھات وال
انپڑتا نہ تھا عرش کا ہات وال

محل خانوں اور مکانوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

دو کھڑکیاں کھلیاں بادتے جھانک کر
دجے پرتے دیکھی سو دو جھانک کر

محل خانوں میں خدمت گار اور دائیاں کثرت سے رہا کرتی تھیں۔

کہی دائی میں تجھوں ہنستی اتھی
تو نیں جانتی کی خبر تج نہ تھی

مشتری کے محل کی آرائش قابل دید ہے۔ محل کی آرائش بھی یوں دکھائی ہے۔ جس میں ہندو مسلم تہذیبوں کا امتزاج ملتا ہے۔

کہیں بت تجانے ہور بت پرست
کہیں نار ہور پرش یک تھا رست
کہیں شاعراں شعر کہتے رہیں
کہیں چشمے امرت کے بہتے رہیں

کہیں ہیں ملائے کہیں ہیں خمار
کہیں ہیں دیوانے کہیں ہیں ہشیار

تخت شاہی کا جلوہ ملاحظہ ہو۔

چتر جھلکے یوں شہ کے مکھ بھان تے
کہ روشن زمیں جیوں ہے آسمان تے

جاگیردارانہ نظام کی عیش کوشیوں کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق کی باتیں بھی ملتی ہیں۔ شاعر عطارد سے کہلواتا ہے۔

خدا جب جسے کچھ دلاتا رہے
تو یوں شاہاں کے بی دل میں لیاتا رہے
خدا جب دلاوے تو کوئی کچھ پائے
شہاں کاں سے دیں جو خدا دلائے

خدا پاس تے توں امید آس منگ
اگر توں منگے تو خدا پاس منگ

جو شاہاں اُپر بول دھرتے رہیں
غلط ہے انوھاں بسرتے رہیں

جب مشتری اپنی ساس اور سسر کے پاس پہنچتی ہے تو اس کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے۔

کھلے پھول امید ہور آس کے
پڑی پانو سسرے ہور ساس کے

قطب شاہ کی شادی کا نقشہ بھی بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔

سو جبریل قاضی ہو واں آئے کر
فرشتیاں کو مہمان سب لیائے کر

بندیا مہر اس نار ناداں کا
سو حاصل زمیں ہور آسماں کا

زمیں تھی سو ہوئی آج جیوں آسماں
کہ ہے قطب ہور مشتری کا قِراں

مثنوی کے تیسرے حصے میں ایک باب ہے "رفتن شہزادہ پیش عابد"۔ اس باب میں بھی اسلامی اخلاق کا درس ملتا ہے۔

کہ جس وضع سوں پند عابد کیا
اسی پند سیتیں وہاں لگ گیا

بہار کی ایک دوپہر

حضرت جوش ملیح آبادی

بھیگی ہیں ہوائیں بادل ہے ہلکا ہلکا
بھیڑیں چرا رہی ہیں دوشیزگان صحرا

ذرّوں پہ دھندلی دھندلی کرنیں چمک رہی ہیں
سرسبز جھاڑیوں میں چڑیاں چہک رہی ہیں

ٹھنڈی ہوا سے ہر ایک پودا لچک رہا ہے
خود رَو گلوں سے سارا میداں مہک رہا ہے

کچھ لڑکیاں چنے کے کھیتوں میں گا رہی ہیں
کچھ پھول چن رہی ہیں کچھ ساگ کھا رہی ہیں

بوڑھا کسان اپنی گاڑی پہ جا رہا ہے
کھیتوں کو دیکھتا ہے اور سر ہلا رہا ہے

دل کچھ سبق وہ گہرے فطرت سے لے رہا ہے
کوؤں کا چیخنا بھی اک لطف دے رہا ہے

رفتار میں ترنم پتے ملا رہے ہیں
ہر گام پر لچک کر نغمے سُنا رہے ہیں

چھن چھن کے بادلوں سے کچھ دھوپ آ رہی ہے
سردی میں اپنا جلوہ گرمی دکھا رہی ہے

احساس جان و دل کے قربان ہو رہا ہے
موسم کو دستِ فطرت کچھ یوں سمو رہا ہے

غنچے چٹک رہے ہیں گلزار زندگی کے
در مجھ پہ کھل رہے ہیں آثار زندگی کے

خود اپنے دل کو مبہم میں یاد آ رہا ہوں
کھویا گیا ہوں ایسا اپنے کو پا رہا ہوں

اردو کے لیے حکومت یو پی کا ایک اور قدم

ہمارے صوبے کے مایۂ ناز وزیر اعلیٰ وشو پرتاب سنگھ صاحب نے جہاں تمام اصلاحات کر کے تھوڑے ہی عرصہ میں اسٹیٹ کو ہر طرح کی ترقی بخشی ہے، وہیں اردو کے لیے بھی یہ اعلان فرمایا ہے کہ تمام محکموں اور عدالتوں میں اردو میں دی گئی درخواستیں قبول کی جائیں گی اور اس پر سختی سے عمل درآمد ہوگا۔ امید ہے کہ اس حکم کے تحت ہر محکمہ کے لوگوں کو اردو پڑھنا پڑے گی، ورنہ اردو میں درخواستیں دینے کا کوئی مطلب نہ ہوگا، اس کا ترجمہ بھی مانگا جائے گا اور لوگ یہ سوچ کر کہیں ان کا کام بگڑ نہ جائے اردو میں خود ہی درخواستیں نہ دیں گے۔ حکومت کو چاہیے کہ خفیہ طریقہ پر اس بات کا پتہ لگاتی رہے کہ اردو کے ساتھ ہندی میں ترجمہ بھی تو نہیں طلب کیا جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ ہر محکمہ میں یا تو اردو والے لوگ بھی رکھے جائیں یا موجودہ اسٹاف کو اردو پڑھنے لکھنے پر مجبور کیا جائے۔

اقوال زرّیں

- جب غصّہ کا غلبہ ہو تو خاموشی اختیار کرنا انسب ہے۔
- راستہ کا کانٹا یا پتھر ہٹا دینا یا کسی بھٹکے ہوئے مسافر کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے۔
- آزمائش جتنی سخت ہوگی، انعام بھی اتنا ہی بڑا ہوگا۔
- انسان کا بدترین دشمن خود اس کا نفس ہوتا ہے۔

مرسلہ: سیدہ طلوت آرا رضوی (سیتاپور)

مومن کو کبھی

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "دعا عبادت کا مغز ہے"۔ اور پھر آپ نے بطور دلیل قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت تلاوت فرمائی۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

اور تمہارے رب نے فرمایا۔ مجھ سے دعا مانگا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ (از راہ تکبر) میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے۔ ذلیل و خوار ہو کر۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتلاؤں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر ہے۔ اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ ہے، اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا ہے۔ اور سونے چاندی کے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے سے بھی بہتر ہے۔ اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن سے (میدان جہاد میں) مقابلہ کرو، اور پھر تم ان کی گردنیں کاٹو اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں"۔

صحابہ نے عرض کیا "کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتلایئے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ وہ عمل اللہ کا ذکر ہے"۔

ایک اور جگہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا۔

"تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اس کے لیے رحمت کے دروازے کھول دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان میں اللہ کو سب سے زیادہ پسند یہ ہے کہ اس سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی دعا مانگی جائے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے کوئی سوال نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس شخص سے ناراض ہو جاتا ہے تم اللہ سے دعا مانگنے میں عاجز نہ بنو اس لیے کہ دعا کرتے رہنے کی صورت میں کوئی شخص کسی ناگہانی آفت سے ہلاک نہیں ہوگا جو شخص یہ چاہے کہ اس کی دعا سختیوں اور مصیبتوں کے وقت اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ اس کو چاہیئے کہ وہ فراخی اور خوشحالی میں بھی کثرت سے دعا مانگا کرے۔

ایک جگہ ارشاد رسول اکرم ہے کہ "دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ دین کا ستون ہے اور آسمان و زمین کا نور ہے"۔

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کے پاس سے گذرے جو کسی مصیبت میں گرفتار تھی تو ان کی حالت دیکھ کر آپ نے فرمایا "کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا نہیں مانگا کرتے تھے۔

ان احادیث کی روشنی میں دعا کی فضیلت ہم پر اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیک خواہش کو رد نہیں کرتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرین مصلحت ہو تو فوراً مراد پوری کر دی جاتی ہے۔ اگر فوراً مراد پوری کرنا قرین مصلحت نہیں ہوتا تو بہ تاخیر مناسب وقت پر وہ مراد پوری کر دی جاتی ہے۔ ورنہ اس کا نعم البدل دنیا یا آخرت میں دے دیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنے کا اجر تو بہر صورت مل ہی جاتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی دعا رائیگاں نہیں جاتی ہے۔

مومن کو کبھی بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لیے کہ وہی مختار کل ہے۔ ہماری خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا وسیلہ ہے۔ اور انسان کی عظمت بھی اسی کی بدولت ہے۔ .....

ہندوستانی عورت سے خِطاب

از جناب زؔر ہاشمی

ہند کی اے صنفِ نازک عمر ہو تیری دراز — تیری ہستی ہے زمانے میں سراپا سوز و ساز
اے کہ تیرے سینہ میں فطرت کی ہے دنیائے راز — خندہ زن ہے تیری ہستی پر زمانے کا فراز

آدمی کے واسطے قفلِ درِ جنت ہے تو
ہیں ملک محروم جس نعمت سے وہ نعمت ہے تو

میں نے مانا مرد عزم و رزم کا مختار ہے — لیکن آخر اس حقیقت سے کسے انکار ہے
تجھ میں بھی اک جوش ہے اک جذبۂ ایثار ہے — تو زمانے میں برابر کی شریک کار ہے

کارنامے تیرے اب تک زینتِ تاریخ ہیں
تیرے افسانے نشانِ عظمتِ تاریخ ہیں

چاند بی بی، تارا بائی، رضیہ و نور جہاں — جن کے افسانوں سے ہے ہندوستاں ہندوستاں
جن کی عظمت جن کی ہمت سے ہے واقف کل جہاں — یہ تیری بہنیں تھیں سب اے قیدیٔ صحن مکاں

فکرِ راحت ہے تجھے پروائے عظمت کیوں نہیں
تجھ میں سیتا کی طرح وہ عزم و ہمت کیوں نہیں

اٹھ خدا کے واسطے ہشیار ہو اے محو خواب — تو ہی بن سکتی ہے بدبختی کا ہم سب کی جواب
ہم سے ناکاموں کو کر سکتی ہے تو ہی کامیاب — تو نے جب چاہا کیا دنیا میں پیدا انقلاب

تو ازل ہی سے کلیدِ قفلِ بابِ قوم ہے
تیری اک ہلکی سی جنبش انقلابِ قوم ہے

نماز

- دیدارِ الٰہی کا ذریعہ ہے • اسی پر اسلام کا دار و مدار ہے۔
- جنت کی کنجی ہے • روح کے میل کچیل کو صاف کرتی ہے۔
- رتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بلند ہے۔ • مومن کی جان ہے
- غافل انسان کو ہوشیار کرتی ہے • صحت و تندرستی بخشتی ہے
- برائیوں اور بدیوں سے روکتی ہے • اللہ کا قرب عطا کرتی ہے۔
- رسولِ پاک کی خوشنودی کا موجب بنتی ہے۔
- انسان کو پاک صاف بناتی ہے • وقت کا پابند بناتی ہے۔

مرسلہ: شاذیہ بخاری (حیدرآباد)

داغ دھبے دور کرنے کی ترکیبیں

قہوہ اور چائے کے داغ دھبے دور کرنے کے لئے کپڑے کو نمک کے پانی میں تر کر کے پھر اس پر باریک سہاگہ پیس کر چھڑک دیجئے اور بعد میں سادہ پانی سے دھو ڈالئے داغ دور ہو جائے گا۔

گھاس کے داغ دور کرنے کے لئے پہلے تو مٹی کا تیل داغ پر لگا کر دھوئیے اور بعد میں الکحل لگا کر دھوئیے کپڑا بالکل صاف ہو جائیگا۔

سبزیوں کے داغ کو سہاگہ سے دھو ڈالئے تو دور ہو جائے گا اور اگر داغ پرانا ہو تو پوٹاسیم اور مگینٹ آگزیلک ایسڈ کو گرم پانی میں حل کر کے داغ پر لگائیے اور پھر دھو ڈالئے کپڑا بالکل صاف ہو جائے گا۔

شوربے کے داغ کو دور کرنے کے لئے کئی چیزیں استعمال کی جا سکتی ہیں۔ تیزیبن۔ ایتھر۔ کلوروفارم یا امونیا گرم پانی میں حل کر کے دھوئیے تو صاف ہو جائے گا۔

ہلدی کے داغ کپڑوں پر بہت برے معلوم ہوتے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے پہلے امونیا لگا کر دھوئیے اور اس کے بعد پوٹاسیم پرمگنیٹ میں پھر پانی سے دھوئیے۔ داغ والی جگہ کو سوڈیم ہائی سلفائیڈ ٹھنڈے پانی میں حل کر کے اس میں ڈبو دیجئے اور اس کے بعد سادہ پانی سے دھو کر خشک کر لیجئے داغ دور ہو جائے گا۔

انڈے کا داغ یہ داغ گرم پانی سے بھی دور ہو سکتے ہیں لیکن اکثر داغ گرم پانی سے دھونے سے دور نہیں ہوتے تو ان کے لئے کپڑوں کو پٹرول سے دھو ڈالئے داغ دور ہو جائیں گے۔

تمباکو کے داغ۔ تمباکو کے داغ کو دور کرنے کے لئے داغ والی جگہ پر فوراً نمک کا تیزاب لگا کر دھو ڈالئے تو دور ہو جائے گا۔

سائیکل کے تیل کے داغ دور کرنے کے لئے مٹی کا تیل یا پٹرول لگا کر دھو ڈالئے تو دور ہو جائیں گے۔

خون کے داغ دور کرنے کے لئے پہلے داغ پر لیمو ملئے اور پھر پھٹکری کا پانی لگا کر داغ کو اسپرٹ اور صابن حل کر کے اس میں تر کر لیجئے اور گرم پانی سے دھو ڈالئے داغ دور ہو جائے گا اور اگر کپڑا رنگین ہو تو اس پر سے داغ دور کرنے کے لئے ہائیڈروسلفائیٹ گرم پانی میں حل کر کے اس میں کپڑے کو دھو ڈالنے سے دور ہو جائے گا یا پوٹاسیم پرمگنیٹ کو ٹھنڈے پانی میں حل کر کے اس میں داغ کو تر کر کے بعد میں دھو ڈالئے تو دور ہو جائے گا۔

مرسلہ۔ کنیز بیگم

اپنا اپنا شوق

از سہالوی

آج آپ کہاں غائب ہوگئے تھے میں چھ بجے تک چائے پر آپ کا انتظار کرتی رہی دفتر سے تھکا ماندہ آدمی سیدھا گھر آتا ہے یا ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے؟

میں نے کہا بیگم تم جانتی ہو کہ میں گھر آنے کے لیے کتنا بے تاب رہتا ہوں جیسے ہی پانچ پر سوئی پہنچی ہے میں تیر کی طرح سیدھا گھر آتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں جو مزا تمھارے ہاتھ کی بنائی ہوئی چائے میں ہوتا ہے وہ بھلا کہاں مل سکتا ہے۔

بیگم نے مسکرا کر کہا کہ جس طرح میں چائے بنانے میں ماہر ہوں اسی طرح ماشاء اللہ آپ باتیں بنانے میں ماہر ہیں۔ میں نے پوچھا تھا آپ کہاں چلے گئے تھے آپ نے اس کا تو کوئی جواب دیا نہیں اور ادھر ادھر کی اناپ شناپ باتیں کرنے لگے۔

بیگم تم نے بھی کمال کر دیا یہ اناپ شناپ باتیں ہیں کہ میرے دلی جذبات جو فرط محبت سے دل کی گہرائی سے نکل کر نوک زبان پر آگئے۔

بیگم نے کہا شاعری نہ کیجئے یہ بتایئے کہ آپ اتنی دیر تک رہے کہاں۔

میں نے کہا بیگم اللہ جانتا ہے کہ میں کسی کی دل شکنی نہیں کرسکتا گھر میں جیسے میں تمھاری ہر ضد پوری کرتا ہوں اسی طرح باہر میں دوستوں کی بات نہیں ٹال پاتا۔ آج سب نے ضد کی کہ اتنے دنوں سے نمائش لگی ہے اور آپ ابھی تک گئے نہیں آج تو آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔

بیگم یہ سنتے ہی فوراً بولیں تو یہ کہیئے نو بجے رات تک نمائش کی سیر کرتے رہے۔

میں نے کہا کیا نمائش دیکھنا گناہ ہے؟
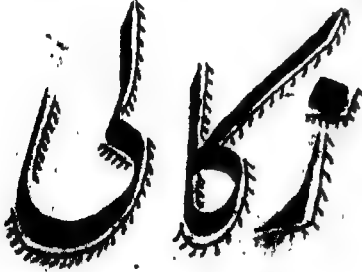
بیگم منھ بنا کر بولیں، میں خوب جانتی ہوں کہ آپ کے دوست احباب روزانہ نمائش میں کیا دیکھنے جاتے ہیں۔ جن مردوں کو تاک جھانک کی عادت پڑجاتی ہے وہ زندگی بھر نہیں جاتی۔ یہ نمائش دیکھنے نہیں عورتیں دیکھنے جاتے ہیں۔

میں نے کہا بیگم معاف کرنا عورتیں بھی تو عورتوں کو دیکھنے جاتی ہیں فرق صرف یہ ہے مرد منھ دیکھتے ہیں اور عورتیں ان کے کپڑے اور زیور دیکھتی ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہمارے یہاں کی عورتیں شادی بیاہ سے لوٹتی تھیں تو سوائے اس کے کوئی بات نہیں کرتی تھیں کہ لڑکی کی بیوی یہ پہنے تھیں اور متن کی بیوی وہ پہنے تھیں۔ اس پر ہمیں ایک بڑا دلچسپ لطیفہ یاد آرہا ہے اگر آپ برا نہ مانیں تو سنا دوں اس لطیفے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خواتین چاہے جس حال میں ہوں وہ دوسری عورتوں کا لباس اور زیور دیکھنے سے باز نہیں آتیں۔

ایک صاحبہ سامان خریدنے گئیں آج کل بازار میں بھیڑ بھاڑ اور دھکم پیل کا جو حال ہے وہ ظاہر ہی ہے ایک طرف سے کار آرہی ہے تو دوسری طرف سے موٹر سائیکل اور پیچھے سے رکشا مطلب یہ کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے بازار میں انھیں ایک کار سے دھکا لگا اور یہ چاروں خانے چت گر پڑیں۔ لوگوں نے دوڑ کر اٹھا لیا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی تھی بس یہ گڑ بڑا کر گر پڑی تھیں اتنے میں پولیس بھی آگئی۔

داروغہ نے پوچھا جس کار سے آپ کو دھکا لگا اس کا رنگ اور نمبر کیا تھا اس پر وہ بولیں بھئی اس کا نمبر اور رنگ تو یاد نہیں ہاں یہ یاد ہے کہ اسے ایک عورت چلا رہی تھی جس کی ساڑی پر لال زری کا باڈر لگا تھا۔ کانوں میں موتی کے جھمکے تھے، گلے میں سونے کا لاکٹ تھا اور کلائی پر گھڑی بندھی تھی ●●●●●●●●

اعتراف

شمیم اختر

ہمارے ہاں ایک بیوہ عورت جس قدر ہمدردی کی مستحق قرار دی جاتی ہے، ایک مطلقہ عورت اسی قدر قابل نفرت سمجھی جاتی ہے۔ اس پر اس حقیقت کا انکشاف طلاق پانے کے بعد ہوا تھا۔ ادھر زبیدہ بیوہ ہوئی اور ادھر اسے طلاق مل گئی۔ قصبے کی ساری عورتیں زبیدہ کے پاس بیٹھ کر پہروں اس کی حالتِ زار پر آنسو بہاتیں۔ لیکن جب اس کا ذکر چھڑ جاتا تو خوب قیاس آرائیاں ہوتیں۔ ہر عورت اپنی بساط کے مطابق اس پر الزام لگاتی۔ سبھی اس بات پر متفق تھیں۔ کہ وہ ایک بدکردار عورت ہے کیسی شریف عورت کو طلاق نہیں ہو سکتی۔ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر الفاظ نہیں تھے۔ قصبے کی سب عورتوں کے مقابلے میں وہ کیونکر جیت سکتی تھی جبکہ اسے طلاق مل چکی تھی۔

اس کے بارے میں قصبے کے مردوں کا رویہ ذرا مختلف تھا۔ وہ زبیدہ کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ بیوہ ہونے کے بعد اس نے کہیں آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا شوہر اتنا اثاثہ چھوڑ گیا تھا کہ وہ گھر بیٹھ کر آرام سے کھا سکتی تھی اور اپنے بچوں کو کھلا سکتی تھی لیکن طلاق پانے کے بعد اس کے پاس ایک نوزائیدہ بچی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مایوسی کے لمحات میں اسے یاد آیا کہ اس کے پاس میٹرک کا ایک سرٹیفکیٹ بھی ہے۔ چنانچہ اس نے بچی کو گود میں اٹھایا اور میٹرک کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں لے کر قریبی اسکول میں گئی۔ ایک نجی ادارہ وہ اسکول چلا رہا تھا وہاں جس سرکردہ شخص سے اسے واسطہ پڑا وہ اس کی جانب ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ مفت کا مال ہو۔ اس کی نظروں سے گھبرا کر اس نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا۔ اور پھر اس شخص کا جواب سُنے بغیر وہاں سے چل دی۔ چھوٹے سے اس قصبے کے ہر مرد کو اپنی بیوی کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ اسے طلاق مل گئی ہے۔ اس لیے جو مرد بھی اس کی طرف دیکھتا اس کی نظروں میں اس کے لیے احترام کے سوا سب کچھ ہوتا تھا۔

اس تجربے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی ایسی جگہ نوکری کی تلاش میں نہیں جائے گی جہاں اسے کسی مرد سے واسطہ پڑے۔ وہ بچی کو گود میں اٹھائے اپنا میٹرک کا سرٹیفکیٹ ہاتھ میں پکڑے کیٹی کے پرائمری اسکول کے ہیڈ مسٹریس کے پاس پہنچی۔ ہیڈ مسٹریس نے اسے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ اس کے اسکول میں کسی معلمہ کی جگہ خالی نہیں ہے۔ ہیڈ مسٹریس کو بھی اس بات کا علم تھا کہ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید ہیڈ مسٹریس اس کو اسی وجہ سے اپنے اسکول میں ملازمت نہیں دے رہی ہے۔ اس نے روتے ہوئے کہا "مجھ سے سبھی نفرت کرتے ہیں۔ آپ مجھ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ نے شہر میں جاکر تعلیم پائی ہے۔ آپ نے دنیا دیکھ رکھی ہے۔ آپ کو بھی اس بات کا علم ہوگا کہ جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے تو بیوی اسے اس فیصلے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ضروری نہیں ہے کہ بیوی میں کوئی خرابی ایسی ہو جو شوہر کو مجبور کر دے کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کر لے۔ میں اکیلی ہوتی تو کب کی زہر پھانک چکی ہوتی۔ لیکن میں اس معصوم کے لیے زندہ ہوں اسے میری ضرورت ہے اس کی خاطر میں نوکری کی تلاش میں ہوں۔"

ہیڈ مسٹریس کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ میٹرک پاس یہ عورت اس کی قابلیت کی معترف ہے۔ اس نے کہا: "تم ایک ذہین عورت ہو۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا کہ میں عام عورتوں کی طرح جاہل نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ مرد جب عورت کو چھوڑنا چاہتا ہے تو اسے عورت کی کوئی خوبی متاثر نہیں کر سکتی۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ عورتیں ہی عورتوں پر ظلم کرتی ہیں۔ وہی طلاق پانے والی عورت کو برا کہتی ہیں وہ یہ بات اپنے شوہروں کے ذہن نشین کرتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اس طرح وہ اپنے شوہر کے دل میں ایک عورت کے خلاف نفرت پیدا کر لیں گی۔ حالانکہ بیویوں کی باتیں سن کر مردوں کے منھ میں پانی بھر آتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ طلاق یافتہ عورت مفت کا مال ہے۔ اسے حاصل کر لینا چاہیے۔ تمہیں ملازمت نہ دینے میں میری مجبوری یہ ہے کہ تم بچہ دار عورت ہو۔ اپنے تجربے کی روشنی میں، میں کہہ سکتی ہوں کہ بچہ دار عورتیں اچھی کارکن ثابت نہیں ہوئیں۔ دن بھر ان کا ذہن اپنے بچے کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ دل جمعی سے کام نہیں کرتیں۔ بیماری کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ دوسروں کے رحم و کرم پر پلنے والا بچہ اکثر بیمار رہتا ہے۔ پچھلے عورتیں بچوں کی بیماری کی وجہ سے ہر دو سرے تیسرے روز چھٹی لے

لیتی ہیں۔ چونکہ یہ چھٹیاں کسی ضابطے کے تحت نہیں لی جاتیں اس لیے اسکول کے نظام میں بے ترتیبی پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کی تعلیم کا حرج ہوتا ہے۔ بچوں کو پڑھنے میں نہ لگایا جائے تو شرارتیں کرتے ہیں۔ جب بہت سے بچے اکٹھا ہو کر شرارتیں کرتے ہیں تو ان کی شرارتوں میں بدتمیزی کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ تمھیں ملازمت دے کر میں اپنے اسکول کا ریکارڈ خراب کرنا نہیں چاہتی۔ اس سے میری ترقی کا راستہ بند ہوسکتا ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم ایسا کرو کہ گھر میں سلائی کا کام شروع کردو۔ اس طرح آمدنی کی صورت نکل آئے گی اور تم گھر بیٹھے اپنی بچی کی دیکھ بھال کر سکوگی۔ تم میٹرک پاس ہو۔ سمجھدار ہو۔ میرے خیال میں میری یہ مختصر سی بات تمھاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

ہیڈ مسٹریس کی باتیں اس کی سمجھ میں آگئیں۔ قصبے میں اور کوئی جگہ ایسی نہیں بچی تھی جہاں وہ اپنے لیے نوکری کی تلاش میں جاتی۔ اس نے سلائی کا کام شروع کرنا چاہا لیکن قصبے کی عورتیں اپنے کپڑوں کی سلائی خود کرتی تھیں۔ چند کھاتے پیتے گھرانے ایسے تھے جن کی عورتیں اپنے کام دوسروں سے کرواتی تھیں۔ لیکن یہ بات ان کی شان کے خلاف تھی کہ وہ اپنے کپڑے درزی سے سلوانے کے بجائے اس سے سلوائیں۔ قصبے کی عورتوں سے اسے کسی ہمدردی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ روزگار کی تلاش میں اسے قریبی شہر کا رخ کرنا چاہیے۔ مگر بچی کو گود میں اٹھا کر وہ اپنے لیے نوکری نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ اس صورت میں اسے وہاں وہی باتیں سننے کو ملتیں جو ہیڈ مسٹریس اسے سنا چکی تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے زبیدہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دن پہلے ہی اس کے شوہر کا انتقال ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس غم نے اسے نڈھال کر رکھا ہے۔ غم کی اس کیفیت نے اس کے دل میں نرمی پیدا کر دی ہوگی۔ اگر وہ اس کے سامنے اپنی بے بسی کا ذکر کرے تو ممکن ہے کہ وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو جائے۔

اس کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ زبیدہ اس بات پر آمادہ ہوگئی کہ اگر وہ اسے بچی کی خوراک اور لباس کا خرچ دے تو وہ اس کی بچی کی دیکھ بھال کرے گی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس طرح اس کا دل بہل جائے گا اور نیکی کے اس کام سے مرحوم کی روح کو ثواب پہنچے گا۔ وہ بچی کو زبیدہ کے پاس چھوڑ کر قریبی شہر چلی جاتی۔ شہر کو بسیں اور ریل دونوں جاتی تھیں۔ وہ ریل سے سفر کرتی کیونکہ یہ ذریعہ اسے محفوظ نظر آتا تھا۔

جب تک اسے نوکری نہ ملی، وہ صبح جاتی اور شام کو لوٹ آتی تھی لیکن نوکری پانے کے بعد روزانہ شام کو لوٹنا اس کے لیے ممکن نہ تھا کیونکہ جس ڈسپنسری میں اسے کام ملا، وہ رات دس بجے تک کھلی رہتی تھی۔ دس بجے ڈسپنسری سے فارغ ہونے کے بعد قصبے کو لوٹنا اس کے لیے مناسب نہ تھا۔ اس کے کردار پر پہلے ہی سب کو شبہ تھا۔ رات کو گیارہ بارہ بجے واپس آتی تو سب کو کھلا کھلا انگشت نمائی کا موقع مل جاتا۔ اس نے ڈسپنسری کے مالک سے اپنی اس مشکل کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگا: "تم چاہو تو رات کو یہیں سو جایا کرو۔ چھٹی کے روز تم اپنے قصبے کو جا سکتی ہو۔" اس سہولت کے عوض ڈسپنسری کے مالک نے اس کی تنخواہ سے بیس روپے کم دیئے لیکن یہ سودا اس کے لیے گھاٹے کا نہ تھا۔ اس سے زیادہ رقم اس کے آنے جانے پر اٹھ جاتی تھی۔ وہ اس سودے پر راضی ہو گئی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

اپنے گذشتہ تجربوں کی روشنی میں اس نے ڈسپنسری کے مالک کو بتایا تھا کہ وہ بیوہ عورت ہے جب مالک نے بچوں کی تعداد پوچھی تو وہ فوراً بولی "میرے کوئی بچہ نہیں ہے"۔ وہ ہاتھ آئی نوکری نہیں کھونا چاہتی تھی۔ ڈسپنسری کے مالک نے اسے ڈیڑھ سو روپے مہینے پر نوکر رکھ لیا۔ جب اس نے اس قدر کم مشاہرے پر اعتراض کیا تو وہ کہنے لگا "تم اکیلی عورت ہو کس لیے لالچ کرتی ہو۔ یہ نیکی کا کام ہے میں راہِ خدا پر ڈسپنسری چلاتا ہوں مجھے اس میں کوئی نفع نہیں ہے۔ مریضوں کو ہر قسم کی دوا صرف ایک چونی کے عوض دیتا ہوں۔ چونی صرف ٹوکن کے طور پر لیتا ہوں۔ اس طرح جو رقم اکٹھی ہوتی ہے وہ مریضوں کے بنچوں کی خریداری پر صرف کرتا ہوں۔ تم بھی اس نیکی کے کام میں حصہ دار بن جاؤ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم صرف میٹرک پاس ہو مجھے تم پر بڑی محنت کرنی پڑے گی۔ میں تمھیں دواؤں کے نام سکھاؤں گا۔ تمھیں پٹیاں باندھنا سکھاؤں گا۔ یوں سمجھو کہ دو مہینے بعد تم نصف ڈاکٹر بن جاؤ گی۔"

وہ ڈسپنسری کے مالک کی ہر بات قبول کرنے پر مجبور تھی۔ ڈسپنسری کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ریلوے اسٹیشن کے قریب تھی۔ اس کے قریب واقع دیہات سے سارے مریض یہیں آتے تھے۔ اس نے دیکھا تھا کہ ہر گھر میں دو تین افراد بیک وقت بیمار رہتے تھے۔ ڈسپنسری کا مالک

جس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رکھی ہے ۔ سب کو ایک ہی طرح کی دوا دیتا تھا ۔ پڑیوں میں پاؤڈر سا ہوتا تھا اور بوتل میں کسیلا سا شربت ۔ لیکن مریضوں کی بیماریاں بھی ایک دوسرے سے مختلف نہ تھیں ۔ اس نے دیکھا تھا کہ عورتوں کو دوا کے بجائے اچھی غذا کی ضرورت تھی ۔ ان رنگ پیلے تھے اور بدن گوشت سے خالی تھے یا پھر وہ بے انتہا موٹی تھیں ۔ برسات کے موسم میں روزانہ معدے کی خرابی کے مریض آتے تھے ۔ بارشیں تمام ہو جاتیں تو ملیریا کے مریض آنے لگتے ۔ سرما شروع ہوتے ہی ڈسپنسری میں نزلہ ، زکام اور کھانسی کے مریضوں کی قطار لگ جاتی گرمی میں سب کے بدن دانوں سے بھر جاتے اور ان پر پھنسی کا گمان ہوتا تھا ۔

ڈسپنسری کے مالک کے کردار پر اسے شبہ نہ ہوتا لیکن کبھی کبھی وہ ایسی باتیں کر جاتا کہ وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی چونکہ وہ رات کو بھی ڈسپنسری میں سوتی تھی اس لیے اسے پتہ چل گیا کہ قیمتی دواؤں کے کئی ڈبے ڈسپنسری میں آتے اور مالک راتوں رات انکو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا تھا گویا وہ خیراتی ڈسپنسری کے نام پر قیمتی دوائیں بٹورتا اور پھر ان کو ادھر ادھر فروخت کر دیتا تھا ۔ اس طرح وہ ہزاروں کما رہا تھا ۔ لیکن سب کچھ جاننے کے باوجود اس نے اپنا رویہ ایسا رکھا کہ جیسے وہ کچھ نہیں جانتی ۔ اسے اپنی تنخواہ سے غرض تھی ۔ وہ پہروں اپنی بچی کے بارے میں سوچتی رہتی ۔ وہ جتنا زیادہ اس کے بارے میں سوچتی ۔ اتنے ہی شد و مد سے پیسہ بچانے کی کوشش کرتی ۔ وہ سب کچھ اپنی بچی کے مستقبل کے لیے کر رہی تھی ۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب نوکری ملنے کے بعد اسے کچھ سکون ملا تو اسے اپنی بیٹی کی یاد ہر وقت ستانے لگی ۔ وہ شدت سے چھٹی کے روز کا انتظار کرتی تھی ۔ چھٹی سے ایک روز پہلے وہ کام کے دوران میں گنگناتی تھی ۔ لیکن جب وہ بیٹی کے ساتھ چھٹی گزار کر واپس آتی تو اس پر افسردگی طاری رہتی مگر افسردہ رہنے سے زندگی کا کام نہیں چل سکتا ۔ وہ زیادہ کمانا چاہتی تھی ۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے مالک سے تنخواہ میں اضافے کی درخواست کرے ۔ لیکن جوں ہی مالک سامنے آتا ۔ الفاظ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ جاتے ۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے حرکت کرنے لگتے ۔ مالک اس کے کام سے خوش تھا لیکن وہ صحیح طریقے سے کارکن کی محنت کو سراہنا نہیں جانتا تھا ۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرے تو ممکن ہے کہ مالک کو اس کی تنخواہ بڑھانے کا خیال آ جائے ۔ اس نے ایک روز مالک سے کہا "یہ دایہ مریضوں کے پیٹ دبا کر دیکھتی ہے اور

وہ اخانے میں جھاڑو لگاتی ہے ۔ میرے خیال میں یہ کام ایسے مشکل نہیں ہیں کہ میں نہ کر سکوں "

مالک یہ اشارہ پا کر بڑا خوش ہوا ۔ اس نے اگلے ہی روز دایہ کی چھٹی کر دی ۔ اب ڈسپنسری کے سارے کام وہی انجام دیتی تھی ۔ جب اسے یہ کام کرتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا اور مالک نے اس کی تنخواہ میں ایک دھیلے کا اضافہ نہ کیا تو وہ رات کو خوب روئی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مالک سے دو ٹوک بات کر کے رہے گی ۔ اگلے روز وہ مالک کے پاس گئی ۔ مالک نے اسے دیکھتے ہی پوچھا "کیا ہے ؟"

وہ رات بھر ان الفاظ کو ترتیب دیتی رہی تھی جن کی مدد سے اس نے مالک کے سامنے اپنا مدعا بیان کرنا تھا لیکن مالک کی آواز سنتے ہی وہ گھبرا گئی اور کہنے لگی "کچھ نہیں ہے ۔ مجھے ایک ہفتے کی چھٹی درکار ہے "

چھٹی کا نام سن کر مالک کا پارہ چڑھ گیا ۔ وہ کہنے لگا "تم اکیلی عورت ہو ۔ تم ایک ہفتے کی چھٹی لے کر کیا کرو گی ۔ میں تم سے ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں کل تمہاری ہفتہ وار چھٹی ہے تم چھٹی سے لوٹ آؤ تو کہوں گا ۔ آج تم نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے "

مالک کا لہجہ بدلا ہوا تھا ۔ وہ اس کے بدلے ہوئے لہجے پر حیران ہوئی جب وہ ریل میں بیٹھ کر قصبے کو جا رہی تھی تو وہ اپنی بیٹی کے بارے میں سوچنے کے بجائے مالک کے لب و لہجہ پر غور کر رہی تھی ۔ وہ پریشان تھی ۔ ایک بار اس کے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ وہ کہیں اسے نوکری سے جواب تو نہیں دینا چاہتا ۔ مگر بہت سوچنے کے باوجود اسے کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ اسے نوکری سے نکال دیا جائے ۔ پھر اس نے سوچا کہ کہیں وہ اپنے کاروبار کا راز نہ بتانا چاہتا ہو ۔ وہ سب کچھ جانتی تھی مگر وہ چاہتی تھی کہ اس کے اور مالک کے درمیان یہ پردہ پڑا رہے تو بہتر ہے ۔ ایک اور خیال سے اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ کہیں اسے یہ پتہ تو نہیں چل گیا کہ وہ ایک مطلقہ عورت ہے ۔

اس آخری اندیشے نے اسے بے چین اور مضطرب کر دیا ۔ جب بیٹی اس کے ساتھ کھیلنے لگی تو وہ کھوئی کھوئی سی تھی ۔ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ ڈسپنسری کا مالک اسے ہوس ناک نگاہوں سے دیکھنے لگے ۔ اسے اپنی ملازمت جاتی نظر آئی ۔ کہاں تو وہ اپنی تنخواہ بڑھوانے کے منصوبے بنا رہی تھی اور کہاں وہ اب اپنی ملازمت کے بچاؤ کے لیے دل

ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی۔

وہ [illegible] دفتر پہنچی تو [illegible] سہمی تھی لیکن مالک اس سے پہلے وہاں آیا بیٹھا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر کہنے لگا: "میں صبح صبح اس لیے آیا ہوں کہ ریتون کی بھیڑ میں تم سے بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ تم ایک بیوہ عورت ہو۔ دنیا میں تمھارا کوئی نہیں ہے۔ میں بھی کسی وجہ سے شادی نہ کر سکا لیکن اب سوچتا ہوں کہ یہ کام کرلینا چاہیئے۔ تم ایک محنتی اور صحت مند عورت ہو۔ میرے خیال میں تم ایک نیک شعار بیوی ثابت ہوگی۔"

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ اس نے ذرا دیر کے لیے اپنا سانس روک لیا۔ وہ کہنے لگی: "نہیں، نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ ناممکن ہے۔" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کی صورت آگئی۔ وہ اب آٹھ سال کی تھی اور قصبے کے اسکول میں تیسری جماعت میں پڑھتی تھی۔ مالک کو توقع نہ تھی کہ وہ اتنی اچھی پیش کش کو یوں ٹھکرا دے گی۔ اگرچہ وہ تند خو آدمی تھا۔ اسے ذرا غصہ آجاتا تھا لیکن اس نے تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا: "تمھیں اس قدر جلد جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک ہفتے تک سوچ سکتی ہو۔ اپنے بڑھاپے کے بارے میں بھی غور کرلینا۔ ایک نہ ایک دن بڑھاپے کو آنا ہے۔ نوکری کا کیا ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے۔"

وہ رات بھر بے چین رہی۔ اسے نیند نہ آئی۔ ایک سوچ ختم ہوتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی نوکری چلی گئی تو اس کی بیٹی کا کیا بنے گا لیکن شادی کے بعد مالک سے یہ بات کیسے چھپی رہتی کہ وہ بیوہ نہیں ہے۔ اسے طلاق ملی تھی اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ اس حقیقت کے انکشاف کے بعد اس کو سخت اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ایک ہفتے تک وہ اسی گومگو کا شکار رہی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اگر مالک نے مجبور کیا تو وہ بتا دے گی کہ اسے طلاق ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کا انتقال نہیں ہوا۔ آنکھیں نیچی کرکے کڑے دل سے اس نے مالک سے کہہ ہی دیا: "ملازمت حاصل کرنے کے لیے اور عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں بیوہ نہیں ہوں بلکہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی تھی اور یہ کہہ۔۔۔"

مالک نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے خیال میں وہ ایک کارآمد عورت تھی۔ موجودہ وقت کی روٹی کے عوض سارے کام مفت انجام دیتی رہے گی اور اس کو گھر میں بھی آرام پہنچائے گی اس کے لیے اس نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "بس، زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمھیں میرے ہاں کام کرتے ہوئے آٹھ سال ہونے والے ہیں۔ میں تمھارے کردار سے بخوبی واقف ہوں۔ ہم شام کو ہی نکاح کرلیں گے۔"

شادی کے بعد اس کا کام اور بڑھ گیا۔ وہ رات کو سونے کے لیے لیٹتی تو اس کا بدن تھکن سے چور ہوتا تھا۔ اس کے شوہر کو زندگی میں کسی چیز سے محبت تھی تو وہ پیسہ تھا۔ وہ پیسہ بچا کر بڑا خوش ہوتا تھا۔ شادی کے بعد اس کے بڑھاپے کو تحفظ مل گیا تھا۔ اپنی بیٹی کے اخراجات کے لیے جو رقم وہ زبیدہ کو بھیجتی تھی۔ اس میں اس نے اضافہ کردیا تھا لیکن اب وہ اپنی بیٹی سے ملنے قصبے نہیں جاسکتی تھی۔ یہ دکھ اس کے دل کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ قصبے کا نام بھی ہونٹوں پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ اگر وہ وہاں اپنے شوہر کے ساتھ جاتی تو اسے ساری بات کا علم ہوجاتا۔ پیسے سے محبت کرنے والا شخص کیسے برداشت کرتا کہ اس کا پیسہ ایک غیر شخص کی اولاد پر خرچ ہو۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے دل پر صبر کی سل رکھ لی۔

اس کی شادی کو چار سال ہوگئے۔ اس کا شوہر بدمزاج ہوگیا۔ اب وہ کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کرکے اس پر ہاتھ اٹھانے لگا تھا۔ اس کے بعد وہ بے چینی سے ٹہلنے لگتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ لیکن چپ رہتی۔ مگر ایک روز اس کے شوہر کے لیے خاموش رہنا مشکل ہوگیا۔ کسی بات پر جب وہ اسے پیٹ پیٹ کر تھک گیا تو بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ جب سانس اس کے قابو میں آیا تو وہ بولا: "تم ایک ناکارہ عورت ہو۔ گائے جب بچھڑا پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوتی تو اسے قصاب کے حوالے کردیتے ہیں۔ تمھیں کوئی اندازہ نہیں ہے کہ میرے پاس کتنی دولت ہے۔ میرے مرنے کے بعد اس دولت کا وارث کون ہوگا؟ کیا کبھی تم نے بھی غور کیا ہے؟"

بیٹی کی جدائی نے اس کے دل کو چھلنی کر رکھا تھا شوہر کی مار سہہ کر اس کا بدن چھلنی ہوچکا تھا۔ آج جب شوہر نے منہ کھول ہی لیا تھا تو وہ بھی دل کا لاوا زبان پر لے آئی۔ آج اسے انجام کی پرواہ نہ تھی۔ وہ کانپتے ہوئے کہنے لگی: "ناکارہ میں نہیں تم ہو۔ شادی کا معاملہ طے کرتے وقت تم نے میری پوری بات نہیں سنی تھی۔ کیونکہ تمھیں شادی کرنے کی جلدی تھی۔ بقیہ بات میں تمھیں آج بتاتی ہوں پہلے شوہر سے میری ایک بچی موجود ہے

<u>ہماری تاریخ</u>

اسلامی غیرت و حمیت کی ایک مثال

شمس الحق ندوی

سورج غروب ہوئے دیر ہو چکی تھی، رات کی تاریکی نے دنیائے انسانیت کو اپنے سیاہ دامن میں چھپا لیا تھا۔ جب میں وادی میں داخل ہوا تو پوری فضا میں سناٹا ہی سناٹا چھایا ہوا تھا، بستی میں پہونچا تو بیواؤں، بوڑھی عورتوں اور مردوں کے روتے چلانے اور آہ و بکا کی مبہم آوازیں سنائی دینے لگیں، میں بھی غم میں ڈوب گیا اور طبیعت نے بے اختیار ایک گھر میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہاں جو کچھ میں نے دیکھا وہ دل کو بیقرار اور روح کو بے چین کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ایک عورت جو سراپا ماتم بنی تھی رو رہی تھی اور رو کر کہہ رہی تھی، اے حکم تو ہماری بھی خبر لے، تو نے ہم سے یہاں تک بے توجہی برتی کہ دشمنوں نے ہمیں بیوہ اور ہمارے بچوں کو یتیم و بے یار و مددگار بنا دیا ہماری زندگی برباد ہو گئی۔ سورج کی ضیا بار شعاعیں بھی ہماری غم کی دنیا میں اجالا نہیں کر پاتیں، تم اپنوں سے اتنے بے خبر کیوں ہو ذرا ہماری دلسوز آہوں کو تو سنو عزتیں لٹ گئیں۔ بستی کے جوان شہید کر دیئے گئے عورتوں کو بیوہ، بچوں کو یتیم اور بوڑھوں کو بے سہارا بنا کر چھوڑ دیا گیا، اب ہم ہیں اور رنج و غم کا ایک اتھاہ سمندر، عورت کا چہرا اترا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی میں نے اس سے پوچھا، تم پر کیا مصیبت آ گئی اس نوحہ و ماتم کا سبب کیا ہے؟ عورت نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی آواز میں سوال کیا تم کون ہو؟ میں نے کہا تمہاری ہی طرح ایک عرب ہوں، عورت نے قدرے امید و اطمینان کے لہجے میں کہا خدا کا شکر ہے ایک عرب عورت اپنے بھائی عرب ہی سے شکایت کر رہی ہے یہ جواب دیتے ہوئے عورت گھر کے کسی گوشہ کی طرف چلی گئی ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا اور دودھ سے بھرا ہوا ایک پیالہ لے کر واپس ہوئی اور معذرت کرتے ہوئے کہا اے بھائی گھر خالی ہو چکا ہے۔ انگریز دشمنوں نے ہم پر حملہ کیا مال لوٹ لے گئے مردوں کو قید کیا جوان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے بوڑھوں اور بچوں کو بے سہارا چھوڑ گئے میں اپنے ایک کام سے سرقسطہ گئی ہوئی تھی واپس ہوئی تو گھر خالی پایا سوائے بوڑھی عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کے کوئی نہیں عمر کا باقی حصہ رونے اور نوحہ کرنے میں گذار رہی ہوں عورت کی بات میرے دل پر بجلی بن کر گری میں نے اپنے پر قابو پاتے ہوئے کہا، بہن رو ؤ نہیں جلد ہی خلیفۃ المسلمین تمہاری مدد کے لئے اپنا لشکر بھیجیں گے۔

رات کسی طرح گذری صبح ہوتے ہی میں گھوڑے پر سوار ہوا اور قرطبہ کی طرف روانہ ہو گیا، قرطبہ پہونچتے ہی گھر گیا، اپنے کپڑے وغیرہ ٹھیک کئے اور فوراً خلیفۃ المسلمین حکم کی خدمت میں حاضر ہوا جو کچھ دیکھا تھا وہ حکم کو سنایا اور کہا ایک عورت تمہارا نام لے کر پناہ مانگ رہی تھی اور تم سے مدد چاہ رہی تھی خلیفہ کے چہرے پر فکر کے آثار ظاہر ہوئے اور واقعہ کی تفصیل چاہتے ہوئے انھوں نے کہا خدا کی قسم میں اس کی مدد اور فریاد رسی میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گا تاآنکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں فوج کے ذمہ داروں کو بلا بھیجا۔ سپاہیوں کو تیاری کا بگل بجا دیا گیا، خلیفہ نے افسوس بھرے لہجے میں کہا ہم عیش و طرب کی زندگی گذار رہے ہیں اور ملک میں ایسی بیوائیں اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کی زندگی رنج و غم میں ڈوبی ہوئی ہے، اس نے فوجوں کو کوچ کا حکم دے دیا۔ یہ سپاہی بھی اسلامی غیرت و حمیت کا پتلہ تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی اس بے جا حرکت کا اچھا جواب دیا۔ آن کی آن میں انھیں شکست دے کر مسلمان قیدیوں کو آزاد کرایا اور کھوئے ہوئے مال و متاع کو واپس لے لیا۔

ہم ذرا تأمل سے کام لیں اور دیکھیں تو آج بھی ان انگریزوں نے ذہنی، فکری اور ثقافتی طور پر ہمارے بے شمار مردوں، عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں کو نہ صرف ہم سے چھین لیا ہے بلکہ ان کا کام اب بھی جاری ہے

کوئی ملک نہیں جو اس ہاری ہوئی جنگ کو پھر سے جیتنے کی جرأت کرے اور ان اجڑے ہوؤں کو پھر سے بسائے بلکہ وہ الٹا اسی میں شامل ہو جاتا ہے اسی رو میں بہنے لگتا ہے لیکن بات اب صرف انگریزوں کی نہیں رہی انھوں نے ہر جگہ اپنے ایجنٹ پیدا کر دیے ہیں کتنے خاندان ہیں جو فساد و بربریت کی نذر ہو چکے ہیں کتنی شریف عصمت مآب مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں ہیں جو فحش لٹریچر، عریاں تصویروں اور گندے افسانوں اور سینما کی نذر ہوتی جا رہی ہیں کتنی معصوم روحیں اسی سیلاب بلا خیز کی زد میں ہیں۔ ان باطل کے داعیوں نے کتنی حرم سراؤں کے پردے الٹ الٹ دیئے کتنی سادہ دل اور پاک طینت و باعصمت لڑکیوں سے حیا و شرم کی چادریں اتار دیں، دینی اسلامی احکام و شعائر کی نفرت بٹھا دی، نوخیز دلوں میں شکوک کو دلوں میں اتار دیا، جوانوں کے ذہن و فکر کو بدل دیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جنگ اب بھی جاری ہے اس لوٹ مار میں کمی تو کیا بلکہ روز بروز زیادتی ہے نہ جانے کتنی بلکتی ہوئی روحیں فریاد کناں ہیں کتنی کراہتی . . . .
اور سسکتی ہوئی روحیں جو کسی معتصم کو آواز . . . .
دے رہی ہیں لیکن کون ہے جو اس کا جواب دے، باپوں کے دلوں سے اولاد کی محبت غائب ہو چکی ان کو بچوں کے آرام و آسائش کا پورا خیال ہے مگر ان کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں یہ تک جاننے کی زحمت نہیں کرتے کہ اسکولوں اور کالجوں میں جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے وہ زہر ہے یا قند۔ شادیوں اور دعوتوں میں تو ہزاروں لاکھوں روپئے تو خرچ کئے جا سکتے ہیں مگر اس ہاری ہوئی جنگ کے لئے اگر کوئی قدم اٹھانا ہو اور کوئی رقم درکار ہو تو یہ ان کے لئے موت سے کم نہیں آخر اس سوئی ہوئی قوم کی تاریک رات کب روشن ہوگی، ان کی امڈتی ہوئی گھٹائیں کب چھٹیں گی، ان کے گرے ہوئے خیمے کب نصب کئے جائیں گے، اس کی کھوئی ہوئی طاقت کب واپس آئے گی، اس کی تہذیب و ثقافت کے مرجھائے، کمھلائے ہوئے چمنستان میں کب بہار آئے گی اور اپنی اندرونی خانہ جنگی و اختلافات باہمی سے کب فرصت ملے گی۔

(بشکریہ تعمیر حیات۔ لکھنؤ)

کیا آپ کا پتہ تبدیل ہونے والا ہے اگر ایسا ہو تو اسکی اطلاع دفتر کو قبل از وقت دیں۔ ایسا نہ ہو کہ پرچہ روانہ ہو جائے اور آپکی اطلاع بعد میں پہنچے ایسا ہوگا تو آپ کو روانہ شدہ پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔

حریمی دسترخوان

کا نیا اڈیشن شائع ہو گیا۔ قیمت مجلد نو روپیہ ادارہ حریم کی تیار کردہ اس کتاب کے متعدد اڈیشن شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ہر گرہست خاتون اس کتاب کو اپنی لائبریری میں ضرور رکھتی ہے۔ آپ بھی طلب فرمائیں۔

ہدایات

کن لوگوں سے نہ ملنا چاہئے۔

- خود غرض اور لالچی سے • بدکار اور مکار سے۔
- دوست کے دشمن اور دشمن کے دوست
- جنھیں نہ جانتے ہوں ان سے • جن سے نہ ملنے کی ہدایت والدین کریں۔

شکایت یا برائی نہ کرو

- اپنی قسمت اور زمانہ کی • اپنے مکان کی تنگی کی۔
- اولاد کے سامنے اپنے بڑوں کی • غیر کے سامنے دوست کی
- ماں باپ اور استاد کی • رخصت کے بعد مہمان کی۔

مرسلہ:۔ پی۔ آر تبسم بیگم (دھاتم باڑی)

نعت رسول اکرمؐ

جب کوئی عاشقِ خستہ حال آگیا ۔۔۔ میری نظروں میں روئے بلال آگیا
حشر میں جب گنہگار مضطر ہوئے ۔۔۔ بخشوانے حلیمہؓ کا لال آگیا
میری نظروں سے سارے حسیں گر گئے ۔۔۔ سامنے جب نبی کا جمال آگیا
جب ہوئی حق سے معراج میں گفتگو ۔۔۔ اپنی امت کا ان کو خیال آگیا
وہ زمین جنتوں کی نگاہوں میں ہے ۔۔۔ جس کے دامن پہ اشکِ بلال آگیا
سب تو پیتے رہے جام کوثر مگر ۔۔۔ میں نے ساقی کو دیکھا تو حال آگیا

میں تو فیروز جنت کے لائق نہ تھا
وہ تو کہئے کہ ان کو خیال آگیا

فیروز نظامی

تبصرات

رضوان لکھنؤ

بچوں کو دینی تعلیم دے کر دینی معلومات میں اضافہ کرنے والا مشہور ماہنامہ ہے جو محمد ثانی حسنی، محمد حمزہ حسنی، امامہ حسنی اور میمونہ حسنی کی ادارت میں گذشتہ ۲۵ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اسی ماہنامہ کا ایک خاص نمبر مرحوم مولانا محمد الحسنی کے مضامین کا انتخاب لے کر جنوری، فروری کے مشترکہ شمارے کی حیثیت سے شائع ہوا ہے جس کی قیمت پانچ روپیہ ہے لیکن سالانہ خریداروں کو بلا قیمت جنوری فروری کے پرچوں کی حیثیت سے دیا گیا ہے۔

مولانا محمد الحسنی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ جن کی تحریروں کی تعریف مولانا ابوالحسن ندوی صاحب اور حکیم عبدالقوی صاحب مدیر صدق جدید کریں، ان کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ صد درجہ معیاری ہوں گی۔ انھیں تحریروں کے نمونے سولہ مضامین کی شکل میں اس خصوصی نمبر میں شامل کیے گئے ہیں۔ انھیں پڑھنے کے بعد ہر وہ قاری بھی مرحوم کی علمی ادبی اور دینی صلاحیتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے گا۔ مرحوم محمد الحسنی کو اردو ہی میں نہیں عربی فارسی زبانوں پر بھی غیر معمولی عبور حاصل تھا جس کے شاہد مرحوم کے وہ تراجم ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا محمد الحسنیؒ ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم کے فرزند تھے۔ جن کا مطب مرجع خلائق تھا اور جن کی خدمت میں اکثر میں بھی حاضری دیا کرتا تھا۔

ہر صاحب ذوق کو چاہیے کہ رضوان کا یہ خصوصی نمبر ضرور پڑھے اور اپنی لائبریری میں رکھے۔

فردوس گمشدہ

مجموعہ کلام جناب محمود سلطانپوری۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ کتابت طباعت اور کاغذ معیاری۔ ضخامت ۱۱۰ صفحات۔ قیمت پندرہ روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ شمع بستی پھاٹک سکینہ دولت بیگم سلطانپور اور اسلامیہ پبلیکیشنز سول لائن الہ آباد۔

کتاب اترپردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

کتاب کا انتساب محمود صاحب نے یوں کیا ہے۔

بصد خلوص و محبت بہ احترام تمام
ادب نواز، سخن سنج، فن شناس کے نام

شعرا کے کلام کی واہ واہ بس مشاعروں میں ہوتی ہے، وہیں ان کے کلام پر سر دھنے جاتے ہیں، لیکن جب وہ شائع ہو کر بازار میں لاتے ہیں تو نہ تو انھیں ادب نواز خریدتے ہیں، نہ سخن فہم، نہ فن شناس۔ اور یہی اردو کے سلسلہ میں سب سے بڑا المیہ ہے۔

محمود صاحب کا کلام کتاب کے ۹۴ صفحات تک اس قابل ہے کہ بار بار پڑھا جائے۔ لیکن نہ جانے کیوں اس سے آگے کے ۱۶ صفحات نظموں کے عنوان سے اس شاعری میں شامل کیے گئے ہیں جس میں کوئی مصرعے دو لفظی ہوتے ہیں اور کوئی دس بیس لفظی۔ ایک نظم ملاحظہ فرمائیں۔

میں نے
جیسے کتاب بنائی
ایک دوسرا چہرہ طلوع ہوا
اور
دیکھتے دیکھتے
"میرا" میں"
"تو" میں بدل گیا

لیجیے نظم ہو گئی۔ نہ جانے اس طرح کی بکواس کا شمار شاعری میں کیسے ہوتا ہے۔ اب محمود صاحب کا رنگ تغزل ملاحظہ کریں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے اشعار کہنے والا شاعر، اس کو شاعری کیسے سمجھتا ہے۔

اطاعت بھی بہ طرز عاشقی ہو تو بہت اچھا
فرشتوں میں بھی کوئی آدمی ہو تو بہت اچھا

دونوں ہاتھوں میں لیے کشتیٔ دل آتی ہے
موج صد رنگ دبحر آپ کی انگڑائی ہے

دیکھ سکتے ہو اگر یہ بھی تماشہ دیکھو
بستر گل پہ بہار کی انگڑائی ہے

تم ہی کہتے ہو شکست جفا کی نہیں تو ہم
پھر دیر اور حرم کشش [illegible] نہ دیکھے

بس اس لیے کہ حسن کی رسوائیاں نہ ہوں
ہیں میری فرد جرم میں ان کے گناہ بھی

ذوق غم امتیاز کیا جائے
دل نشیب و فراز کیا جائے

سنیے تو میری بات سمجھے تو میری بات
یہ وہ نہیں ہے بات، کوئی اور بات ہے

اس عنوان کے تحت حریم کی بہنوں کی ہر سال صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور کم سے کم الفاظ میں لکھی جائے۔ خبر کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جو خبریں ۲۰ر تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ تاخیر سے چھپتی ہیں۔ ہر خبر علیحدہ کاغذ پر لکھی جائے۔ ایک سے زائد خبر بھیجیں تو ضرور لکھیں کہ کون سی خبر پہلے شائع کی جائے

● خریدار نمبر ۱۰۲/۳۰۰۹۷ آپ نے نام خود غلط لکھا تھا اس لیے تصحیح شائع نہیں ہو سکی

ولادت اطفال کی خبریں

● بیگم نجم الدین (سیتاپور) میری بہن اور بہنوئی کے گلشن حیات میں ۱۳ر جنوری ۱۹۸۱ء بروز منگل بوقت ۶ بج کر ۲۰ منٹ (صبح شام کی تفصیل نہیں ہے) اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سا فرزند عطا فرمایا۔ نام۔ محمد سلمان قرار پایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک نومولود کو عمر خضری عطا فرمائے والدین اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے

● بے بی لبنیٰ زریاب رومی (آغاپور۔ بیگو سرائے) میرے ممانی کلیم عارف دلہن ممی کے چمن حیات میں دوسری بار بتاریخ ۲۵ر بروز بدھ (مہینہ نہیں لکھا) بوقت پونے تین بجے ایک دلکش پھول کھلا۔ ننھے کا نام ہم نے آصف رکھا۔ خدائے قدوس سے دعا ہے کہ سورج کی کرنوں کی طرح ہمیشہ جگمگائے اور فخر خاندان بنے۔

● عشرت فرحت (میسور) ہماری پیاری دیدی مسرت (بنت فضل الحق مینو زیب النساء) خریدار حریم اور بہنوئی کلیم صاحب کے گلشن حیات میں ۱۱ر مارچ ۱۹۸۱ء کی شام کو ۷ بجے ایک چاند سی کلی کھلی۔ نام صحیحہ شیریں رکھا گیا۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ اسے عمر طویل بخشے صاحب اقبال بنائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

● عذرا رب، شاہدہ رب (رحیم آباد۔ سمستی پور) میرے بھیا شاہد رضا کی صاحبزادی صبیحہ پروین اور داماد عزیز الہیٰ کے چمن حیات میں اللہ پاک نے ۹ر فروری ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بوقت ۷ بجے شام پہلی بار ایک چاند سی گڑیا عطا فرما کر میرے بھیا دبھابی کو پہلی بار نانا نانی بننے کا شرف بخشا۔ اللہ مبارک کرے۔

پیغامات نشاط

● کہکشاں جبین، شمع جبین (شیر گھاٹی۔ گیا) میری پھوپھی زاد بہن تنویر صبا اور نوشے بھائی رضی احمد ایڈوکیٹ (فرزند مسعود احمد صاحب مونگیر) کی شادی ۳۱ر اکتوبر کو بمقام دھرم پور سائنس پوری، چمپارن میں بخیر و خوبی انجام پاگئی۔ خدائے پاک سے دعا ہے کہ دلہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

● شاہین بانو (امراوتی) میرے دوست دامن دستگیر دلد شری گلاب راؤ نیتر جی کی شادی میری پیاری سہیلی پرمیلا بنت سونا جی باڑی مادھی سادر کر کے ساتھ امراوتی راجہ پیٹھ میں ۳ر فروری کو بخیر و خوبی عمل میں آئی۔ اللہ پاک دونوں کو شاد و خرم رکھے

● نجمہ خاتون (علی گڑھ) میری ہمشیرہ عزیزہ سعدیہ سلمہا (دختر ڈاکٹر ایم، آر صدیقی صاحب مرحوم) کی شادی معین الدین قیصر، پروجیکٹ انجینئر ای پی آئی (فرزند خالد الدین صاحب) دہلی کے ساتھ ۸ر مارچ ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت سہ پہر پر کاش لاج، علی گڑھ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

● نکہت پروین (آنولہ) میرے پھوپھی زاد بھائی مختار الدین (فرزند سیع الدین صاحب) کی شادی نزاکت النساء بیگم (بنت حاجی ظہیر الحق) سے ۲۰ر مارچ ۱۹۸۱ء بمقام آنولہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو شاد و خرم رکھے۔

● ثمرہ ناز، نازلی (پرنام بٹ) میرے خالہ زاد ماموں شاہ الحمید عرف مشتاق احمد (فرزند جناب ذی کے عبد الجبار) کی شادی خانزاد آبادی شکیلہ عرف شازیہ، بنگلور کے ساتھ ۵ر مارچ ۱۹۸۱ء بروز جمعرات شادی محل بنگلور میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

● میرے محترم کرم فرما جناب نذر محمد خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر مقیم نینی تال کے فرزند سرفراز سلمہ کی شادی سائرہ سلمہا دختر نیک اختر الطاف احمد خاں صاحب مرحوم) سے ۲۶ر مارچ ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بمقام رامپور بحسن و خوبی انجام پائی۔ ۲۹ر مارچ کو ڈلیوزی اسکوائر نینی تال کے پر فضا ماحول میں نذر صاحب نے اپنے

۱۹۸۰ء اور احباب کو دعوت ولیمہ دی۔ کاش میں بھی شریک ہو سکا ہوتا افسوس کہ سفر کے قابل نہیں رہا۔ بہرحال میری دلی دعا ہے کہ سرفراز سلمہٗ کی ازدواجی زندگی پُر مسرت گذرے۔

● عزیزی اقبال اشرف سلمہ (پسر اشرف علی خاں مرحوم و نواسہ جناب عبدالحق خاں صاحب مرحوم) کی شادی عزیزی پروین احمد سلمہا (دختر جناب احمد علی خاں صاحب) سے ۱۵ر مارچ ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت ایک بجے دن بمقام کوٹھی منصور علی خاں صاحب، محلہ بشیرت گنج لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ دلہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں اپنی محترم بھابی بیگم عبدالحق خانصاحب مرحوم، و عزیزی انجمن آرا بیگم سلمہا، والدہ اشرف سلمہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ نسیم انہونوی

انتقال پُرملال کی خبریں

● محترم شان الہٰی نوری صاحب (جیمس نٹ ویر آگرہ) کے خط سے ان حادثات کا علم ہو کر بہت افسوس ہوا۔ موصوف کے برادر مکرم جناب (شفاعت الہٰی صاحب کے سب سے بڑے فرزند آفتاب الہٰی کا عین جوانی العمر میں بمقام کراچی انتقال ہو گیا۔ مرحوم سے شان الہٰی صاحب کی بھانجی کی شادی ہوئی تھی۔ دوسرا حادثہ عارف الہٰی صاحب کے انتقال کا ہے جو ۱۷ر مارچ ۱۹۸۱ء کی صبح کو ۴ بجے اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے مرحوم شان الہٰی صاحب کے بھانجے تھے اور حریم و نسیم بک ڈپو کے دیرینہ معاون تھے۔ مرحوم کی صاحبزادی کی شادی میں چند سال قبل میں آگرہ بھی گیا تھا۔ اللہ پاک مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور محترم شان الہٰی صاحب اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

شریک غم (نسیم انہونوی)

● نجمہ فضل حق (راجپور۔ غازی آباد) میں بڑے دکھ اور صدمہ کے ساتھ تحریر کر رہی ہوں کہ میرے پیارے بھائی حاجی عارف الہٰی صاحب مالک فرزند نٹ ویر کمپنی، آگرہ ۱۷ر مارچ ۱۹۸۱ء بوقت صبح چار بجے اپنے رشتہ داروں کو تڑپتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے افسوس کہ مرحوم میرے تنہا بھائی تھے۔ اللہ پاک کی مشیت کہ اس نے انھیں بھی مجھ سے جدا کر دیا۔ دعا ہے کہ پروردگار عالم انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● شمس النساء نجمہ (مدراس) بہت دکھ کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے ماموں سید احمد مولانا صاحب کا ۸ر فروری ۱۹۸۱ء کو بمقام کولمبو اچانک انتقال ہو گیا۔ افسوس کہ مجھے مرحوم کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہو سکا۔ مرحوم کی زوجہ محترمہ زلیخا سید احمد صاحبہ آپ کے حریم کی خریدار ہیں۔ دعا فرمائیے کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ بخشے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مجھے اس حادثہ سے دل صدمہ پہنچا، اس لیے کہ آپ کے خاندان سے میرا اور حریم کا قدیمی تعلق ہے (نسیم انہونوی)

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی باتیں

● آسمان چار ستونوں پر قائم ہے۔ یقین، صبر، عدل اور جدوجہد۔
● گناہ کو چھوڑ کر تمام معاملات میں لوگوں سے اتفاق کرنا حسن خلق ہے
● معاف کرنے میں عجلت کرنا انتہائی شرافت ہے۔
● اوقات فرصت کو غنیمت جانو، جو جا کر پھر نہیں آتے۔
● انتقام میں جلد بازی کریموں کا شیوہ نہیں۔
● جو چھوٹے ہاتھ سے دیتا ہے وہ لمبے ہاتھ سے پاتا ہے
● سخاوت کر کے احسان جتانا بری کمینگی ہے۔
● اصل عقلمند اپنی خواہشوں پر غالب آتا ہے۔
● عقلمند اپنے آپ کو پست کر کے بلندی حاصل کرتا ہے اور نادان اپنے آپ کو بڑھا کر ذلت اٹھاتا ہے۔
● حسن اخلاق انسان کا رفیق اور ادب اس کی میراث ہے

عالیہ نشاط (رام پور)

بقیہ پسندیدہ اشعار ——— صفحہ ۲۳ کا

دنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش
ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا لیا

مرسلہ: نازش ہدی (ودھیاد)

ہر گھڑی انکار تصور، ہر گھڑی انکار خیال
دل انھیں کیا دے دیا، جاں بڑی مشکل میں ہے

مرسلہ زینت حامر (   )

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان پر ہو، موزوں، سنجیدہ اور پاکیزہ ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے اشعار شائع نہیں کیے جاتے۔ ہر ماہ کا شعر علیحدہ علیحدہ کاغذ پر لکھا ہونا ضروری ہے۔ مئی کے لیے عنوان ہے "نظارہ" اور جون کے لیے (آئینہ)

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مرسلہ پیدائش تبسم بیگم (دانجباڑی) مرسلہ سلمیٰ (رام پور)
مرسلہ۔ زاہدہ جبین (کرنول)

ترے خیال کی جب دل نے روشنی ڈالی
رہ حیات میں ہم نے نہ تیرگی پائی

مرسلہ۔ روحی اختر (آرہ)

لرز رہا تھا ظن جس خیال کے ڈر سے
وہ آج خون رلاتا ہے دیدۂ تر سے

مرسلہ۔ شہناز مجاہد (دانداپا)

آئینہ دیکھ کر خیال آیا ❖ تم مجھے بے مثال کہتے تھے

مرسلہ: صفدا کلام روحی (بنگلور)

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

مرسلہ: نور جبین (اکبر پور۔ رجھٹا)

خیال خام ہے اپنوں سے فائدہ پانا
صدف کے کام کسی دن گہر نہیں آتا

مرسلہ: ساجدہ بیگم، شہناز بیگم (رنگاز اپیٹا)

خیال ترک محبت کی خیر ہو یارب
مگر اک سست نگاہوں کی وہ جو ستم گر ہو۔

مرسلہ: نجمہ انصار (شاہ شکل)

مجھے تمہاری جدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دنیا میں پاس ہو میرے

مرسلہ: نیلوفر گوڑے (دیولاپور)

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

مرسلہ: زبیدہ بتول، سیدہ بتول (آمبور)

ہے خیال حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے مری گور کے اندر کھلا

مرسلہ: کشور جہاں شمسی (دیلی جیتا)

خوب ہے یہ خیال کی دنیا، نقش ماضی جہاں ابھرتے ہیں
دل کی بے رنگ دنور داری سے، یاد کے قافلے گزرتے ہیں

مرسلہ: قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ، لیکن کون جانے، کون سمجھے دل کا حال

مرسلہ: شاہین بانو ایم یوسف (امراوتی)

گھر خیال دلربا کا دل ہمارا ہو گیا
کس کی ملکیت تھی ہائے قبضہ کس کا ہو گیا

مرسلہ: مس نسیمہ عزیز زبرہ پورہ۔ بھاگلپور)

اے دوست ہم کو ہجر کی راتوں کا خوف کیا
تیرا خیال جاگا کرے گا، سویا کریں گے ہم

مرسلہ: جیش امام حمیرہ نسیم کوہر تاج (آمبور)

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

مرسلہ: کشور سلطانہ (لکھنؤ)

دیکھ کر جو خیال غم جاناں مجھ کو
گردش وقت دبے پاؤں گزر جاتی ہے

مرسلہ: مہوش شرافت (رامپور)

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مرسلہ: نجم السحر (کرنول)

بقیہ پسندیدہ اشعار صفحہ پر

طرح اب بھی دل میں بیٹھ رہا تھا اور کسک پیدا کر رہا تھا۔ وہ رہ کر اس کے ذہن میں بجلی چمکتی! اور کرنل کمال احمد کا بارعب۔ پُروقار بوڑھا چہرہ سامنے ابھر آتا۔ بار بار اماں کا پیار لہجہ کانوں میں گونجتا ۔!

"تمھارا اور تمھارے باپ کا نام احمد پر ختم ہوتا ہے۔ اپنے لوگوں کو ڈھونڈھ نکالنا۔ خدا کرے کہ تم اپنوں میں پہنچ جاؤ۔"

وہ پریشان تھا۔ اگر وہ کرنل صاحب سے کوئی استفسار کرتا تو وہ اسے دیوانہ سمجھتے کیا ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جس کا نام احمد پر ہو۔ اس کا بچھڑا ہوا باپ ہوتا۔ اور یہ وقت و موقع ایسے استفسار کے لیے مناسب بھی نہیں تھا۔

عجیب عجیب خیالوں کے بھنور میں چکراتا وہ گرد و پیش سے بے خبر بنچ پر بیٹھا تھا۔ احراز نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ وہ دیوار سے سر ٹیکے مسلسل چھت کو گھورے جا رہے تھے۔ ان کا دل ناامیدی کے پاتال میں چلا گیا تھا۔ کوئی آواز ان سے کہہ رہی تھی۔

"جو کچھ ہوا برا ہوا۔ اور جو کچھ ہوگا بہت برا ہوگا!"

شاید۔ ان کے عزیزوں کو مسلسل مدتوں، راحت و آرام اور فراغت کا بڑا بھیانک تاوان بھرنا پڑے گا!۔ احتشام اور گیتی جان۔ دونوں مریض ہیں۔ اگر احتشام کی کوئی چھوٹی سی خبر بھی بیگم نیصان کو مل گئی تو پھر ان کا زندہ رہنا معلوم۔ ان کی بوڑھی ذات کے متعدد الیئے احراز سے پوشیدہ نہیں تھے۔! اب تک سب نے ان سے احتشام کے مرض کی بات چھپائی تھی!

"اللہ" انھوں نے کربناک سانس لی اور ادھر ادھر چلتی پھرتی نرسوں کو دیکھنے لگے۔ (باقی آئندہ)

"کیا تعجب کہ اولے پڑ رہے ہوں۔ سردیوں کی بارش ہے" اقبال صاحب نے کہا۔

"اتنے دنوں سے ممی تھیں گھر اچھا لگ رہا تھا۔ نازیہ نے کہا اور ایک مجبور سی ہنس دیں: میں نے کتنا کہا کہ ابھی ہفتہ بھر اور نہ جائیے۔ یہاں رہ بہت بہلی رہتی ہیں بے چاری کا جانے کہاں سے اختلاج کا مرض ہوگیا ہے۔ اے اللہ! امی ایسے برے دورے پڑتے ہیں ان پر کہ کسی طرح مزاج قابو میں نہیں آتا۔!"

"بیٹی۔ یہ آج کا نہیں۔ پرانا مرض ہے۔ پچیس سال پرانا" اقبال صاحب نے کہا اور آہ بھر کر بولے۔ "دراصل میں کہتا ہوں یہ مرض نہیں۔ مسلسل غموں کا ردعمل ہو۔ بیچاری کو بچوں ہی کے داغ کیا کم لگے ہیں۔ یہ داغ سب سے گہرا اور پائیدار ہوتا ہے۔ خدا سب کو محفوظ رکھے۔"

"اں سچ ہے۔ بے چاری" بیگم نے کہا: "اگر وہ بے چارہ لڑکا ہوتا تو شاید اب تک" انھوں نے احراز اور مکرم پر نظریں دوڑائیں پھر آہ بھر کر بولیں: "اب تک مکرم کی عمر کا ہوتا۔ بدنصیب۔"

مکرم کا دل قلابازیاں کھانے لگا۔ کیا یہ رات اس کی زندگی میں کوئی انقلاب آفریں رات ہوگی۔ کیا کہنے چلی ہیں بیگم صاحبہ۔ اس تیز سردی میں بھی اسے اپنا پیشانی ٹھنڈے پسینے سے بھیگتی معلوم ہوئی! گال دہکنے لگے اور وہ مبہوت سا انھیں تکنے لگا۔ مگر دونوں کے لیے خاموش ہوگئی تھیں۔ مکرم پر سے دو صدیاں بیت گئیں۔ بڑی مشکل سے اس نے ہمت کر کے حلق تر کرکے اور حواس اکٹھا کر کے پوچھا۔

"وہ لڑکا۔ اسے کیا ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ!"

"اے ہیئے بیٹا۔ ان کے نصیب۔ بیگم نے کہا: لڑکے کو خسرہ نکلی آئی تھی کسی کو پتہ نہ چلا وہ نامراد ظاہر ہوئے بغیر پیٹ میں اتر گئی۔ اچھا خاصا ڈھائی برس کا ہنستا کھیلتا بچہ تین دن میں چٹ پٹ ہوگیا۔! بڑا شدید غم رہا انھیں جیسنوں سنبھل نہ سکیں

مکرم کے سینے سے ایک لمبی سانس نکلی۔ اور وہ خالی خالی آنکھوں سے دہکتی ہوئی انگیٹھی کو تکنے لگا!۔

"میاں۔ وہ کھڑکی کھول کر دیکھو۔ بارش کی رفتار میں کچھ کمی ہوئی؟" اقبال صاحب نے اس سے کہا۔ اس نے اٹھ کر باہر باغ میں کھلنے والی کھڑکی کھولی۔ اچانک بجلی چمکی اور ایسا لگا جیسے ہزاروں تیز چمکدار چاقو زمین پر گر کر بکھر گئے ہوں۔ تیز چمک کے بعد باغ میں بلا کی تیرگی چھا گئی۔ اور پھر وہی تیز بارش کا جھڑاکا۔ ہواؤں کا شور۔ بادل کی گرج۔ ننھے والی دھار کی شکل میں پانی گر رہا تھا!۔ اور کھڑکی سے ایک قطعہ آسمان گھیرے کالے ابر میں لپٹا دکھائی دے رہا تھا!۔

"بند کرو۔ بند کرو۔" احراز جلدی سے بولے۔ "مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئی۔ ہمارے پھاٹک پر۔ دستک دے رہا ہے۔!"

"اس وقت؟"۔ اقبال صاحب چونکے!۔

"میں نے بھی سنا ہے۔" نازیہ نے دہشت زدہ ہو کر کہا۔ "شاید کوئی راہ گیر ہے۔ سنیئے آواز پھر آئی۔"

اچانک پردہ ہٹا اور سیمی کی شکل دکھائی دی۔ "ابا جان۔ کوئی پھاٹک پر کھڑا ہے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ جب میں پانی پینے برآمدے میں آئی تب میں نے آواز سنی۔ کوئی بھائی جان کا نام لے کر پکار رہا تھا!"

"چلو دیکھیں۔" احراز صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ مکرم اور اعجاز بھی اٹھ کے باہر نکلے۔ بارش کی پرواہ نہ کر کے وہ لوگ جلدی جلدی نیچے اترے — واقعی کوئی دروازے پر تھا۔

"چوکیدار کو کیا ہوا!؟" احراز بڑبڑایا۔

"وہ ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر گاؤں گیا ہے۔" مکرم نے کہا۔

نہ ہوئی۔ ماں کی دھندلی بوڑھی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ لب کانپ رہے تھے۔ مگر انھوں نے بیٹے کا ہاتھ اپنے مرتعش ہاتھوں میں لے لیا۔ پھر جھک کر کان کے بال برابر کیے اور پیشانی چومی۔ تب بڑے بڑے قطرے آنسوؤں کے احتشام کے چہرے پر گرے!

"نہ روئیے امی۔ آپ دل بھاری کر رہی ہیں۔ کرنل صاحب نے آپ سے کہا کہ نہیں دیا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ آپ کے رونے سے میں پکے بیمار ہو جاؤں گا۔ امی چپ ہو جائیے۔ آپ کو خدا کا واسطہ"

"بیٹے تمہاری پل پل کی بلا اللہ دور کرے۔ تمہاری ہزاری عمر ہو۔ مجھے تو ہسپتال کے بستر پر تمہیں پڑا دیکھ کر رونا آیا۔ بیٹا اب سینے میں درد تو نہیں ہے۔" اماں نے آنسو پونچھے لہجہ سنبھال لیا اور سیدھی ہو بیٹھیں۔ پھر وہ ان سے حوصلہ افزا باتیں کرتی رہیں۔!

دو دو منٹ کے لیے ان سب سے مل کر چلے گئے!۔ مگر اب باہر احتشام کے دوستوں اور طلبا کا ہجوم ہونے لگا تھا!۔ احراز جب انھیں تسلی دے کر جانے لگے تو احتشام نے کہا: "تم پھر میرے پاس آنا۔ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں:"

"گھبراؤ نہیں۔ نرس جلدی کر رہی ہے۔ میں تمہارے وارڈ کے باہر ہی بیٹھا ہوں۔ سیمی نہیں آئیں؟"

"صبح سویرے سے باہر بیٹھی ہے۔ بلاؤں!؟"

"نہیں!" احتشام نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ احراز باہر آ گئے۔ نرس نے دروازہ بند کر دیا۔ سب لوگ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے!۔ [illegible] گیا!۔

مکرم جو خود کو احتشام کا مرہون احسان سمجھتا تھا۔ وہ بھی [illegible] ساتھ ہی ٹھہر گیا!۔ اس کے ذہن میں پھر آندھیاں سی چلنے لگیں تھیں! احتشام کی [illegible] مرض کی فکر، تشویش اور بے قراری۔ اور دوسری طرف۔ وہ زہرہ کا ...

نے بھی ایک گہری سانس لی۔ اور بولے: "خیر۔ اپنی تمام کوششیں تو میں کروں گا۔ نتیجہ
خدا کے ہاتھ ہے۔ تم ٹسٹنگ انسٹرومنٹس لے کے چلو۔ میں ابھی آتا ہوں!"
"جی بہت اچھا:"

احتشام نے آہستہ سے کروٹ موڑا۔ اپنے بوڑھے ستم رسیدہ باپ کو دیکھ کر ان کی
عجیب حالت ہوئی۔ بجلی کے کوندے کی طرح پچھتاوا ان کے ذہن میں آیا۔ کاش
انھوں نے کسی طرح اس صدمہ کا اثر قبول نہ کیا ہوتا۔ جس نے ان کا یہ حال کیا تھا۔
دنیا میں صرف محبت ہی ایک چیز نہیں۔ انھوں نے اپنے ضعیف ان باپ کو اپنی محبت
پر قربان کر دیا۔ افسوس۔ کیا انجام ہوگا اس بوڑھے باپ اور مکزور ماں کا۔ پھر ایک
ٹیس ان کے دل سے اٹھی اور سارے جسم میں درد کی سخت ٹیسیں پھیل گئیں۔!

"بیٹے۔ کرنل صاحب نے بڑا اطمینان دلایا ہے۔ وہ سینے کے امراض کے ماہر ہیں۔ کہہ
رہے تھے کہ معمولی چیک اپ کی خاطر تمھیں ایک آدھ روز کے لیے یہاں روکا ہے۔
انشاء اللہ کل تم گھر آ جاؤ گے۔ پریشانی کی کیا بات ہے۔ آج کل یہ مرض عام ہو گیا ہے
بیٹا۔ چلتا رہے گا۔!"

احتشام کا دل رونے لگا۔ بظاہر وہ مسکرائے: "ہاں ابا جان۔ میں سمجھتا ہوں تھوڑے
سے سینے کے درد کو میں نے خوامخواہ اتنی اہمیت دی۔ آپ بھی نہ گھبرایئے۔ میں
بالکل اچھا ہوں:"
"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے:" چچا میاں کے جھریوں پڑے چہرے پر سرخی سی بکھر گئی۔
"اب تو سینے میں چبھن نہیں ہوتی۔!"
"بالکل نہیں:"
"یا خدا احسان ہے تیرا:" انھوں نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیے۔
اور جب ضعیف ماں ان کے پہلو میں آ بیٹھیں۔ تب ضبط کی کوشش احتشام سے

"اُبھی۔ یہ تو چچا میاں کے ملازم کی آواز ہے۔ خدا رحم کرے:" احراز کے منہ سے
نکلا اور انھوں نے جھپٹ کر دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے [illegible] صاحب؟" احراز نے پریشان ہو کر پوچھا: "آپ اس وقت
تیز بارش میں۔ سب خیریت تو ہے۔!؟"

"خیریت کہاں [illegible] میاں:" ملازم نے [illegible] کہا: "مغرب کو اچانک
چھوٹے سرکار کی طبیعت خراب ہو گئی۔ پہلے تو گھر ہی پر کرنل کمال احمد کو بلا کر دکھایا۔
مگر جب [illegible] ان کی [illegible] تو کرنل صاحب انھیں اپنے ساتھ
ہسپتال لے گئے۔ بڑی سرکار [illegible] پریشان ہیں۔"

احراز [illegible] پریشان ہو گئے: "مگر [illegible] کیا آخر ہوا کیا تھا؟"

"پتہ نہیں صاحب۔ [illegible] کچھ [illegible] آتا:" ملازم بولا: "اب مجھے صاحب نے
آپ کے پاس دوڑایا۔ بارش کے [illegible] تھے مگر بارش کا زور بڑھتا ہی گیا
تو صاحب نے [illegible] ابھی خبر نہیں دی۔ بیگم صاحبہ
[illegible] وہ آپ کا انتظار کر رہے ہوں۔
اکیلی ہیں۔ بے حد گھبرا رہی تھیں۔!"

"ارے بھئی [illegible]" احراز [illegible] صاحب نے پکارا: "کیا ہوا
کیا بات ہے [illegible]؟"

"میں چلتا ہوں میاں۔ آپ جلدی کیجئے۔ کرنل صاحب اپنے ذاتی نرسنگ ہوم
میں صاحب کو لے گئے ہیں:" صابر علی یہ کہہ کر تیز تیز قدم بڑھاتا اپنے مکتبے کی طرف
بڑھ گیا۔

سارا قصہ سن کر اقبالی صاحب اور بیگم سخت پریشان ہوئے۔
نازیہ نے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا: "اللہ بھی ان پر رحم کرے۔ میں کہتی تھی

تھی کہ احتشام بھائی ہمیشہ گم صم رہتے ہیں۔ سوچتے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بیماری
بلالیں گے۔ وہی ہوا ؟"

اللہ پاک بھابی پر رحم کرے۔ ارے تو چلئے پھر چلیں " بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں
نہیں۔ تم لوگ نہیں " اقبال صاحب نے مفلر اسٹینڈ سے اتار کر گلے اور کانوں میں
لپیٹتے ہوئے مرتعش لہجے میں کہا " اس وقت میں اور احراز جاتے ہیں۔ صبح
میں دیر کتنی ہے۔ صبح کو تم لوگ جا کے دیکھ آنا۔ مکرم۔ بیٹے چلو تمہارے سوا ڈرائیو
چلانا کسی کو نہیں آتا "

اباجان۔ میں بھی چلوں : اعزاز بولا۔

ہاں ہاں آؤ" اقبال صاحب نے کہا۔ مکرم گیرج سے کار نکالنے بھاگا!۔

بارش اب بھی موسلا دھار ہو رہی تھی۔ موسم بدستور ہوشربا تھا مگر اب موسم
کی پرواہ کسے تھی!۔ اسی آندھی پانی میں وہ لوگ کرنل صاحب کے نرسنگ ہوم پہنچے
صابر علی ان کے انتظار میں لاؤنج میں کھڑا تھا۔ انھیں احتشام کے کمرے تک لایا۔
اقبال صاحب، احراز، مکرم اور اعزاز اس حالت میں وارڈ میں داخل ہوئے کہ
پانی ان کے لباس سے موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا!۔

کیا ہوا ؟" اقبال صاحب نے مدھم سرگوشی میں پوچھا اور خوفزدہ نظریں احتشام
پر ڈالیں جو اپنے سرد سفید بستر پر سیدھے لیٹے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔ پتہ چلانا دشوار
تھا وہ غافل تھے۔ بیہوش تھے یا بے خبر سو رہے تھے ؟۔

چچا میاں جن کی عمر ساٹھ سے اوپر جا چکی تھی۔! جو بہت بھاری بھرکم اور صاحب
تھے۔ خاندان کے بزرگ تھے۔ اور بے حد بہادر سمجھے جاتے تھے۔ جن کے وقار سے اور
جن کے سینے پر پھیلی ہوئی سفید گنجان داڑھی سے لوگ ڈر جاتے تھے۔ وہ اس وقت
سارے دم خم بھول چکے تھے۔ ان کی ہمت اور وقار بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں

انھوں نے امید و بیم میں ملی جلی سانسیں لیں۔! اور ایک دوسرے کو دیکھا۔
کم از کم۔ ہم انھیں ایک دفعہ اور دیکھ تو لیں: فیضان صاحب نے کہا۔
ہاں۔ مگر ایک ایک کر کے۔!" کرنل صاحب نے کہا۔
پھر وہ ایک طرف چلے گئے۔ اور احتیاطاً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے بعد بڑی آہستگی سے
اپنے اسسٹنٹ سے پوچھا " آپ کا کیا خیال ہے ... اس سلسلہ میں۔ میں تو کہتا ہوں
کہ یہ دوسرا کیس ہے جس میں ناکام رہوں گا۔ دل کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے"
لیکن جناب۔ آپ نے ان سب کو اطمینان دلا دیا ہے۔ کم از کم مسٹر احراز کو حالات
سے باخبر کرا دینا چاہیے۔ وہ بدترین صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار رہیں۔ اگر ایسی
وقت پڑے۔!"

یہ لوگ میرے پرانے واقفکار ہیں مسٹر امتیاز۔ میں ان کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔ ان
سب نے مجھ سے اچھی توقع رکھی ہوگی۔ میں ان کو نا امیدی کا پیغام نہیں سنا سکتا۔
یہ ٹھیک ہے کہ وہ اچانک کوئی بڑا صدمہ برداشت نہ کرسکیں گے۔ تو بھی۔ انھیں بیمار
کے متعلق کوئی حکم ناطق سنانا۔ نہیں۔ یہ تو سنگدلی ہے۔ ظلم ہے"

"کیا واقعی مسٹر احتشام بچ نہیں سکتے ؟ " ڈاکٹر امتیاز نے بڑی آہستگی سے پوچھا
میں حیران ہوں۔ بھائی " کرنل صاحب نے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ لیے
اور پر تفکر لہجے میں بولے " یہ نوجوان، طاقتور اور مضبوط آدمی کہاں سے ایسی
ہلاک بیماری لگا لاتے ہیں۔ یہ تو خیر طبی دنیا میں تحقیق ہو چکا ہے کہ عورتوں کی بہ نسبت
مردوں کو دل کی بیماری زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن۔ ایک جوان صحت مند اور ... خیال
سرور آدمی کی دل کی بیماری۔ اتنی خطرناک فیصلہ کن بیماری۔ بس موت جس کا علاج ہم
کیا سامنے رکھتی ہے۔ ؟"

ڈاکٹر امتیاز نے ایک طویل سانس لی اور متاسفانہ انداز میں چپ ہو گئے [illegible]

اسے آنکھوں ہی آنکھوں کے اشارے سے اتنا تو واضح کرنا تھا کہ اس نے اس کی پیش کش قبول کی۔

سبین نے پھر ایک بار بڑی گہری نظر اس پر ڈالی۔ اور بے ساختہ تعریفی احساس سے اس کا دل معمور ہو گیا۔

اس کے سینے میں بے شک پتھر رکھا ہوگا۔ مگر صورت۔ صورت کسی کے جذبات میں تلاطم پیدا کرنے کو کافی تھی!۔ وہ ایک معمولی خاندان کا فرد تو لگتا ہی نہ تھا۔ جاذبِ کشش کسرتی جسم، بانکا قد۔ خوبصورت شانے۔ چوڑی چکلی پر کشش پشت، چہرہ جاذبِ نظر۔ بڑی خوشنما آنکھیں۔ غم آلود۔ رحم طلب۔ ان آنکھوں کا سحر طلسم جیسا تقاضا جیسی تھا۔

سبین گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ مجرمانہ احساس سے اس کا دل دھڑکنے لگا ایک بیمار کی موجودگی میں وہ اس قسم کی باتیں سوچنے لگی تھی۔!

دفعتاً کرنل صاحب اپنے اسسٹنٹ سمیت اس طرح آتے نظر آئے!۔ چچا میاں، فیضان صاحب وغیرہ ان کا منہ تکنے لگے!۔

"ڈونٹ وری" وہ مسکرائے۔ احراز نے جن کا ذہن فی الحال کسی قسم کی تشویش یا فکر سے بوجھل نہیں تھا۔ ان کی مسکراہٹ کا تصنع بھانپ لیا۔ اور یکبارگی ان کا دل ایک عمیق گہرائی میں لڑھکتا چلا گیا!۔

اب ٹھیک ہیں؟۔ فیضان صاحب نے پوچھا۔

جی ہاں۔ جی ہاں۔ ایسی کوئی بات نہیں" کرنل صاحب نے کہا۔ "لیکن اپنے ساتھیوں کی رائے کی بہ نسبت کم از کم صرف میں یہ چاہتا ہوں کہ مسٹر احتشام کو ہفتہ بھر یہیں رہنے دیا جائے۔! چونکہ وہ کمزور ہو گئے ہیں۔ اور کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ آپ حضرات اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔ یوں بھی ہسپتال میں اتنے افراد کی موجودگی مناسب نہیں۔ ہے!"

تبدیل ہو چکا تھا!۔ کرنل خانم کرسی اسٹول سے اٹھے اور اقبال صاحب کو الگ گوشے میں لے آئے۔!

"تمھارے پاس سے جب ہم لوگ واپس آئے۔ تبھی میں نے محسوس کیا کہ ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی!۔ انھوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا کہ ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مگر میرے اصرار پر بھی وہی ڈاکٹر کے پاس جانے پر راضی نہیں ہوئے۔ دس گیارہ بجے رات کو اچانک ان کے دل میں درد ہونے لگا!۔ خدا بچائے۔ ساری علامتیں قلب کی بیماری کی تھیں۔ میں نے اسی وقت بھائی کمال احمد کو بلوایا۔ انھوں نے ان کا معائنہ کیا مجھ سے تو کچھ کہا نہیں۔ مگر اپنے ساتھ احتشام کو یہاں لے آئے!" وہ ہاتھ ملنے لگے "میں بھی ساتھ آیا۔ تمھاری چچی گھر پر اکیلی ہیں۔ فیضان کو بھی اطلاع نہیں دی۔ اس کی بیوی خود بیمار رہے۔ بس۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر تمھیں بلوایا۔! سخت پریشانی تھی"

ہم لوگ بھی جاگ ہی رہے تھے۔ بھائی صاحب" اقبال صاحب نے کہا "پتہ نہیں ماحول کی ہولناکی کا اثر تھا کہ احتشام کی سوء مزاجی کا۔ دل قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اچھا تو کمال احمد صاحب نے کیا مرض تشخیص کیا؟"۔

گہری آہ بھر کر چچا میاں نے کہا "دل کی بیماری۔ میاں۔ نامراد دل کی بیماری۔! مجھ میں نہیں آتا کیوں اس نے اپنے دل پر کسی بات کا اثر لیا! بظاہر تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اور کل تو اس کی دیرینہ خوشی کا سامان میں نے کیا تھا۔ تمھاری لڑکی سے وابستگی اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی"

ارے اس لہجے میں آپ کیوں کہہ رہے ہیں بھائی صاحب" اقبال صاحب نے کہا "خدا احتشام کو سلامت رکھے۔ پہلا معمولی سا حملہ ہے۔ علاج سے ٹھیک ہو جائے گا۔"

خدا کرے!" چچا میاں نے کہا اور پھر اپنے اسٹول پر جا بیٹھے۔

اعزا و اقربا از گرم صم اعتشام کے پائینتی کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر زردی تھی۔ اور صاف ظاہر تھا کہ وہ خود کو جا بجا جس قدر پر امید دکھائیں۔ درحقیقت پر امید نہیں تھے! اکرم جو ایک غیر متعلق آدمی تھا بحیثیت ایک ملازم کے ان کی گاڑی چلاتا ہوا یہاں تک آگیا تھا وہ بھی اپنے دل میں اضطراب محسوس کر رہا تھا جیسے احتشام کا اندرونی کرب اسی کی ذات سے ہو کر گزر رہا ہے! خاموش کھڑا احتشام کی شکل تک رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کل وہ اسی وقت کتنے خوش تھے۔ طعام خانے میں بیٹھے ہنس رہے تھے ایاز بیٹھے ... انسان اپنے آنے والے لمحات سے کتنا غافل اور بےخبر ہوتا ہے۔ اگر اسے مستقبل کا علم ہو جاتا تو وہ آنے والے اچھے یا برے دونوں سے متاثر ہو کر فرط خوشی یا دفور غم سے ختم ہو جاتا!۔ احتشام کو کیا معلوم تھا۔ ٹھیک بارہ گھنٹوں بعد وہ ایک ہلکے اور نا مبارک مرض میں مبتلا ہو کر ہسپتال کے بستر پر آ لیٹیں گے!؟

سب خاموش تھے۔ گفتگو کا کوئی موضوع بھی نہ رہ گیا تھا۔ باہر فضا میں قدرت اپنے جوش و غضب کا خوفناک مظاہرہ کر رہی تھی۔ ہسپتال کا ماحول بھیانک اور خوفناک تھا!۔

دفعتاً ایک ڈیوٹی ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ وارڈ میں آیا۔ اس نے جھک کر بڑی آہستگی سے احتشام کے چہرے پر نجانے کیا علامتیں ڈھونڈیں۔ کچھ نوٹ اپنے شیٹ پر لکھا۔ نہایت دبی زبان سے نرس سے کچھ کہا!۔ اور پھر ان سب پر ایک نظر ڈالی۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ ان کے چہروں پر کتنا کرب، درد اور خوف چھایا ہوا تھا۔ خاص کر وہ معمر بزرگ۔ جن کی لمبی سفید داڑھی پر اب بھی اسے ایک آدھ قطرہ آنسو کا چھپا ہوا نظر آ رہا تھا!۔

ڈونٹ وری!۔" ڈاکٹر کی زبان سے نکلا: آپ سے کرنل صاحب نے کچھ تو کہا

مقابلہ کر سکے گی؟ اپنے ماں باپ کو کیا جواب دے گی؟۔ اس کے اپنے عزیز رشتہ دار دنیا والے۔ اُف مالک!۔

... دل و دماغ دلی پر آمادہ تھا۔ جذبات پر کس کا اختیار ہے! یہ تو پسند ناپسند کا معاملہ ہے۔ اسے ایک معیاری خوبرو انسان سے زیادہ معمولی ملازم اگر اچھا لگا تو کیا! اس کی خاموشی، بےکسی اور بےبسی کا وہ مجبور احساس جو اس کی المناک آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے!۔ وہ معصوم آنکھیں جو خاموش رہ کر بولتی رہیں۔ وہ آدمی جو انسان کے سیل رواں میں بہتا بہتا اس کے در سے آ ٹکرایا تھا!۔ وہ بہرحال حق رکھتا تھا اسے چاہا جا سکتا تھا۔ کون نہیں جانتا۔ محبت کے کھیل نرالے اور انوکھے ہوتے ہیں۔ کیا بڑے بڑے شہنشاہوں نے صرف محبت کی خاطر اپنے تخت و تاج نہیں ٹھکرا دیئے۔ اس نے اگر اس معمولی آدمی سے اپنے احساسات وابستہ کر دیئے تھے تو کون سا ایسا گناہ کبیرہ کیا تھا!؟

لیکن اکرم۔ اس نے پھر ایک لرزتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ اور اپنے اظہار خیال کا اثر اس کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ ... سے ناکامی ہوئی۔ کوئی احساس تفاخر جذبہ ... یا پھر مسرت پنہاں اس کے چہرے پر اسے نظر نہ آئی۔ بلکہ اکرم نے تو نظر اٹھا کے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں! ایسا انداز تو اس کا پچھلی رات کو بھی تھا ہمیشہ کی طرح سیدھا سادا خاموش اور مغموم سا وہ اقبال صاحب کی فرش پر دھیان ان کے پہلو میں بیٹھا رہا!۔

جب سوچتے سوچتے اس کا ذہن اس نقطہ پر آ کر ٹھہرا کہ اکرم نے اپنے زعم مردانگی میں اسے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس کے جذبۂ الفت کی پذیرائی کر سکے تو وہ ایک آگ میں جل گئی۔ کیا سمجھتا ہے یہ آدمی اپنے آپ کو۔ حالانکہ اس نے اس کی مدد کی تھی ... کب کی ہے جتنا یاد رہے دو ہزار روپے اس کی مٹھی میں دبا دیئے تھے ...

سب کو چائے کیک اور بسکٹ دینے لگا۔!

سبین ایک گوشے میں کرسی کے کنارے لگی ہوئی متوحش نظروں سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل اس ننھی سی فاختہ کی طرح سینے میں سمٹ گیا تھا۔ جس کے پیچھے عقاب لگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سرخ دھند ابھر رہی تھی۔ سینے میں بے شمار دہشتوں کا انبوہ تھا۔ اس کا جسم تپ رہا تھا اور آنکھیں سلگ رہی تھیں۔

خدا جانے کیوں۔ اس کی نگاہیں ام کر کے بے لوث، سیدھے سادے چہرے پر پڑتیں اور پلٹ جاتیں جیسے کسی نے ایک جھٹکے سے ان کا مرکز بدل دیا ہو۔ وہ خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ بڑی حماقت کی تھی اس نے۔ گر پڑی تھی اپنے مقام سے۔ اپنی نگاہ میں اب اس کا کوئی درجہ نہ رہ گیا تھا۔ اس وحشت بھری صبح کو۔ جب وہ اپنے بیمار بیگم کے قریب تھی۔ امید و بیم کی جانگسل کشمکش میں، وہ بدنصیب مجرم اپنی سنگین حالت اور ہیجان کو ارشی معصوم کے چہرے پر تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی! اس خطرے اور اندیشے سے بھی بے خبر کہ خود اس کی حرکت کا ردعمل اور یل پر کیا ہوگا؟

آدمی کو دوسرے نظروں سے گرا دیں تو کبھی اٹھا بھی لیتے ہیں۔ لیکن وہ انسان جو اپنی نگاہوں سے گر جائے۔ اسے کوئی نہیں اٹھا سکتا!۔

شقوت نہ ایک وورخی روح کی مانند وہ اپنے تکلیف دہ اور بے حد اذیت ناک خیالوں سے کسی حریف کی طرح لڑ رہی تھی!۔

دل و دماغ کی جنگ بے حد خوفناک ہونے لگی تھی۔

دماغ ملامت کر رہا تھا۔ اس نے یہ کیا غضب کیا۔ ایک گمنام اجنبی اور ملازم کے سامنے اظہار محبت جیسی ہول اور لغو حرکت کی تھی۔ زمانہ کیا کہے گا۔؟ ایک عالی خاندان۔ بہایہ اعلیٰ معیار کے انسان کو ٹھکرا کے احمد نے اپنے ڈرائیور سے دل ہارا ہے کیا کہیں گے لوگ؟۔ وہ اپنوں بیگانوں کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی تحقیر کا کیونکر

ہوگا: انھوں نے تو اطمینان دلا دیا تھا: چچا میاں نے بڑے صبر و ضبط سے جواب دیا مگر بیٹے اصلی حقیقت ہمیں تم بتا دو۔ کیا بات ہے انھیں ہوش کیوں نہیں آ رہا ہے؟"

آجائے گا جناب:" ڈاکٹر نے کہا: لیکن جب بھی انھیں ہوش آئے آپ لوگ ان کے سامنے فکر و تشویش کا اظہار نہ کریں۔ اور اس طرح پریشان صورتیں بھی ان کے حق میں مفید اثرات نہیں پیدا کر سکتیں۔ لہٰذا آپ خود کو خوش و خرم ظاہر کرکے ان کے سامنے آنا چاہیئے۔ براہ کرم ان سے ہرگز مت پوچھئے کہ ان کی طبیعت کیسی ہے یہ ہم آپ کو بتا دیا کریں گے!"

اس نے ان پر ایک ترحم آمیز نظر ڈالی اور بے آواز کمرے سے نکل کر چلا گیا!۔

وہ رات ان کے لیے بڑے عذاب کی رات بن گئی۔ وقت کی طاقتور سُئیاں ایک جگہ مضبوطی سے گڑ کر رہ گئی تھیں۔ اضطراب و دہشت کا ایک ایک لمحہ ان پر گراں تھا۔ رات کا شامیانہ بدستور ان پر تنا ہوا تھا! یوں لگ رہا تھا جیسے اس رات کی کبھی سحر نہ ہوگی۔!

دوسرے دن ... ومتین و فوزیہ نے فون کرکے احتشام کی خیریت دریافت کی تھی اور پھر صبح کی آمد کے ساتھ نازیہ، بیگم اور سبین ہسپتال پہنچ گئے!۔

کرنل صاحب جب آئے تب احتشام نے بھی ساری رات کی گراں خوابی کے ساتھ آنکھیں کھول دیں۔ گہری تھکن ان کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ اور مایوس آنکھوں کے نیچے سرمئی حلقوں میں پسینے کی چمک واضح ہونے لگی تھی!۔

اپنے آس پاس اپنوں کو دیکھ کر وہ بے حد دست سے مسکرائے۔!

کرنل صاحب ان کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے!۔ سینے پر استھے ٹس کو پ رکھا اور انگلیاں نبض پر۔ پھر وہ سر جھکا کر ناپائیدار بے وفا دل کی دھڑکنیں سننے لگے!۔

بالکل ٹھیک!" معائنے کے بعد کرنل صاحب نے مسکرا کر کہا "معمولی سا اختلاج

کو آپ نے ہارٹ اٹیک کا نام دے کر بستر پکڑ لیا ہے۔ احتشام صاحب۔ یو آر کوائٹ ویل
بس۔ آج دن بھر کے ٹریٹ منٹ کے بعد میں آپ کو اپنے ہسپتال سے بھگا دوں گا۔"
یہ کہہ کر انھوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اور وہاں موجود تیمار داروں کے تن مردہ میں
ان کے بے فکر قہقہے نے ایک نئی روح دوڑا دی۔!

"سچ مچ۔ ڈاکٹر صاحب؟" احراز نے خوش ہو کر پوچھا۔

"ہاں ہاں" انھوں نے اپنی موٹی موٹی بھویں تان کر کہا۔ "ٹھہریئے۔ ابھی تفصیلی
چیک اپ کے بعد میں آپ کو صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ مگر آپ حضرات۔ یہاں
مجمع نہ لگایئے۔ باہر آ کے بڑے ہال میں تشریف رکھیئے۔ یا پھر میں اپنا ریسٹ روم کھلواتا
ہوں۔ اطمینان سے وہاں بیٹھ جایئے۔ دراصل زیادہ لوگوں کی موجودگی بیمار کے لیے ٹھیک
نہیں ہوتی!"

"لیکن آپ تو کہہ رہے ہیں۔ یہ اچھے ہیں!" جلدی سے اقبال صاحب نے اعتراض
کیا۔ "تب بھی" کرنل صاحب نے کہا "نرسنگ ہوم کے اصول کے خلاف بات بھی تو ہے
اچھا آپ حضرات نرس کے ساتھ جایئے!"

طوعاً و کرہاً وہ نرس کے ساتھ بڑے ہال کی طرف چلے گئے!

لاؤنج میں پہنچ کر احراز نے فیضان صاحب کے دفتر ٹیلی فون کیا۔ انھیں اس
سانحہ کی اطلاع دی۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ بھی پہنچ گئے!۔ وہ سب چپکے چپکے
باتیں کرنے لگے! فیضان صاحب نے بے حد پُر تفکر انداز میں اپنی کنپٹیاں جکڑ لیں
"ارے کیا بتاؤں بھائی صاحب۔ نجانے اس واقعہ کا اثر ہے یا موسم کی نحوست —
ساری رات بیگم بھی بے چین رہی ہیں۔ پل بھر کے لیے جو آنکھ لگی ہو تو کیا مجال
بیٹھے بیٹھے سویرا کر دیا۔ الامان والحفیظ۔ کیا قیامت کا سماں تھا رات کو!
ایسے موسم میں آپ کیسے لائے احتشام کو یہاں تک؟"

لانا پڑا میاں" چچا میاں نے کہا "اور یہ میرے خیال میں اچھا ہی ہوا۔"
"چچا میاں۔ کیا حرج ہے کہ آپ ایک پیالی کافی پی لیں" احراز نے کہا "اب تو
خدا کے فضل سے کرنل صاحب نے اطمینان دلایا ہے...!"
"منگوا لو بیٹے۔ بھوک پیاس کس کی باقی ہے۔؟" وہ بولے۔ اور پھر آہ بھر
کر رہ گئے!۔

"خداوند کریم میرے بچے کی خوشی راس لائے" چچی ماں کی آنکھوں میں آنسو
بھرے ہوئے تھے "کل کتنا خوش تھا۔ اس کی خوشی میں میری ہی نظر لگ گئی۔ جان
کا صدقہ اگر جان ہے تو پروردگار مجھے اٹھا لے۔ اسے بخش دے۔ اس نے دنیا میں
ابھی کیا دیکھا ہے۔!"

"ایسی باتیں نہ کیجئے بھابی جان" بیگم نے سمجھایا "یہ تو آپ دور پار ہی لڑکے
کا برا چیت رہی ہیں! میں نے اپنے کانوں سے سنا کرنل صاحب نے بالکل اطمینان
دلایا ہے۔ شام تک گھر بھجوا دیں گے۔ اللہ جل جلالہ آپ کو ان کی خوشیاں دکھائے
آپ اگر احتشام کے سامنے اس لہجے میں باتیں کریں گی تو ان کا کیا حال ہوگا؟"

"مرض کے ساتھ ساتھ علاج بھی تو موجود ہے" اقبال صاحب [illegible] "ہم
کوئی بری بات کیوں سوچیں۔ اللہ سے ہر وقت اچھی امید رکھنی چاہیئے"

"ہزار چاہتی ہوں۔ بھیا۔ مگر۔ دل بیٹھا جا رہا ہے" انھوں نے [illegible] اور رحم
طلب نظروں سے آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔ جہاں رات کے [illegible] کا
نام ونشان بھی نہ تھا۔ مطلع صاف تھا اور نکھرا ستھرا آفتاب تیزی سے چمک رہا تھا۔
اس کی حرارت آفریں حیات خیز گرم کرنیں بھیگی زمین میں پیوست ہو کر [illegible] بخار
پیدا کر رہی تھیں!۔

دیا ز ادا عزاز جا کے قریبی کیفے سے کھانے پینے کا سامان لے آئے۔ ساجد علی

THE HAREEM

May.81

Rs. 1.30

ایڈیٹر

ایک بہن نے مجھ سے دریافت کیا ہے۔ سنا ہے آپ اپنے ایک بیٹے کی شادی کی فکر میں ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ جہیز لینا پسند کریں گے۔ یہ میں اس لئے دریافت کر رہی ہوں کہ بارہا آپ جہیز کی مخالفت میں کہہ چکے ہیں۔ جوابا عرض کر رہا ہوں کہ جہیز میں نے اپنی بیٹی کو ضرور دیا تھا۔ لیکن یہ جہیز نمائشی نہ تھا، جو بھی تھا یہ بہولت صندوق میں سما سکتا تھا۔ اس کی نمائش بھی نہیں کی گئی تھی جیسا کہ شاید آپ کو بھی علم ہو یہاں بالکل قریبی عزیز خواتین بھی ہر وقت عزالہ کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، جانتی تھیں کہ کیا دیا جا رہا ہے۔ جہیز بکسوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ اس میں ملبوسات، زیورات اور ایسی چیزیں ہی شامل تھیں جو بکسوں میں بآسانی بند کی جا سکتی تھیں، نہ ریفریجریٹر تھا، نہ صوفہ سیٹ، نہ ڈائننگ ٹیبل نہ ٹی۔ وی۔ نہ مسہری اور الماری نہ مشینیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے سمدھی قاسم بھائی یا ان کی اہلیہ ساجدہ بہن نے کسی بھی چیز کی فرمائش نہیں کی تھی، کبھی کسی چیز کی کمی کا انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ اشارۃً کنایۃً کہتے۔ ویسے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا میں بعد میں بھی اپنی بیٹی کو دیتا رہا۔ اس لئے کہ میری محبت اس کی متقاضی تھی۔ اس زمانے میں جہیز گراں نہیں گذرا، جو دیا وہ میری محبت کا تقاضہ تھا۔ تکلیف تو جب ہوتی جب مطالبات ہوتے، اور میں ان کی تکمیل میں زیر بار ہو کر عرصہ تک قرض ادا کرتا رہتا۔

جہیز کے خلاف جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اس کا مطلب یہی ہے جہیز کے سلسلہ میں لڑکے والوں کی طرف سے مطالبات نہ ہوں، جو کچھ لڑکی والے بھی بیٹی کو محبت کے تحت دے سکیں، اسے ہی بسر و چشم قبول کریں۔ کبھی شکوہ نہ کریں۔ بہو کو طعنے نہ دیں ۔۔۔ اگر جہیز اسی طرح دیا جاتا ہے اس خیال سے کوئی بری بات نہیں۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں، جن کے صرف ایک ہی لڑکی ہوتی ہے، اس لئے ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے، اسی بیٹی کا ہوتا ہے۔ وہ اسے جو بھی دے ڈالیں کم ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی

جو کئی اولادوں کے والدین ہوتے ہیں۔ رسم و رواج کے تحت جہیز [illegible] دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں، میرے خیال سے یہ ضروری ہے کہ [illegible] ہو کر جہیز نہ دیں۔ اپنے مستقبل کا خیال رکھتے ہوئے، بآسانی جو [illegible] سکیں اسی قدر دیں۔ اور لڑکے والوں کو چاہئے کہ بہو جو کچھ بھی لائے، بخوشی اس پر اکتفا کریں، اور خوش رہیں، کبھی بہو کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کہیں جس سے اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔

اب یہ سن لیجئے کہ اگر میری بہو کے ساتھ کچھ جہیز آئے گا [illegible] واپس نہ کر دوں گا کہ لڑکی والوں کو دل شکنی ہو۔ انشاءاللہ تعالیٰ، اگر میرے لڑکے کی شادی میری زندگی ہی میں ہوئی تو میرا کوئی مطالبہ نہ ہوگا۔ خدا کا [illegible] احسان ہے کہ میری شریک حیات عزالہ بھی ایسے ہی خیالات رکھتی ہیں [illegible] جہیز کی کوئی فکر نہیں وہ تو بس یہ چاہتی ہیں کہ لڑکی نیک و صالح ہو [illegible] لڑکی والے بھی شریف النفس ہوں خدا کے فضل و کرم سے [illegible] گھر میں موجود ہے۔

جہیز کا ذکر آ گیا ہے تو یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ جہیز کے سلسلہ میں جو نمائش لگائی جاتی ہے وہ نہایت معیوب بات ہے، یہ [illegible] ہے۔ ہزارہا خاندان ہر جگہ ایسے ہیں جو کافی دولت مند ہیں [illegible] کر بیٹی یا بیٹیوں کو جہیز دیتے ہیں، اس لئے کہ دے سکتے ہیں۔ [illegible] اگر دولت کی فراوانی ہے تو بیٹی کو کیوں نہ دی جائے، لیکن جو کچھ دیا جائے اس کی نمائش نہ کی جائے۔ شادی میں شریک افراد ایسے بھی [illegible] جن کی آمدنی محدود ہوتی ہے اور وہ بس برائے نام ہی جہیز [illegible] ایسے والدین کو عظیم الشان جہیز دیکھ کر بیحد دکھ ہوتا ہے [illegible] سکتے۔۔۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے [illegible] ہیں۔ ان کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ ہمیں بھی ایسا ہی [illegible] کرنا چاہئے جہاں شاندار جہیز مل سکے۔

اگر جہیز اس طرح دیا جائے کہ قریبی عزیزوں کے [illegible]

[illegible] نقصان نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ لوگ جہیز کی نمائش کرتے ہیں ان کا مقصد صرف نام و نمود ہوتا ہے۔ کاش وہ [illegible] سمجھ سکتے کہ [illegible] نام و نمود کا دوسروں پر کیا اثر پڑے گا۔

آپ بیٹی کو جہیز ضرور دیں مگر اسی قدر، جتنا آپ بآسانی دے سکیں۔ اور اس کی نمائش نہ کریں۔ جہیز بیٹی کو دیا جاتا ہے۔ دوسرے اسے دیکھیں تو اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ اگر آپ بیٹی کی محبت کے تحت جہیز دیتے ہیں تو اس طرح دیجئے کہ بیٹی ہی کو خبر ہو کہ آپ نے اسے کیا دیا۔

اپریل کا حریم

خدا کا شکر ہے کہ اپریل کا حریم وقت مقررہ پر شائع ہو گیا اس مرتبہ ہم مارچ ہی کو حریم کی کاپیاں مکمل کر کے پریس بھجوا دی گئی تھیں۔ [illegible] سرفراز پریس نے بھی تعاون فرمایا، اس لئے تاخیر نہیں ہوئی۔ خدا کرے کہ اب حریم اسی طرح پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہے۔ حالانکہ اس کی امید کم ہی ہے۔ گرمی کے ساتھ ہی ساتھ بجلی کی سپلائی اور زیادہ متاثر ہوتی جا رہی ہے۔ اگر بجلی نے ساتھ دیا تو شاید پھر حریم وقت سے شائع ہو، بہرحال ہماری جانب سے پوری کوشش ہوگی کہ [illegible] شائع کرنے کا ارادہ ہوتا رہے۔

آل انڈیا میرا اکاڈمی کا عظیم الشان جلسہ

۹ اپریل کی شب میں آل انڈیا میرا اکاڈمی کا جلسہ تقسیم اسناد ایسی شان کے ساتھ اقبال منزل لکھنؤ میں ہوا، جس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔

انعامات تقسیم کرنے کے لئے ڈاکٹر جگناتھ مسرا صاحب وزیر اعلیٰ بہار تشریف لائے تھے۔ ساتھ ہی ہمارے صوبہ کے ہردلعزیز اور شریف النفس وزیر اعلیٰ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے جلوہ افروز تھے۔ اقبال منزل کا سبزہ زار ادیبوں اور معززین سے بھرا ہوا تھا۔

اسی زمانہ میں لکھنؤ میں غیر مسلم اردو کانفرنس بھی ہو رہی تھی اس کے [illegible] کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی۔ میرا خیال ہے لکھنؤ میں عرصہ سے ایسا کوئی اجتماع نہیں ہوا۔ جس میں اتنے اور ایسے ممتاز ادبا، شعرا اور علمی ادبی شخصیتوں نے شرکت کی ہو۔

جناب مقبول احمد لاری صاحب، تنہا میرا اکاڈمی کے [illegible] روا رہیں

یہ بات قابل فخر ہے کہ ایک واحد شخصیت ہر سال ہزاروں روپیہ کے نقد انعامات اور سندیں اردو کے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں کو تقسیم کرتی ہے۔ میرا اکاڈمی کو تو حکومت کی اعانت حاصل ہے نہ کسی اور کی۔ شاید ہندوستان بھر میں ایسا کوئی ادارہ نہ ہوگا جو کسی فرد واحد کی ملکیت ہو اور ایسی دریا دلی سے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہو۔ بلاشبہ جناب مقبول احمد لاری صاحب جنھیں میں شانِ لکھنؤ اور جانِ لکھنؤ کہتا ہوں، قابل مبارکباد ہیں کہ اردو کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح کا کام انجام دے رہے ہیں۔

تین ادیبوں کو سند کے ساتھ ہی تین تین ہزار روپیہ نقد دیا گیا اور پچاس سے زائد اشخاص کو سندیں اور پانچ پانچ سو روپیہ عطا ہوا۔

اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا فرض سب سے پہلے بہار کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مصرا صاحب نے ادا کیا۔ سردست بہار کے پندرہ اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دیا گیا ہے اور جیسا کہ مصرا صاحب موصوف نے اپنی تقریر میں فرمایا، جلد ہی بقیہ اضلاع بھی اسی ضمن میں شامل ہو جائیں گے۔

ہمارے صوبہ کے منصف مزاج اور ہمدرد خلائق وزیر اعلیٰ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے بھی اردو کو سہولتیں بہم پہنچائی ہیں اور وعدہ فرمایا ہے کہ وہ کانگریس آئی کے اعلان کے مطابق اردو کو ۱۹۸۱ء کے اختتام سے پہلے ہی یوپی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ مرحمت فرما دیں گے۔

میرا اکاڈمی کا ایوارڈ مجھے بھی عطا ہوا ہے اور میرے محبان صادق ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب، ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب، ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب، عبد القوی دسنوی صاحب، امین سلونوی صاحب، [illegible] انصاری صاحب اور [illegible] حسین صاحب، کو بھی ایوارڈ ملا ہے، جس کے لیے میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

جشن کے اختتام پر تمام حاضرین کو بہترین قسم کا طعام پیش کیا گیا جس کا حوصلہ مقبول احمد لاری صاحب ہی اس زمانہ میں کر سکتے تھے میں تہ دل سے لاری صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انھیں ایسی شاندار علمی ادبی تقریب منانے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

نسیم انہونوی

کچھ اپنے متعلق

کافی عرصہ تک نفس کی روح فرسا تکلیف سے نجات حاصل رہنے کے بعد اب پھر مرض ابھر آیا ہے۔ لیکن پھر کرکے ایسی کمی محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کرے تکلیف اس سے زیادہ نہ بڑھے۔ عزیزی عائشہ پروین سلمہا اللہ تعالیٰ انتخابات الموکرنے گئی تھیں وہاں سے ہندوستان آتے ہی کلکتہ آنے کا پروگرام بھی تھا۔ لیکن اپنی کسی عزیزہ کی علالت کے سلسلہ میں سورت چلی گئیں اور میرے پاس نہ آسکیں، جس کا مجھے افسوس ہے۔ عائشہ سلمہا میرے لئے عجوہ کھجور بھی لائی تھیں، جو نجم السحر سلمہا کو دیں اور اب نجم السحر سلمہا کے ساتھ کلکتہ پہنچ گئی ہے۔ پھر کھانا شروع کر رہا ہوں خدا کرے کہ حسب سابق پھر مجھے اس سے سکون مل سکے۔

نسیم انہونوی

۱۰ / اپریل ۱۹۸۳ء

مفید معلومات

۱۔ بہترین ذکر لا الٰہ الا اللہ اور بہترین دعا استغفار ہے۔

۲۔ بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔

۳۔ بہترین انتقام کسی کو معاف کر دینا ہے۔

۴۔ بہترین ساتھی اچھی کتابیں ہوتی ہیں۔

۵۔ اولاد کے لئے ماں باپ کا بہترین تحفہ اچھی تعلیم و تربیت ہے۔

۶۔ یتیم وہ نہیں جس کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو، یتیم وہ ہے جس میں اخلاق نہ ہو۔

۷۔ دنیا نے ہمیشہ ناکامیوں ہی سے کامیابیوں کی بنیادیں مستحکم کی ہیں۔

۸۔ بہترین دولت اچھی یا اچھا شریک زندگی اور نیک و سعادت مند اولاد ہوتی ہے۔

مرسلہ۔ بیگم ہوشیار جنگ (بمبئی)

• مسکراہٹ دوستی کی کنجی ہے۔ • مسکراہٹ یاس کے بادلوں میں امید کی کرن ہے۔ • مسکراہٹ اظہار تشکر کا لطیف طریقہ ہے۔ • مسکراہٹ وہ زیور ہے جو خریدا نہیں جا سکتا۔ مسکراہٹ ایک ایسا جذبہ ہے جس کے پیچھے ہزاروں راز پنہاں ہیں۔

مرسلہ سیدہ محمدہ زینب اختر

(آرہ)

تبصرا

رنگ برنگے پھول۔ ترتیب شہناز حسین و خند کشور، ناشر: پبلیکیشنز ڈیویژن۔ پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی۔ سائز ۱۰×۸ صفحات ۹۰ کاغذ نہایت نفیس کتابت و طباعت معیاری۔ قیمت دس روپیہ

یہ کتاب اردو کے ایسے مایۂ ناز شعرا کی منتخب منظومات کا مجموعہ ہے جنہوں نے بچوں کے لئے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حالی، اقبال، نیر، محوی، افسر، اسمٰعیل تو وہ مشہور ہستیاں ہیں جنہوں نے بچوں کے لئے کافی معلوماتی اور اصلاحی نظمیں لکھی ہیں اور جنہیں شہرت حاصل ہوئی ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ ان شعرا کے علاوہ دوسرے بھی جن شعرا نے بچوں کے لئے اچھی نظمیں لکھی ہیں، ان کا انتخاب اس کتاب میں شامل ہے۔

کتاب بڑے سائز پر اس طرح شائع کی گئی کہ بچے دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ والدین کو چاہیئے کہ اسے خرید کر اپنے بچوں کو اس کی نظمیں پڑھائیں یا سنائیں تاکہ ان کے اخلاق سنوریں اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔

بہار مدینہ

مبارک ہوا ہے بیقرار مدینہ
بڑھا ہے یہ اضطراب مدینہ
الٰہی دکھا دے بہار مدینہ
کہ دل ہے بہت بیقرار مدینہ
وہاں کی ہے تکلیف راحت سے بہتر
گل سے بڑھکر ہے خار مدینہ
کبھی گرد کعبے کے رہوں میں تصدق
کبھی جا کے ہوں میں نثار مدینہ
کبھی لطف حج کا حاصل کروں
کبھی جا کے لوٹوں بہار مدینہ

سیدہ راحت افزا بیگم

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سید فضل الرحمٰن جعفری

وادی بطحا شرک اور بت پرستی کا مرکز تھی۔ اور انسان کی مقدس پیشانی انسان کے تراشے ہوئے پتھر کے سامنے جھکی رہتی تھی۔ یہ تاریخ عالم کا تاریک اور مہیب دور تھا۔ اس عہد میں خدا شناسی معدوم تھی اور پتھر کی مورتوں کو معبود قرار دے دیا جاتا تھا۔ اس تاریک اور اصنام پرستی کی فضا میں بطحا میں ایک ایسی شخصیت بھی موجود تھی جس کا دامن بتوں کی پرستش سے آلودہ نہ تھا اور جو دین ابراہیمی پر پوری طرح جمی ہوئی تھی اور وہ شخصیت قحافہ کے بیٹے ابوبکر کی تھی۔

وہ اپنی سادگی اور نرم خوئی اور نیک دلی کی وجہ سے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ لوگوں کے کام آتے تھے ان کا دل محبت سے معمور تھا۔ ان کے دل میں خدا کا خوف تھا۔ وہ سچے تھے اور ان کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح اجاگر تھی۔ وہ دین ابراہیمی پر قائم تھے۔ اس لئے شرک اور بت پرستی سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی جبین نیاز کبھی اصنام کے آگے نہیں جھکی۔ انھوں نے کبھی بتوں کو کارساز نہیں سمجھا۔ ان کا یقین تھا کہ یہ پتھر نفع پہنچانے والے نہیں۔ وہ دین ابراہیمی پر تھے۔ اس لئے توحید پرستی ان کا شعار تھا۔ قحافہ ان کے باپ تھے۔ وہ بیٹے کو بت پرستی کی ترغیب دیتے تھے۔ ایک بار وہ اپنے بیٹے کو بت خانے لائے اور ایک بت کے سامنے کھڑا کر کے کہا۔

"بیٹا! یہ تیرا معبود ہے تو اس کے سامنے سجدہ کر۔"

ابوبکرؓ باپ کا حکم سن کر خاموش رہے۔ باپ چلے گئے اور وہ اکیلے بت خانہ میں رہ گئے تھے۔ انھوں نے بت سے کہا۔

"اے بت! میں بھوکا ہوں مجھے کھانا کھلا۔"

وہ خاموش رہا۔ پھر انھوں نے کہا۔

"میں ننگا ہوں مجھے کپڑے دے۔" پھر بھی وہ چپ رہا۔ پھر انھوں نے [illegible] کر کہا۔

"میں یہ پتھر تجھ پر پھینکتا ہوں۔ اگر تو سچا ہے تو اپنے جسم کو بچا لے۔"

اس پر بھی اس کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی۔ پھر انھوں نے وہ پتھر اس پر زور سے پھینکا کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

مکے میں اس زمانے میں بے حیائی، بدکاری اور گناہ و فساد کے تمام کام ہوتے تھے۔ شراب، زنا، جوا، عداوت، خونریزی، ظلم و جور۔ لوگوں کی سرشت میں داخل تھی۔ ان قبیح عادتوں کی وجہ سے معاشرے میں ایک ہلچل اور تلاطم برپا رہتا تھا۔ ابوبکر کا دامن ان تمام بری عادتوں سے پاک تھا۔ وہ بڑے پارسا اور پاکباز تھے دیانت داری اور راست بازی ان کا شعار تھا۔ جب وہ اسلام لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار دینار تھے۔ اس کے علاوہ بکثرت مال تھا۔ اور غلام بھی تھے۔ چونکہ وہ قریش میں ممتاز تھے اور راست باز اور امین اور صادق تھے۔ اس لئے زمانۂ جاہلیت میں مقدمات کے فیصلے بھی آپ ہی کیا کرتے تھے۔ آپ بہادر بھی تھے آپ کی شجاعت ہمت اور بے جگری کا حال حضرت علیؓ سے پوچھو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "لوگو! جنگ بدر میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک سائبان بنایا تھا۔ پھر ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ آپؐ کی حفاظت کے لئے کسے چنا جائے۔ سب خاموش رہے۔ کسی میں محافظ بننے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر جو ہم میں سے آگے بڑھا وہ ابوبکرؓ کی ذات تھی۔ چنانچہ ابوبکرؓ نے اپنے ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر پاسبانی کے فرائض انجام دیئے جب کوئی کافر آگے بڑھتا آپ بڑھ کر اس پر وار کرتے اور اسے ڈھیر کر دیتے۔ اس لئے میں انھیں سب سے زیادہ بہادر سمجھتا ہوں۔"

دربار نبوی گرم ہے صحابہ کرام شمع نبوی کے گرد جمع ہیں۔ زبان نبوت سے لشکر کے لئے چندہ کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ تمام صحابہ توجہ سے سنتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ چندہ دینے کا ارادہ کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ وہ اس ارادے سے گھر گئے کہ وہ ابوبکرؓ سے زیادہ مال لا کر پیش کریں

گئے اور اس طرح اُن پر سبقت لے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مال کی وافر مقدار خدمت نبوی میں حاضر کر دی۔

ارشاد ہوا۔ اے عمرؓ! تم نے گھر میں کیا چھوڑا؟

عرض کیا: یا رسول اللہ! اسی قدر۔

پھر حضرت ابوبکرؓ اپنا مال لے کر حاضر ہوئے زبانِ نبوتؐ سے یہ آواز بلند ہوئی۔

اے ابوبکرؓ تم نے اپنی بیوی بچوں کے لئے کیا چھوڑا؟

عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ اور اس کا رسول۔

صحابہ کرام اس جواب کو سن کر حیران رہ گئے۔ اور حضرت عمرؓ بولے کہ خدا کی قسم! میں ابوبکرؓ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل بے شمار ہیں۔ آپ نے اسلام کو فروغ دینے میں بے پناہ قربانی دی۔ آپ نے غلاموں اور کنیزوں کو خرید کر آزاد کیا جو اسلام لانے کی وجہ سے مظالم و مصائب کا شکار تھے۔ ان میں بلالؓ تھے . . . عامر بن فہیرہ تھے اور ان میں زنیرہ، نہدیہ، لبینہ، اور ام عبیس بھی شامل تھیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا یہ دستور تھا۔ بوڑھی عورتوں کو جب وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوتیں تو خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارتحال کے بعد بعض فرقے مرتد ہو گئے تھے۔ گو عہد نبویؐ کے آخری ایام میں ہی اس کے آثار ظاہر ہو گئے تھے لیکن ارتداد کا کھلم کھلا اظہار نہ ہوا تھا۔ ہر فرقہ کے ایک ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ مدعیانِ نبوت میں ذوالخمار عنسی، مسیلمہ کذاب، اور طلیحہ اسدی شامل تھے۔ ذوالخمار کو فیروز دیلمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے حکم سے قتل کر ڈالا تھا۔ دوسرے مدعیانِ نبوت کا استیصال حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا۔ اس طرح ارتداد کی لعنت سے اسلام کا دامن پاک ہو گیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں آپ امامت رہے۔ دینی بصیرت عرفانِ شریعت اور ایثار و قربانی، ہمت و عزیمت اور احسان و تقویٰ میں بڑا درجہ رکھتے تھے اور اس پر آپ کی پوری زندگی گواہ ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رفاقت کا ہمیشہ شرف حاصل رہا۔ اسلام لانے کے بعد وصال نبویؐ تک آپ ہر جگہ ساتھ رہے ہر مشکل وقت میں صرف آپ کو خدمت اور پاسبانی کا شرف حاصل رہا۔ کبھی جدا ہونا گوارا نہ کیا۔ غارِ حرا میں ساتھ رہے۔ اُحد کی جنگ میں حنین کی جنگ میں اپنی شجاعت اور اسلام سے اپنی وابستگی اور جذب جنوں کے جوہر دکھائے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی خوشنودی کے لئے اپنا گھر لٹایا اور بیوی بچوں کو چھوڑا۔

آپ کو دینی بصیرت، صبر و استقامت اور حسن تدبیر کی ایسی صلاحیت عطا ہوئی تھی کہ آپ نے مرتدین کی سرکوبی کی [illegible] زکوٰۃ کا استیصال کیا مدعیانِ نبوت کو موت کے گھاٹ اتارا وصال نبویؐ کے وقت صحابہ کرام کو صبر و استقامت کی تلقین کی اور قرآن کی یہ آیت سنا کر رنج و اندوہ کے اثرات دور کئے جس کا ترجمہ

اور محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) محض رسول ہی تو ہیں ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم لوگ اس لئے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر جائے گا تو خدا کا نقصان نہ کرے گا۔ اور خدائے تعالیٰ حق شناس لوگوں کو جلد ہی عوض دے گا:

حضرت ابوبکر صدیقؓ ۲ جمادی الآخر ۱۳ھ کو علیل ہوئے اس وقت میں اسلامی لشکر دمشق کا محاصرہ کر رہا تھا۔ آپ کی علالت کا سلسلہ پندرہ دن تک جاری رہا۔ انتقال کے دن پوچھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کس دن وفات پائی لوگوں نے بتایا "دوشنبہ کو" آپ نے فرمایا

"مجھے امید ہے کہ میری موت بھی اسی دن ہو گی"

آپ محسن انسانیت، تاجدارِ نبوت، ختمی مرتبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے دو سال ۳ ماہ بعد مکے میں پیدا ہوئے یہودیوں نے دلیہ میں زہر گھول دیا تھا آپ نے وہ دلیہ کھایا تھا چنانچہ اسی مرض میں ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ کو ۶۳ سال کی عمر میں اسلام کا یہ خورشید تاباں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ دو سال ۳ ماہ تک خلافت کا بوجھ اٹھایا۔ وفات کے وقت زبان پر یہ کلمہ تھا۔ یا رب! مجھے اسلام کی حالت میں موت دے اور مجھے صالحین سے ملا۔

بدگمان

عفت موہانی

یہ سارا گھپلا اماں نے کیا تھا۔ ابھی بہو کی تلاش میں انھوں نے نہ صرف اپنی آدھی عمر ضائع کی تھی بلکہ کمال میاں کو بھی پیٹ کر کے اس اونچے پر لا کھڑا کیا جہاں سر پر دونوں وقت ملتے ہیں۔ کمال خاصے پڑھے لکھے اور عمدہ عہدے پر کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی سخت مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ بہت دنوں بعد فراغت کے دن نصیب ہوئے گھر میں عیش کی چیزیں دکھائی دینے لگیں اور اماں نے کمال سے چھپا کر چار پیسے جوڑنے تو انھیں خوبصورت بہو اور گول مٹول پوتوں کو کھلانے کی سوجھی۔ کمال نے اس طرف دھیان تک نہ دیا تھا۔ بہت پہلے انھیں اپنے ہمسائے کی زہرہ اچھی لگی تھی لیکن جب اس کی شادی ہو گئی اور وہ کچھ عرصہ بعد ایک ننھا منا بچہ دابے اماں سے ملنے آئی تو کمال دھک سے رہ گئے تھے۔ یہ کیا ہو گیا۔ ان کے دل کی دل ہی میں رہ گئی اور زہرہ ماں بھی بن گئی۔ بس پھر کمال نے سوچا ہی نہیں کہ ان کی قسمت میں بھی کوئی ساتھی لکھی گئی ہے۔ بہت سیدھے سادے بھولے بھالے سلمان تھے۔ دفتر سے آتے۔ اماں کو چائے بنا کے پلاتے۔ عورتوں کے انداز میں دن بھر کی رپورٹ اماں سے سنتے، اپنے آفس کی باتیں سناتے اور بس بچوں کی طرح معصومیت سے سو جاتے۔ بے چاروں کو خیالی ہستی سے وہ بیگم کے خیال سے جذباتی انداز میں انگڑائیاں لینا اور جاگ جاگ کر تارے گننا آتا ہی نہ تھا۔ یہ طوفان تو اماں نے اٹھایا تھا۔ اچھی خاصی زندگی میں آگ سی لگا دی۔

کمال شادی کے تذکرے پر شرمائے تھے مگر اماں نے کہا تھا۔ اب کیا میں اکیلی ہی گرہستی کیا کروں گی نہ بہو نہ پوتا۔ آنگن کیسا منحوس لگے ہے۔

جب تک بہو کی پائل زیب کی چھن چھن گھر میں نہ گونجے بچوں کی کلکاریاں نہ [illegible] گزارہ کر لیں گی۔

کمال [illegible] سے کہے بہوؤں کی خوشبو [illegible] کو [illegible] قریب سے یوں گزری کہ ایک [illegible] سنو [illegible] تھے۔ ایک بار تو

ان کی گود بھگو دی۔ وہ بیچارے گی چونک پڑے۔ ارے بدمعاش۔

مگر وہ شو کرنے والی ننھی سی کٹوریا ان کی گودی میں لڑھک گئی تھی۔ انھوں نے پسینے پسینے ہو کر اماں کی طرف دیکھا۔ وہ ناک کی پھننگ پر برسوں پرانا چشمہ لگائے بدستور پالک کا ساگ بینے میں مصروف تھیں اور بڑبڑا رہی تھیں۔ موئے نکلے بھاجی سبزی میں آدھی گھاس ملا کر باندھ دیتے ہیں۔ سوجھے بھی تو نہیں ہے۔ دلہن ہوتی تو ان کی قسمت میں یہ خواری کاہے کو بدی ہوتی وہ موئے میں سبزی ترکاری چاہتی۔ اب چونکہ کمال میاں کی گود بھی خیالی بچے نے تر کر دی تھی۔ وہ [illegible] سے لمبی سانس لے کر بولے۔

"اماں آپ تو اس طرح غصے ہو رہی ہیں جیسے میں نے منع کر دیا ہو۔ میں تو اب خود چاہتا ہوں۔ آپ کو آرام ملے۔ گرہستی کوئی اور کرے۔ آخر آپ کب تک ——"

اور اس طرح بہو گھر میں آ گئی تھی۔ کمال نے سوچا اماں سچ کہہ رہی تھیں۔ یہ تو واقعی گھر کی بتی ہے۔ ہاتھ لگا یا کہ دھندلی ہوئی۔ دلار کی بہتات نے نشاط کے دل عید بارات دیوالی کر دی۔ خوب مزے کئے۔ اماں نے دلہن کو ہفتوں پلنگ سے اٹھنے نہ دیا۔ لیکن۔ اچانک نجانے کیا ہو گیا۔ گھر میں کسی کی نظر لگ گئی۔ کوئی پونس کر گیا تھا۔ اماں بے چاری دن بھر کام کاج کر کے تھک کے سونے گئی تھیں۔ اور پھر وہ اس نیند سے کبھی نہ جاگیں۔ جیسے کسی کتاب کا دلچسپ باب ختم ہوا اور غم نیا باب شروع ہو گیا۔

نشاط نے تھوڑی ماتم منایا۔ اسے فکر تھی اب گھر کیسے چلے گا۔ اماں نے اسے کسی کام میں ہاتھ لگانے نہ دیا تھا۔ لیکن کمال [illegible] طرح روتے تھے۔ وہ بہت دیر میں سنبھلے [illegible] نے انھیں [illegible] دیا [illegible] ڈاکٹر [illegible]

ہینگ کیے تھے۔ پکا پکایا کھایا تھا۔ اب جو چولہے پاس آنکھیں کھلیں
دھواں ناک میں گھسا اور سمجھ میں نہ آیا کہ ارہر کی دال لہسن سے بگھاری
جائے یا زیرے سے تو وہ بھی کھوپڑی سے باہر رہنے لگی۔ اور پھر گھر میں
ایک معقول سی [illegible] بچی۔

کمال کو آفس جانا تھا۔ جلدی جلدی نہا دھو کے وہ دسترخوان پر
آئے۔ دسترخوان پر ابھی تک صرف دھبے دار جگ میں پانی مٹ میلے گلاس
اور فضول سی ڈھلی ہوئی رکابیاں ہی رکھی تھیں۔ نہ روٹی نہ سالن، وہ دل
ہی دل میں آپے سے باہر ہونے لگے اور ضبط کر کے ہانک لگائی۔

"ارے بھائی۔ کیا کچھ تیار نہیں ہوا ابھی تک؟"

"میرا سر تیار ہوا۔ ٹھہر جائیے۔ آٹا گندھ رہا ہے" چولہے پاس سے
جلی بھنی آواز آئی "ہزار کہا کہ ایک لڑکا ہی رکھ لو۔ کم سے کم وہ برتن
دھو دھو تو دھوئے۔ میں تب تک چولہے میں منہ ٹھونسوں"

پاؤں پٹختے کمال باورچی خانے میں پہونچے "تم ذرا سویرے اٹھ
جاتیں تو اب تک روٹیاں تو پک ہی سکتیں۔ میں بازار سے کباب یا نہاری
لے آتا"

"اب لے آئیے۔"

"اب کیوں؟ کیا کھڑی دال بھی نہیں پکی؟"

"کھڑی دال لیٹی دال کچھ نہیں پکی۔ آٹا گوندھ کے انڈے تلوں گی"
کمال کا تھرمامیٹر اونچا ہونے لگا "حد ہے۔ تم سے زیادہ جلدی
تو شاید میں ہی پکا لیتا!"

"پکا لیجئے پھر۔ اگر آتا ہو پکانا"

تم کاہے کے لئے ہو۔

ہاں ہاں۔ نوکرانی ہوں نا گھر کی۔

اماں بھی آخر کرتی ہی تھیں۔ دو آدمیوں کا کام ہی کتنا ہے۔

اماں کی قبر پہ انگارے برسیں۔ یہ آپ کی اماں ہی کا کیا دھرا
ہے۔ جو اپنے میکے میں اچھی بھلی تھی۔ دھول لے ڈالی تھی دہلیز کی۔ آخر
اس جہنم میں گھسیٹ ہی کے دم لیا۔

خدا کی قسم۔ اماں کو کچھ کہو گی تو پھر ــــ کمال کی آنکھیں سرخ
ہو گئیں۔

مگر نشاط بیگم تو رونے ہی لگی تھیں۔ انھوں نے آٹے کی لگن دور
سرکا دی۔ [illegible] اور ہچکیاں ہچکیاں کرنے لگیں

کمال کو اماں مرحومہ کی قبر شریف پر انگارے برسنے والی بات سے
سخت غصہ آگیا تھا۔ انھوں نے سوچا۔ سالی آنسوؤں سے کچھ بڑپن
چھپانا چاہتی ہے۔ رتی بھر نہ پگھلے بلکہ خالص شوہرانہ رعب سے
بولے۔

"یہ نخرے مجھے پسند نہیں۔ سمجھیں۔ ایک تو تم اماں مرحومہ کی شان
میں گستاخی کرو اور اوپر سے ٹسوے بہاؤ۔ ہنھ۔ بہانہ اچھا ہے۔ روئے
دھوئے کی مصروفیت میں ناشتہ تیار کرنے سے بچ گئیں"

ہائے میری امی" دلہن نے دہائی ڈالی "ذرا آ کر دیکھو کیسا ستم
میری جان پر ہو رہا ہے۔ ہائے کیسے کیسے کرم میرے ہو رہے ہیں"

اور کیا" کمال نے جلے پر تیل انڈیلا "سینکڑوں گالیاں سنتی ہو۔
مار پیٹ سہتی ہو۔ جہنم میں رہتی ہو! بلاؤ اپنی امی جان محترمہ کو۔ میں
بھی تو ان سے پوچھوں آپ نے صاحبزادی صاحبہ کو آخر کیا سکھا کے
سسرال بھیجا ہے۔ جسے صبح آٹھ بجے سے دس بجے تک دو آدمیوں
کا ناشتہ تک تیار کرنا نہیں آتا۔ صرف بھاڑ جھونکنا آتا ہے۔
لاحول ولا قوۃ"

مجھے آپ کی بکواس نہیں سننا ہے سمجھا!۔

سمجھ گیا۔ میرے ساتھ رہنا ہے تو میری بکواس بھی سننا پڑے گی۔

نشاط بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں "مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہی کب
ہے؟"

"فائدہ بھی کیا ہے۔ میں تو اکیلا ہی بھلا تھا"

"لا دیجئے رکشا۔ میں جاؤں اپنے گھر"

تمہارے باپ کا غلام ہوں کہ حکم پر رکشا لانے دوڑا جاؤں گا"

اجی۔ آپ نے میرے باپ کا نام کیسے لیا؟"

"تم نے میری مرحوم ماں کی قبر پر آگ کیسے برسائی۔ جاؤ اپنی شکل
لے جاؤ"

اور اس جنگ کا اختتام یوں ہوا کہ کمال میاں غصے میں بھرے
ہوئے بھوکے پیاسے اپنے آفس سدھارے۔ دلہن بیگم میاں کے
خلاف شکوے شکایتوں کے گٹھر باندھے میکے جا اتریں!
غصے کا بھوت دال کے سر سے اترا دال کے۔ اپنی اپنی جگہ
مارے الجھن کے حیران۔ کمال میاں دفتر سے آئے۔ کچھ کھائی پی
باہر کر اپنے گھر کی دال روٹی کے سوا پیٹ کہاں بھرتا ہے سو چاکہ

وہ خود تو کبھی نہیں چکھیں گے۔ ویسے وہ آئے جاہے نہ آئے۔ آخر اماں کی زندگی میں بھی پکاتے ہی تھے۔ مسور کی دال، پھلکے، اور کیا نام چائے تو فرسٹ کلاس بنا لیتے تھے۔ دودھ ابالنے میں تو کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ دودھ چولہے پر رکھ کر کسی سوچ میں گم ہو جاتے یا آلو چھیلنے لگتے اور بہ نہایت اطمینان سے آدھ سیر کا دودھ آدھ پاؤ کر دیتے۔ زمین پر بے شک جیسے نہر بہہ نکلتی!۔ لہٰذا وہ کچن میں یہ سوچتے ہوئے اچھل پڑے۔ دیکھا کر دھوئی دال کی پتیلی میں میڈیم سائز کا چوہے کا بچہ غرق ہے۔ اور صبح کا گندھا آٹا پھول پھال کے پاؤ رسٹ کی بڑھیا پوری بن چکا ہے۔!

گالیاں بکتے اور بڑبڑاتے ہوئے انھوں نے دال اور آٹا پھینک دیا۔ نقصان سے کلیجے پر گھونسہ پڑا تھا۔ انھوں نے سوچا ایک جان بھر کی کھچڑی پکا لیں۔ بس۔ دونوں لے زیادہ ہوگی تو صبح ناشتے میں کام آئے گی۔! انھوں نے اطمینان سے چاول میں ماش کی دال ملا کے دھوئی۔ اماں ماش کی کھچڑی بے حد مزے کی پکاتی تھیں۔ اس میں مکے کا دانہ، دار مٹی، اہری مرچ اور دھنیا کی پتی کی چٹنی، پاپڑ ساتھ میں بھا ہوا دہی۔ واہ۔ کیا مزہ ہوتا تھا اس کھچڑی میں۔! پہلی مرتبہ وہ پکانے چلے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ اچھل پڑے۔ کہیں آ ہی دھمکی ہو بچا کے ۔۔ وہ باہر جھپٹے۔

دروازہ کھولا اور منہ پر ہوائی سی اڑ گئی۔ بہت بے تکلف دوست صاحب کھڑے تھے۔

وہاں گیا انڈوں پر بیٹھے تھے " انھوں نے اندر آتے ہوئے کہا " دس آوازیں دیں۔

معاف کرنا یار۔ چولہے پاس تھا!" کمال کھسیائے "آواز سنائی نہیں دی"

چولہے پاس" سلطان صاحب نے حیرت سے کہا اور گردن اونچی کر کے صحن کی طرف دیکھا" کیا قصہ ہے۔ بھابی کہاں ہیں۔ یہ سناٹا سا کیسا ہے؟"

چلی گئیں صبح ہی لڑ جھگڑ کے" کمال بولے " میں نے بھی کہا کہ جاؤ دفع ہو۔ کیا میں کچھ کر نہیں سکتا۔ روز روز کی بیہودگیوں سے تو یہ اکیلا پن ہی بھلا ہے"

" یار وہ کیا ہوٹل ہی میں کھایا کرو گے ؟"

واہ۔ ارے میں کھانا پکا سکتا ہوں بھائی۔

اچھا ؟۔

" ہاں۔ کھچڑی بگھارنے جا رہا تھا کہ تمہاری دستک سنائی دی"

کھچڑی ؟"

ہاں۔ اب الگ الگ سالن دالیں روٹی وغیرہ کا جھنجھٹ کون کرے۔ کمال نے کہا " اچھا تو تم ذرا دیر بیٹھو۔ میں کھچڑی بگھار کے ابھی آیا۔ ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔ نہ کہنا کہ کمال صاحب کیا ذور دار چیز آپ نے پکائی ہے۔ ابھی آیا۔ تم جب تک یہ پرچے دیکھو!۔

اب تو میں تمہارے ہاتھ کی پکی کھچڑی کھا ہی کے جاؤں گا۔ جاؤ تم بگھار کے آؤ۔!"

کمال بھاگم بھاگ باورچی خانے میں آئے ــــــ جلدی سے تیل کا چولہا جلایا اور پتیلی چڑھائی۔ تیل ڈالا۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کھچڑی بگھاری کاہے سے جاتی ہے!۔ ادرک لہسن سے یا لونگ سے یا پیاز سے۔ ادھر پتیلی میں تیل سنسنانے لگا تھا۔! جھنجھلا کے انھوں نے سوچا کہ یونہی تیل میں دھوئی کھچڑی جھونک دو۔ اوپر سے گھی تو ڈالیں گے ہی۔ بگھار دگھار کا بدلہ ہو جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے ہاتھ کا چمچہ سا بنایا اور جو کھچڑی پتیلی میں جھونکی تو چھم سے ایک لوکا اٹھا اور اُبلتا ہوا تیل اچھل کر ان کے ہاتھ پر گرا۔ .... ان کے منہ سے ایک وزن دار گالی مع چیخ کے نکلی۔ ہاتھ پکڑ کے رہ گئے۔ مگر کیا کرتے۔ دوست کو دعوت دے ڈالی تھی۔ اس پر بھی سینکڑوں لعنتیں بھیجیں اور کسی نہ کسی طرح کھچڑی کے آخری رسوم انجام دے کر ہاتھ دھوئے اور باہر پہونچے!۔ اب تو دوست کی صورت زہر سے بدتر لگ رہی تھی۔ مگر بڑے اخلاق سے باتیں شروع کر دیں۔ انھوں نے پرچہ ایک طرف رکھ کے پوچھا " آخر یہ جھگڑا ہوا کیونکر ؟"

کیونکر نہ ہوتا " دانت پیس پیس کر کمال نے قصہ سنایا۔ سلطان بے تکلف تھے کسی حد تک رازدار بھی تھے انھوں نے فکرمند صورت بنائی۔ اور بولے۔

" مگر یہ ناممکن ہے۔ تم آفس کام کرنے والے گرہستی کیسے کر سکو گے۔ یہ تم سے کب ہو سکے گا کہ تم دن بھر دفتر میں چکی پیس کر گھر آؤ اور یہاں کھانا پکاؤ۔

" کچھ بھی ہو۔ میں اسے بلاؤں گا تو ہرگز نہیں "

آخر کب تک ؟" سلطان نے پوچھا۔

بہت بڑا [illegible] : کمال نے کہا: آخر کی پیشی نے کہا تھا کہ
اماں کی [illegible] ۔ اماں کا احسان ہو گیا۔ جیتے جی اسے بٹھا کر
کھلایا۔ اس کا یہ بدلہ ہے :

: میاں یہ تلون طبعی سے خاص ہوتی ہے۔ بھول جاؤ۔ انہوں
نے بس سوچے سمجھے بغیر منہ سے ایک سنی سنائی بد دعا لڑھکا دی تھی۔
دل سے نہیں کہا تھا۔ تبھی دل بڑا کرو۔ معاف کر دو۔ گھر لے آؤ:
گدھے پن کے مشورے مت دو: کمال جھلائے: آخر میری بھی
کوئی آن ہے خودداری ہے۔ وہ جیسے گئی ہے۔ ویسے آئے: اور
پھر وہ یکبارگی اچھل پڑے: جل گئی: اور بے تحاشہ اندر بھاگے۔
[illegible] سے ایک نئی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ کمال نے اسے اتار کے
الگ رکھا۔ چولہا بجھایا۔ فی الحال چیتی بینا [illegible] ان کے
[illegible] تھی نہیں۔ ادھر ادھر ڈھونڈنے کے بجائے کب کا [illegible] اچار
[illegible]۔ اور پھر باہر گئے۔ سلطان سے پوچھا۔
: کہو تو کھانا نکالوں۔ اندر ہی چلے آؤ۔ اب پردہ کرنے والا کون
ہے :

سلطان اندر آ گئے۔ اور دیکھا کہ گھر میں ہر طرف بدتر بد سلیقگی
[illegible] بکھرے پڑے ہیں۔ فرش پر کوڑا بکھرا۔ سگریٹ کے ٹکڑے۔
تخت پر کمال کے میلے اور صاف کپڑے۔ کوئی چیز صاف ستھری اپنی جگہ پر
دھری۔ کمال نے جلدی جلدی کھانے کی میز صاف کی۔ سلطان ہاتھ دھو کر
کرسی پر جم گئے۔ کمال سارا کھانا نکال کے بے حد سلیقے سے لے گئے !۔
اور بولے۔

: بس یہی اور پاپڑ تل سکا۔ کہو تو دوڑ کے لے آؤں :
ارے بیٹھ جاؤ۔ یار۔ سچ سچ تم نے تو کمال ہی کیا۔ میں تو سچ کہتا
ہوں۔ ایک پیالی چائے تک نہیں بنا سکتا :
میں بنا سکتا ہوں۔ اماں نے سکھا دیا تھا : کمال نے یوں کہا کہ
[illegible] کی نسائیت اور بھی صدقہ ہو گئی۔ سلطان کو بے ساختہ ہنسی
آ گئی۔
کمال نے جلی ہوئی دار کھچڑی رکابی میں نکالی۔ اور کھچڑی میں کنواں سا
بنا کے گھی کا کوارا کر دیا۔
سلطان نے دو نوالے کھائے پھر انہیں ہنسی کے مارے اچھو ہو گیا:
[illegible] سی لیٹر ہو کے رہ گئی ہے۔ زبان پر رکھی نہیں کہ حلق کے

یار۔ اندر سے دو چمچے لے آؤ۔ ہاتھ سے تو اور بنا کے تو کھائی نہیں
جاتی :
کمال کو بھی ہنسی آ گئی: معلوم نہیں۔ اماں کس ترکیب سے
پکاتی تھیں۔ بڑی لذیذ ہوتی تھی :
: وہ اماں ہی تھیں : سلطان نے کہا: تم یہ ترکیبیں کیا جانو۔
لاحول ولا قوۃ : کمال جواب میں بولے: یہ تو کھائی ہی نہیں
جا رہی :
سلطان نے قہقہہ لگایا: اس چیز کے بدلے کا [illegible]
سے کرو تو کافی کمائی ہو سکتی ہے :
کمال جھینپے: گولی مارو۔ احمق میں نے ہاتھ بھی جلا لیا۔
ہائیں ؟!۔
ہاں۔ یہ دیکھو: کمال نے آدھی بانہہ تک آستین سرکا کر ہاتھ دکھایا۔
جس پر خاصے سرخ سرخ چھالے پڑ گئے تھے۔ !
اف او۔ جلن ہو رہی ہوگی۔

بہت زیادہ
اب یہ سزا روز ہی بھگتو گے۔ یا تو پھر آدھی تنخواہ ہوٹل کے نصیب
میں جائے گی۔
اب جو کچھ بھی ہو !۔
ضد باندھ کے بیٹھ ہی گئے ہو۔ ؟
بالکل۔ !
بھابی کو نہیں لاؤ گے۔
قطعی نہیں۔
: ارے کس اماں سے خالہ اماں بہو لائی تھیں۔ وہم ہے شادی
کی تھی۔ تمہارے جیسے کھلانے کو ان بے چاری کو کتنا ارمان تھا۔ واہ واہ:
اسی بدبخت نے ان کی قبر پر آگ برسائی : کمال وہ بات بھولتے
ہی نہ تھے۔
معاف بھی کر دو میاں۔ یہ عورتیں سوچے سمجھے بغیر یونہی بک
اٹھتی ہیں : سلطان نے سفارش کی: اب اچھا ہی بھابی کی خاطر ہو۔
برسوں برسوں میں نے کہا تھا کہ بش شرٹ پر استری کر دو۔ [illegible]
[illegible] سے پریشان رہی تھیں۔ [illegible]
[illegible]

"...گر کر دی ہوگی استری۔" کمال ہنسنے لگے۔

"شاک دی۔ میں نے خوشامد کی کہ بھئی ذرا کوٹ تو ہی سی دو۔ وہ بھی ماسیا۔ اور لگیں اپنی قسمت کو کوسنے۔ بجلی کرے۔ صاحب ڈبے اور خدا جانے کیا اول جلول۔ میں دوسرا قمیص پہن کر چلا گیا۔ رات کو گھر آیا تو دیکھا کہ کوٹ بھی سل گیا تھا اور استری بھی ہوئی تھی۔ تو میاں کہنے کا مطلب یہ کہ ایسی کھٹ پٹ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ یکبارگی ایسا ہوا ہی گھاٹ کر دینا کچھ مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"بھابی شریف زادی ہیں۔" کمال نے کہا۔

وہ رات ان کی بڑی بے کیف گذری۔ ہاتھ کی جلن تو تھی ہی۔ اب کف دست پر ہر سائز کے آبلے بھی پڑ گئے تھے۔ ان میں تکلیف زیادہ ہی تھی۔ ادھر انہوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ ان کی گھمسان کی جنگ میں کمال کی امی کی کھکھیاہٹ کوئی کام دے گی!۔ قریب تھا کہ وہ رونے لگے مگر انہیں صبح کے قریب نیند آ گئی۔ آئی بھی تو ادھ کچری نیند۔ جو کسی کے دروازہ پیٹنے پر اچٹ بھی گئی۔

کمال بدتمیز آ مرا۔ صبح ہی صبح: وہ دانت پیستے ہوئے اٹھے اور بڑے طیش میں دروازہ کھولا۔۔۔ اور کہا جا کر نیند خراب کرنے والے کو خوب لتاڑ رہے ہے۔ مگر ——

"ہائے اللہ۔ آپ کے دشمن کیسے جل گئے؟" نشاط جھپٹ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔ "رات کو جب سلطان بھائی نے آکر کہا کہ آپ جل گئے سر سے پاؤں تک آگ ہی آگ لگ گئی تو۔ پوچھئے کہ میرا کیا حال ہوا۔ نیند تھوڑی ہی آئی۔ بس روتی رہی۔ دکھائیے کہاں جلے؟"

کمال سر سے پاؤں تک مکھن ہو گئے۔ مسکرا کر جلا ہوا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔ اور پوچھا "کیا کہا تھا اس بدمعاش نے؟"

"آپ چولہے پر گر پڑے تھے اور بھر بھر کر کے جل اٹھے تھے۔ چھوٹے کہیں کے۔" لاڈ و شوخی۔ کمال نے سب کچھ بھول بھال کے قہقہہ لگایا۔

نشاط شرمائی سی مسکرا کر بولی "اب جو کبھی آپ سے لڑوں تو میری توبہ۔ فجر کے وقت سے جاگ کے ناشتہ پکا رہی ہے۔ چلئے کھلاؤں۔ کل سے آپ بھوکے ہیں۔" وہ انہیں اندر کھینچ لائی۔

کمال نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا اور وہ جھینپی جھینپی سی ہنس کھنک گئی!! ——

جھوٹ سچ

از شوکت تھانوی

مثل مشہور ہے سانچ کو آنچ نہیں مگر یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے کوئی یہ کہہ دے کہ آگ ٹھنڈی ہے۔ اس کو اچھا فرض کر لیجئے آگ کا ٹھنڈا ہونا ممکن بھی ہو جائے تو بھی یہ ہمت کوئی کہاں سے لائے کہ اس سے کھیلنا شروع کر دے۔ سچ کی بہت سی خوبیاں پڑھی بھی ہیں اور بزرگوں سے سنی بھی گئی ہیں۔ دل کو بھی یقین ہے کہ سچ کا درجہ انسان کی تمام خوبیوں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ سچ بولنے والا نہایت بہادر، نہایت ایماندار، نہایت خوش معاملہ اور ہر اعتبار سے نہایت قابل قدر ہوتا ہے۔ اکثر جی بھی چاہتا ہے کہ چلو ہم وہ زندگی ہی گزارنا شروع کر دیں مگر ہمیشہ سچ کے خوفناک نتائج سامنے آ جایا کرتے ہیں اور ہم سہم کر لرز کر اور کانپ کر عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے جھوٹ ہی کو زندگی کا سہارا بنا کر رہیں اور سچ بول کر عاقبت کے ثواب کے لئے زندگی کے وہ عذاب مول نہ لیں جو زندگی ہی دشوار کر دیں۔ سچ کتنا ہی پاکیزہ ہنر کیوں نہ ہو لیکن خدا محفوظ رکھے اس کے نتائج سے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے عیب اور بڑے سے بڑے جرم کے بھی وہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے جو اس سچ کے پیدا ہوتے ہوئے ہم نے خود دیکھے اور سنے ہیں۔ بڑی بڑی باتوں کو جانے دیجئے جن میں سچ بولنے کی بدولت عدالت چل جانے اور سزا ہو جانے تک کی نوبت آ سکتی ہے روزمرہ کی گھریلو زندگی ہی کو لیجئے کہ کیسے کیسے ہنگامے محض سچ بولنے کی وجہ سے ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً دیر سے گھر آئیے بیوی کا بگڑنا یقینی ہے کہ کہئے وہ اس سیلاب کو آہ جانے بغیر نہ رہوں گی۔ اب کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ اس ایٹم بم کے سامنے دلیری سے سچ بول کر کہہ دے کہ ہم دوستوں میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور تم نے جو دام دیئے تھے کپڑا لانے کے لئے وہ ہار کر آئے ہیں۔ اس سچ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ اہل دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسرے اس قسم کا سچ بولنا کوئی ایسی جرأت بھی نہیں ہے اس کو ایک سیاسی قسم کی خودکشی کہا جا سکتا ہے۔ مگر بجائے اس کے جھوٹ اس قسم کے مواقع پر نہایت مجرب بھی ثابت ہوتا ہے اور فنکار جب چاہے اس کو حسین بھی بنا سکتا ہے۔ فن کا کمال یہ ہے کہ یہی غصہ ہمدردی میں تبدیل ہو جائے۔ آرٹ اسے کہتے ہیں کہ مقابل کا آتش فشاں پھول برسانے لگے۔ جھکے ہوئے انداز سے پہونچے، ایک آدھ ٹھنڈی سانس بھری زیر لب مصرعہ پڑھا۔ ؎ موت سے کس کو رستگاری ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ پوچھیں گی ضرور کہ کیا ہوا۔ اب اس کا جواب خواہ کتنا ہی سفید جھوٹ سہی مگر غور کیجئے کہ کیا برمحل ہے حسب معمول ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ جواب دیا۔ قبرستان گیا تھا، بیچارے کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر اللہ ری غیرت کبھی اپنی مصیبت کی کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ دیر میں آنے کے سلسلہ میں باز پرس کی جو تقریر بیوی صاحبہ نے تیار کر رکھی تھی وہ تو وہیں سے التوا میں پڑ گئی۔ ایک دم نہایت غمگساری کے ساتھ پوچھا "کون آخر کون" جواب دیا، عبدالکریم میرے ساتھ کا پڑھا ہوا تھا، چھوٹے چھوٹے چار بچے چھوڑے ہیں۔ اور دو سال کی بیماری میں گھر کی ایک ایک چیز اس حد تک ختم ہو چکی تھی کہ مرنے کے بعد کفن دفن کے لئے ایک پائی بھی نہ تھی، مجھ سے تو ضبط نہ ہو سکا، تم نے جو روپیہ دیا تھا وہ میں نے بھابی کو دیا اور کچھ ایک اور دوست سے لیکر کفن دفن کا انتظام کیا، ہائے کیا بیکسی کی موت تھی، جو دوسروں کا دستگیر تھا۔ اس کی آخری منزل اس طرح طے ہوئی۔ ذرا سی بات میں غصہ کا تو ذکر کوئی ذکر ہی نہیں روپیہ تک کے لئے فرمایا۔ آپ نے بہت اچھا کیا اگر آپ کسی کو مجھ سے کہکر بھیج دیتے تو میں اور روپیہ بھیج دیتی اچھا خیر اب ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا لیجئے، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ یہ ہم جانتے تھے کہ ہم تاش پارٹی میں خوب ڈٹ کر کھا پی چکے تھے چہرہ پر ہوائیاں تو ہار کی اڑ رہی تھیں لہٰذا ہم نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ نہیں اب کھانے کو نہ کہو گی۔ آپ کو معلوم نہیں کہ کریم میرا کیسا دوست تھا، بچپن کا ساتھی ہمیشہ درد دکھ میں شریک اور شریف ایسا کہ مرتے

عورتوں کی لڑائی

از کوثر چاندپوری

السلام :

سکینہ نے اپنے کوٹھے کی دیوار سے سر نکال کر رضیہ کو مخاطب کر کے کہا جو مکان کے صحن میں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی اس نے اپنی سفید سفید بھویں سکیڑ کر بے رونق نگاہوں سے اوپر کو دیکھا اور بے رخی سے کہا۔

پڑے خاک ایسے سلام پر۔

کیا ہوا بوا، آج کیوں منہ سجائے بیٹھی ہو ؟

چل پرے، لمبی بن، آئی وہاں سے بوا کی لاڈلی۔

بوا، کیا ہو گیا تمہیں، کیوں تمہارے سر پر سنیچر سوار ہے آج :

سنیچر سوار ہو تیرے سر پر، دیکھ سکینہ میرے منہ مت لگیو۔

یہ کیا باؤلے کتے نے کاٹ کھایا تمہیں جو کاٹ کھانے کو دوڑی پڑتی ہو۔

کتا کاٹے تجھے تیرے پیاروں کو اللہ نہ کرے جو مجھے کاٹے باؤلا کتا۔

بوا دیکھو میرے پیاروں کا نام لیا تو چوٹیا کی خیر نہیں ذرا منہ سنبھال کے بات کرو۔

منہ وہ سنبھالے جو تیری دبی بسی رہتی ہو، تیرا دیا کھاتی ہو، مجھ پر تیرا کیا دباؤ ہے جو میں سنبھالوں منہ کو۔

دیکھ سکینہ منہ میں لگا دیدوں گی جو میرے بڑھے بوڑھے کا نام لیا۔

بوا تمہارا دماغ چل گیا ہے زبردستی جیب چلائے کو بیٹھ گئیں تم۔ میں نے بھلا کیا کیا تھا، تمہیں سیدھے سبھاؤ سلام کرنے کو چلی آئی تھی مجھے کیا خبر تھی یہاں جلی بھنی بیٹھی ہو۔

جلا تو، بھنے تو، میں کیوں جلتی، جیب چلانے کو مجھے کیا کوڑا ہے۔

کیسی لگائی ہے باز ہی نہیں آتی بالکل سر پر چڑھی جا رہی

ہے ہم تو بڑھاپے کا خیال کر رہے ہیں آپ ہیں کہ آپے ہی سے باہر ہوئی جا رہی ہیں۔

آئی وہاں سے بیچاری بڑھاپے کا خیال کرنے والی، بڑھاپے کا خیال کرتی تو مردوں میں بیٹھ کر میری صورت میں کیڑے ہی تو ڈالتی ارے میرے منہ میں دانت نہیں رہا، آنکھوں سے پانی بہتا ہے۔

تو تیرے باوا کا کیا نقصان ہے یہ تو اللہ کی قدرت ہے جس کو چاہے جیسا بنا دے مگر بندے کو کسی بات پر گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔

بوا ذرا دوسرے کی بھی سنا کرو۔ تم تو اپنی ہی کہے جا رہی ہو کون کہتا ہے میں نے تمہاری صورت میں کیڑے ڈالے، بوا جھوٹ بولنے کی میری عادت نہیں، دیکھو ایسے طوفان مت اٹھاؤ تم مجھ پر کوئی سنے گا تو کیا کہے گا میرے ہی جنم میں تھوکے گا کہ ضرور اس نے بوا کو کچھ کہا ہوگا۔

اس گھر میں رہتے رہتے میرے بال سفید ہو گئے آج تک کوئی کہہ تو دے، میں نے کس پر طوفان اٹھائے، میں کس پر تہمت لگائی ہے اکیلی تم ہی تو رہتی ہو محلہ میں کوئی اور تو رہتا نہیں ایک تم پر ہی طوفان توڑ رہی ہوں میں۔

اور دل کی میں کیا جانوں بوا، میں تو اتنی کہتی ہوں خدا اپنا دیدار اور محمدؐ کی شفاعت نصیب نہ کرے۔ جو میں نے کسی کے سامنے تمہیں کچھ کہا ہو !۔

خدا کے خوف سے ڈر سکینہ !

اب اس کا تو علاج ہی نہیں کہ ان ہوئی بات کو تم میرے سر تھوپ دو، کوئی بیچ میں ہو تو اس کا نام لو، میں اولاد کی قسم دیکر پوچھوں کس کے آگے کہا میں نے بوا کو برا بھلا۔

سکینہ یوں باتیں مت بناؤ، ہم نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے۔

بوا تم نے دھوپ میں سفید کیے ہوں بال یا سایہ میں

اس سے واسطہ نہیں، میں تو یہ کہتی ہوں تم اس جندی کا نام جاؤ کس کے سامنے میں نے تمہیں بُرا بھلا کہا جب جھوٹ سچ کھلے گا بوا اللہ کرے میں اتنی ہی بڑی مر جاؤں جو میں نے ایک حرف بھی زبان سے نکالا ہو۔

کس کس کا نام بتاؤں سکینہ کوئی ڈھکی چھپی بات ہو تو میں نام بھی بتاؤں کسی کا، بھرے مجمع میں بیٹھ کر تم نے اس دن نیم والے گھر بیگمات مجھے اندھا بنایا، منحوس کہا۔ آنسو ڈھال کہا، تم نے کہا صبح صبح کوئی اس کی صورت بھی دیکھے جس دن میں اس کا منہ دیکھ لیتی ہوں شام تک چین نہیں ملتا۔

توبہ کرو بوا توبہ! دیکھو ایسا طوفان مت اٹھاؤ، اللہ کیسے بہتان باندھ رہی ہو، خدا جانے آسمان کس کے بھاگوں کھڑا ہے۔

اچھا قسم کھاؤ، تم نے نہیں کہا۔

بوا تمہارے سر کی قسم، اپنے بچہ کی سوں جو میں نے تمہارا نام بھی لیا ہو۔ پڑے خاک جھوٹ بولنے والے کی صورت پے، بچہ سے زیادہ مجھے دنیا میں اور کیا ہے؟ ہاں اتنی بات تو ہوئی تھی بوا دیکھو میں سچی سچی بتاؤں تمہیں کہ بلو دھوبن کا ذکر آ گیا تھا تو میں یوں بولی کہ اب تو ویسے سوجھتا بھی نہیں اور منہ پر تو پھٹکار برستا ہے جس دن سویرے ہی سویرے صورت دکھا جاتی ہے روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی اور کچھ نہیں تو کتا ہی ہنڈیا میں منہ ڈال جاتا ہے۔ بوا لو یہ بات تو میں نے ضرور کہی تھی تمہارا تو نام بھی نہیں لیا، نہ معلوم بڑھاپے میں تمہاری عقل چرنے چلی گئی ہے کیا، پہلے بات کا انجام سوچ لیا کرو پھر منہ سے کچھ نکالا کرو، وہ تو اچھا ہوا میں چلی آئی اس وقت نہیں تو تمہارے دل میں پھپھولا بھرا ہی رہتا۔

سکینہ اللہ تیرا کلیجہ ٹھنڈا رکھے بچی! لے میری کیا خطا ہے مجھ سے تو جیسا کسی نے کہہ دیا میں نے یقین کر لیا میں آپ تو کچھ سننے گئی نہ تھی مجھے کیا خبر کہ بلو دھوبن کا قصہ تھا میں تو یہ سمجھی کہ تو مجھی کو کہہ رہی ہوگی سکینہ میرا دل تو اندر سے گواہی دے رہا تھا کہ زمین آسمان ٹل جائے اپنی جگہ سے مگر سکینہ میرے لئے ایسے بول منہ سے نہیں نکال سکتی اور انھیں باتوں کی بدولت [illegible] تیرے لئے دعائیں نکلتی رہتی ہیں میرے بدن کے رو نگٹے رو نگٹے سے۔

[illegible] سے بچے کو وہ بھی کس کام کے آتے تو یہ زہر اگل کر اور کچھ کہہ دیا کسی نے تم سے تو میں کیا بگاڑوں گی۔ اس کا پا جانا۔

ہاں کہنے سے کیا ہوتا ہے سکینہ! ایسی میں بالکل سٹری تھوڑی ہو جاؤں جو ہر کسی کے کہنے سے یقین کروں گی اب لے، اتنی بات تو کہنے والے نے بھی جھوٹ نہیں کہی، کسی کا ذکر تو تھا، تم خود ہی کہتی ہو بلو دھوبن کو کہہ رہی تھیں ہاں اتنی بات اور بڑھ گئی کہ اس کی جگہ میرا نام لے دیا بہی تو کرتوت ہیں بوا دشمنوں کے، میں تمہاری جان کی قسم کھا کر کہتی ہوں بلو دھوبن کو کہہ رہی تھی، تمہیں کیا معلوم نہیں اس کی صورت دیکھ لو صبح صبح تو روٹی نہیں ملتی سارے دن بھوکا رہنا پڑتا ہے ابھی خدا کی قسم میں نے تو جس روز اس مردار کی صورت دیکھی مجھے سورج ڈوبنے تک چین نصیب نہیں ہوا۔

کیا کہہ رہی ہو سیدانی بلو دھوبن کا دم نہ ہوتا تو چھینک چھینک کر مر جاتیں تم، یہ میں ہی تھی کہ جب ٹانگیں پھیلائے پلنگ پر پڑی تھیں تم اور کوئی پانی پلانے والا بھی پاس نہ تھا تو اپنے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر تمہاری پٹی کے نیچے آ بیٹھتی تھی۔ پیر میں دباتے تمہارے۔ منہ ہاتھ میں نے دھلوایا، روٹی میں نے پکا کے کھلائی سارے کنبہ کو اور آج تم کہتی ہو بلو منحوس ہے۔ اس کی صورت دیکھنے سے روٹی نہیں ملتی۔ وہ دن بھول گئیں کہ جب بلو کے سوا تمہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے نیکی کر اور کنوئیں میں ڈال۔

سکینہ بلو کو دیکھتے ہی چونک پڑی، اس کے بدن میں کاٹو تو لہو کی بوند نہیں اسے سان گمان بھی نہ تھا کہ بلو دیوار کے نیچے کھڑی سب کچھ سن رہی ہے وہ بہت ہی گھبرائی بلو نے سارا قصہ اپنے کانوں سے سن لیا تھا اب اس کی تردید ہی کیا ہو سکتی تھی۔ بوا کو تو اس نے سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کر دیا تھا وہ پرانے وقتوں کی نیک دل، بیوی تھیں مگر بلو باہر پھرنے والی بیباک عورت اس کی زبان کسی کے سامنے رکنے والی ہی نہ تھی مگر سکینہ نے ہمت کر کے کہا۔

بلو کیوں آپے سے باہر ہوئی جا رہی ہے، میں تو مذاق کر رہی تھی، بوا کو نہ معلوم کیا ہو گیا تھا ایک دم سے مجھ پر برس ہی تو پڑیں، ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کو میں نے تیرا نام لے دیا تھا، تیرے بچہ کی قسم کوئی اور بات تھوڑی ہی تھی اچھا لے اب میں نے کوئی گالی دی ہو تجھے تو۔

گالی تم کیا دیتیں سیدانی۔ میں تو ایسے اچھوں کی نہیں سنتی۔

تم تو بیچاری ہو کس شمار میں، اور کالی دیلے میں تم نے کیا کر رکھی ہے منحوس تم نے کہا، اندھا تم نے کہا، اور کیا رہ گیا بھلا کہنے کو۔
سیدانی مجھے تمہارے یہ گن معلوم نہ تھے نہیں تو کبھی تھوکتی بھی نہیں تمہارے گھر آکے اور اب دیکھو آگے کو۔
بلو معلوم ہوتا ہے تو بھی بھنگ پی کے آئی ہے میاں نے تو گھر بسی منحوس اور اندھا نہیں کہا تجھے، پوچھ لے بوا سے۔ آنکھوں میں انگلیاں مت دو سیدانی میں بہری تو ہوں نہیں اللہ رکھے میرے کان ابھی سلامت ہیں، میں یہیں بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو اینٹ مار کے یہیں سے سر پھوڑ دیتی اللہ کی سوں! وہ تو معلوم کس بات کا خیال آگیا اور بوا سے کیا پوچھ لوں، یہ تو تم سب کی کہی بدی ہے، تم سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہو، پھر بوا کاہے کو کہیں گی؟۔
بلو دیکھ میں اور قسم کی عورت ہوں، سکینہ ہی سے منہ لگائے جا میرا نام لیا تو ٹھیک نہیں۔
کس قسم کی عورت ہو تم بوا میرا بھلا کیا کرو گی جیسا کہو گی ویسا سنو گی میں کب تمہاری دی ہوئی روٹی کھاتی ہوں جو دبوں گی۔
دبے گی کیسے نہیں۔ کمینوں کو منہ لگانے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔
سکینہ دیکھو ہمارے برابر بیٹھتے بیٹھتے آج بلو کا یہ حوصلہ ہو گیا کہ وہ کہتی ہے جیسا کہو گی ویسا سنو گی۔ بلو اچھی طرح سن لے کان کھول کے میں تیری برابری کی نہیں ہوں۔
زمیں پے پاؤں رکھ کے چلو بوا زمین پے۔
اب کیا تیرے سر پے رکھ کے چل رہی ہوں۔
میرے سر پے تم کیا پیر رکھو گی بیچاری، چرخہ کاتتے کاتتے تمہاری عمر گزر گئی، ایک دن چرخہ لیکے نہ بیٹھو تو اگلے دن کھانے کو روٹی نہ ملے۔ تم میرے سر پے کیا پاؤں رکھو گی۔
بلو دیکھ منہ میں لگام دے چڑیل کہیں کی آئی وہاں سے باتیں بنانے ایران توران کی۔
بوا عمر کا خیال کرتی ہوں، سفید بالوں سے اللہ میاں کو بھی شرم آتی ہے، نہیں تو وہ بے نقط سناتی، کہ سر پیٹ لیتیں تم اپنا۔
کھوسٹی تو رہ مردار۔ پیڑھی ہی سر پے دے ماروں گی۔
میں چونڈا اکھاڑوں گی پیڑھی مارنے والی کا
بک بک کئے جا رہی ہے چپ نہیں ہوتی کمینی۔
تم ہزار دفعہ کمینی۔
سکینہ سن رہی ہو اس دلہن کی باتیں تم۔
ہاں بوا سن تو رہی ہوں مگر کچھ بس نہیں چلتا۔
وہ کہا سنے گی ابھی تو مجھے اس کے دانت دیکھنے ہیں۔ تم تو ویسے ہی بیچ میں ٹانگ اڑا بیٹھیں جھگڑا تو سیدانی سے ہو رہا تھا۔
میرے کیا دانت دیکھے گی تو چڑیل؟
سیدانی زبان سنبھالو نہیں تو منہ نوچ لوں گی، بالوں میں آگ لگا دوں گی۔
میں تیری چٹیا موڑ لوں گی۔
میں تیرے لاوڑ کا خون پی لوں گی۔
ارے تیرے منہ میں لگے آگ خون پی اپنے پیاروں کا۔
سیدانی اللہ کرے تو منحوس ہی ہو جا۔
خدا نہ کرے مجھ تجھ سا۔
تیرے مریں بچے سیدانی! مجھے منحوس کہنے والی۔
بلو دیکھ زبان قابو میں رکھ کیسا منہ بھر بھر کے کوس رہی ہے نمک حرام۔
تیرے مریں لال۔
بلو خدا کے لئے۔
تیرا لٹے سہاگ۔
تیرا مرے خصم
تیرا نکلے جنازہ
بلو تیرے پھوٹیں دیدے۔
تیرے منہ میں نکلے کالا دانہ
بوا خدا کے لئے اس کی جیب کتر لو۔
سیدانی تو اتنی ہی بڑی مرجائے، اللہ کرے تجھے شام ہونی نصیب نہ ہو اور بوا مداخلت کون ہوتی ہے۔ جیب کترنے والی۔
بلو میں پہلے کہہ چکی ہوں میرے منہ مت لگ تو۔
تو میرا کیا بگاڑ لے گی۔
میں تیرا کلیجہ نکال لوں گی۔
میں تیرے منہ پے خاک ڈال دوں گی۔
نکل چڑیل میرے گھر سے۔

۔۔۔ ہاتھ کا پاؤں کی خبر نہیں، بس تو مر نے ہی کو ہم
رہیں ۔۔۔ کی مرتی آئی مر جاؤں مجھے بہ داہ نہیں مگر تم کھینچی کھینچی
پھرو گی زمانے بھر میں۔

ابا اور ابو کو الجھا کر سکینہ دبے پاؤں کوٹھے سے اتر آئی اور جلدی
سے کواڑوں کی زنجیر لگا دی تھوڑی دیر تک ابا کو کوستی پیٹتی رہی اور
کی برابر جواب دیتی رہیں۔ ۔۔۔ میں دن چھپ گیا اور ابا نماز کو کھڑی
ہوگئیں ابو نے فرصت پا کر اوپر دیکھا تو سکینہ غائب! اس نے غصہ
میں بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنے ہاتھ کو کھڑا کر کے زور سے مارا
اور دانت کچکچا کے بولی بولی، تیرے کھاؤں کلیجے! تو آگ لگا کر چل
دی جو کہیں کی نہ مجھے یہاں سے لڑوا دیا اور آپ کھسک گئی۔

سیرِ فلک

درخشاں ملیح آبادی

شبِ اسریٰ حبیبِ کبریا گردوں پہ جاتے ہیں
ملائک رہ گزر میں اپنی آنکھوں کو بچھاتے ہیں

سجایا اس قدر دونوں جہاں کو دستِ قدرت نے
نظارے باغِ جنت کے نظر ہر سمت آتے ہیں

نکھار آیا ہے ایسا آج حسنِ شانِ والا پر
تصدق گلستاں کرنے بہاریں اپنی لاتے ہیں

نہیں دیکھے ہیں بلبل تو نے شاید عارضِ احمد
گلِ رنگیں کو بھی شیدا جو اپنا خود بناتے ہیں

نظر آتی ہیں جب اہلِ چمن کو سرمگیں آنکھیں
تو چشمِ نرگسِ شہلا کو بھی وہ بھول جاتے ہیں

بنائی کہکشاں نے راہ بھر کر مانگ تاروں سے
بچھانے چادرِ نوری مہِ تاباں کو پاتے ہیں

ملا یہ حکم رضواں کو ہو مودب حور غلماں تم
کہ سیرِ خلد کو محبوبِ حق تشریف لاتے ہیں

سنا کرتے تھے شہرہ حسنِ دل افروز کا جن کے
وہی ماہ لقا اور دلربا جلوہ دکھاتے ہیں

طبیبِ دردِ دل ہیں اور یہ ہے شانِ مسیحائی
لبِ جاں بخش کی جنبش سے مردوں کو جلاتے ہیں

مبارک عاصیوں کو ہیں جو ان کے مونس و یاور
شفیعِ روزِ محشر کا لقب وہ آج پاتے ہیں

لگائے آسرا بیٹھے ہیں ان سے دردِ و غم والے
بوقتِ بیکسی جو بیکسوں کے کام آتے ہیں

ٹھہرتے ہیں دل لرزاں گنہگارانِ امت کے
سہارا جب نگاہِ رحمتِ عالم کا پاتے ہیں

سفینہ اے درخشاں، نذرِ طوفاں تیرا کیوں کر ہو
کہ بن کر ناخدا خیر البشر اس کو بچاتے ہیں

لیجیے پان کھائیے

شہناز سعادت

لیجیے صاحب! پان حاضر ہے.... شوق فرمائیے مگر شرط یہ ہے کہ اس انمول سیال کو سڑک، فٹ پاتھ اور در و دیوار پر نقش و نگار بنانے میں ضرور استعمال کیجیے گا۔ دہانِ مبارک کے اندر پان چبانے کے بعد جو محلول تیار ہوتا ہے اور جسے عرفِ عام میں "پیک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دراصل وہ ایک اعلیٰ قسم کا "پینٹ" ہے۔ اس کا استعمال نہایت سہل اور نتائج بڑے دیدہ زیب اور دلآویز ہیں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ کل ہی کی تو بات ہے سڑک پر ٹریفک اتنا تھا کہ تمام گاڑیاں رینگ رہی تھیں۔ ہم بھی دیرینہ عادت کے مطابق گاڑی کے بند شیشوں سے بازار میں بکھری اشیاء کا نظارہ کر کے خوش ہو رہے تھے۔ اچانک پچکاری مارنے کی آواز نے ہماری محویت کو توڑ دیا۔ ہم نے بے اختیار اپنے دائیں طرف دیکھا...... سبحان اللہ دل خوش ہو گیا۔ ہماری بے رونق گاڑی پینٹ کے لئے ترس رہی تھی۔ اور کسی نہ کسی وجہ سے ہم اس کی یہ خواہش پوری کرنے سے رہ جاتے تھے۔ اب غیر متوقع طور سے اس کی یہ آرزو پوری ہو چکی تھی۔ برابر سے گزرتی ہوئی بس میں سوار ایک شریف خاتون نے یہ نیک کام انجام دے دیا۔ اس نے کھڑکی سے سر نکالا اور پیک مار کر ہماری گاڑی کی پیاس بجھا دی۔ ہم نے اس کو جی بھر کر دعائیں دے ڈالیں۔ ہماری گاڑی کا دایاں حصہ بہت حد تک خوشنما پھولوں سے ڈھک گیا۔ ہم سارے راستے یہ دعا مانگتے گئے کہ کوئی دوسری بس بائیں طرف سے بھی گزرے اور اس میں سوار کوئی اللہ کی نیک بندی گاڑی کے بقیہ آدھے حصے کو رنگین کر دے۔

چلیے صاحب پیک نے گاڑیوں کے پینٹ کا مسئلہ حل کر دیا۔ اب آئیے دروازوں اور دیواروں کی طرف۔ پان کھانے والے جانتے ہیں کہ ہاں بھی کتنی ہوں گی جو ہمارے ہاں آنے والے چالاک ہیں۔ وغیرہ پان کے رسیا ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری اکثر جان پہچان مہمان خواتین کو پان پیش کرنے کے فوراً بعد اگالدان آگے کر دیتی ہیں کہ لیجیے! اس میں تھوکیے مگر سمجھدار خواتین اسے تکلف جان کر کہتی ہیں: "ارے بہن ہٹاؤ اسے، اس کی کیا ضرورت ہے": اور پھر اپنی سرخ سرخ زبان پر پیک رکھ کر بے تکلف بے رنگ در و دیوار پر پچکاری مار کر پیک اور حسین نقش بنانے کے بعد مطمئن ہو جاتی ہیں۔ چلیے در و دیوار بھی منقش ہو گئے۔

مہنگائی کے اس زمانے میں پینٹنگ کا یہ سستا طریقہ دل کو بڑا بھاتا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس رمز سے واقف نہیں ہیں۔ وہ پیک کی پچکاری پر برہم ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ مختصراً سنیے۔ ایک مرتبہ میں اپنے ابا اور دادا، دادی کے ہمراہ اپنے کسی عزیز سے ملنے جا رہی تھی۔ راستے میں ابا نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کی اور کچھ لینے کے لئے دوسری طرف چلے گئے۔ ہماری دادی بڑی دیر سے پان چبا رہی تھیں۔ انھوں نے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور پچ سے ایک لمبی سی پچکاری دے ماری اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ان کو اس بات سے کیا غرض کہ وہ کسی کے ملبوس کے کرتے پر لال لال پیک سے کوئی نقش کھینچ چکی ہیں۔ اور سفید لباس میں ملبوس ایک صاحب ان کو خونخوار نظروں سے گھور رہے ہیں۔ کیونکہ ان کا سفید لباس قصہ پارینہ بن چکا تھا۔ ہمیں ان کے سفید لباس پر یہ لال پرنٹ بڑا شاندار لگا۔ لیکن وہ شخص تنک کر بولا: عورت ہو! اگر تمہاری جگہ کوئی مرد ہوتا تو میں اچھی طرح سمجھ لیتا۔

ہم بیٹھے سوچتے رہے کہ آج کل فیشن کا زمانہ ہے جس میں ایک آدھ کپڑوں پر باٹک بنا دیا ہو سب کھٹ اکڑ رہا ہے۔ حالانکہ ایک مرتبہ ہماری ایک خالہ جان نے زور کی چھینک ماری تو ان کے منہ سے پان کا سارا مرچہ ہمارے نئے نویلے سوٹ پر گلکاری کر گیا۔ خوشی سے ہمارا دل بھی بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ ہم نے جلدی میں بغیر [illegible] سوٹ سی کر پہن لیا تھا۔ خیال تھا کہ بعد میں [illegible] سے گلکاری

[illegible] پان نے ہماری مشکل حل کر دی۔ آپ ذرا تصور کیجئے
کہ لال زمین پر لال رنگ کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے پان کی پیک کا پتہ
ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ عمر بیت جاتی ہے۔ یہ نہیں چھٹتا۔
اگر آپ نے اب تک پان نہیں کھائے تو اب کھانا شروع کر دیں۔
[illegible] کے بڑے فوائد ہیں۔ سینہ [illegible] دار ہوتا ہے۔ اور صحت کا رنگ
[illegible] ہے ہونٹ جیسے لپ اسٹک کے لال لال نظر آتے ہیں۔ آپ کھانا
[illegible] کھائیں مگر پان ضرور کھائیں [illegible] سے ایک بات اور
[illegible] پان کھا کر اگالدان میں تھوکنے کی غلطی کبھی مت کیجئے گا۔
[illegible] در و دیوار، گاڑیاں اور کپڑوں پر گل کاری کے لئے کام میں
[illegible] ملے تو گورے گورے چہروں پر بھی پچکاری مارنے سے
گریز نہ کیجئے۔ اسی بات پر یہ ایک پان حاضر ہے۔ نوش فرمائیے۔ ارے
ادھر سے پیک ماریئے۔ وہ دیکھئے اک سفید دیوار ہے جی ہاں جلدی
[illegible] ورنہ بیچاری ادھر آنکلیں تو اگالدان لاکر آگے رکھ دیں گی۔

ایک پنتھ دو کاج

ایک کنجوس آدمی کو، جو ایک پنتھ دو کاج کو پسند کرتے تھے
اپنے نوکر سے یہ شکایت تھی کہ وہ جس کام کو جاتا، دیر سے واپس آتا۔
مالک کہتا، تم ایک ہی کام میں سارا وقت گزار دیتے ہو، اچھا نوکر
وہ ہوتا ہے جو ایک کام کو بھیجا جائے تو دو کام کر کے لوٹے۔ ایک بار
مالک شدید بیمار ہوا، نوکر سے کہا جاؤ ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ میری طبیعت
بہت خراب ہے۔ نوکر گیا تو ڈاکٹر کے ساتھ ہی مالک کے آٹھ۔ دس
عزیزوں کو بھی بلا کر ساتھ لے آیا۔

آقا نے ڈاکٹر کے ساتھ ان سب کو آتے دیکھا تو نقاہت سے
بولا تم ان لوگوں کو کیوں بلا لائے۔

نوکر نے کہا۔ آپ کہا کرتے تھے کہ ایک کام کو جائے تو دو کام کر کے
لوٹے۔ میں نے سوچا آپ کی حالت خراب ہے، شاید انتقال ہو جائے تو دوبارہ
عزیزوں کو بلانے کیوں جانا پڑے۔ میں نے دو کام کر لئے۔

مرسلہ۔ مسز ایم [illegible] ([illegible])

شمیم اختر

بیویاں اکثر صحیح بات سوچتی ہیں

یہ آج سے ٹھیک پچیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت میں تیس سال کا تھا۔ ان دنوں تیس سال کی عمر میں کسی مرد کی شادی کا طے پانا اسی طرح اچنبھے کی بات تھی جس طرح کہ آج کل کسی پچاس سالہ کنوارے کی شادی جب میں نے تیسویں سال میں قدم رکھا تو محلے والوں نے اپنے طور سے یہ سوچ لیا کہ میں شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کی خاطر میں نے یہ قربانی دی ہے۔ اس لئے محلے والے مجھے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے آرام کو دوسروں کی خاطر ترک کرنا نیکی کا کام ہے۔ ہر عام انسان کی طرح وہ دوسروں کو نیکی کرتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ جیسے اس نیکی کا صلہ انہیں کو ملے گا۔

ان کا یہ خیال غلط تھا کہ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کی خاطر میں شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ بے شک میں نے اپنے بہن بھائیوں کی وجہ سے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ معذور باپ کی موجودگی کی وجہ سے میرے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ محدود آمدنی میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں پوری کروں اور بیوی کے ناز اٹھاؤں۔ خاندان بھر میں ہی کمانے والا تھا۔ [illegible] کے لئے ماں کی نظریں میری جانب لگی رہتی تھیں۔ اپنی فیسوں، کتابوں اور کپڑوں کی رقم کے لئے بہن بھائیوں کے ہاتھ میری طرف ہی بڑھتے تھے۔

میرے بعض خیرخواہوں کا کہنا یہ تھا کہ ان حالات میں شادی کر لوں تو مجھ پر کوئی اضافی بوجھ نہیں پڑے گا۔ گھر میں اتنا [illegible] ہوگا کہ اس نیک بخت کے لئے دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔ لیکن میرے خیال میں بیوی [illegible] کہ وہ وقت کی روٹی [illegible] شوہر کی کمائی کو اپنا حق سمجھتی ہے۔ وہ شوہر کو اپنی [illegible] سمجھتی ہے۔ اس کے خیال میں شوہر صرف اسی کا ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے [illegible] کہ [illegible] شوہر کے والدین اور بہن بھائیوں سے الفت [illegible]

وہ سمجھتی ہے کہ یہ سارے رشتے ایسے ہیں۔ جن کی محبت وہ اپنے شوہر کے دل سے نہیں نکال سکتی۔ اپنے شوہر کے وہ دوست بھی برے لگتے ہیں جن سے وہ تعلق خاطر رکھتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اگر ان حالات میں میں نے شادی کر لی تو گھر میرے لئے جہنم بن جائے گا۔ محدود آمدنی کی وجہ سے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میں شادی کے بعد بیوی کو علیحدہ مکان میں رکھتا تاکہ منہ در منہ لڑائیوں کی نوبت نہ آتی۔

ہمارا ماحول ایسا نہیں تھا کہ کسی لڑکی کو مجھ سے محبت ہو جاتی۔ آج سے پچیس سال پہلے اس قسم کے واقعات کم ہی پیش آتے تھے۔ اگر کبھی کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا تو وہ صرف لڑکی کے لئے بھی رسوائی کا سبب بن جاتا تھا۔ بفرض محال، اگر کسی لڑکی کو مجھ سے محبت ہو جاتی اور اپنی محبت کے ہاتھوں بے بس ہو کر وہ مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی تو میں اسے اپنے مالی حالات سے آگاہ کرتا اسے کہتا [illegible] مجھ سے شادی کر کے تم کو میری محبت تو ملے گی لیکن آرام نہیں ملے گا۔ میں تمہارے تقاضے پورے نہیں کر سکوں گا۔ کیونکہ مجھے اپنے والدین کو روٹی کھلانی پڑتی ہے اور بہن بھائیوں کو اپنے بچوں کی طرح پالنا پڑتا ہے۔

یہ حالات جاننے کے باوجود اگر وہ مجھ سے شادی کرنے پر بضد رہتی تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بیوی کی تمام تر خوبیوں کے باوجود میری زندگی جہنم ہو جاتی۔ وہ [illegible] کے مطابق خاموش رہتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال تک یہ صبر برقرار رکھتی [illegible]

نے ایک چادر اور ایک کمرہ سالانہ بچے گی ان کے حوصلے اور عزم کے سامنے کچھ نہ کہہ سکا تھا وہ باتوں سے اور آنسوؤں سے مجھے زیر کر لیتی وہ کہتی تمہیں پیٹ کا جو وہ سب کے کھا رہے ہیں۔ میں تمہیں ماں باپ کا بوجھ اٹھانے سے منع نہیں کرتی۔ وہ مجھے اپنے والدین کی طرح عزیز ہیں لیکن تم نے اپنے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ وہ اچھے بھلے ہیں کہ اپنی دیکھ بھال خود کر سکتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ وہ وقت کا درست کریں اور شبینہ کالجوں میں پڑھیں۔ یہ اپنے اخراجات خود برداشت کر سکتے ہیں۔ مگر تم نے ان سب کو بچہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر میں اپنی بیوی کی بات سنتا تب گناہگار ٹھہرتا اور جو نہ سنتا تو جینا محال ہو جاتا۔ ان تمام حالات کے بارے میں سوچ کر میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں بہن بھائیوں کے فرائض سے فارغ ہونے کے بعد شادی کروں گا۔ سچ بات یہ ہے کہ کوئی والدین بخوشی اپنی بیٹی کسی ایسے لڑکے کے ہاتھ میں دے دیتے جو کنبے کا واحد کفیل ہو اور جس کے والدین زندہ ہوں۔ باپ معذور ہو اور جس نے سب بہن بھائیوں کی ذمہ داری اپنے ذمے لے رکھی ہو۔

جب میں بہن بھائیوں کی ذمہ داری سے آزاد ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ میری عمر چالیس سال کی ہو چکی ہے۔ اب سے پچیس سال پہلے ایک تیس سالہ کنوارے کو لڑکی ملنی اتنی ہی دشوار تھی جتنی کہ آج کل ایک پچاس سالہ کنوارے کے لئے دشوار ہے۔ لیکن میری ماں کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا دنیا بھر میں سب سے حسین اور جوانوں کا جوان ہے۔ اس نے میرے لئے رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ سب سے پہلے اس نے شہر میں بسنے والی تیرہ سالہ لڑکیوں کے مکان تلاش کئے۔ وہ ہر روز ایک نہ ایک لڑکی کے گھر میرا رشتہ لینے کے لئے جاتیں۔

میرا خیال تھا کہ تیرہ سالہ لڑکی کے والدین ایک چالیس سالہ مرد کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہنے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ کسی ایک نے میری ماں سے کہہ دیا ہو کہ لڑکے کی عمر لڑکی کے باپ کے برابر ہے لیکن میری ماں کے جانچنے کے مطابق شہر کی ہر تیرہ سالہ لڑکی کے چہرے میں کوئی نہ کوئی نقص تھا۔ کسی کا رنگ کالا تھا تو کسی کا بہت گورا۔ کسی کی ناک چھوٹی تھی اور کسی کی موٹی۔ کسی کے بال بہت گھنے تھے اور کسی کے بہت چھدرے۔ کسی کی آنکھیں کانی تھیں اور کسی کی چال۔ کسی کا قد بانس کی پھلانگ تھا۔ اور کسی کا ٹھگنی جتنا بجوکا اور اگر کوئی بہت حسین تھی تو اس کے مزاج ایسے تھے کہ ہوا بھی کترا کاٹ کر نکلے۔

مجھے اپنی ماں کی نیت پر قطعاً شبہ نہیں ہے وہ خلوص دل سے میرے لئے رشتہ تلاش کر رہی تھیں۔ حالانکہ بعض لوگوں نے مجھے میری ماں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تھی کہ وہ تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ جبھی تو وہ ہر اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہیں جہاں سے انہیں انکار کی توقع ہوتی ہے۔ ایک دو گھرانوں سے جب انہیں مثبت جواب ملا تو وہ گھر آکر بیماریوں پڑ گئیں اور پھر وہ ان گھروں کا راستہ ہی بھول گئیں۔

ایسے ہی ایک دوست نے میرا رشتہ ایک ایسی لڑکی سے پکا کیا جس کی عمر اکیس سال تھی اور اس کی منگنی کسی وجہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ اب سے پچیس سال پہلے جس لڑکی کی عمر اکیس سال ہو جاتی تھی تو بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگتے تھے کہ اس کی شادی زندگی بھر نہیں ہو سکتی۔ اور جس لڑکی کی منگنی ٹوٹ جاتی تھی اسے کوئی بھی بیاہ کر لے جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس بات سے کسی کو غرض نہیں تھی کہ منگنی کے ٹوٹنے میں لڑکی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ بے قصور ہے۔

شادی کے بعد میری بیوی اٹھتے بیٹھتے طعنے مارتی تھی کہ میں نے اپنی زندگی اپنے بھائی بہنوں کے لئے تج دی۔ اپنے لئے کچھ بچا کر نہیں رکھا۔ جوانی کی سی حالت ساری زندگی نہیں رہتی کہ آدمی کمائے اور کھلائے۔ جوانی میں بچایا ہوا مال بڑھاپے میں کھایا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ اگر برا وقت پڑا تو ان بہن بھائیوں میں سے کوئی بھی مجھے پوچھنے نہیں آئے گا۔

اپنی بیوی کی باتوں سے میرے دل کو رنج پہنچتا تھا مگر میں بے بس تھا۔ میری بیوی جب میرے بہن بھائیوں پر اٹھنے والی رقم کا حساب جوڑتی تھی تو اس کا حاصل جمع یہ نکلتا تھا کہ اس رقم سے ہم اپنے لئے ایک کوٹھی اور ایک کار خرید سکتے تھے اور بقیہ رقم سے بچوں کی ضروریات کی فکر سے آزاد ہو جاتے۔

اس عورت کی باتیں عجیب تھیں۔ وہ حسد اور جلن میں مبتلا، بچوں کی شادیوں کی فکر میں گھلتی رہتی تھی جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ میں بنیادی طور پر ایک نرم دل آدمی ہوں۔ مجھ سے اس کا جلنا اور کڑھنا نہیں دیکھا جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کسی طرح مجھے ایک

[illegible] تو میں اس کی تمام خواہشیں پوری کردوں۔

میں ایک دن دفتر میں اپنے کام میں مگن بیٹھا تھا کہ بریف کیس اٹھائے ایک آدمی مسکراتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ کچھ بھلا سا نام تھا۔ اس بات کو پچیس سال گذر چکے ہیں۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے آفٹر شیو لوشن کی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا۔ وہ بہت محبت اور خلوص سے مجھے زندگی کے نشیب و فراز سمجھاتا رہا۔ اس کی باتیں مجھے قائل کر رہی تھیں۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے چند کاغذات پر مجھ سے دستخط لئے۔ میں نے اپنی جیب سے چند سو روپے نکالے۔ اس نے وہ رقم اپنے بریف کیس میں رکھی اور چل دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری جیب ایک لاکھ روپے کے نوٹوں سے بھر گئی ہے۔

میں جب گھر میں داخل ہوا تو بہت خوش تھا۔ میری بیوی مجھے خوش دیکھ کر کہنے لگی "کیا آج کوئی چھوٹا بھائی راستہ بھول کر سلام کرنے چلا آیا تھا جو اس قدر خوش ہو"

میں نے کہا "نیک بخت، تمہارے نصیب اچھے ہیں۔ یوں سمجھو کہ ایک لاکھ روپے کا انتظام کر کے آرہا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ ایک لاکھ میں کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم اپنے لئے نئی کوٹھی، ورنئی کار خرید سکتے ہیں۔ باقی جو رقم بچے گی وہ میں تمہارے نام پر بنک میں جمع کرادوں گا۔ چاہے اس رقم سے بچوں کی شادیاں کرو یا اپنے لئے زیور بناؤ۔ میں اس معاملے میں ہرگز کچھ نہیں بولوں گا"

اسے اس خوشخبری سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہ لہجے میں زہر بھر کر بولی "زندگی بھر بہن بھائی تمہیں لوٹتے رہے۔ کیا اب تم نے کسی کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہے یا روپوں کا درخت بو کر آرہے ہو"

اس کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے خوش دلی سے کہا "کسی کو لوٹنے کا منصوبہ بنایا ہے اور نہ روپوں کا درخت لگایا ہے۔ لیکن ہاں، شاید روپوں کے درخت کا بیج بو کر آیا ہوں۔ درخت کا پھل آدمی خود نہ کھا سکے تو اس کی اولاد کھاتی ہے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے [illegible] چلا۔ میں نے پچیس سال کے لئے اپنی زندگی کا بیمہ کروایا ہے۔ [illegible] سمجھو کہ میں نے معمولی رقم اس مد میں لگائی ہے۔ آج سے ٹھیک پچیس سال بعد میں تمہارے ہاتھ پر ایک لاکھ نقد روپیہ لا کر رکھوں گا۔ اس وقت ہمارے بچے جوان ہوں گے۔ تمہاری ہر خواہش پوری ہوجائے گی۔ جیسا کہ تم اب کہتی ہو بڑھاپے میں [illegible] در بدر نہیں پھرنا پڑے گا۔ اگر ان پچیس سالوں کے دوران میرا انتقال ہوجائے تو یہ رقم تمہیں ملے گی۔ تمہیں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا۔ اپنی بیمہ پالیسی میں نے تمہارے نام کی ہے"

ایسے موقعے پر عام طور پر عورتیں اپنے شوہر سے جو کچھ کہتی ہیں وہی میری بیوی نے مجھ سے کہا۔ یعنی "خدا میرا سہاگ سلامت رکھے۔ مجھے روپیہ پیسہ نہیں چاہئے" بہرحال اس کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا۔ بیوی کے طعنوں سے مجھے جو رنج پہنچتا تھا۔ اس میں کمی آگئی تھی۔

آج اپنی زندگی کے پچیس سالوں کے بیمے کی رقم ایک لاکھ روپیہ میرے ہاتھ میں ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج سے پچیس سال پہلے میری بیوی نے میری بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بیویاں عام طور سے صحیح باتیں سوچتی ہیں۔ میں نے گھر میں ابھی تک کسی کو نہیں بتایا کہ میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے۔

عورت ایک لمحۂ فکریہ

بیگم ہوشیار جنگ

قدرت خداوندی کی بنائی ہوئی تمام اشیاء کائنات میں سب سے اچھی شے [illegible] و شاہکار عورت ہے۔ اس کی حیثیت چمن عالم میں ایک سدا بہار پھول کی سی ہے اس کے دم سے گھروں کی زینت ہے۔ جس گھر میں عورت نہیں وہ گھر گھر نہیں، ایک ویرانہ ہے۔ لیکن وہ ضعف و ناتوانی کا شکار ہے۔ اس کی روح مجروح اور [illegible] ستم رسیدہ ہے۔ دنیا کی ہر عورت کو اپنی زندگی میں تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ پہلا مرحلہ جب وہ دنیا میں قدم رکھتی ہے اس وقت وہ بہن اور بیٹی کہلاتی ہے۔ اور اپنے والدین کی آغوش میں تربیت پاتی ہے۔ اور جب سن شعور کو پہنچتی ہے تو کسی شخص کی شریک حیات بنا کر سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں سے اس کی زندگی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ وہ بیوی بن کر ایک اجنبی کے گھر میں داخل ہوتی ہے۔ تیسرا موڑ اس وقت شروع ہوتا ہے جب وہ ماں بنتی ہے ماں بننے کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک طرف شوہر کی اطاعت اور خانہ داری کی ذمہ داریاں دوسری طرف بچوں کی نگہداشت، اور ان کی تعلیم و تربیت کا احساس۔ یہی دور اس کی زندگی کا اہم دور ہوتا ہے۔ اس مرحلے کو جو عورت بحسن و خوبی انجام دیتی ہے وہ اچھی ماں اور بہترین بیوی کہلانے کی مستحق بنتی ہے۔ خصوصاً ماں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی آغوش کو بہترین تربیت گاہ بنائے۔ بچوں کا بیشتر وقت ماں کی معیت میں گزرتا ہے۔ اگر ماں مذہبی احکامات کی پابندی کرے گی اور بزرگوں کا ادب کرے گی تو یقیناً اس کی گود میں پرورش پانے والے بچے بھی متاثر ہو کر اسی راستے پر گامزن ہوں گے۔ آغوش مادر وہ تربیت گاہ ہے۔ جہاں بچے تہذیبی و اخلاقی درس پاتے ہیں اور یہی درس ان کی زندگی اور سماجی تعلیم میں معاون ثابت ہوتا ہے [illegible] بچوں کو ابتدا ہی سے اچھی تعلیم و تربیت دیتی ہے اور ان کے [illegible] ہے اس کے بچے مستقبل میں نہ صرف اپنے والدین کے لئے بلکہ ملک و قوم کے لئے قابل فخر ہوتے ہیں۔ ملک و قوم اور سماج کے معمار بنتے ہیں۔ آج ہمارے معاشرے کی حالت جس قدر بگڑتی جا رہی ہے وہ ہر شخص پر روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ آج تعلیم یافتہ لڑکوں اور لڑکیوں کی کمی نہیں لیکن ان میں کتنے ایسے ہوتے ہیں جو اخلاقی تعلیم و تربیت سے پوری طرح آراستہ ہوں۔ آج کل ترقی پسند عورتیں اپنی گھریلو ذمہ داری اور بچوں کی نگہداشت کرنے سے زیادہ اہمیت آزادی کو دیتی ہیں جس کے باعث ان کی گودیں خالی ہوتی جا رہی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو نوکروں کے حوالے کرکے سینما گھروں، پارکوں اور کلبوں کی زینت بن رہی ہیں اس جملے سے میری یہ مراد نہیں کہ عورتیں اپنے ذوق، شوق اور تفریح کو ختم کرکے صرف بچوں کی ہی طرف متوجہ ہو جائیں بلکہ انہیں چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور دیگر ضروریات سے فراغت پانے کے بعد اپنی جانب توجہ دیں۔ اگر کسی لڑکی کو والدین کے گھر سے اخلاق و تہذیب کی تعلیم نہ ملی ہو تو وہ کس طرح اپنے بچوں کی صحیح تربیت کر سکتی ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ جب لڑکی لڑکپن کے حد سے گزر کر جوانی کی سرحد میں قدم رکھے تو اس کو اخلاق و تہذیب کے زیور سے آراستہ کریں تاکہ وہ اپنے بھائیوں کے لئے اچھی بہن والدین کے لئے بہترین بیٹی اور شوہر کے لئے نیک شریک حیات بن کر مثالی بیوی اور ماں بننے کے بعد اپنے بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرے۔ عورت ہی ماں کا وہ روپ ہے جو اپنے بچوں کو اخلاقی تعلیم کا پیکر بنا کر اس کے ہاتھ میں علم کی مشعل دے سکتی ہے۔ جس کے ذریعہ اس کے بچے بڑے ہو کر دنیا میں عظیم کارنامے انجام دے سکتے ہیں اور اپنے ملک و قوم کے اچھے معمار بن سکتے ہیں۔

یہ آزادیٔ نسواں کا دور ہے، لیکن میں افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ اس آزادی سے ہماری بہنیں غلط فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ یہ معیوب ہے۔ آزادی کا مطلب خواتین نے بھی ویسا ہی سمجھ لیا ہے، جیسا ہندوستانیوں نے سمجھا ہے کہ ملک آزاد ہوتے ہی سب کو کرسیوں کی فکر پڑ گئی۔ لیڈروں نے قوم کی خدمت کرنے کے بجائے اپنی تجوریاں بھرنے کا کام شروع کر دیا۔ کالا بازاریوں نے لوٹ مچا رکھی ہے اور عمال حکومت دل چسپی اور دل جمعی سے

کام نہیں کرتے، رشوت کا بازار گرم ہے۔ کوئی کام مشکل ہی اس کے بغیر انجام پاتا ہے۔ خواتین بھی آزادی کی تڑپ لے کر بے عمل ہو گئی ہیں۔ انھیں فیشن پرستی کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ سیر و تفریح سے دل نہیں بھرتا، گھر اور بچوں کو نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ملبوسات اور حسن افزا چیزوں پر بے دریغ روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ ان سب باتوں کی اصلاح ہونی چاہیئے تاکہ مشرقی خاتون کا وہ مرتبہ باقی رہے جو شہرت رکھتا تھا۔ ہماری بہنوں کو شمع محفل بننے کے بجائے خاتون خانہ بننا چاہیئے۔

اقوالِ زرّیں

- فیشن، بدصورتی کی ایک شکل ہے اور اس قدر ناقابل برداشت کہ ہر ماہ بعد اسے بدلنا پڑتا ہے۔
- بہت کم خلوص نہایت خطرناک ہوتا ہے اور بہت زیادہ سراسر جھوٹ۔
- بے سکونی ایک آدمی یا قوم کی ترقی کے لئے پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔

مرسلہ۔ بیگم تبسم اشرفی۔ لکھنؤ

عرفانیات

۱۔ سب سے بڑی چیز ۔۔۔۔۔۔۔ خدا کا نام
۲۔ سب سے اچھا ناصح ۔۔۔۔۔۔۔ اپنا ضمیر
۳۔ سب سے لذیذ کھانا ۔۔۔۔۔۔۔ تندرستی
۴۔ سب سے تلخ چیز ۔۔۔۔۔۔۔ مفلسی
۵۔ سب سے بھاری مفلسی ۔۔۔۔۔۔۔ قرض
۶۔ سب سے حرام غذا ۔۔۔۔۔۔۔ غصّہ
۷۔ سب سے بڑی دولت ۔۔۔۔۔۔۔ علم
۸۔ سب سے بڑا خزانہ ۔۔۔۔۔۔۔ قناعت
۹۔ سب سے اچھی دوا ۔۔۔۔۔۔۔ امید
۱۰۔ سب سے بڑا جادو ۔۔۔۔۔۔۔ گانا
۱۱۔ سب سے بڑا جنون ۔۔۔۔۔۔۔ خود پرستی
۱۲۔ سب سے بڑا دشمن ۔۔۔۔۔۔۔ خوشامدی
۱۳۔ سب سے بڑا کمینہ ۔۔۔۔۔۔۔ احسان جتانے والا

مرسلہ۔ مس [illegible]

خواتین کے لکھے پاکستانی ناول

ناول	مصنفہ	قیمت
ہالہ	اے۔ آر خاتون	۳۰/-
افشاں	"	۵۰/-
پرمان	"	۱۴/-
سنگسار	سلمیٰ کنول	۹۰/-
سہاگن	"	۱۴/-
ناجیہ	رضیہ بٹ	۲۵/-
ثمینہ	"	۱۶/-
شائستہ	"	۲۰/-
ریشم	"	۱۴/-
رابعہ	"	۲۵/-
بھنور اور ساحل	ماہ منیر فروغ	۱۶/-
آسمان سے آیا فرشتہ	دیبا خانم	۱۶/-
دل سے دل تک	"	۱۵/-
پونم کا چاند	رضیہ بٹ	۲۰/-
نگینہ	فرزانہ نصیر	۹/-
حوریہ	بلقیس ہاشمی	۲۰/-
جینے کی آرزو	فریدہ حق منجو	۹/-
اور تم بیتاب	زہرا رضویہ	۲۵/-
آئیڈیل (افسانے)	رضیہ بٹ	۱۵/-
آگ	شمیم نقوی	۲۰/-
آئینہ	بیگم وائی علی خاں	۹/-
شبو	رضیہ بٹ	۱۵/-
عفرا	عابدہ نسرین	۳۰/-
لیزا	پروین شریف	۲۰/-
مونا	زرینہ صنوبر	۵/-
نقش قدم	فردوس حیدر	۱۴/-
زرین	رضیہ بٹ	۲۵/-
شعاع	نادرہ خاتون	۲۰/-
تنت جگا	دینا خانم	۱۸/-

مع اہل و عیال

از سہا[illegible]

شادیوں میں شرکت بظاہر بڑا خوش گوار کام ہے لیکن اس کا اثر گھر کے بجٹ پر ایسا بُرا پڑتا ہے کہ وہ کسی طرح سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

پندرہ فروری کے بعد سے اپریل کے آخر تک نہ زیادہ سردی نہ زیادہ گرمی والا موسم شادیوں کے لئے بہترین موسم ہوتا ہے اور اس موسم میں دعوت ناموں ... اور پیام فرحت والے لفافوں کی ایسی زبردست بارش ہوتی ہے کہ دماغ چوندھیا جاتا ہے۔

دعوت ولیمہ میں شرکت کا کارڈ بھیجنے والے حضرات سب سے زیادہ ستم ظریفی یہ کرتے ہیں کہ دعوت نامے میں خواہ مخواہ مع اہل و عیال کا دم چھلا لگا دیتے ہیں۔ ان کے یہ دو لفظ بڑھا دینے میں ان کو تو کوئی خاص زحمت نہیں ہوتی لیکن ہمارے سر پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے آپ سے کیا چھپی۔ ہمارے جیسے اوسط طبقے کے لوگوں کے لئے مع اہل و عیال کے کسی تقریب میں شرکت کے لئے جانا آسان نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کافی اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ ہتو کا جوتا پھٹا ہے منی کے لئے غرارے کی فروست گڈی کے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں۔ مجو نئے سوٹ کے لئے اڑے ہوئے ہیں بیگم کہتی ہیں۔ موئے جیں سال کے پرانے دھرا دھو جوڑے آخر کب تک گھسیٹے جائیں گے ہر تقریب میں وہی گھسے پٹے جوڑے پہن کر جاتے اب تو شرم آنے لگی ہے غرض فرمائشوں کی ایسی بھرمار ہو جاتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ شادی میں شریک ہونے کے بجائے سرپٹ کر جنگل کی راہ لی جائے۔

بات یہ ہے کہ شادی میں شرکت کا شوق ہم سے کہیں زیادہ اہل و عیال میں ہوتا ہے اور ٹھیک بھی ہے ہم تو خیر ادھر ادھر گھوم پھر کر اپنا دل بہلا لیتے ہیں لیکن بال بچوں کی تفریح کا ذریعہ تو یہی شادی بیاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری بیگم صاحبہ جب کبھی کوئی دعوت نامہ آتا ہے تو سب سے پہلے وہ بڑے اشتیاق سے مع اہل و عیال والے جملے کو تلاش کرتی ہیں اور اگر کسی دعوتی کارڈ میں یہ خوش آئند الفاظ نہیں ہوتے تو وہ بڑی بیزاری سے اسے کہیں طرف بڑھا دیتی ہیں۔

ہم خود چاہتے ہیں کہ بال بچوں کو کبھی کبھی ادھر ادھر جانے اور تفریح کرنے کا موقعہ ملے مگر مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں کا تعلق ان خوش قسمت مالدار گھرانوں سے نہیں جن کے بال بچے نک سک سے ہر وقت درست رہتے ہیں اور کہیں جانے کے لئے انھیں کسی قسم کی تیاری نہیں کرنی پڑتی لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے یہاں تو ہر چیز کام چلاؤ ہے اس لئے ہمارے اہل و عیال کا شادی بیاہ میں شرکت کرنا کافی کھمبیر ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم اپنی ڈاک گھر کے پتے پر نہیں اپنے ایک دوست کی دکان کے پتے پر منگاتے ہیں تاکہ اہل و عیال والے دعوت ناموں پر بیگم کی نظر نہ پڑ سکے۔

لیکن کبھی کبھی اس میں بڑی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہمارے ایک عزیز نے بڑے خلوص سے مع اہل و عیال کے شادی میں شرکت کا بلوا دیا۔ مگر ہم نے اس کی کان وکان بیگم کو خبر ہونے نہیں دی۔ جب ہم اکیلے ٹڑوں ٹوں شادی میں شرکت کے لئے ان کے دولت کدہ پر پہونچے تو انھوں نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا۔ جب ان کی بیگم کو ہماری سونی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گئیں اور شادی کے بعد بنفس نفیس خود شکایت کے لئے۔ ہمارے گھر تشریف لے آئیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ ہماری ان کی ملاقات باہر کے برآمدے ہی میں ہو گئی اور ہم خیریت خیر سلا پوچھنے کے بعد اندر جانے کے بجائے اپنے ایک دوست کے یہاں جا کر پناہ گزیں ہو گئے اور جب تک بیگم ... بک بک کر ڈھنڈا نہ پڑ گیا ہم گھر کے اندر داخل نہیں ہوئے۔

اب ہم نے اپنے خطوط گھر کے پتے پر منگانے شروع کر دیے ہیں اور بیگم سے کہہ دیا کہ ہم اپنے جیسے لوگوں کا ایک وفد حکومت کے پاس لے جانے کی تیاری کر رہے ہیں جو حکومت سے دست بستہ درخواست کرے گا کہ یا تو وہ امداد برائے شرکت شادی کوئی فنڈ قائم کرے یا دعوت ناموں میں مع اہل و عیال کے الفاظ شامل کرنے پر پابندی عائد کر دے۔

- اگر آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جوابی کارڈ یا ڈاک ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔ ● تبدیلی پتہ کی اطلاع ... کو ... کر ۳۰ تاریخ تک مل جائے۔

ادارہ

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال پر ملال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح روانہ کی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ تاخیر سے پہنچنے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں خبر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں اور ان پر یہ بھی لکھ دیں کہ پہلے کون سی خبر شائع کی جائے۔ ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

- صبیحہ تسنیم، ذہین احمد صدیقی (جونپور) میرے بھائی حسین احمد اور بھابھی عشرت جبیں کے گلزار حیات میں پہلی بار ۲۰ فروری ۱۹۸۱ء بروز سنیچر بوقت ۱۰ بجے دن، بمقام ٹاٹولہ جونپور اللہ تعالیٰ نے ایک کلی کھلائی۔ نام عائشہ صدیقہ قرار پایا۔ دعا ہے کہ شادمانیوں کے گہوارے میں پھولے پھلے اور فخر خاندان بنے۔
- قیصر جہاں (ایسولی۔ سلطانپور) میرے پیارے بھیا منصور حسین اشرفی اور پیاری بھابھی نسیم بانو کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے دوسری بار ۹ فروری ۱۹۸۱ء بروز دوشنبہ ایک چاند سا پھول کھلایا۔ پیار کا نام شانی رکھا گیا۔ دعا ہے کہ نومولود عمر دراز پائے اور بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔
- امۃ الحبیب اعجاز (میسور) میرے بڑے بھائی عبدالحفیظ صاحب ایم۔ایس۔سی لکچرر، اور بھابی امۃ الرفیع حفیظ بی۔ایس۔سی۔بی۔ایڈ کے گلشن حیات میں ۳ مارچ ۱۹۸۱ء بروز منگل بوقت ۴ بجے شام ایک حسین کلی مسکرائی۔ نام امۃ الوحی رکھا گیا۔ پیار کا نام سعدیہ ارم قرار پایا۔ خدا سے دعا ہے کہ صاحب نصیب ہو۔ اور اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

پیغام مسرت ...

- عزیزی (بابو) محمد فاروق سلمہ ابن جناب عبدالغفور صاحب عرف گروجی کی شادی عمیرہ جمال سلمہا بنت عبدالقدیر صاحب ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ء بروز اتوار بعد نماز مغرب مسجد امامن سردار پٹیل باغ میں نہایت سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ عزیزی فاروق سلمہ کو ہمارے مرحوم دوست حاجی عبدالرشید صاحب (فرم حاجی عبداللہ عبدالرشید۔ فراش خانہ۔ کانپور) نے مثل اولاد کے پرورش کیا تھا۔ شادی محترمہ بیگم صاحبہ حاجی عبدالرشید صاحب نے سرانجام دی۔ مجھے دلی صدمہ ہے کہ میں کمزوری کے باعث سفر کرنے سے معذور ہوں اس لئے شرکت نہ کرسکا۔ بہرحال بہن صاحبہ کو مبارکباد دیتے ہوئے دعا کرتا ہوں اللہ پاک بہو کو نیک و سعادتمند کرے۔ بیگم نجم الدین (سیتاپور) میرے بھانجے اخلاق احمد سلمہ خلف عبدالحسیب صاحب کی شادی خانہ آبادی سائرہ (بنت سردار حسین صاحب) میلانی گنکش، کھیری، ۵ اکتوبر ۱۹۸۰ء بروز یکشنبہ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو شاد و آباد رکھے۔
- بی۔ آر تسلیم بیگم (واثم باڑی) میری ماموں زاد بہن شاکرہ بانو عرف ناہید (دختر بیگ اختر ایچ۔ ایم الور پاشا) کا عقد سعید غنی محمد جاوید، بی ایس۔ سی (ابن جناب غنی محمد یوسف مرحوم ....) کے ساتھ ۲۲ مارچ ۱۹۸۱ء بروز اتوار بمقام برنام پیٹ بحسن و خوبی انجام پایا اور واثم باڑی میں دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ مبارک کرے۔ دعا ہے کہ دونوں ہمیشہ یک جان دو قالب ہو کر رہیں۔
- رضیہ سلطانہ العیدروس (جنجیرہ۔ مرڈیہ) بڑی مسرت سے لکھ رہی ہوں کہ میرے چھوٹے بھائی سید عزیز الحق العیدروس کی شادی سیدہ فرزانہ بیگم میر کے ساتھ ۲۹ مارچ ۱۹۸۱ء کو بمقام ... بخیر و خوبی انجام پائی۔ خدا سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے اور باہم شیر و شکر ہو کر زندگی گذاریں۔
- مہ ناز فریدی (مراد آباد) میرے سب سے چھوٹے بھائی محمود کی شادی ہمراہ یاسمین سیما ۱۰ جنوری ۱۹۸۱ء بروز ہفتہ بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ دونوں کو ہمیشہ خوشیوں سے ہمکنار رکھے اور شاد و آباد رہیں۔
- کشور صباح (کانپور) میرے دیور نفیس عالم کی شادی ۱۱ اپریل ۱۹۸۱ء بروز سنیچر ہمراہ ماہ جبیں بخیر و خوبی انجام پائی۔ ولیمہ ۱۲ اپریل

بڑی شان سے ہوا۔ دعا ہے کہ خدا میرے دیور کی جوڑی سلامت رکھے۔

• مرحوم عبدالاحد صاحب کی صاحبزادی شائستہ سلمہا کی شادی ہمراہ ظہیر سلمہ (فرزند جناب نثار الدین۔ بہرائچ) پھول باغ لکھنؤ میں ۱۷ر اپریل ۱۹۸۰ء کی شب میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

نسیم انہونوی

• چودھری محمد حبیب یار صاحب (فتحپور) کی دختر نیک اختر کی شادی شرف اللہ قدوائی (فرزند مجیب الدین قدوائی صاحب، ریٹائرڈ ڈپٹی اکسائز کمشنر کے ہمراہ ۱۲ر اپریل ۱۹۸۰ء بروز اتوار بمقام کٹرہ عبدالغنی فتحپور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• اردو کے مشہور ادیب ڈاکٹر شجاعت علی صاحب کی دختر نیک اختر پروین شجاعت سلمہا کی شادی محمد شکیل الدین سلمہ۔ بتاریخ ۵ر اپریل ۱۹۸۰ء بمقام ممتاز کالج لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی جس میں ادیبوں، شاعروں اور عزیزوں نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• مرحوم محمد قطب الدین صاحب (آمہور) کی بھتیجی فاطمہ شائستہ سلمہا (بنت جناب مرحوم عبدالغنی) کا عقد سعید ہمراہ حفظ الرحمٰن سلمہ (ابن مینگار عبدالقیوم مرحوم۔ پرتاب گڑھ) ۱۲ر اپریل ۱۹۸۰ء بوقت دوپہر بمقام مسجد نور اللہ بیٹ آمہور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پُرملال کی خبریں

• غنی احمد صاحب (پٹنہ) کے خط سے یہ علم ہو کر بیحد افسوس ہوا کہ ان کی شریک زندگی۔ بہن شکیلہ جبیں ۱۷ر مارچ بروز منگل بوقت ۹ بجے شب دماغ کی رگ پھٹ جانے سے پٹنہ اسپتال میں انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ کی شادی کو صرف ۱۲ سال ہوئے تھے، صرف دس سال کی ایک بچی ان کا نام روشن کرنے کے لئے ہے۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔ مرحومہ شادی سے پہلے اپنے میکے میں حریم منگایا کرتی تھیں، شادی کے بعد اپنی سسرال میں بھی منگاتی رہیں۔ اس لئے ادارہ حریم کو ان کی دائمی جدائی کا بیحد دکھ ہے۔ اللہ پاک ان کے شوہر، ان کی بچی، ان کی والدہ اور ان کے بھائی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نسیم انہونوی

• شمس النساء بیگم (کلکتہ) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میری خالہ راضیہ بی بی صاحبہ ۲۲ر جنوری ۱۹۸۰ء کو بمقام آنولہ اس جہان فانی سے رحلت فرما گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد ہی دوسری خالہ عارفہ بی بی بھی ۱۹ر فروری کو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• محترمہ زبیدہ بانو محمد اقبال مستری افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرا چہیتا لاڈلا اور اکلوتا چھوٹا بھائی عبدالجبار ہاشم لاکڑا والا جس کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۰ء بروز جمعہ بوقت صبح ۲ بجے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ انتقال یوں ہوا کہ ۲۷ر فروری کو اچانک پانچ منزلہ عمارت کا چوتھی اور پہلی منزل کا درمیانی حصہ گر گیا۔ پانچویں منزل پر ممی عبدالجبار اور بہن زاہدہ بانو گھبرائیں کہ کیا ہوا، لیکن اللہ کی قدرت کہ پانچویں منزل قائم رہی۔ ۱۴ دن بعد ہاؤسنگ بورڈ کی جانب سے دکروں لی گئی تو آخر میں گھر ملا، افسوس کہ دو ہی دن بعد بھائی عبدالجبار اسکوٹر کے حادثہ میں زخمی ہو کر بیہوش ہو گئے پھر یہ بیہوشی تین شبانہ روز قائم رہی اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کا زبردست سوگ منایا گیا اس لئے کہ مرحوم بیحد ہر دلعزیز تھے۔ افسوس کہ ہم دونوں بہنوں اور ماں کا واحد سہارا اللہ نے ہم سے چھین لیا۔ سچ ہے اللہ باقی رہے گا۔ اور سب فنا ہونے والا ہے۔ حریمی بہنوں سے درخواست ہے کہ میرے بھائی کی مغفرت کے لئے دعا فرمائیں۔

• عزیزہ بلقیس (حسان) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے خسر بزرگوار حاجی غلام احمد صاحب تاجر پارچہ ۱۳ر مارچ ۱۹۸۰ء کی شام کو ۴ بجے اس جہان بے ثبات سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑے پابند صوم و صلوٰۃ تھے، نیک اور خوش اخلاق تھے۔ مرحوم کی عمر ۸۰ سال تھی۔ ان کی خوشدامن صاحبہ جن کی عمر ۱۱۰ سال ہے بقید حیات ہیں۔ انھوں نے اپنے داماد کی میت پر عطر وغیرہ چھڑکا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• کلثوم قادر (بلاری) بڑے رنج و افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے چھوٹے بہنوئی سید عنایت الدین صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ سنٹرل اکسائز ۱۲ر مارچ کی شب میں ساڑھے گیارہ بجے اچانک

بمقام حیدرآباد ہارٹ اٹیک سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ضعیف ماں، دو شادی شدہ بہنیں، ایک بھائی، ایک بیوی، تین بیٹیاں چھوڑیں۔ اللہ پاک مرحوم کی مغفرت کرے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ۲۳ اور ۲۴ اپریل کی درمیانی شب میں ایک بجے ٹیلیفون سے یہ افسوسناک خبر سنی کہ عروسہ سلمہا (دختر اسلام احمد شمسی صاحب مرحوم و مغفور۔ کانپور کی صاحبزادی) اور ارشد سعید سلمہ (پسر جناب سعید احمد صاحب۔ کانپور) کی شریک حیات کا ۲۳ اپریل ۸۱ء کو انتقال ہو گیا۔ ۲۱ اکتوبر ۷۹ء کو عروسہ مرحومہ کی شادی ہوئی تھی۔ چند ہی ماہ قبل اللہ پاک نے اسے ایک فرزند عطا فرمایا تھا۔ جواب اس کی زندہ یادگار ہے۔ ایسی جوانی کی موت سب ہی کے لئے بیحد افسوسناک ہوتی ہے۔ ہم سب کا بھی خبر سن کر دل بھر آیا۔ عروسہ کی شکل آنکھوں میں پھر گئی۔ اس کا بچپن یاد آنے لگا، آتی تھی تو کس پیچھے ضد کرتی تھی کہ آپ لوگ کانپور آئیں۔ محبت کرنے والی اور خوش مزاج تھی۔ چند ہی ماہ قبل اسلام شمسی صاحب کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ بیگم اسلام صاحب ابھی اسی صدمہ کو فراموش نہ کر پائی تھیں کہ یہ جانکاہ حادثہ بھی پیش آگیا۔ اللہ پاک ہی انھیں صبر دے سکتا ہے۔ ہم سب ان کے غم والم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدائے تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے آمین۔

شریک غم۔ نسیم انہونوی

شام کو امی آکر دیں گی

ایک بچی ماں سے چاکلیٹ کے لئے ضد کر رہی تھی۔ ماں کے پاس چونکہ روپیہ نہ تھے اس لئے انھوں نے کہا، تم جاکر جنرل اسٹور سے چاکلیٹ لے لو، وہ تمہیں پہچانتا ہے کہدینا امی شام کو آکر روپیہ دے دیں گی۔

بچی خوش خوش جنرل اسٹور پہنچی۔ اسٹور والے نے چاکلیٹ دے کر بچی سے کہا۔ اب تم مجھے ایک پیار دیتی جاؤ۔

بچی کو چاکلیٹ کھانے کی عجلت تھی اس نے کہا شام کو امی آکر دیں گی۔

مرسلہ۔ نجمہ انصار (بھٹکل)

• منیجر نے اپنی پرائیویٹ سکریٹری کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ تم آج پھر دیر سے آئیں، لڑکی نے کہا منیجر گھر کے کام میں دیر ہو جاتی ہے۔

منیجر نے کہا تو پھر تم گھر کے کام دھندے کے لئے شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔

مرسلہ۔ ناہید اشرف۔ مدراس

حریمی دسترخوان

جھینگا پلاؤ۔ (ایک روسی کھانا)

روسی اپنے کھانوں میں غذائیت کا بیحد خیال رکھتے ہیں۔ جھینگا پلاؤ بھی ایک مفید غذا ہے۔

اشیاء: جھینگے خشک ایک کلو چاول پرانے ۵۰۰ گرام ناریل (کھوپرا) پیا ہوا چار کے ہونچے۔ ٹماٹر دو۔ انڈے دو۔ نمک حسب ضرورت پیاز بڑی چار گٹھی۔ ہری مرچ حسب خواہش۔ ہرا دھنیا حسب خواہش۔ لہسن چند جوے۔ مکھن دو ٹیبل اسپون۔ گھی ۱۰۰ گرام

ترکیب: پیاز باریک کاٹ کر لچھوں کی شکل میں کر لیں۔ قلعی دار دیگچی یا اسٹیل کے بھگونے میں دو کھانے والے چمچے گھی ڈال کر نصف پیاز کو اتنا تلیں کر خوب سرخ ہو جائے۔ احتیاط کے ساتھ چار کی تین چار پیالی پانی ڈال کر نمک ڈالیں اور چاولوں کو جو پہلے سے بھگو دئے گئے ہوں، ڈال کر ابالیں، چاول گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو ہلکی آنچ پر دم ہونے کے لئے رکھدیں۔

اب ہرا دھنیا، لہسن اور ہری مرچ باریک پیس لیں۔ کسی بھگونے میں تھوڑا پانی ڈال کر ٹماٹروں کو کاٹ کر ابالیں، جوس کافی گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔

اب دوسری دیگچی یا بھگونے میں بقیہ گھی ڈال کر بقیہ پیاز کے لچھے ڈال کر تھوڑی دیر پکائیں پھر جھینگوں کو اچھی طرح صاف کرکے دھو کر ڈالیں اور بھونیں۔ پانی کے چھینٹے حسب ضرورت دیں تاکہ جھینگے گل جائیں۔ اس کے بعد کسی بھگونے میں چاولوں کی ہلکی تہہ بچھا کر جھینگوں کی تہہ لگائیں پھر چاول کی تہہ دے کر جھینگے پھیلائیں اور اس کے بعد بقیہ چاولوں کو بچھا دیں۔ انڈوں کی زردی سفیدی اچھی پھینٹ کر چاول کی تہہ پر پھیلا دیں۔ سب سے آخر میں ٹماٹر جوس اور مکھن ملا کر ڈالیں۔

اگر آپ کے پاس اوون ہے تو اسے اوسط آنچ پر تھوڑی دیر رکھکر نکال لیں۔ اوون نہ ہو تو نیچے انگیٹھی رکھکر ہلکے سے پھیلائیں اور بھگونے کو چولہے پر رکھدیں۔ بھگونے پر سرپوش رکھ کر سرپوش پر انگارے رکھدیں تاکہ انڈے کا آمیزہ پک جائے۔ کچھ دیر بعد بھگونا اتار لیں جھینگا پلاؤ تیار ہو گیا۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت بھیجا گیا ہو سنجیدہ، موزوں اور معیاری ہو اس کے ہمراہ نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کیا گیا ہو۔ ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والے اشعار شائع نہیں ہوتے۔ جون کے لئے عنوان ہے "آئینہ" اور جولائی کے لئے "درد" ہر ماہ کے لئے شعر علیحدہ علیحدہ کاغذ پر لکھ کر روانہ کریں۔ ادارہ

صدیقؓ کے عشق کا ہے وہ جاں سوز نظارا
جبریل نے یا ایتہا النفس پکارا

مرسلہ:۔ روحی اختر الملکی محلہ (آرہ)

میری آنکھوں میں سمایا اس کا ایسا نورِ حق
شوقِ نظارہ ترا اے بدر کامل اٹھ گیا

مرسلہ:۔ ساجدہ بیگم، شہناز بیگم (بنگاراپیٹ)

آنکھ ان کو دیکھتی ہے نظارہ کیے بغیر
پردے میں چھپ گئے ہیں وہ پردہ کیے بغیر

مرسلہ:۔ نجمہ انصار (منابھٹکل)

شاید نظارہ نہیں آئنہ کیا دیکھنے دو دل
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

مرسلہ:۔ نجم السحر (کرنول)

صبح جب میری نگہ سودائی نظارہ تھی
آسماں پر اک شعاعِ آفتاب آوارہ تھی

مرسلہ:۔ احمدی عظمت (آمبور)

اظہارِ محبت مشکل تھا تکمیلِ تمنا کیا کرتے
تھے برق کی صورت میں جلوے ہم ان کا نظارہ کیا کرتے

مرسلہ:۔ قمر لطیف نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

مجھ میں جلوا جو پنہاں ہے سناؤں کس کو
کچھ شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو

مرسلہ:۔ پی آر نجم الاقبال (معاش)

اے صبح یاں ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے دے بڑھ کے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ۔ کلکتہ

ہر چہرہ یہاں چاند تو ہر ذرہ ستارہ
یہ وادیِ کشمیر ہے جنت کا نظارہ

مرسلہ:۔ صولتی نسیمہ عاشی (آمبور)

کبھی ایسا بھی نظارہ کیا ہے تو نے اے مجنوں
کہ لیلیٰ کی طرح تو خود بھی ہے محمل نشینوں میں

مرسلہ:۔ مومنہ مختار (میسور)

اگر چاہوں کہ نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر میرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارہ

مرسلہ:۔ عصمت آرا (یالنکا)

نظارہ شفق کی خوبی اس کے زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

مرسلہ:۔ جمیلہ کاسرگوڈ (بھٹکل)

- نمبر ۱۴۶۲، ۹۲۳۲، ۱۲۵۶ ناموزوں۔ نورجبیں۔ صرف ایک ہی مصرع کو اپنے دو ٹکڑوں میں لکھ دیا ہے۔

ماں کا مرتبہ

یہ تو آپ سب کو معلوم ہے کہ اللہ کے پیغمبر حضرت موسیٰ خدا سے باتیں کرنے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے جاتے تھے آپ ایک بار اپنی ماں کی وفات کے بعد کوہ طور کی طرف جا رہے تھے پہاڑ سے ایک صدا بلند ہوئی۔ اے موسیٰ سنبھل کر چلو کیوں آج تمہارے لئے دعا کرنے والے سب خاموش ہیں اس چھوٹے سے واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماں کا درجہ کتنا بلند ہے قرآن پاک میں بھی جگہ جگہ اپنی ماں کی خدمت پر زور دیا گیا ہے۔ رسول پاک کا ارشاد ہے وہ شخص بڑا بدنصیب ہے جس نے ماں کے ہوتے ہوئے اس کی خدمت نہ کی اور جنت سے محروم ہو گیا۔

بیگم ہوشیار جنگ۔ بمبئی

آپ نے سنا کہ جانے سبین باجی نے کرم صاحب سے کیا جھگڑا کیا کہ وہ یا تو بھائی صاحب کی جی جان سے تیمارداری کر رہے تھے۔ کیا تو گھر چلے گئے!۔ یہ سبین باجی بہت مغرور ہو گئی ہیں!۔

وصیہ تم غیبت کرنا بھی سیکھ گئی ہو:

ارے کیا باجی۔ غیبت کیا۔ میں نے آپ سے کہا نہیں۔ وہ تو مجھ سے یہ کہہ رہی تھیں کہ وہ بھائی صاحب سے منگنی پر تیار نہیں۔ توبہ توبہ۔ اتنی لمبی زبان ہو ان کے منہ میں۔ مجھے ان کی باتیں ذرا پسند نہ آئیں:

تم سے کیوں کہا تھا۔!: نازیہ نے حیرت سے پوچھا۔

جی مجھے پیغام بر بنا رہی تھیں کہ میں ان کا اظہار چچا میاں تک پہنچا دوں میں نے کہا کہ نہ بابا۔ مجھے اپنی چٹیا منڈوانی نہیں ہے!:

تم نے کسی سے کہا تو نہیں؟:

میں یوں کسی کا دل دکھاتی باجی۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ یہ الٹی سیدھی بکواس انھوں نے ضرور احتشام بھائی سے کی ہے۔ تبھی تو وہ بیمار ہو کے اسپتال گئے۔ اور اب۔ جبکہ وہی اکیلی ان کے پاس بیٹھی تھیں ان پر ایسا سخت دورہ پڑا تھا۔

تم کسی سے کچھ نہ کہنا۔ خبردار۔ سبین تم سے اگر جواب طلب کریں تو کہہ دینا کہ تمھیں یاد نہ رہا تھا:

اور کیا۔ مگر مجھے بے چارے کرم صاحب پر ایسا ترس آرہا ہے۔ وہ کتنے خاموش، گم صم رہتے ہیں۔ کسی سے کچھ مطلب نہیں رکھتے۔ انھیں سبین باجی نے کیسے ٹھکرا دیا:

تمھیں کیسے معلوم ہوا!؟: (باقی آئندہ)

سبین کا حال ابتر تھا۔ پچھتاووں کے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔ ضمیر ملامتوں کے کوڑے برسا رہا تھا۔! اس نے بہت برا کیا تھا!۔ اب کن نظروں سے ایک ملازم اسے دیکھے گا؟۔ خود کو سبین کا آقا سمجھنے لگے گا!۔

سہ پہر اداس تھی۔ کل کی طرح آج بھی گہرے سیاہ ابر کے پرے کے پرے مطلع افق پر اکٹھا ہو کر پھیلنے لگے تھے۔ ہوائیں دم بخود تھیں۔ اور تحتِ پائیں باغ کے اونچے درخت اس طرح ساکن و صامت کھڑے تھے کہ ان میں خفیف سی حرکت بھی نہ تھی!۔

موسم کی سنسانی کا اثر آدمی کے مزاج پر ضرور ہوتا ہے۔ سبین اپنے کمرے کی کھڑکی میں بیٹھی بے خود و بے خبر سی مٹیالی فضا میں موہوم سی بجلیوں کی چنگاریوں کو اڑتے اور منتشر ہوتے دیکھ رہی تھی کبھی کبھی بادل ہولے سے گرج کر خاموش ہو جاتا!۔

کچھ دیر قبل اعزاز نے ہسپتال سے اسے فون پر اطلاع دی تھی کہ احتشام صاحب کی حالت پھر غیر یقینی ہو گئی تھی۔ اور اس نے سبین کو تاکید کر دی تھی یہ خبر گھر میں عام نہ کی جائے!۔

اس وقت گھر میں کوئی تھا بھی نہیں!۔ اقبال صاحب اپنے سرکاری اور ضروری کام کے سلسلے میں باہر مصروف تھے۔ اعزاز ہفتہ بھر کی چھٹی کے بعد ویسے اپنے آفس چلے گئے تھے۔ اور چونکہ کرم صاحب نے بڑے تیقن سے چھوٹی آپا، چچا میاں اور رضوان صاحب کو دے رکھی تھی۔ لہٰذا وہ لوگ بھی

انہیں اپنے فرائض سے فرصت کر کے شام ہی کو ہسپتال جانے والے تھے!

اعجاز، ایاز اور یاسر، مع مکرم کے ہسپتال میں تھے! انہیں احتشام سے مل بیٹھنے یا گفتگو کرنے کی قطعی اجازت نہ تھی! بس وہ وارڈ کے باہر ہال میں لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے خاموش اور دم بخود سے وارڈ کی طرف تکا کرتے تھے۔ اس وقت ان لوگوں نے ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ اور نرسوں کی مضطربانہ چلت پھرت دیکھی تو سراسیمہ ہو گئے۔

یاسر نے اپنے بڑے بھائی کے سلسلے میں ایک نرس سے کچھ پوچھا بھی تھا۔ مگر وہ اس سے سیدھے منہ سے بولے بغیر ایک طرف دوڑ گئی!۔

پھر ان لوگوں نے ایک نرس کو دیکھا جو آکسیجن سلینڈر لیے جا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کے حواس گم ہو گئے۔ ہوش اڑ گئے۔ اتنا تو انہیں علم تھا ہی کہ آکسیجن علاج کا آخری مرحلہ ہے!۔

اب کیا ہو گا؟: یاسر کے آنسو بہنے لگے!۔

بھائی جان کے پاس کوئی اپنا نہیں ہے: اعجاز بولا: معلوم نہیں۔ ڈاکٹر کیا کر رہے ہیں؟۔

مکرم صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟: ایاز نے کہا: ہمیں کوئی اندر جانے نہ دیگا مگر آپ تو جا سکتے ہیں کسی صورت سے جائیے اور بھائی صاحب کا حال دیکھ آئیے۔ مکرم نے ایک نرس سے اجازت طلب کی! لیکن اس نے بڑی نخوت سے نفی میں سر ہلایا اور ایک کمرے میں گھس گئی۔

آپ گھر پر فون کر دیجئے: اس نے بدحواس ہو کر کہا: شاید فرحت صاحب یا اعزاز صاحب موجود ہوں۔ جلدی کیجئے!۔

ابو اور دادا ماں کی خاطر ہمیں کوئی صورت حال سے آگاہ کرنا۔ ساتھ

پر فائز نظریں ڈال کر کہا: میں نازو کو لے کر خود اقبال بھیا کے یہاں جاؤں گا

مجھے یہیں چھوڑ جایئے گا؟؟: نازیہ نے احتجاج کیا۔

تمہاری مرضی: وہ بولیں: وہ سسرال ہے یہ میکہ۔ جہاں چاہو رہو۔ میں تو اپنا اطمینان کر آؤں۔!"

نہیں ممی نہیں: نازیہ نے باپ کا اشارہ دیکھ کر جلدی سے کہا: ہم آپ ساتھ چلیں گے!۔ کچھ دنوں اور ٹھہر جایئے۔!"

جس قدر یہ لوگ انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا اصرار اور اشتعال ترقی پر تھا۔ ذہن میں ایک خیال جم گیا تھا کہ ہو نہ ہو کوئی بات ضرور ہے تب تو دونوں انہیں روک رہے ہیں اور نازیہ ان کی جان کی قسم نہیں کھا رہی!!۔

وہ ملول اور دل گرفتہ سی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہیں!۔

اتنے میں شام کے چار بجے کے قریب وصیہ کالج سے آ گئی۔! اور اپنا فولڈر اس نے میز پر رکھا اور اپنی ماں کا خیال کیے بغیر بولی۔

"آپ نے سنا۔ باجی۔ میں دوپہر کو کالج سے نرسنگ ہوم گئی تھی۔ اللہ۔ وہاں تو حشر بپا تھا۔ بھائی صاحب کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ کرنل چچا نے اعجاز بھائی سے کہہ دیا کہ۔ کوئی امید نہیں۔ اور۔!

وصیہ۔؟: نازیہ نے چیخ کر کہا اور تنبیہاً انگلی ہونٹوں پر رکھ لی۔

"بیٹی جانتی ہو کہ تمہاری والدہ پر ایسی اور بری خبروں کا ردعمل نہایت شدید ہوتا ہے۔ پھر بھی تم خیال نہیں رکھتیں!: فیضان صاحب ناخوشگوار لہجے میں بولے۔

وصیہ کھسیا کر بہن کے پاس بیٹھ گئی۔ اور چپکے چپکے بولی: اور باجی۔

وہم کا علاج ممکن نہیں ہے! کیسے کیسے واقعات تمہیں یاد ہیں۔"
بھائی صاحب تو بے حد پریشان ہوں گے۔
کا ہے کی پریشانی ؟۔
آپ لاکھ چھپائیے۔ مجھے تو آپ کا چہرہ بھی پریشان لگتا ہے۔؟
"میں کہتا ہوں کہ اگر بے چارہ لقمان دوبارہ زندہ ہو جائے تو وہ بھی تمہارے وہم کا علاج نہ کر سکے!"
اچھا۔ میں نازیہ سے پوچھتی ہوں!۔
نازیہ ان دنوں وہیں تھیں۔ انھوں نے باپ کا اشارہ سمجھ لیا اور سفید جھوٹ بولیں۔
"ممی۔ مجھے تو اس کا بھی پتہ نہیں کہ احتشام بھائی کو نزلہ بھی ہے؟"
"پھر بیچارا سرایا ز وغیرہ سب کہاں بھاگے بھاگے پھرتے ہیں!؟"
"ارے ممی یہ لڑکے بھلا ایک جگہ نچلے بھی بیٹھتے ہیں؟۔ روز فلم بازی ہے۔ ڈرامے دیکھنے بھاگتے رہیں!۔
اچھا کھاؤ میری جان کی قسم ؟!۔
ممی آپ کو یقین کیوں نہیں آ رہا!؟"
کیسے یقین آئے۔ میرا دل جو کہہ رہا ہے کہ ہو نہ ہو۔ کوئی خاص بات گھر میں ہوئی ہے" بیگم نیشان اپنے خیال پر اڑی رہیں" نہ تو اب احراز آتے ہیں نہ احتشام نے جانے کا آخر نہیں کیا ہوا۔ یہ لوگ تو فلم اور ڈرامے دیکھنے نہیں جاتے۔ اور تو اور اقبال بھیا بھی نہیں آئے!"
نازیہ انجان بن کر اپنے بچے کو لوری دینے لگیں۔
"نہ بتاؤ تم لوگ۔ بلا سے" بیگم نیشان نے باری باری اپ بچوں کی منتیں

بھی تاکید کی۔ کسی سے یہ بات نہ کہنا۔
اقبال صاحب اور احراز گھر پر نہیں تھے۔ نازیہ اپنی والدہ کے پاس چلی گئی تھیں اور مسرت بیگم اقبال ڈھنڈار ایسے دالان میں بیٹھی کا دعا کر رہی تھیں۔ ان سے وہ کیا کہتی!۔
ایک آوارہ وہ درماندہ روح کی طرح۔ جسے سزا بھگتنے کے لیے اعراف سے بھی نکال باہر کیا گیا ہو۔ وہ سارے گھر میں پھرتی رہی۔! کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی کیا کرنا چاہتی تھی!۔
اپنے کمرے میں آئی۔ اور کھڑکی کھول کر بیٹھ گئی!۔
دماغ میں چکر آ رہے تھے۔ سارے جسم میں ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔ ناقابل برداشت ٹھنڈک جیسے اعصاب آہستہ آہستہ سن اور مردہ ہوتے جا رہے ہوں!۔
پچھتاوے اس کی رگ رگ سے لہو نچوڑ رہے تھے۔ آنسوؤں کا سیلاب سے سینے میں ابل رہا تھا آنکھیں جل رہی تھیں!۔ اس نے بے تاب ہو کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ دفعتہ نظریں سونی کلائیوں اور سفید لباس پر پڑیں جن سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے!۔
"نہیں"۔ اس نے نچلا لب اس طرح دانتوں میں جکڑا کہ خون کی نمی زبان پر محسوس کی!۔
اپنی شدید غلطی کا بھی خمیازہ مجھے کھینچنا ہے کریں۔ احتشام کی بیوی اگر نہ کہلاؤں تو ان کی بیوہ کہلاؤں۔!
مگر ابھی سے۔ یہ سونے ہاتھ۔ سفید کپڑے۔
نہیں۔

سے ملی جلی آوازوں کا شور ابھرا۔

احراز۔ احراز۔ تم کہاں ہو؟ احتشام بے چین تھے۔

"کہو بھائی۔ میں تو تمھارے پاس ہوں۔" احراز کی حالت ابتر تھی۔

"میرے سینے پر۔ دل کے پاس۔ ایک لفافہ رکھا ہے۔ وہ تم نکال لو۔ احراز پتھر کی سل دھری ہے میرے دل پر۔!" احتشام نے بڑی مشکل سے کہا۔

قبل اس کے کہ احراز ان کی التجا کی تکمیل کرتے۔ نرس کرنل صاحب کو لے کر آگئی۔ انھوں نے ان سب کو بڑے اخلاق سے کمرے سے باہر نکالا اور خود دروازہ بند کر کے احتشام پر جھک گئے۔!

بیگم نیضان کو ابھی تک حالات کی خبر نہ تھی۔ ویسے وہ اپنے شوہر ناز یہ اور یاسر، غزہ کی بے چینی اور طبیعتوں کا انتشار دیکھ رہی تھیں۔ کچھ پوچھتے اس لیے خائف رہتی تھیں کہ خدا جانے کوئی کیا کہہ دے؟!

بڑی غور اہم خبر انھیں یہ دی گئی تھی کہ احتشام کو معمولی سا نزلہ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے سینے میں درد شروع ہو گیا ہے۔ اس خبر نے بیگم نیضان کا لہو نچوڑ لیا۔ انھوں نے کانپتے ہوئے لہجے میں اپنے شوہر سے کہا۔

"نزلہ۔ سینے میں درد۔ آپ کو یاد نہیں کہ کیسے ندیم بھائی کو نزلہ ہوا تھا اس نے انفلوئنزے کی صورت اختیار کی۔ پھر نمونیہ ہوا اور وہ ہفتہ بھر کے اندر ہی اندر۔ خدانخواستہ۔"

لاحول ولا قوۃ۔ نیضان صاحب نے لاپرواہی سے جھٹکتے ہوئے

وہ تو پہلے سب کچھ ہونے والے تھے۔

اسعادن کی نیاز مندانہ گفتگو یاد آئی۔ محبت پاش نظر۔ دل کو برمانے لگیں دھیمے لہجے میں ہنسنے کا انداز جگر کو چیرنے لگا اور پھر۔ وہ بے بسی تڑپانے لگی۔ بجانے کیا گزری تھی دل پر۔ چپ چاپ اسپتال کے بستر پر جا لیٹے!۔

"اگر۔ وہ۔ زندہ نہ رہ سکے۔ تب۔؟

نہیں۔ میرے اللہ نہیں۔" اس نے زار و قطار روتے ہوئے چوکھٹ پر سر رکھ دیا۔

"بچالے انھیں میری خاطر۔ میرے پروردگار۔!"

اور جی بھر کے رو لینے کے بعد وہ اٹھی۔! بدشگونی کے نحس اثرات زائل کرنے کے لیے رنگین لباس پہنا۔ چوڑیاں پہنیں۔ وہ طلائی زنجیر نکالی جو کبھی اس کی سالگرہ پر احتشام نے نذر کی تھی۔! اور اس طرح بن سنور کر دالان میں آئی۔

بیگم نے سر اٹھا کر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔!

"امی میں اسپتال جا رہی ہوں۔"

اس لباس میں بیٹی؟!" بیگم نے بے حد تعجب سے پوچھا۔

امی۔" بیچارگی وہ سسکنے لگی۔

کیا ہوا؟" انھوں نے کلام پاک بند کر دیا۔" اللہ نہ کرے کوئی خبر آئی ہے؟"

"امی۔"

"بیٹی کہو تو۔ آخر ہوا کیا؟"

"آپ نے اللہ کے کلام میں پڑھا ہے۔ خدا سب کی دعائیں سنتا ہے وہ بندے کی شہ رگ سے قریب رہتا ہے۔ امی۔ وہ عورت جو اللہ کو اللہ کہے جو اپنے بچوں کو جنم دیتی ہے۔ کیا وہ ان سے اتنی محبت نہیں کرتی کہ ان

لیا۔ دفعتہً ان کی سانسیں منتشر ہونے لگیں اور سینے کے درد سے چہرہ سرخ ہوگیا

"اسی لیے تو میں ایسے کپڑے پہن کے آئی ہوں۔ آپ ابا جانی اور چچاجیوں سے کہیے۔ اپنا لیجئے مجھے۔ آپ فوراً اچھے ہو جائیں گے!"

"وقت۔ وقت گزر چکا!" ہانپتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "اب وہ وقت واپس نہیں آسکتا۔ سبین۔ کیا تم ایک زندہ لاش سے شادی کروگی!"

"اُف اوہ۔ میرے خدا۔ تم نے۔ ایک زہریلا ناگ۔ میرے ہاتھ۔ میں تھما دیا تھا جس نے۔ مجھے ڈس لیا۔ زہر پھیل گیا۔ میری محبت کی رگ رگ میں۔ اے میرے اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے!"

سبین نے سر اٹھایا اور احتشام کی حالت دگرگوں دیکھ کر بے تحاشہ چیخیں مارنے لگی!

"کرنل صاحب۔ کرنل صاحب!"

کرنل صاحب شاید راؤنڈ پر چلے گئے تھے۔ سبین کی چیخیں سن کر ایک طرف سے ڈیوٹی ڈاکٹر اور دوسری طرف سے نرس جھپٹے... اس نے دیکھا کہ بیمار کے اوپر تیز تیز قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے!

ڈاکٹر ایک بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔

"دیکھئے یہ کیسے ہوتے جارہے ہیں!" سبین بولی۔ اور دل تھام کر دیوار سے لگ گئی۔

ڈاکٹر بیمار پر جھکا اور پھر جلدی سے نرس سے بولا۔

"کرنل صاحب کو بلاکر لاؤ۔ فوراً!"

نرس تیزی سے بھاگی۔

[illegible]

کا دکھ درد سہے، ان کے رنج و غم بانٹے اور ان کی آرزوئیں پوری کرے۔!

وہ بڑی حیرت سے سبین کو دیکھا کیں۔

"آپ میری ماں ہیں۔ میری ایک آرزو پوری کردیجئے!"

"کون سی ایسی بات ہے۔ میری بچی۔ جو تم اس طرح بلک رہی ہو!"

"آپ سب نے مجھے احتشام صاحب سے منسوب کیا تھا۔" وہ سر جھکا کے کانپتے لہجے میں بولی: "میں انھیں۔ اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ امی! ان کو ہمیشہ کے لیے میرا بنا دیجئے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے۔ مجھ سے شادی کرنے کے بعد وہ ضرور اچھے ہو جائیں گے۔"

"شادی!" کلام پاک بیگم کے ہاتھوں میں لرز گیا۔ "خدا خدا کرو بیٹی۔ کیسے ہو جائے گی ان سے شادی۔ وہ ہسپتال میں پڑے ہیں۔ اللہ انھیں صحت و خیریت کے گھر آنا نصیب کرے... یہ تم کیسی بے حجابی کی باتیں میرے سامنے کر رہی ہو!"

"میری بات مان لیجئے امی۔"

"مجھے کب انکار ہے۔ مگر تم تو تماشہ کرنا چاہتی ہو۔ میں اپنے اختیار سے اتنا بڑا کام کیسے کر سکتی ہوں۔ بیٹا۔ تمھارے باپ بھائی اور چچا تمھارا یہ سب کیا سوچیں گے۔ یہ ناممکن ہے!"

"اگر وہ میرے ہو جانے کے بعد اس طرح بیمار پڑتے تب۔!"

اس نے آنسو پونچھ لیے۔ اور جانے کے لیے مڑ گئی۔

بیگم اسے آوازیں دیتی رہیں اور یہی کہتی رہ گئیں: "سنو تو۔ اچھا میں ذرا تمھارے ابا سے ذکر کروں گی۔"

[illegible]

اچھا ہوا۔ آپ چلی آئیں: مکرم نے کہا۔ اور ساتھ ہی اس کی متحیر و متعجب نگاہیں اس کے لباس پر پڑیں۔ ارغوانی پھولدار قیمتی لباس۔ کلائیوں میں بہت بہت سی سرخ و سنہری چوڑیاں۔ گلے میں لاکٹ، جیسے وہ کسی دعوت میں شریک ہونے کے لیے آئی تھی۔

اچھا ہوا۔ میں چلی آئی: دانت پیس کر اور قہر آلود نظروں سے مکرم کو گھورتے ہوئے اس نے کہا: اس لیے اور بھی اچھا ہوا کہ مجھے تمھارے سامنے سرنگوں بھی تو ہونا تھا۔ خدا کی شان ہے کہ جس نے تمھیں اس درجہ [illegible] کیا ہے۔ تم نے اس کی عورت پر [illegible] ارا ہے۔ اوقات۔ تمھاری [illegible] کہ [illegible] تم اپنے [illegible] یہ سمجھتے ہو کہ حقیقت میری کچھ نہیں ہے۔ تمھارا تکبر ایسا نہیں ہے جو معافی کے قابل ہو۔ میں نے حماقت کی تھی۔ اب میں اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ وہ غلطی جو میں نے کی تھی۔ تم اس پر دل ہی دل میں ہنستے ہو۔ مگر کیا تم کبھی کے [illegible] کر تم سے زبانی جواب بھی [illegible]!:

مکرم [illegible] تھا۔ اس کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ کیا کہہ رہی تھی سبین؟ ایک ایک لفظ [illegible] کی طرح اس کے دل و دماغ پر لگا تھا [illegible]!

[illegible] پھیل گیا۔ مدھم لہجے میں بولا۔ [illegible] آپ کی [illegible]

"میری ایک بات مانیے گا؟: اس کے لب کانپ رہے تھے۔

"کیا تمھیں مجھ پر اتنا بھی بھروسہ نہیں؟؟:

نہیں۔ وعدہ کیجیے!

سبین؟؟

جی!!

ایک بوجھل خاموشی کے بعد احتشام نے پژمردہ اور تھکی تھکی آواز میں کہا

"سبین۔ میں نہیں جانتا۔ تم نے اپنے دل میں کیا سوچا ہے۔ مجھ سے نیم مردہ آدمی سے تم کیا توقع رکھتی ہو۔ اپنی زندگی سے میری دلچسپی ختم ہو چکی ہے۔ میں خود کو زندہ نہیں سمجھتا۔ ایک ایسی لاش سمجھتا ہوں۔ جو صرف سانس لے رہی ہو۔ جو کچھ تمھیں نظر آ رہا ہے۔ وہ میرا کالبد خاکی ہے بے شک ہے۔ مگر اس میں روح نہیں۔ وہ تو کبھی کی ہو چکی۔ جب۔ تم نے۔ مگر نہیں۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تو صرف میری تقدیر کا مذاق تھا:

نہیں میں کچھ نہیں جانتی: سبین نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ آپ کو میری التجا ماننی ہی پڑے گی:

سبین! وعدہ تو میں کروں۔ مگر اس کا ایفا کرنا بہت دشوار ہے: انھوں نے سوچا۔ وعدہ کیا۔ جبکہ وہ [illegible] کے کنارے پہ پہنچ چکے ہیں۔ مسکرا کر بولے۔

"بہت اچھا۔ جیسی تمھاری مرضی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ جو کچھ تم کہوگی میں مان لوں گا:

سبین ان کے ہاتھ پر جھک گئی اور گھٹتے ہوئے لہجے میں بولی [illegible]

[illegible]!

کیا یہ ممکن ہے؟۔ اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ یا پھر اس پر بھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ ایک آخری اور شدید دھڑکن کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گا۔

بے شمار جذبے ان گنت احساسات اس کے دماغ پر یورش کر رہے تھے۔ اور ان سب میں اتنے الجھاوے تھے کہ کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ آتا تھا۔

پل بھر کے لیے احتشام صاحب کی خطرناک حالت کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکل گیا اور وہ دونوں آنکھوں سے اپنی چٹختی ہوئی کنپٹیاں دبائے وہیں بیٹھ گیا اس سے بے پرواہ کہ ادھر کون آتا ہے کون جاتا ہے!۔

احتشام نے بے حد حسرت اور تکلیف سے سیمیں کو دیکھا۔ وہ پہلی دفعہ ان سے ملنے آئی تھی!

ان کے پہلو میں بیٹھ کر اس نے ان کا ہاتھ اپنے دہکتے ہوئے ہاتھوں میں دبا لیا پھر ضبط کر کے مسکرائی۔

احراز نہیں آئے۔ سیمیں!!۔

"بس آتے ہی ہوں گے!۔ مجھ سے کہئے۔ کیا کام ہے؟":

نہیں۔ انھیں آنے دو۔!"

سنیئے!:

میں سن رہی ہوں سیمیں :

کرنل صاحب نے آپ سے باتیں کرنے کو منع کیا ہے۔ مگر میں ـــ ہاں تم جی بھر کے باتیں کرو۔ سیمیں۔ کرنل صاحب کی ہدایت کی پرواہ نکرو۔ وہ نہیں جانتے۔ تم کیا جانو کہ رہنے سے بھی دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ چین ملتا ہے آج بولنے دو ـــ!

انھوں نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھا اور ٹھہر گئے!۔

"معاف کیجئے گا۔ جناب:" محرم نے سانسوں کے ہجوم کو بڑی مشکل سے قابو میں کر کے کہا: میں۔ آپ سے:

"بیمار کے متعلق اگر کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا!"

"جی۔ جی نہیں۔ میں۔ نہیں۔ مگر کچھ اپنے متعلق پوچھنا چاہتا ہوں"

کیوں۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟۔

"کرنل صاحب۔ ابھی آپ نے مجھے دیکھ کے تعجب کا اظہار کیا تھا کیا وار ہے تھے آپ کہ کچھ سوچ کے رک گئے۔!"

ہاں بھئی۔ جب لڑکی نے کہا کہ تم۔ اس کے یہاں ملازم ہو تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ۔ میں تمہیں فیضان صاحب کا بیٹا سمجھا تھا:

"فیضان کا بیٹا:" وہ حیران و ششدر ہو کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا:" میں ان کا قدیم خاندانی معالج ہوں:" کرنل صاحب نے کہا:" اور۔ جانتا ہوں کہ فیضان صاحب نوجوانی کے زمانے میں بعینہ تمہارے ہم شبیہ تھے۔ اور شاید ان کا ایک لڑکا تھا بھی:

"آپ یا سر کو تو نہیں کہتے۔ محترمہ نازیہ کا چھوٹا بھائی:

ہاں وہ یاسر ہے۔ مجھے یہ مغالطہ ہوا تھا کہ ان کا وہ لڑکا جو گمشدہ تھا شاید انھیں واپس مل گیا ہے:

گمشدہ لڑکا!: محرم کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ کرنل صاحب [illegible] وہ [illegible] یا ہوا جو کو گھور رہا تھا جو

THE HAREEM

June 81

گھریلو زندگی کے نشیب و فراز

شمیم اختر

میرے شوہر کو مجھ سے یہ شکایت تھی کہ میں اپنی مالکہ مکان سے بنا کر نہیں رکھتی۔ دراصل جب ہم نے مکان کرائے پر لیا تھا تو ہمیں مالک کے بجائے مالکہ مکان سے سابقہ پڑا تھا۔ تقی صاحب اتنے بھلے آدمی ہیں کہ ان سے بگاڑ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کے ساتھ ہمارا تعلق کرائے دار کی حیثیت سے بڑھ کر قائم ہوا۔ لیکن جب عورتوں کو عورتوں کے ساتھ معاملات طے کرنے پڑتے ہیں تو انداز بدل جاتے ہیں۔ خدانخواستہ میری لڑائی کبھی مسز تقی سے کبھی نہیں ہوئی لیکن تیور کچھ ایسے رہے ہوں گے کہ میرے شوہر کو مجھ سے یہ شکایت پیدا ہوئی۔

پچھلے دنوں کی بات ہے جب ہماری آمد و رفت کا ذریعہ ایک جیپ تھی۔ دفتر جانے کے لئے میں سڑک پر پہنچی ہی تھی کہ مجھے مسز تقی ٹیکسی کے انتظار میں فٹ پاتھ پر کھڑی نظر آئیں۔ اسی وقت مجھے اپنے شوہر کی شکایت کا خیال آیا اور میں نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ مسز تقی اپنے ایک اور کرایہ دار سے کرایہ وصول کرنے مسرسید روڈ تک جا رہی تھیں۔ یہ جگہ میرے دفتر کے قریب ہی تھی۔ دفتر میں ضروری کام تھا اس لئے میں پہلے اپنے دفتر پر اتری اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ مسز تقی کو سرسید روڈ پر چھوڑ کر میاں صاحب کے پاس چلا جائے۔

ابھی میں نے دو سطریں ہی لکھی تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میرے شوہر گاڑی کے بارے میں پوچھنے لگے کہ ابھی تک کیوں نہیں پہنچی۔ میں نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ یقیناً اب آپ کی شکایت دور ہو گئی کہ میں مسز تقی سے بنا کر نہیں رکھتی۔

[illegible] ایک گھنٹہ [illegible] ہو جاتا ہے گاڑی ابھی تک نہیں پہنچی۔ اب کے لہجے میں گرمی زیادہ تھی۔ اس کے بعد ہر پانچ منٹ بعد فون آتا رہا اور ہر بار ایک نیا انکشاف مجھ پر ہوتا کہ گاڑی میرے آرام کے لئے نہیں ہے۔ دفتر کے کام کے لئے ہے۔ میرے شوہر کو سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ میں پہلے مسز تقی کو سرسید روڈ پر اتارتی۔ اس کے بعد اپنے دفتر جاتی۔

جب ٹیلی فون کا سلسلہ کلائمکس پر پہنچا تو میرا یہ حال تھا کہ ایک ہاتھ سے قلم پکڑے لکھے جا رہی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھنے میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے فوری طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اب اگر فون آیا تو میں بات کرنے سے انکار کر دوں گی۔ لیکن تین گھنٹے تک فون کی گھنٹی نہ بجی۔ دل میں یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ اب میں اپنے شوہر کی شکایت [illegible] پھر نہیں رکھوں گی۔ ایک بجے تک میں اس مضمون کو لکھوا چکی تھی۔ اس وقت میرے شوہر کا فون آیا وہ اپنے رویے پر معذرت خواہ تھے۔ میں نے درگزر کرنے میں دیر نہیں کی۔ کیونکہ [illegible] اس گاڑی پر بیٹھ کر دفتر آ گیا تھا۔ اگر میں بے خبر رہتی تو مجھے کس طرح پتہ چلتا کہ مسز تقی اپنے مکان کا راستہ بھول گئی تھیں۔ مکان کی تلاش میں انہوں نے ڈیڑھ گھنٹہ صرف کر دیا۔ اگر مجھے حقیقت حال کا پتہ نہ چلتا تو شام تک میرا ذہن اغوا اور حادثے کی سینکڑوں کہانیاں ترتیب دے چکا ہوتا۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ شام کو جب اپنی پڑوسن سے میری ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگی: "تم میرا حال چال ہی نہیں پوچھتی ہو"۔

میں نے کہا: "کیوں کیا ہوا؟ تم مجھے بالکل تندرست نظر آتی ہو"۔

وہ کہنے لگی: "تمہیں میرے گھر سے برتن ٹوٹنے کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں؟"

میں نے کہا: "کل شام کو مجھے ایک آواز سنائی دی تھی لیکن کبھی کبھی اچانک ایک آدھ برتن میرے ہاتھ سے بھی چھوٹ جاتا ہے۔"

وہ کہنے لگی: "مجھے جب غصہ آتا ہے تو میں برتن توڑتی ہوں۔"

دفتر کے ذکر پر اس شخص نے میرے دفتر کا نام پوچھا۔ جب میں نے بتایا تو وہ ذرا چونک کر اور فریدہ حنیف کا نام لے کر پوچھنے لگا کیا آپ اس کو جانتی ہیں۔ میں نے اس بات کا اقرار کیا کہ میں فریدہ کو جانتی ہوں............

اب وہ کچھ پریشان سا تھا کہ مجھ سے کیا بات کرے۔ وہ کہنے لگا۔ "آپ نے مجھ پر اعتماد کیسے کر لیا اور میری گاڑی میں بیٹھ گئیں"۔ مجھے اس کی بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا "اس میں اعتماد کی کیا بات ہے! مجھے دفتر پہنچنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ آپ نے ادھر جانے کا اشارہ دیا اور میں نے آپ کی مدد قبول کر لی۔

ذرا دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر کہنے لگا "آپ کو گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ڈر نہ لگا"۔ میں نے "نہیں" وقفے کے بعد جواب دیا "آپ کو مجھے بٹھاتے ہوئے ڈر نہیں لگا؟"

یہ بات چیت میاں کے گوش گزار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے چند دنوں تک جب بھی دفتر جانے کے لئے مجھے گاڑی نہ ملی میرے لئے پرائیویٹ ٹیکسی کا انتظام کر دیا گیا۔

ملازمت پیشہ عورتوں کی شوہر کے ساتھ محبت اور لڑائی جھگڑے کا گاڑی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے کہ شوہر کو اس کے دفتری امور کے لئے گاڑی کی ضرورت رہتی ہے اس لئے گاڑی کے استعمال کا اولین حق اسی کو حاصل ہے لیکن کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا ناگزیر ہے۔

میرے شوہر ایک صبح مجھ سے یہ کہہ کر پندرہ منٹ میں گاڑی تمہارے پاس پہنچ جائے گی، گھر سے چل دیئے۔ سابقہ تجربات کی روشنی میں، میں نے پندرہ منٹ میں آدھے گھنٹے کا اضافہ کیا اور جوتوں کے تسمے باندھ کر ہاتھ میں بیگ پکڑ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔ مگر پون گھنٹہ ہو گیا ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا اور گاڑی نہ آئی۔ میں جب اپنے شوہر کے ساتھ دل ہی دل میں جی بھر کے جھگڑ چکی تو پھر ان کے دفتر فون کیا۔ اور گاڑی کے بارے میں پوچھا۔ وہ حیرت سے پوچھنے لگے کہ کیا مجھے کہیں خاص کام سے جانا پڑ گیا ہے۔ میں نے کہا آپ کا مطلب کیا ہے؟ خاص کام کیسا، بس دفتر جانے کے لئے ڈیڑھ گھنٹے سے گاڑی کا انتظار کر رہی ہوں"۔ انہوں نے فوراً کہا "اچھا، اچھا، گاڑی بھیج دوں"۔

میں نے ذرا تیور سے پوچھا "گھر کی گاڑی کا حادثہ پیش آ گیا تھا کہ آنے میں

اتنی دیر کر دی۔ وہ کہنے لگے "صاحب دفتر پہنچے تو تب پہلے سے وہاں موجود تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بیگم صاحبہ کو چھوڑنے جانا ہے تو وہ کہنے لگے۔ نہیں خود انہیں دفتر چھوڑ کر آیا ہوں یہ ان کو بھی کہیں جانا نہیں تھا۔ اس لئے میں گاڑی دھونے لگا"۔

چونکہ اس وقت ملازمت پیشہ عورتوں کے شوہروں کی گاڑیوں کا ذکر ہو رہا ہے اس لئے میں یہ نہیں بتاؤں گی کہ میاں صاحب کی اس سہو پر میں نے کیا کہا اور ان کی موجودگی میں منہ در منہ بولے اور دل میں کیا کچھ کہا۔

دفتری اوقات کے دوران اگر ہمیں گاڑی کی ضرورت پیش آ جائے تو ہمارے فوٹوگرافروں کے اسکوٹر ہمارا بار گراں اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس مقصد کے لئے فوٹوگرافروں کے ساتھ تعلقات کی خوشگواری بنیادی شرط ہے ورنہ منزل ایک ہونے کے باوجود ٹکا سا جواب ملتا ہے۔ لیکن ایک روز ہم نے ان کو ٹکا سا جواب دے دیا۔ انہوں نے چھوڑنے کی پیشکش کی تو میں نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے انکار کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا "میاں نے ڈانٹا ہے وہ کہتے ہیں کہ اسکوٹر پر بیٹھتی ہو کسی روز ٹانگ ٹوٹ جائے گی"۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑے کھڑے ٹانگیں نہ ٹوٹ جائیں۔ میں اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔ یہی صورت حال دیگر خواتین کی ہے۔ لیکن اس خوش حالی میں ایک مشکل یہ ہے کہ جب کسی فوٹوگرافر کو کام کی بنا پر کبھی لے کر جانا پڑے تو وہ فوراً کہتے ہیں کہ فلاں روز ان کو فلاں جگہ نہیں لے کر گئے تھے، اس لئے شکایت کرتی ہیں۔ لیکن ان کی یہ باتیں ہم اس وقت بالکل فراموش کر دیتے ہیں جب کوئی ٹیکسی ہمیں طارق روڈ تک لے جانے پر راضی نہیں ہوتی اور شفیق صاحب یا زیدی صاحب کمال مہربانی سے ہمیں باری باری وہاں تک لاد کر لے جاتے ہیں۔

میں پہلے ہی تو کہتی ہوں کہ اگر ہمارے شوہروں کے پاس گاڑیاں نہ ہوتیں تو ہمارا کہیں آنا جانا بند تھوڑی ہو جاتا۔ ایک تقریب میں فاطمہ منصوری ملیں۔ وہ بھی یہی بات سمجھا رہی تھی وہ کہنے لگیں "تم مجھے خارجی ہو"۔ پھر وہ اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگیں "اس مرد کو دیکھ رہی ہو مجھے حیرت ہے کہ یہ میرے ساتھ اب تک زندہ کیسے ہے"۔

منصوری کی زندگی کا راز میں جانتی ہوں۔ وہ فاطمہ

کو معلوم ہے کہ اسے بیگم روز بھی دفتر جانا ہے۔" اور اب اس سارے واقعے میں جب ہمیں دفتر جانے کی جلدی ہوتی ہے تو شوہر بڑے بستر سے نکلتے ہیں، اور جب ہماری طبیعت سستی کی طرف مائل ہوتی ہے تو انکی طرف سے حکم ملتا ہے۔ "چلنا ہے تو اسی وقت نکل چلو، ورنہ پھر خود سے دفتر جانا پڑے گا۔" ہمارے پیروں تلے پہیئے لگ جاتے ہیں اور ہم ہنستے مسکراتے کھانے کی ٹوکری اٹھائے گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔

میری پڑوسن اپنے شوہر سے کہتی ہیں "ان کے گھر سے ہمیشہ ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کبھی ان کو لڑتے سنا؟ ایک میں ہی بدنصیب ہوں جس سے تم ہر وقت لڑتے رہتے ہو!!"

اگر آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جوابی لفافہ یا ڈاک ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔ فیصلہ پتہ کی اطلاع دفتر حریم کو روانہ فرمائیں کہ ۲۰ تاریخ تک مل جائے ـــــ ادارہ

صحافیوں کے لئے بہبودی فنڈ

ریاستی حکومت کا تین لاکھ روپیہ کا عطیہ

- مرحوم اخبار نویسوں کی بیواؤں، والدین، ۲۰ سال سے کم عمر کی اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے ریاستی سرکار کا نیا انتظام

- یکمشت امداد کی رقم پانچ ہزار روپیہ ہے جو ۴۰۰ اور ۲۵۰ روپیہ کی ماہوار قسطوں میں بھی دی جا سکتی ہے

- ماہوار امداد ایسے اخبار نویسوں کو دی جائے گی جو کم سے کم دس برس تک صحافت میں رہ کر پانچ سال تک بہبودی فنڈ میں عطیہ دے چکے ہوں۔

- بہبودی فنڈ کا قیام سرکار سے حاصل کئے گئے عطیہ، منتظمین اور اترپردیش کے محنت کش اخبار نویسوں سے حاصل کئے گئے عطیات پر ہوگا۔

- اخبار نویسوں کے منتظمین کی رقم کی بنیاد اخباروں کے مختلف معیار پر ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ رقم دس ہزار روپیہ اور کم سے کم دو سو روپیہ ہوگی۔

کام کرتے ہوئے صحافیوں سے کم سے کم ایک دن کی تنخواہ کے برابر سالانہ عطیہ

کام میں لگے ہوئے صحافیوں کی بھلائی کے لئے حکومت اترپردیش کا معمولی عطیہ

محکمۂ اطلاعات عامہ اترپردیش کے ذریعہ شائع کیا گیا۔

چند سکوں کی کہانی

اس نے مٹھی کھول کر یہ نہ دیکھا کہ رقم کتنی ہے۔ اسے یہ دیکھنے کا ہوش ہی کب تھا۔ اسے اپنے کانوں کی لوؤں سے دھواں اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ سڑک پر کوئی چیز نہ تھی۔ ایک وسیع دنیا سامنے تھی جس میں اسے ایک ایسے گوشے کی تلاش تھی جہاں اسے تنہائی کا ایک لمحہ میسر آ جائے۔ مگر اسے یوں لگا کہ جیسے سب راہگیروں کی نگاہیں اسی پر لگی ہیں۔ یہاں تک کہ بسوں، کاروں اور رکشاؤں کی سواریاں بھی یہ جانتی ہیں کہ اس کی مٹھی میں کیا ہے۔ وہ ایک پل کے لیے بھی کہیں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ چند لمحے قبل حاصل ہونے والا سرمایہ وہ کھونا نہیں چاہتا تھا کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ راستے کی روک ٹوک کی وجہ سے اس کی مٹھی میں آئی ہوئی دولت چھن جاتی؟ اس خوف کے ساتھ دوسرے کئی احساسات بھی اس کی حالت کو دگرگوں بنائے ہوئے تھے۔

اس پر چوری کا الزام لگ سکتا تھا۔ حالانکہ اس نے چوری نہیں کی تھی۔ ورک شاپ بند ہونے کے بعد اس نے کپڑے بدلے۔ ہوٹل سے اٹھے ہوئے کپڑے اس نے ورکشاپ کے غسل خانے کی کھونٹی پر ٹانگے۔ اس کا ارادہ تھا کہ ان کپڑوں کو دھو ڈالے گا۔ تین ماہ سے اس نے اپنا جوڑا نہیں دھویا تھا۔ صبح اس نے اپنے اس ارادے کا ذکر اپنے ساتھیوں سے کیا تھا۔ اس کی بات سن کر وہ ہنس دیے تھے۔ ایک نے کہا تھا: ان کپڑوں کو پانی اور صابن لگا تو بالکل گل جائیں گے۔ ان میں اتنا دم نہیں ہے کہ کر سنگوٹ ہی بنا لو۔ دوسرے نے پہلے کی بات پر گرہ لگاتے ہوئے کہا: ہوا! کپڑے گل جائیں تو اچھا ہے۔ پھر یہ بھی ہماری طرح مضبوط ترین کپڑے کا جوڑا پہن کر کام کرے گا۔ انسان کی کھال سے بڑھ کر مضبوط کپڑا اور کون سا ہے۔ اس کی ماں کب تک اس کی لاڈ اٹھائے گی۔

مگر اسے اس قدر نیند آ رہی تھی کہ اس نے میلے کپڑے کھونٹی پر ٹانگے۔ دیہاڑی کی رقم جیب میں ڈالی اور اپنی راہ چل دیا پچھلے تین دن سے وہ بس پر گھر جانے کے بجائے پیدل جا رہا تھا۔ افطاری کی زحمت کے عوض جتنی تو ہر قدم پر رکتی ہوئی اسے دو گھنٹے میں گھر پہنچا آتی تھی

اس نے حساب لگایا کہ اگر وہ شارٹ کٹ لیتا ہوا پیدل چلے تو ایک گھنٹے میں گھر پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے ورکشاپ سے وہ اپنے گھر پیدل جانے لگا تھا۔ لیکن ایک کے بجائے وہ دو گھنٹوں میں گھر پہنچتا تھا۔ اسے شارٹ کٹ پسند نہ تھے۔ شارٹ کٹ کے لیے سونے اور کچے راستوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اسے لوگوں سے بھری روشن سڑکیں پسند تھیں۔ وہ فٹ پاتھ پر چلتے وقت اپنی گردن دکانوں کی جانب موڑے رکھتا۔ اسے شوکیسوں میں سجے ہوئے کپڑے، جوتے، کھلونے اور دوسری چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ وہ شوکیسوں میں رکھی ایسی کئی چیزیں دیکھتا تھا جن کے بارے میں اسے معلوم تک نہ تھا کہ وہ کیا ہیں اور کس کام آتی ہیں۔

اس روز وہ اپنے معمول کے مطابق راہگیروں کے کندھوں سے ٹکراتا دکانوں میں رکھے شوکیسوں میں سجے سامان کو دیکھتا چلا جا رہا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں میں شوق کے بجائے نیند کا غلبہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے فٹ پاتھ پر بنی ہوئی سیڑھی کا خیال نہ رہا۔ اس نے قدم رکھا ہی تھا کہ اس کے پورے بدن کو جھٹکا لگا۔ اس کی کھوپڑی کا بھیجہ اپنی جگہ سے ہل سا گیا اس کی نیند بھاگ گئی۔ اس نے چونک کر نیچے دیکھا ایک پھٹے ہوئے کاغذ کے لفافے میں اسے چند سکے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ وہ پل بھر میں جھکا۔ سکوں کو اپنی مٹھی میں دبایا اور تیز تیز چلنے لگا۔

اس وقت اسے یہ سوچنے کا موقع بھی نہ ملا کہ اس کا یہ عمل صحیح ہے یا غلط۔ ماں اسے چوری کرنے اور جھوٹ بولنے سے منع کرتی رہتی اس لیے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ چوری کرنا اور جھوٹ بولنا برکات ہے یا نہیں۔ یہ رقم زمین پر پڑی تھی۔ راہگیروں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ رقم کس کی ہے۔ یقیناً یہ رقم کسی غریب کی ہی ہوگی جو اس نے احتیاط سے کاغذ کے لفافے میں لپیٹ کر رکھی تھی۔ کسی امیر کا اس فٹ پاتھ پر کیا کام؟ اگر یہ رقم کسی امیر کی جیب سے گری ہوتی تو اس میں چند نوٹ بھی شامل ہوتے لیکن یہ تو صرف سکے تھے جنہیں

آپ کو مطمئن کرنے کے لیے اس نے سوچا کہ اگر وہ پورا خرچ اٹھاتا تو کوئی اور اٹھا لیتا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے اس کی غربت کو دیکھتے ہوئے اس کی مدد کرنے کی کوشش کی ہے مگر فوراً ہی اسے یہ خیال آیا کہ اس کی ماں کیا اس دلیل کو مان لے گی۔

اسے اپنی ماں پر غصہ آنے لگا۔ چند دنوں سے اس کا رویہ عجیب ہو رہا تھا۔ اس نے بات بات پر روک ٹوک شروع کر دی تھی۔ اگر وہ ذرا سی سرکشی دکھاتا تو ماں رونے بیٹھ جاتی تھی۔ وہ بھی عجیب عورت تھی۔ اس نے زندگی بھر دکھ اٹھائے تھے۔ لیکن اپنے بچوں سے محبت کرتی تھی۔ اسے ہر وقت یہی پریشانی رہتی تھی کہ کہیں اس کا کوئی بچہ بری راہ اختیار نہ کرلے۔ وہ ان کو محنت سے روزی کمانے کی تلقین کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ رزق حلال میں ہی روح کی تسکین ہے۔ اسے یہ پریشانی تھی کہ ماں اس حرکت پر اس کی سرزنش کرے گی۔ ممکن ہے کہ وہ کہے کہ اسی وقت میرے ساتھ چلو اور جہاں سے یہ رقم اٹھائی ہے وہیں رکھ کر آؤ۔ لیکن اس کا کیا ٹھیک تھا۔ ایک وقت میں وہ اس سے کہتی تھی کہ تم بڑے ہو گئے ہو۔ تمہاری مسیں بھیگنے لگی ہیں۔ آواز بھاری ہو گئی ہے۔ بچوں کی سی حرکتیں چھوڑ دو۔ تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے۔ اس بات کو کبھی ایک دن بھی نہ گزرتا اور وہ کہنے لگتی "تم ابھی چھوٹے ہو۔ میں نے تمہارے لنگوٹ بدلے ہیں۔ تمہارے پوتڑے بدلے ہیں۔ آج تم مجھ پر حکم چلاتے ہو۔ وہ دن ابھی دور ہے کہ جب تم حکم چلانے کے قابل ہو گے۔"

ماں کی یہ باتیں اسے پریشان کر دیتیں۔ کبھی اسے اپنے آپ پر غصہ آتا اور کبھی اپنی ماں پر۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ چھوٹا ہے یا بڑا ہو گیا ہے۔ اپنے بدن میں واقع ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے وہ سمجھتا تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن کبھی اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی کہ ماں کے احساس دلانے پر اسے خود بھی محسوس ہوتا کہ وہ ابھی چھوٹا ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے، وہ بچپنے کا تجربہ ہے۔ لیکن بدن کے ساتھ ساتھ اس کے خیالات میں بھی تبدیلی ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں اور ماں سے دور رہنا چاہتا ہے [illegible] کسی ویسے دوست [illegible] ان تبدیلیوں کی [illegible]
[illegible]

تھا لیکن [illegible] کوئی ایسا دوست نہیں تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی کسی لڑکی کو دیکھ کر سیٹی بجائے یا فلمی گانا گائے جیسے اس کے ورکشاپ کے ساتھی کرتے تھے لیکن ماں کی نصیحتیں اس کے ذہن پر ایسی ثبت تھیں کہ اس کے ہونٹ اپنی جگہ سکڑ کر رہ جاتے۔ اس نے جب پہلی بار ورکشاپ کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سگریٹ کا پہلا کش لیا تھا تو یوں لگا تھا کہ اس کا دل اچھل کر حلق سے باہر نکل آئے گا گھبراہٹ دور کرنے کے لیے اسے تین گلاس پانی پینا پڑا تھا۔ آئندہ اس نے سگریٹ کو ہاتھ لگانے کی توبہ کی تھی۔ اس کی انہی عادتوں کی وجہ سے ورکشاپ کے ساتھی اسے لونڈیا کہنے لگے تھے۔

وہ ہاتھ آئی دولت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ماں کے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اس رقم سے اس کی کئی ضرورتیں پوری ہو سکتی تھیں۔ اس نے ابھی تک یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس کی مٹھی میں کتنے پیسے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ اس کی تمام ضرورتیں پوری نہ کر سکے لیکن اس کی کئی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت یا خواہش تو پوری ہو ہی سکتی تھی۔ جب سے اس نے گھر پیدل آنا شروع کیا تھا اس کے پاس اتنا بچا کرایہ جمع ہو گیا تھا۔ بس کے کرائے میں یہ رقم جمع کر دی جائے تو وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔

آج اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ دنیا میں اتنے سارے لوگ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہجوم میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کسی طرح لوگوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ جیسے ایک جلوس اس کے پیچھے چلا آرہا ہے۔ اس کی نیند رفو چکر ہو چکی تھی۔ اسے اپنے پیروں میں تھکن کا احساس بھی نہ تھا۔ وہ چلتا رہا اور آخر پارک کے کنارے جا پہنچا جہاں دن بھر رش رہتا۔ مگر چونکہ گھر واپس جانے کا وقت ہو چلا تھا اس لیے اسے پارک میں کم لوگ نظر آئے۔

وہ پارک میں داخل ہو گیا۔ اس کی مٹھی بند تھی۔ اسے اپنی مٹھی میں پسینہ محسوس ہوا۔ اس نے مٹھی کو سختی سے بند کر رکھا تھا۔ اس لیے اب سکوں کے کنارے اس کی ہتھیلی میں چبھنے لگے تھے۔ وہ پارک کے سنسان حصے کی طرف چل دیا۔ وہاں پارک کو سیراب کرنے والا [illegible] تھا۔ وہ [illegible] کے پاس پہنچ گیا [illegible]
[illegible]

بچوں سے کہتی رہتی تھی کہ " جو دکھاؤ گے تو گندہ بن جائے گا ۔ دوسروں کو دو گے تو پھول بنے گا " وہ یہ بھی تو کہتی تھی کہ کچھ بھی کھاؤ آخر میں اسے گند ہی بننا ہے ۔ پیٹ کے دوزخ کو جتنا پھیلاؤ گے اتنا ہی پھیلے گا اس دوزخ کو اپنے قابو میں رکھو ۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے دوزخ پر قابو پا لیا ۔

کھانے میں یہ رقم ضائع کرنے سے بہتر تھا کہ وہ اپنے لیے ایک جوڑا جوتا خرید لے ۔ اس نے جب بھی اپنی اس خواہش کا اظہار ماں کے سامنے کیا ۔ ماں نے اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ " بیٹا ابھی تمھاری عمر بڑھ رہی ہے ۔ عمر کے ساتھ ساتھ پیر بھی بڑے ہو رہے ہیں ۔ اتنا قیمتی جوتا خرید کر کیا کرو گے ۔ دو دن میں پاؤں میں تنگ ہو جائیگا ۔ خوامخواہ جوتے کو دیکھ کر دل جلاؤ گے کہ خرید اگر پہننے کا شوق پورا نہ ہوا ۔ ہوائی چپل خرید لو ۔ پیر تھوڑا بہت بڑا ہو بھی جائے تو چپل ساتھ دے جاتا ہے ۔ جب تمھارا بدن اپنی جگہ پر ٹھہر جائے گا تو جوتے خریدنے کا شوق پورا کر لینا "

وہ گھر میں کوئی ایسی چیز خرید کر نہیں لے جانا چاہتا تھا جس سے ماحول میں بدمزگی پیدا ہو ۔ اگر وہ اپنے لیے ہوائی جہاز والی بنیائن خریدتا تو اس کی ماں فوراً اعتراض کرتی کہ " اس رقم میں تو تمھارا پورا جوڑا بن جاتا ۔ ہم جیسے لوگوں کو یہ فضول خرچیاں زیب نہیں دیتیں ۔ بنیائن ایک دھلائی میں لٹک جائے گی ۔ ہوائی جہاز کے رنگ ایسے بگڑیں گے کہ چولھے کی صافی نظر آئے گی ۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو ۔ بچوں والے یہ چونچلے چھوڑ دو "

اس نے سوچا کہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے لیے ایک جوڑا کپڑوں کا خرید لے ۔ صبح ورکشاپ میں ساتھی اس کے کپڑوں کا مذاق اڑا رہے تھے ۔ واقعی وہ جوڑا اب اس قابل نہیں رہا کہ اسے کام کے دوران میں پہنا جا سکے ۔ ایک ساتھی نے کسی وجہ سے اسے بازو سے پکڑ کر مخاطب کرنا چاہا تھا ۔ قمیص کی آستین اتنا دباؤ بھی نہ سہار سکی آستین قمیص سے جدا ہو کر نیچے کو لٹک گئی ۔ تھوڑی دیر میں وہ زمین پر تھی ۔ موبل آئل کی کیچڑ تھے زمین پر گرنے کے بعد اس آستین کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں گئی ۔ پیروں تلے آ کر ذرا دیر میں آستین کیچڑ کا حصہ بن گئی ۔ ساتھی ہنس ہنس کر کہتے تھے کہ اگر وہ اپنا جوڑا [illegible] تو پورا جوڑا [illegible] میں بہہ نکلے گا ۔ وہ اس کے ہاتھ میں صرف ماچس کی ڈبیا رہ جائے گی ۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل رہے تھے ۔ ہری بھری گھاس اس کے بدن کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی ۔ ٹھنڈے پانی میں لٹکے پیروں کی وجہ سے اس کے وجود کی گرمی دور ہو چکی تھی ۔ ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کو یوں چھیڑ رہے تھے کہ بالوں سے اس کو اپنے چہرے پر گدگدی محسوس ہو رہی ۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا اسی وقت اٹھ کر وہ اپنے لیے جوڑا خرید لائے ۔ بال اپنے چہرے سے ہٹانے کے لیے اس نے اپنا ہاتھ چہرے پر پھیرا ۔ اس کی آنکھ فوراً کھل گئی ۔ مالی اس کے ماتھے کو چھو کر اسے جگا رہا تھا ۔ اسے جاگتے دیکھ کر مالی کہنے لگا ۔ " لڑکے " اٹھو ، گھر جاؤ ۔ اندھیرا پھیلنے لگا ہے " پھر وہ یوں گویا ہوا جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو " اس عمر کی نیند بھی کیا دولت ہے بڑے بڑے امیروں کو میسر نہیں آتی ۔ میں گھنٹے سے اسے آوازیں دے رہا ہوں مگر جاگنے کا نام ہی نہیں لیا ۔ اگر میں بھولے سے اسے جگائے بغیر گھر چلا جاتا تو شاید یہ یوں ہی رات بھر پڑا رہتا "

اس کی مٹھی کھلی ہوئی تھی ۔ ہتھیلی کا پسینہ خشک ہو چکا تھا مٹھی میں بند سکے کب کے لڑھک کر نالے کے پانی میں جا کر گرے تھے ۔ نہ جانے پانی کے ساتھ بہتے ہوئے وہ سکے کہاں سے کہاں پہنچ چکے تھے ۔ وہ تھوڑی دیر تک آنکھیں کھولے چت لیٹا رہا ۔ مالی نے اپنے اوزاروں کا تھیلا سائیکل کی ہتھی میں لٹکایا تو وہ چونک کر وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا ۔ اس نے اپنے ہوائی چپل پہنے اور مالی کی سائیکل کے پیچھے چل دیا ۔ اس کا جی چاہا کہ وہ مالی سے کہے کہ " مجھے اپنے پیچھے سائیکل پر بٹھا کر لے چلو " لیکن اسے یہ بات ایک بوڑھے آدمی سے کہتے ہوئے شرم آئی ۔ اس نے سوچا کہ یہ کہنے میں برائی نہیں کہ " مالی ، تم پیچھے بیٹھ جاؤ ۔ میں سائیکل چلا کر تمھیں پہنچا آتا ہوں " لیکن اسی وقت سائیکل پارک کے پھاٹک سے [illegible] اور موڑ کا شتی ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی ۔

اپنے متعلق

کاش چار ماہ پر سکون رہنے کے بعد میرا دماغ [illegible] گیا ہو کہ حالت بگڑ گئی تھی ۔ بہرحال اب پھر [illegible] [illegible] قارئین حضرات بھی اچھا بچاؤ ۔

فرشتہ

روشن صبا۔ بی، اے، آنرز

جب سے بھیا ڈاکٹر ہوئے ہیں بالکل سنجیدہ بن گئے ہیں۔ ہر وقت شرارت کرنے والے بھیا نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں۔ ہر لمحہ ان کے چہرے پر غور و فکر کی لکیریں ابھری رہتی ہیں۔ میں ان کی اس تبدیلی پر حیران ہوں۔ ہر وقت مجھے چڑھانے والے بھیا یک بیک اتنے کیسے بدل گئے؟ ان کا تو روز کا معمول تھا۔ صبح اٹھتے اور مجھ سے جھگڑا کرنے لگتے۔ جب میں بھی بڑھ چڑھ کر بولنے لگتی تو وہ اپنی باتوں کا رخ دوسری طرف پھیر دیتے اور بہت شرارت بھرے انداز میں امی سے کہتے "امی! اس کالی بندریا کو جلدی سے بھگا دیجئے نا!" اور میں غصہ سے گال پھلا لیتی تو بھیا کا بلند قہقہہ پورے کمرے میں گونج جاتا اور وہ ہنستے ہی جاتے جب مجھے بھی ہنسی آ جاتی تو پھر وہ مجھے چڑھانے لگتے۔ بھیا کے مذاق میں ہمیں خوب لطف آتا جہاں ہم اور بھیا یکجا ہوتے یا بالکل بھول جاتے کہ ہم صرف ایک بھائی اور ایک بہن۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سارے لوگ بول اور ہنس رہے ہیں لیکن جب سے بھیا نے اپنی شرارتوں کو چھوڑ دیا ہے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اب تو وہ جلدی بات بھی نہیں کرتے۔ میں نے ایک دن طے کر لیا کہ آج بھیا آئیں تو میں ضرور پوچھوں گی۔ اسی وقت بھیا آ بھی گئے وہی غور و فکر میں ڈوبا ہوا چہرہ لیے جس پر سوچ کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں بھیا کو دیکھتے ہی برس پڑی "آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے بھیا؟ جب دیکھو گم سم! مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا ہے۔ آخر تم اتنے اداس کیوں رہتے ہو؟ بتاؤ بھی تو" ساجد کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ آ گئی۔ "کچھ نہیں میری لاڈلی بہن! آج کل میں بہت مصروف ہوں۔"

"میں بول پڑی بھیا! کان کھول کر سن لو! میں تمہاری شادی امی سے کہہ کر کرا رہی ہوں۔ تب بھابی خوب خبر لیں گی!" بھیا نے میری ان باتوں کا کوئی جواب نہ دیا اور منہ بنا کر دوسری طرف چلے گئے۔ میں اپنا منہ لے کر رہ گئی۔

ایک دن بھیا اسپتال گئے تو رات گئے تک واپس نہ آئے ہم سب پریشان ہو گئے اور کمال اضطراب سے ان کا انتظار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح کی کرنیں نمودار ہو گئیں مگر بھیا پھر بھی نہ آئے! میری بیقرار نگاہیں اپنے بھیا کی منتظر تھیں۔ دن کے بارہ بجے کے قریب بھیا کی کار آ کر پورٹیکو میں رک گئی ہم سب دوڑ پڑے۔ لیکن بھیا تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی بیٹھی تھی۔ ابو جان یہ دیکھتے ہی غصہ سے کانپ گئے اور امی کا منہ سرخ ہو گیا۔ پہلے تو ہمیں بھی بہت غصہ آیا کہ بھیا نے چپکے سے شادی کیوں کر لی؟ پھر بھی میرا دل اپنی بھابی کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا لیکن جیسے ہی کار کی طرف بڑھی امی کی گرجدار آواز فضا میں گونج گئی "صبو! تو وہاں نہیں جا سکتی!" میرے اٹھے ہوئے قدم رک گئے لیکن میری آنکھیں ادھر ہی تک رہی تھیں جہاں ایک لڑکی ہلکے گلابی رنگ کی پرانی ساری پہنے گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ بھیا کار کا دروازہ کھول کر اترے تو ابو جان گرج پڑے "نالائق! تمہیں یہاں آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟ جب تم خود ہی اپنی مرضی کے مالک ہو تو کہیں دور جاؤ، میرے گھر کا دروازہ تمہارے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے!"

ہم نے دیکھا بھیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں۔ میں تڑپ گئی۔ بھلا میں اپنے پیارے بھیا کی آنکھوں میں آنسو کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میں نے دیکھا امی بھی بے چین ہو رہی ہیں۔

پھر بھیا بولے "ابو حضور! میری بات تو سن لیجئے پھر جو سزا دینا چاہیں دیجئے اور وہ کہنے لگے۔ ابو حضور! آئے دن ہمارے پاس ایسے کیس آتے رہتے تھے جن سے میرے دل کو بہت تکلیف پہنچی تھی۔ کوئی لڑکی شادی کا نہ ہونے کی وجہ سے زہر کھا لیتی، کوئی پھانسی لگا لیتی تو کوئی ندی میں ڈوب کر جان دے دینا چاہتی۔ جب سے میں ڈاکٹر ہوا تھا۔ میرا سارا سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ مجھے ہر وقت یہی فکر لگی رہتی سماج کی یہ برائی

کیسے دور ہو۔ لڑکے والے اتنے ظالم اور بے رحم ہو گئے ہیں کہ ان کی نظروں میں دولت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے یہ دولت کے لیے کتنی ہی معصوم جوان لڑکیوں کی موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ سماج سے یہ برائی کیسے دور ہو؟ اسی سوچ میں میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور اس دنیا سے مجھے نفرت سی ہو گئی۔ کل رات ہمارے پاس پھر ایک ایسا ہی کیس آیا جسے دیکھ کر میں تڑپ گیا ایک بہت بوڑھے آدمی کو ایک لڑکی سہارا دے کر میرے پاس لائی تھی۔ لڑکی بہت پریشان تھی وہ اپنے باپ کو کسی بھی قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ میں نے ہزار کوشش کی لیکن میں اسے بچا نہ سکا۔ مرنے سے پہلے وہ بہت بے چین تھے وہ اپنی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگے۔ بیٹا! میرے بعد اس دنیا میں نازلی کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ وہ میرے ہاتھوں کو پکڑ رو پڑے بیٹا! میرے بعد نازلی کا کیا ہوگا! پھر میری نازلی اس بھری دنیا میں کہاں جائے گی؟ میں نے اس کی شادی کر دینا چاہی، لیکن مجھ غریب کے پاس جہیز کہاں تھا۔ بڑے جہیز کے بغیر اسے کسی نے قبول نہ کیا۔ بیٹا! تم ہی اس کا سہارا بن جاؤ۔ میری روح اس کے لیے تڑپتی رہے گی اور میں سکون سے نہ مر سکوں گا۔ بوڑھا کیا میں بھی اس کی ماں کی طرح اسے بے سہارا چھوڑ کر دم توڑ دوں یہ کہہ کر وہ رونے لگے میں بت بنا ان کی باتیں سنتا رہا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ دوسرے ہی لمحہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس معصوم لڑکی کا سہارا بن جاؤں میں نے بوڑھے سے کہا: بابا فکر نہ کیجئے نازلی کا سہارا بن کر مجھے خوشی ہوگی!۔ نازلی کے ابی نے خوش ہو کر نازلی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ وہ پرسکون نیند سو گئے۔ ان کو دفن کرانے کے بعد آپ کے پاس آیا ہوں۔ اس قصور کی آپ جو سزا چاہیں مجھے دیں۔ یہ کہہ کر بیٹا سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ ہم نے دیکھا ابو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ بولے۔ بیٹا تم بہت اچھے بیٹے ہو ایسے بیٹے پر ہمیں فخر ہے!" امی بھی خوشی سے بھائی کی طرف بڑھتے گئیں۔ لیکن امی سے پہلے جلدی سے کار کے پاس پہنچ گئی اور نئی بھابی کا گھونگھٹ اٹھا لیا میں خوشی سے لپٹ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گھر آنگن میں خوشی کے پھول کھل گئے ہیں سوچنے لگی۔ بھیا انسان نہیں فرشتہ ہیں••••

اسلام کیا ہے؟

○ اسلام کا مفہوم خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔

○ اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا اسلام ہے۔

○ خدا کے مقابلے میں اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو جانا اسلام ہے۔

○ خدا کی بادشاہی اور فرمانروائی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا اسلام ہے۔

○ اسلام کی اصل شان یہی ہے کہ جو چیزیں عزیز ہوں ان ہی کو خدا کی خاطر قربان کیا جائے۔

○ اسلام زندگی کا ایک سانچہ ہے جسے اختیار کرنے کے بعد اس میں ڈھلا ہوا نظر آنا ایک فطری مطالبہ ہے

خواتین کے لکھے پاکستانی ناول

ناول	مصنفہ	قیمت
○ ہالہ	اے آر خاتون	30/-
○ افشاں	〃 〃	20/-
○ رمانہ	〃	14/-
○ سنگسار	سلمیٰ کنول	40/-
○ سہاگن	〃	10/-
○ تاجیہ	رضیہ بٹ	30/-
○ ثمینہ	〃 〃	15/-
○ شاہینہ	〃 〃	30/-
○ ریشم	〃 〃	14/-
○ ریطہ	〃 〃	25/-
○ شبنم	〃 〃	15/-
○ لیزا	پرچیشا شریف	20/-
○ آنچل	شمیم تقوی	20/-
○ عذرا	عابدہ نسرین	30/-
○ رت جگا	رعیانا خانم	10/-
○ شبانہ	نازرہ خاتون	30/-
○ نورین	رضیہ بٹ	20/-

اسلام میں

والدین کے مقام پر ایک نظر

ف۔ ریحانہ آصبود

والدین خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ ہر عاقل اس بات کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے کہ والدین خدا کی بہترین نعمت ہیں۔ قرآنی تعلیمات میں خدا اور رسول کی اطاعت کے بعد والدین کی فرمانبرداری اور اطاعت کو بہت ہی اہمیت دی گئی ہے۔ ان کا ادب و احترام، ان کی عزت و تکریم کو اسلام نے ایک بلند مقام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ان کی اطاعت کرنے کی بار بار تاکید کی ہے

"والدین خدا کی بہت بڑی نعمت ہیں وہ بہت ہی خوش نصیب ہے جو اپنے والدین کی خدمت بجالایا: خدائے پاک کا ارشاد ہے

اے پیغمبر تمہارے پروردگار نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کو سمجھا دو کہ اے لوگو سوائے خدائے واحد کے کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ جب ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچیں تو ان کے لیے کبھی اُف تک زبان پر نہ لایا کرو اور نہ جھڑکی دینا اور بات ادب کے ساتھ کرنا اور عجز و نیاز کے ساتھ ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے پروردگار جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا اور میرے حال پر رحم کیا اسی طرح تو بھی ان کے حال پر رحم و کرم فرما"

اس آیت میں اللہ پاک نے اپنے بندے کو سمجھاتے ہوئے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے اور ان کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے۔

ایک نبی اپنی امت کے لیے جس طرح مہربان ہوتا ہے اسی قدر بلکہ شفیق ماں اپنی اولاد کے لیے مہربان ہوتی ہے اس کو خوش دیکھ کر خوش ہوتی ہے اور اس کو غمگین دیکھ کر اداس ہو جاتی ہے ماں کی تربیت کی بدولت اولاد کی تربیت اچھی ہوتی ہے۔ ماں اگر نیک ہو تو اولاد بھی نیک ہوتی ہے۔ بچوں پر ماں کا خاص اثر پڑتا ہے۔ والدین کی گود ہی بچوں کا پہلا مکتب ہے جہاں تربیت پائے بغیر دوسری جگہ تربیت پانا مشکل ہے ایک نیک اور اچھی ماں بچوں کے لیے ہزار اساتذہ سے بہتر ہوتی ہے۔

حضور اکرم کا ارشاد ہے "ماں کے قدموں تلے جنت ہے" جس کا مطلب یہ ہے کہ ماں کی خدمت کا بدلہ جنت ہے۔

حضور صلعم کا ارشاد ہے تمام گناہوں میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا بخش دے گا مگر وہ شخص نہیں بخشا جائے گا جس پر اس کے والدین کے حقوق باقی رہ گئے ہوں۔ اس لیے یہ حقوق جلد ادا کیے جانے والے ہیں یہ حقوق حیات ہی میں واجب ہو گئے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں تین چیزوں کی وصیت کرتا ہوں پہلی نماز میں کوتاہی نہ کرنا، دوسری والدین کے ساتھ نیکی کرنے میں خطا نہ کرنا تیسری باندی اور غلام کو ایذا اور رنج نہ دینا۔

ان احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ والدین کی حیثیت اسلام میں کیا ہے؟ اللہ پاک نے قرآن شریف میں ان کی اطاعت کرنے کی تاکید فرمائی ہے اور حضور صلعم نے بھی ان کا مقام بتاتے ہوئے ان کی خدمت بجالانے کی تاکید فرمائی۔

اس لیے ثابت ہوا کہ والدین خدا کا دیا ہوا بہترین عطیہ ہیں ان کی اطاعت فرمانبرداری خدمت ثواب دارین کا باعث ہو جس شخص کے والدین اس کی حیات ہی میں دنیا سے کوچ کر چکے ہوں اس پر یہ واجب ہے کہ انھیں ہر دعا میں مقدم رکھے خدا سے ان کی مغفرت چاہے اور ان کے نام پر خیرات کرے، قرآن پڑھ کر ثواب پہنچائے۔

رب العزت سے بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ ہمیں والدین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ ہر ایک ایسی خبر شائع کی جاتی ہے جو ولادت اطفال، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر مختصر سے مختصر الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو۔ اور نمبر خریداری و پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی گئی ہو۔ خبر کی اشاعت میں کتابت کی غلطی کا ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر غلطی کی اصلاح شائع کر دی جائے گی۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ تک وصول نہیں ہوتیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔

ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

عفیرہ ناز دختر قمر لطیف (آنبور) میرے چاچا نا موتا ابن الرحمن اور چاچی قمر سلطانہ کے گلشن حیات میں ۵ اپریل ۱۹۸۰ء کی شب میں ساڑھے نو بجے اللہ پاک نے دوسری بار ایک پھول سی بیٹی عطا فرمائی۔ نام ناصیہ ثمرین قرار پایا۔ میری اور ممی کی دعا ہے کہ اللہ پاک ناصیہ ثمرین کو دونوں جہان کی نعمتوں سے نوازے۔

- اطیبانہ جمیل، روحیل کریم، عدیل عرفات (آنبور) ہمارے ابا سعد اللہ باشاہ اور ممی رضیہ سلطانہ (پرنام بٹ) کے گلشن حیات میں بڑی آرزوؤں کے بعد ۳ مئی ۱۹۸۰ء کو صبح ۸ بجے ایک ننھی منی چاند سی گڑیا اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ نام اسمٰہ صبرین قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ یہ گڑیا عکس فاطمہ زہرہ بنے۔
- خالد نسیم قاسم شمسی (دہلی سٹیٹ) میرے پیارے بھائی محمد احمد اور پیاری بھابی مسبوشیریں کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے پہلی بار ۲۳ اپریل ۱۹۸۰ء کی شام کو ۷ بجے بمقام ڈھاکہ ایک ننھی کلی کھلائی۔ پیار کا نام شائلہ صدف رکھا گیا۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ اسے عمر طویل بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

پیغامات نشاط

- سید جمیل الحسن صاحب رضوی منیجر نسیم بکڈپو کی پارۂ جگر عزیزی شہلا سلمہا کی شادی سید جعفر رضا سلمہ ابن سید عسکری رضا صاحب رضوی مرحوم (جہولی) کے ساتھ ۱۳ مئی کی شب میں بمقام کٹرہ ابوتراب خاں لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اس تقریب سعید میں اکثر معززین شہر نے شرکت فرمائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ شہلا سلمہا اور جعفر رضا سلمہ باہم شیر و شکر بنکر زندگی گزاریں اور ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ ۱۴ مئی کو سید جعفر رضا سلمہ نے اپنے اعزہ و احباب کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ نسیم بتول
- بیبیہ مسعود (چک بلاپور۔ کولار) میری ماموں زاد بہن عائشہ ناز بنت سید اسد اللہ صاحب (آپ کا مکمل نام پڑھا نہیں جا سکا) کا عقد مسعود اشرف اللہ بن سید افضل اللہ حیدر جو کے ساتھ ۱۲ اپریل ۱۹۸۰ء کو بمقام بنگلور بحسن و خوبی انجام پایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔
- شہلا پروین ظفر احمد مرزائی (کھٹک) میرے چچا منور احمد مرزائی صاحب (فرزند حسین صاحب مرزائی) کو بتاریخ ۸ مئی ۱۹۸۰ء بروز جمعرات بوقت ۱۱ بجے دن بمقام شموگہ محترمہ قمر سلطانہ دختر شبیر احمد صاحب کے رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ان کا یہ بندھن ہمیشہ قائم رہے اور ان کی ازدواجی زندگی شاد و خرم گذرے۔
- شبنم بیگ، عرفانہ بیگ (آنولہ) ہمارے پیارے بھائی مختار الدین صاحب کی شادی نزاکت النسا بیگم (بنت حاجی مظہر الحق صاحب) سے ۲۹ مارچ ۱۹۸۰ء بروز ہفتہ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہمارے بھیا اور بھابی کی زندگی کے دامن خوشیوں سے بھرے رہیں۔
- حاجی عبدالستار صاحب الکٹرونکس ہملائی۔ الاٹش روڈ لکھنؤ کے فرزند عبدالصمد عرف اختر سلمہ کی شادی عارفہ بانو دختر حاجی افتخار محمد حنیف صاحب بھیکا۔ بہرائچ) کے ساتھ اور صاحبزادی شہناز بانو کی شادی شکیل احمد (خلف رشید خادم رسول صاحب بہرائچ) کے ساتھ ۱۸ مئی ۱۹۸۰ء کی شام کو بمقام مینا گاؤں

نکاح بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور دونوں خوشیاں شادمانی سے زندگی گزاریں۔
نسیم انہونوی

- مسٹر رقیہ بائی حاجی ہارون صاحب (بمبئی) کے فرزند دلبند آدم (فرزند مرحوم حاجی ہارون حاجی محمد) کی شادی شیریں سلمہا (دختر جو سب عثمان میمن مرحوم) کے ساتھ کچھی میمن جماعت خانہ بمبئی میں ۱۰ مئی ۱۹۸۱ء کی شام کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
(نسیم انہونوی)

- نسرین بانو (دنیا باڑی) میری پیاری بہن جناب اختر بخت کنٹریکٹر محمد اسحٰق صاحب) کی شادی جاوید احمد بی۔ کام (فرزند منڈی جبل الجبار) کے ساتھ ۱۰ مئی ۱۹۸۱ء بروز اتوار، بوقت ۱۱ بجے دن بخیر و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ یہ دونوں ایک جان دو قالب بنکر رہیں۔
آمین

- اردو کے مشہور شاعر حضرت شاداں بارہ بنکوی کی صاحبزادی ثریا سلمہا کا عقد نکاح عزیزی محمود علی سلمہ (رسولی بارہ بنکی) کے ساتھ ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت ۵ بجے شام شاداں صاحب کے دولتکدہ، بانسی کی مسجد لکھنؤ میں بحسن و خوبی عمل میں آیا۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- سرفراز پریس کے کہنہ مشق مشین مین نشی کی صاحبزادی نسیم بانو سلمہا کا عقد نکاح، میاں محمد صغیر (ابن محمد اسمٰعیل صاحب (بمبئی) کے ساتھ ۲۸ اپریل ۱۹۸۱ء بروز منگل بوقت ۱۱ بجے دن بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- میرے مرحوم دوست ڈاکٹر محمد سردار خاں صاحب، سابق سپرانٹنڈنٹ زولوجیکل گارڈن لکھنؤ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی یاسمین سلمہا کی شادی ثمر سلمہ (فرزند عمر صدیقی۔ لندن) کے ساتھ ۲۳ مئی ۱۹۸۱ء بروز سنیچر بمقام اشاری کیپر بہنیو اسکول، ولنگٹن گارڈن، بارکنگ ایکس۔ لندن بحسن و خوبی انجام پائی۔ مجھے مسرت ہے کہ بہن زبیدہ ڈاکٹر سردار خاں نے اس موقع پر مجھے بھی دعوتی کارڈ بھیجا۔ میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہوں کہ اللہ پاک یاسمین سلمہا کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔
نسیم انہونوی

- میرے کرم فرما، مایہ ناز طبیب اور مشہور ادیب جناب کوثر چاند پوری کی پوتی ناہید سلمہا کی شادی آفاق سلمہ (پسر مرحوم حکیم جمیل احمد صاحب)

کے ساتھ ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء کی شام کو بمقام ٹیچرس کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے
(نسیم انہونوی)

- عبدالخالق شیر علی صاحب کی صاحبزادی نزہت سلطانہ سلمہا کی شادی سعید احمد سلمہ (پسر صغیر احمد صاحب) کے ساتھ ۲۴ مئی ۱۹۸۱ء بوقت ۷ بجے شام بمقام قریش نگر، کرلا، بمبئی، بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- قاضی رفیع الدین احمد خاں عرف بنی میاں (البشیرت گنج لکھنؤ) نے اپنے فرزند عزیزی سراج الدین احمد خاں کی شادی کے سلسلے میں ۲۰ مئی ۱۹۸۱ء کی شام کو اپنے اعزہ اور احباب کو دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- جی۔ وی محمد نذیر صاحب (زمیندار گرگیسوری) کے بھائی الحاج وی۔ عبدالعزیز صاحب مرحوم۔ سابق چیرمین گرگیسوری) کی صاحبزادی نسیم فاطمہ سلمہا کا عقد مسعود جی کے اعجاز احمد سلمہ بی۔ اے (فرزند ارجمند جی۔ وی۔ محمد خلیل صاحب مرحوم۔ زمیندار گرگیسوری) کے ساتھ ۱۰ مئی ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے دن بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔

- محمد عبدالقیوم صاحب (بلاری) کی سب سے بڑی صاحبزادی عاصمہ پروین سلمہا بی۔ ایس سی کی شادی، سید عنایت اللہ بی۔ ایس سی (فرزند الحاج سید ابراہیم صاحب، بنگلور) کے ساتھ ۱۰ مئی ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت ۱۰ بجے دن بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- مختار احمد انصاری (نیا گاؤں۔ لکھنؤ) کی صاحبزادی شمیم بانو سلمہا کی شادی رشید احمد سلمہ (ابن بقائی مرحوم) کے ساتھ ۳ مئی ۱۹۸۱ء بروز اتوار بعد مغرب بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

- سید اکرام الحق صاحب (ماڈل ہاؤس۔ لکھنؤ) نے اپنے فرزند دلبند عزیزی عرفان سلمہ کی شادی کے سلسلے میں، جو ہمراہ عذرا سلمہا (دختر جناب شہاب الدین، بہار شریف) میں ہوئی ۲۰ مئی ۱۹۸۱ء کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔
نسیم انہونوی

انتقال پر ملال کی خبریں

- ممتاز فریدہ (مرادآباد) ایک نہایت ہی دردناک خبر دے رہی ہوں۔ میرے چچازاد بھائی مختار احمد اپنی بچی کو لینے مالیگاؤں جا رہے تھے جہاں کے دارالعلوم میں اسے خاص طور پر حفظ قرآن کے لئے داخل کیا گیا تھا۔ افسوس کہ مالیگاؤں بس اسٹینڈ سے تھوڑی دیر پہلے بس حادثہ کا شکار ہو گئی اور بھائی مختار احمد موقع واردات ہی پر ۲۰ مئی ۱۹۸۰ء کو ہلاک ہو گئے۔ دارالعلوم والوں نے ان کی میت کو سپرد خاک کر دیا۔ آخری سفر کے وقت ان کی بچی ہی بس ان کے پاس تھی۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور ان کے پسماندگان خصوصیت سے ان کی بیوہ اور بچوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ مرحوم کی عمر ۴۵ سال کے قریب تھی۔ بڑے نیک اور پارسا انسان تھے۔ (حادثہ واقعی بیحد المناک ہے۔ میں مرحوم کے پس ماندگان کا شریک غم ہوں۔ نسیم انہونوی)

- بی بی عقیلہ انجم راحیلا (برنام بٹ) افسوس صد افسوس میری خالہ زاد بہن آمنہ بیگم زچگی کے انیس روز بعد ۳ مئی ۱۹۸۰ء بصد افسوس بوقت ۹ بجے شب ہم سب کو گریہ کناں چھوڑ کر راہی ملک عدم ہو گئیں۔ مرحومہ کی عمر صرف ۲۱ سال تھی۔ جس بچی کے جنم دینے کے سلسلہ میں ان کی موت ہوئی وہ مرحومہ سے ایک روز قبل ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی دو کم سن بچیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک بطفیل حضور سرور کائنات صلعم انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر کی طاقت عطا فرمائے (مجھے بھی یہ خبر پڑھ کر بیحد افسوس ہوا۔ میں بھی آپ سب کا شریک غم ہوں۔ نسیم انہونوی)

- شمیمہ نشاط سلمہا دھنباد سے لکھتی ہیں۔ افسوس میرے نانا حضور الحاج محمد عثمان (اشرفی) ۲۲ اپریل ۱۹۸۰ء بوقت ۲ بجے شب اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم بڑے پابند صوم صلوٰۃ تھے۔ ملنسار، نیک اور سخی تھے۔ ان کی جدائی نہ صرف ان کے متعلقین بلکہ سارے محلے کے لئے ایک المیہ ہے۔ اللہ پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ناول بھتا دے ختم ہو گیا

انشاءاللہ جولائی سے مصنف موصافی کا دوسرا

قسط وار ناول "دیدہ آشنا" شروع ہو جائے گا۔ جو بہنیں اب تک حریم کی خریدار نہ ہوں اور نیا ناول شروع سے پڑھنا چاہیں وہ جولائی سے خریدار بن جائیں۔

چند ضروری باتیں نوٹ فرمالیں۔

- حریم نہ ملنے کی شکایت ۲۰ تاریخ تک انتظار کرنے کے بعد کیجئے۔
- مضمون بھیجیں تو اپنا نمبر خریداری اس پر ضرور تحریر فرمائیں۔
- پتہ کی تبدیلی کی اطلاع اس طرح دیجئے کہ ۱۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔

(بقیہ اشعار صفحہ ۳۲)

یہ ادائیں اداس چہرے، یہ حسیں، حسین تبسم
تری انجمن میں شاید کوئی آئینہ نہیں ہے

مرسلہ: کنیز فاطمہ لاری (حاجیگو۔ کانپور)

اس قدر تیرا تصور کبھی بڑھ جاتا ہے
آئینہ دیکھوں تو منہ تیرا نظر آتا ہے

مرسلہ: عادل جمال شمسی (کلکتہ ۲)

حیف میں ان کا آئینہ نہ ہوا
خوب ہی دیکھ بھال کی ہوتی

مرسلہ: صبیحہ سلطانہ (سہسوان)

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

مرسلہ: بی بی عقیلہ انجم راحلہ (برنام بٹ)

پسینہ موت کا ماتھے پہ آیا، آئینہ لاؤ
ہم اپنی زندگی کی آخری تصویر دیکھیں گے

مرسلہ: کشور سلطانہ (لکھنؤ)

آئینہ کیا بتائے گا، مجھ سے ملاؤ آنکھ
میری نظر کسوٹی ہے حسن و جمال کی

مرسلہ: صادق النساء عبدالسلام (توحید نگر، مرادآباد)

وہ شاید اسرار واقف ہی ہو۔ لیکن خون کا تعلق ایسا نہ تھا جو انہیں کسی غیر معمولی حادثے کی اطلاع نہ دیتا۔

ابھی وہ صحت مند نہ ہو سکی تھیں کہ انہیں بڑی مصلحت سے مکرم کی بانیابی کی خبر آہستہ آہستہ کرکے سنائی گئی!۔ لیکن یہ مصلحت بھی کارگر نہ ہو سکی۔ وہ صرف اتنی ہی کا خبر سن سکیں تاب ہو گئیں کہ کسی کے ذریعہ ان کے بیٹے کا پتہ چل سکتا ہے!۔ ان کی بیماری اس قدر بڑھی کہ سب پریشان ہو گئے۔ ویسے بھی مکرم کو شاہان احمد کے روپ میں دیکھ کر دوسرے شفیقن بھی خود کو قابو میں نہ رکھ سکے تھے۔ دیر تک خوشی کے آنسو بہانے کا سلسلہ جاری رہا تھا۔ تو پھر بیگم نعمان جو اپنی موت کو مٹھی میں لیے پڑی تھیں کیونکر سنبھل سکتی تھیں۔ انجام یہ ہوا کہ جب کشاں کشاں مکرم ان کے سامنے لایا گیا۔

تب ۔۔۔

انھوں نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیے۔ مکرم ان کی باہوں میں سما گیا۔ انھوں نے خود پر ضبط کر لیا لیکن بیگم نعمان بے چاری ضبط نہ کر سکیں۔ ان کے دو لب جو مکرم کا بیٹا لانے کو تھے۔ بتدریج سرد ہونے لگے۔ باز و نیم جان ہو کے ادھر ادھر گر گئے!۔ بس ایک طویل محبت پاش نگاہ انھوں نے اپنے بیٹے پر ڈالی۔ نہ کچھ کہا نہ سنا اور چپکے سے آنکھیں بند کر لیں!۔

ان کی حادثاتی موت نے شفیقن پر نہایت دلخراش اثر ڈالا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ وہ خود کو ہر طرح بچا کر بشاشت ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ انھیں یقین تھا اگر وہ احتشام کو یہ خبر سنا دیں گے کہ مکرم ہی اصل ان کا بچا نادر بھائی تھا۔ تب شاید وہ بچارا اس خوشخبری کو برداشت نہ کر سکتے:

سب سے زیادہ ان دونوں حالات سے جو متاثر ہوا وہ وسیمہ تھی!۔ اسے ابھی ان کا اپنا ہونا نظر بند کر دیا تھا۔ وہ اپنا قسمت میں احمد مکرم

فرمائیے۔ وصیہ بی بی:

وصیہ کمرے میں نہیں گئی۔ پردہ تھامے کھڑی رہی۔ اس نے مکرم کو اس حال میں دیکھا تھا کہ اب ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ اس سے بات کرتی! پھر بھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی اس آدمی کے لیے کیوں اس قدر اپنائیت اور محبت رکھتی ہے۔ جس کا تجزیہ کرنے سے وہ قاصر تھی۔

مکرم نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور پوچھا: کچھ کام ہے۔ آپ نے یہاں تک تکلیف کی ہے:

میرا نہیں۔ باجی کا کام ہے!: وصیہ بولی۔

فرمائیے:

اچھا۔ ابھی کہتی ہوں۔ مگر آپ یہ بتائیے کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟۔

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور رخ پھیر کر میز پوش کا گوشہ ٹھیک کرنے لگا!۔

وصیہ کمرے میں آ گئی! اور اسکے جواب کی پرواہ نہ کرکے بولی: باجی سے میں نے کہا تھا کہ شاید باجی نے آپ کو نجانے کیا کہا ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کو گھر چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ باجی بڑی رنجیدہ تھیں۔ انھوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے؟:

"وصیہ بی بی۔ میں ایک آوارہ وطن ہوں۔ کہیں سے بھولا بھٹکا چلا آیا تھا۔ یہاں بھی رہنا نہیں تھا۔ اب پھر چلا جاؤں گا۔ مجھے اپنا شہر اپنے ہمسائے یاد آ رہے ہیں۔ یہاں وطن کھینچ رہا ہے۔ آپ محترمہ نازیہ صاحبہ کا بہت بہت شکریہ میری طرف سے ادا کر دیجئے۔ اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ ان کے یہاں رہ کر ان کی خدمت کرتے ہوئے اگر کوئی فروگزاشت مجھ سے ہو گئی ہو تو وہ۔ اور سب معاف کر دیں۔!"

یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ آپ کی لمبی چوڑی باتیں میں سنتے ہی جاتے بھول جاؤں گی: وصیہ نے کہا: آپ کیوں تنہا گھٹ گھٹ لیجیے۔ اور پھر آپ اس موقع پر کہاں جا رہے ہیں جبکہ بھائی جان بیمار ہیں۔ وہ کیا سوچیں گے؟:

[illegible]

دفعتاً ایک نئی مردانہ آواز نے صحن کے دروازے پر ہانک لگائی۔

"بیرسٹر صاحب!؟"

کون صاحب ہیں؟ زمینہ نے چیخ کر پوچھا۔

"کرنل صاحب نے بیرسٹر صاحب کو ہسپتال میں بلوایا ہے۔ میں وہاں کا اردلی ہوں۔ آپ لوگ فوراً پہنچیں۔ پروفیسر صاحب کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔ اچھا میں جا رہا ہوں!

الٰہی خیر!: بیگم فیضان نے دل پر ہاتھ رکھ لیا: ہسپتال سے اردلی آیا ہے۔ یہ کون پروفیسر صاحب ہیں؟: نازیہ۔ بیٹی جلدی بتاؤ۔ خدا رحم کرے۔ میرا تو دم سینے میں رکنے لگا!:

ارے بھابی کون ہے ہی۔ ابا جان کے سینکڑوں تو دوست ہیں۔ کوئی ہوگا: نازیہ کے دل میں پنکھے لگے تھے۔ دل اپنی رفتار بھول رہا تھا مگر انھوں نے لاپرواہی سے کہا۔

"باتیں نہ بناؤ بیٹی۔ خواہ مخواہ میرا دل نہیں گھبرا رہا: وہ مضطربانہ انداز میں سینے لگیں۔

ہم کیسے جائیں!: زمینہ نے اشارے سے نازیہ سے پوچھا۔

گھر جانے کا بہانہ کرکے میں تو جاتی ہوں: نازیہ نے سرگوشی کی۔

اللہ باجی۔ میں اکیلی گھر پر نہیں رہوں گی۔

کتنی پریشانی ہے؟: نازیہ دہشت کے مارے اللہ کو یاد کر رہی ہوئیں۔ دونوں بہنیں گم سم تھیں۔ مگر کوئی الجھن تھی جو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی!

فیضان صاحب ہسپتال پہنچے! برآمدے میں انھوں نے سب کو دیکھا۔ متوحش اور پریشان ان کا تماشا تھا۔

[illegible] ڈاکٹر نے بتایا: بروقت امداد نے [illegible] دیا ہے۔ مگر انہیں سمجھا کر تسلی دو۔ آج کی [illegible]

[illegible]

تم کیوں پوچھ رہے ہو؟:

"آپ بتائیے تو:"

اعزاز نے پھر سے سگریٹ سلگا لیا اور بولے "بھئی وہ نازیہ کے چھوٹے بھائی شایان احمد پر بچی جان نے مقرر کی تھی۔ بڑی خاطر کیا کرتی تھیں اس کی۔ وہ بھی ٹھیک ہی تھی۔ مگر معلوم نہیں کہ اچانک اس کے سر پر کون سا شیطان سوار ہوا کہ بچی جان کو دھوکا دے کر ان کا ایک سال کا بچہ لے کر بھاگی! بے چاری بچی جان۔ وہ تو مرتے مرتے بچیں۔ یہ اختلاج کا عارضہ انہی دنوں کی یادگار ہے۔!"

زاہدہ کے شوہر کا نام محمد اکرم تھا؟:

غالباً یہی تھا: اعزاز بولے: مگر یہ تم۔ ایک زمانے کی باتیں۔ آج کیوں پوچھنے بیٹھے ہو؟:

"وہ عورت۔ زاہدہ۔ میری خالہ تھی!:

سچ مچ!۔

"جی ہاں!:

تو پھر کہاں ہے؟: اعزاز نے بے تابی سے پوچھا: میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اب نہیں ہے؟

"کیوں"

سال بھر قبل ان کا انتقال ہو گیا!:

انتقال ہو گیا: اعزاز اچھل پڑے: اور وہ بچہ۔ جسے وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کہاں ہے؟ جلدی جواب دو۔ اکرم۔ میرے خدا۔ میں یہی کہتا کہ یہ [illegible] بچی جان [illegible] دیکھیں گی! آپ نہ وہ [illegible]

اعجاز حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ کوئی بات بھی تو وہ مربوط نہیں کہہ رہا
تھا۔

"جی ہاں۔" اس نے سر ہلا کر پھر کہا۔ "اگر کسی کو یقین نہ آیا تو پھر خواہ مخواہ
میں شرمندہ ہوں گا۔ فائدہ کچھ بھی نہیں۔"

"کریم؟" انھوں نے اسے تادیباً پکارا۔

"جی!" وہ ہوش میں آ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں تکنے لگا۔

"تمھاری گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"اچھا آپ بیٹھیے۔" اس نے اپنی فطرت کے خلاف ان کا بازو تھاما اور والہانہ
انداز میں بولا۔ "آئیے۔ اس طرف بیٹھ کے باتیں کریں۔"

نشستانے میں پہنچ کر اس نے سر جھکا کر کچھ سوچا پھر جب سر اٹھایا تو اعجاز
نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"مجھے یقین نہیں کہ آپ میرے واقعات کو سچ سمجھیں گے؟"

"یہ کیا چیستاں سی بگھار رہے ہو بھائی!" اعجاز نے کہا۔ "کہہ دو۔ جو کچھ کہنا
چاہتے ہو۔"

"جی کبھی آپ کے یہاں زاہدہ نامی کوئی خاتون کسی بچے پر گورنس مقرر تھی؟"

"خاتون؟!" اعجاز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر حقارت سے
بولے: "اس ذلیل ناہنجار، دھوکے باز ڈھنگ عورت کو تم اس قدر احترام
سے خاتون کہہ رہے ہو۔ اس بدبخت نے تو چچا جان کی خوشیاں کہاں اجاڑ
کے رکھ دیں۔ چچا جان کو زندہ درگور کر دیا۔"

"کون تھی وہ؟" — کریم کے دل پر مرحوم عورت کے تعلق سے
[illegible]

"یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی؟" فیضان صاحب کی آنکھیں تارہ بن کر واردی کی طرف گھوم گئیں
اتنے میں کرنل صاحب بھی ادھر آ گئے۔ اور فیضان صاحب کے پوچھنے پر بولے: "جی ہاں —
تدبیروں سے ہم ایک ممکن خطرے کو حتی الامکان پیچھے دھکیل تو رہے ہیں۔ لیکن۔ توقع نہیں
ہے کہ۔ وہ دور ہو گا۔ فی الحال انھیں آرام ہے۔"

"خدا اس کا مرض دور کرے۔" فیضان صاحب نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ اچانک کرنل
صاحب نے کہا: "ارے ہاں۔ میں اس پریشانی کے عالم میں ایک ضروری بات آپ
سے کہتے کہتے رک جاتا ہوں۔"

"فرمائیے۔ فرمائیے۔"

"جب میں نے ان صاحبزادے کو دیکھا تھا۔" کرنل صاحب نے کریم کی طرف اشارہ
کر کے کہا: "بخدا میں تو چونک گیا تھا۔ کیونکہ مجھے یاد آیا کہ جب آپ اور میں یونیورسٹی
میں پڑھتے تھے تب ان کی عمر آپ کی ہو گی اور بعینہٖ یہی شکل آپ کی تھی۔ بس یونہی
یہ خیال آ گیا تھا کہ اگر وہ۔ آپ کا گمشدہ بیٹا شایان احمد آج موجود ہوتا تو یقیناً
ایسا ہی ہوتا!" وہ ہنسنے لگے۔ "کیسے کچھ یاد آیا؟"

فیضان صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا: "کہاں صاحب۔ کاش ایسا ہوتا۔ ہم تو
اس بدنصیب کو بھول کے بیٹھ گئے۔ کس کس کو یاد کر کے کلیجہ چھلنی کریں۔ ایک ختم ہو گیا
ایک زاہدہ لے کے بھاگی۔ افسوس۔ مرے کو صبر کر لیا۔ جیتے کا صبر نہیں ہوا۔ بیگم نے
اس غم میں اختلاج کا روگ پالا ہے۔ کیا عرض کیا جائے!"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" کرنل صاحب نے کہا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔
کریم کا دل حلق میں آ گیا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں
آ رہا تھا۔ اس نے جو کچھ سنا تھا وہ خواب نہیں تھا۔

"زاہدہ ایک بچے کو لے کر بھاگ گئی!"

فیضان صاحب کا گلو گرفتہ لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا!

نفیسہ وہ اس کی مرحوم اماں کا ہی تو نام تھا۔

مگر وہ یہ یاد کرنے پر اب بھی تیار نہ تھا کہ واقعی فیضان احمد صاحب اس کے باپ ہو سکتے ہیں۔

وہ دم بخود سکتے کی حالت میں وہیں کھڑا رہا۔

اسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہاں کون آیا کون گیا!۔

پھر ادھر احراز آئے اور انہوں نے اطمینان بخش خبر سنائی کہ احتشام اب کچھ سنبھل گئے ہیں۔ ان کے چہرے پر نہایت ناگواری کے اثرات تھے۔ فیضان صاحب کے استفسار کے بغیر انہوں نے کہا۔

"میں پہلے کہتا ہوں۔ چچا جان کہ احتشام کی یہ حالت محض سبین کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

"کیوں؟"

"ایسا نہیں ہے تو کیا" وہ بگڑے ہوئے تھے "کیا وہ ایسی ہی عقل کی اندھی تھی کہ۔ اس عالم میں جبکہ احتشام غریب آخری سانسیں پوری کر رہے ہیں ان سے نکاح کی درخواست کرنے پہنچی!۔"

"نکاح کی درخواست" فیضان صاحب کے لبوں سے نکلا۔

"ترقی پسندی اور بے جا آزادی کا نتیجہ۔ لاحول ولا قوۃ۔ ظاہر ہے کہ اس بے باکی نے احتشام پر کیسا ناگوار اثر ڈالا ہوگا!"

"اب لڑکی کو سرزنش کرنے سے کیا حاصل۔ میاں۔ اس کا اپنا دماغ بھی چلا جاتا ہے" فیضان صاحب نے کہا "وہ اس کے منگیتر تو ہیں۔ بے چاری نے خدا جانے کیا سوچا ہوگا!۔ مگر یہ کیسی کایا سی پلٹ گئی ہے۔ یہ تو وہ دن عجیب

کہ ان کی شادی کا سامان ہو رہا تھا!"

"کہاں کی شادی! چچا جان، فی الحال تو احتشام کی زندگی [illegible]

احراز کچھ دیر کھڑے سبین کی دیدہ دلیری پر پیچ و تاب کھاتے رہے [illegible] کہہ کر کر ہوٹل سے سب کو جانے بھجوانے کی ہدایت کرنے جا رہے تھے [illegible] بڑھ گئے۔

کرم جو ابھی تک خواب و بیداری کے سنگم پر سہما سا کھڑا تھا [illegible] کے ساتھ بڑھا۔ انہوں نے اس کی طرف مڑ کر کہا۔

"میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ تم آگے بڑھ کر ڈرائیور کو آواز دو!"

"م۔ گر۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے" کرم نے ہکلا کر کہا [illegible] نہ جائیے گا!"

"نہیں جاؤں گا!" انہوں نے برآمدے میں ٹھہر کر سگریٹ جلائی [illegible] کرم بھی ہیرے کو آواز دے کر ان کے پاس آ گیا۔ انہوں نے سگریٹ [illegible] کر اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا اور پھر سر اٹھا کر اس کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگے!

کرم کے سینے میں خیالات کی طغیانی موجزن تھی۔ سیل جذبات کے [illegible] کا کوئی راستہ اسے سجھائی نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک سرا تھامنے کی کوشش کرتا اور دوسرا سرا ہاتھ سے نکل جاتا۔

پھر وہ یہی کہہ سکا: "آپ کے سوا کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس سے میں یہ سب کچھ کہہ سکوں۔ وہ۔ واقعات جو مجھے پاگل بنا رہے ہیں۔ میں کہنا چاہتا تھا مگر یہ سن کر رک گیا۔ مگر خدا جانے کرنل صاحب [illegible] میں شاید خواب دیکھ رہا ہوں۔ اچھا آپ میرے یاد [illegible]

The Hareem Lucknow June. 1981 (Phones : 44358 45334) Regd. No. LW/N

Price Rs. 30/-

THE HAREEM

July. 81

Rs. 1.30

ٹیلیفون نمبر آفس :۔ ۴۴۵۵۹

گذشتہ ۵۱ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے
اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

ٹیلیفون نمبر رہائش ۴۵۲۳۴

جلد ۵۹ — نمبر (۷)

ماہنامہ

حریم

لکھنؤ

اڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاون مدیر
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین
ماہ جولائی سنہ ۸۱ء

قیمت سالانہ ۔ اعزازی ۔ منی آرڈر سے پچیس روپیہ ۔ مخصوص خریداری ۔ منی آرڈر سے تئیس روپیہ ۔ معمولی خریداری ۔ منی آرڈر سے بیس روپیہ ۔ وی ۔ پی سے پرچہ منگانے پر چار روپیہ زائد ۔ فی پرچہ ۔ ایک روپیہ تیس پیسے ۔ غیر ممالک سے ۴۵ روپیہ یا اس کے برابر غیر ملکی سکہ برائے سی میل ۔ ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں ۔

آفس اور ترسیل کا پتہ ۔ نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ

[illegible] نے باہتمام سید [illegible] سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر [illegible] ۱۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

[illegible] دالان سے بھاگے، نہ کھڑکی سے کودے بلکہ صدر دروازہ سے [illegible] داخل ہوگئے۔ اور اس داخلہ کو اپنے تک ہی محدود رکھنے کے بجائے انھوں نے جو ٹیم تیار کر دی وہ بھی نسیم امروہوی کی طرح بلا پردہ قدم رکھتے ہوئے آزادانہ ہر گھر میں داخل ہو جاتی ہے۔

نسیم صاحب کا میرے نزدیک اس سے بھی بڑا کمال ان کی وہ [illegible] ہے جو انھوں نے پردے کی تبلیغ کے سلسلہ میں دکھلائی ہے۔

نسیم صاحب اصطلاحاً نہ مولوی ہیں نہ مفتی نہ مبلغ ہیں اور نہ مصلح و مرشد [illegible] دیانت داری کے ساتھ کوئی جائزہ لیا جائے تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ [illegible] ہیں اور بڑے بڑے جبادری مصلحوں سے کہیں بلند ہیں۔

قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے کہ — یا ایھا الذین امنو لم تقولون ما لا تفعلون اے ایمان والو وہ بات کہتے کیوں ہو جو خود کرتے نہیں۔ میں اپنی مکمل جہالت کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ آیت شریف میرے نزدیک انہی نام نہاد مصلحین کے لئے نازل ہوئی ہے جو منبر و محراب سے دن رات دوسروں کو اس زندگی کی تلقین کرتے ہیں جس کے برعکس ان کا اپنا عمل ہوتا ہے۔ میں الزام تراشی کے لئے نہیں بلکہ اظہار حقیقت کے لئے عرض کر رہا ہوں کہ ہند و پاک ہی نہیں بلکہ [illegible] جن کی علمیت کے ڈنکے بج رہے ہیں ان کی لڑکیاں جب مخلوط سوسائٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں تو کسی نے دریافت کر لیا کہ پردہ جیسی [illegible] تصنیف نیز لڑکیوں کو عصمت کے مذبح ڈالنے کے بعد آپ نے کیا کیا؟

مصلح اعظم کا جواب ندامت کے ساتھ نہیں شرمندگی کے ساتھ نہیں جھوٹ کے بوجھ میں بھی نہیں بلکہ پوری ڈھٹائی اور ہنک کے ساتھ یہ تھا کہ اگر میں ایک طرف جماعت کا امیر ہوں تو دوسری طرف اپنی لڑکیوں کا باپ بھی تو ہوں۔ علامہ نسیم امروہوی۔ (اور اب مجھے علامہ کہنے کا حق ہے) نے پردہ کا علم بلند کیا تو پھر اس علم کو حریم کے صفحات ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اپنے گھر کی سب سے اونچی دیوار پر اسے نصب بھی کیا اور وہ علم آج بھی پردائی [illegible] دیکھنے والوں کو دعوت پردہ دے رہا ہے۔

نسیم امروہوی جس پردہ کے علم بردار ہیں وہ اسلامی، شرعی یا فقہی پردہ ہے یا مشرق کی مسلم تہذیب اور لطافت کا پردہ ہے میں اس بحث میں جانے سے گریز کرتے ہوئے بس اتنا ہی عرض کروں گا کہ جس پردہ کی ہندوستانی [illegible] اور لڑکیوں کو ضرورت ہے نسیم اسی پردہ کے مبلغ ہیں۔

میں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی جس طبقہ میں زندگی گزاری اور جس سماج کو دیکھنے کا موقع ملا اس میں، میں نے پردہ کی قدروں کو دن بہ دن اور قدم بہ قدم بدلتے ہوئے دیکھا ہے میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ تانگہ کے اندر برقعہ میں ملبوس ہونے کے باوجود ستر کے پردہ کے لئے چادریں تانی باندھی جاتی تھیں اور پھر میں نے انہی مستورات کی بیٹیوں کو کار، اسکوٹر اور سائیکل چلاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ میں نے سفر بغیر محرم کے حرام کے فتوے بھی پڑھے ہیں اور انہی مفتیوں کے گھر کی بیبیوں کو بغیر محرم کے غیر ملکوں کا سفر کرتے بھی دیکھا ہے۔ لیکن نسیم امروہوی کے پردہ میں کبھی افراط ہوئی اور نہ تفریط ان کا پردہ سیدھا سادہ اور صاف پردہ ہے وہ مخلوط تعلیم مخلوط سوسائٹی اور مخلوط معاشرہ کو مسلمان عورت کے لئے گڑھا قرار دیتے ہیں ان کا پردہ وہ ہے جس کے بارہ میں حدیث میں آیا ہے کہ۔ اتقو مواضع التہم۔ تہمت کی جگہ سے بچو۔ اور حدیث کی جو روح ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ تہمت سے تو کوئی نہیں بچ سکتا البتہ تہمت کی جگہ سے بچنے پر ہر شخص کو قدرت حاصل ہے۔ یہی نسیم صاحب کی دعوت ہے کہ آزادانہ اختلاط اور نامحرم افراد سے خواہ کتنی ہی پاک باطنی کے ساتھ ملا جائے پھر بھی وہ جائے تہمت کے حکم میں ضرور آسکتا ہے۔

نسیم صاحب کا رسالہ حریم بھی نسیم صاحب کی ثابت قدمی کی تصویر ہے۔ اس کی طباعت اس کا غذ اور اس کے مندرجات نسیم امروہوی کی شیروانی ان کی ٹوپی اور ان کی بنی سنوری شخصیت کی طرح رد و بدل اور مد و جزر سے اتنی دور ہے کہ کبھی تو نسیم صاحب حریم معلوم ہوتے ہیں اور حریم کو دیکھ جی چاہتا ہے کہ کہہ دوں۔ نسیم صاحب۔ السلام علیکم

یوں تو انسان کی تخلیق کا مقصد ہی اپنے خالق و پروردگار کی عبادت ہے، انسان اللہ کا بندہ ہے اور وہ اپنی زندگی کے ہر مرحلے اور ہر شعبے میں اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند ہے، کیونکہ اسی طریقے سے خالق کائنات کا نظام صحیح طریقے سے چل سکتا ہے اس سے انحراف بندگی نہیں بغاوت اور انکار ہے، خاص طور سے اسلام نے عبادت پر اسی لئے زور دیا اور مسلمانوں کو اپنی ساری زندگی اللہ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے کی تلقین کی ہے، کہ یہی انسان کا مقصود ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی کے شب و روز اسی عبادت میں بسر کر کے ساری انسانیت کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے عملی مثال قائم فرمائی، آپ نے نہ صرف وعظ و نصیحت اور عبادت پر زبانی طور سے زور دیا بلکہ خود بھی اس پر عمل فرمایا اور اس طرح عمل فرمایا کہ آپ کی حیات مبارکہ کا ہر لمحہ لوگوں کے سامنے تھا، آپ نے بتایا کہ خالق کائنات اور پروردگار عالم سے قربت اور اس کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ اس کی عبادت اور اس کی یاد میں زندگی بسر کرنا ہے کہ یہی انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی کی کامیابی و سرفرازی کا راز ہے۔

اسلام وہ مذہب ہے جس نے عبادت کی نئی راہیں کشادہ کیں اور انسان کو اللہ تعالیٰ سے قریب لانے کے بے شمار مواقع فراہم کئے۔ اس غرض کے لئے مختلف مہینے، دن اور رات کی تخصیص بھی کی گئی، انہی میں شعبان کا مہینہ اور اس کی چودھویں شب بھی ہے، قرآن مجید میں تو ماہ شعبان اور اس کی خصوصیت کا کوئی واضح ذکر نہیں ملتا ہے۔ لیکن احادیث میں اس کی فضیلت و اہمیت کا وافر تذکرہ موجود ہے۔ آنحضورؐ نے فرمایا ہے کہ رمضان اللہ کا مہینہ اور شعبان میرا مہینہ ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رمضان کی اہمیت و خصوصیت تو قرآن مجید میں مذکور ہے لیکن برکتوں اور فضیلتوں کے اعتبار سے شب برات بھی اہم ہے، اس طرح آپ نے رمضان المبارک کی آمد سے قبل مسلمانوں کو عبادت ریاضت میں مشغول رہنے کی تلقین فرمائی تاکہ رمضان المبارک کے لئے تیاری مکمل رہے، چنانچہ اس سے بڑی بات کیا ہوگی کہ آنحضرت صلعم نے شعبان کو اپنا مہینہ قرار دیا۔ چنانچہ شب شعبان کو لیلۃ البرأۃ یعنی نجات کی رات عفو و درگزر، بخشش و مغفرت اور رحمت خداوندی کے نزول کی رات ہے!

حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نصف شعبان کی رات آئے تو رات کو بیدار رہو، اور نماز ادا کرو اور دن کو روزہ رکھو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس رات کو غروب آفتاب کے وقت سے نیچے کے آسمان پر تجلی فرماتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں کہ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ ہم اسے رزق عنایت کریں، ہے کوئی گرفتار مصیبت کہ ہم اس کی مصیبت دور کریں، یہ صدائے عام اسی طرح جاری رہتی ہے یہاں تک کہ صبح صادق ہو جائے!

اس سے بڑی نعمت اور کیا ہو سکتی ہے کہ خود پروردگار عالم پکار کر اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازنے کا اعلان فرما رہا ہے۔ یہ رات نعمتوں سے دامن بھر لینے کی رات ہے، لیکن اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اس اعلان کے باوجود بندہ غافل رہے اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی مغفرت اور نعمتوں کے حصول کے لئے دعا نہ کرے۔

---

* ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے بستر پر آنحضرت کو نہیں پایا، میں نکلی تو آپ کو بقیع کے قبرستان میں موجود پایا ہیں

اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ

سید فضل الرحمان جعفری

نجاشی شہنشاہ حبشہ کا دربار ہے، ایک نقیب حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے "جہاں پناہ! ایک ایلچی مدینے سے آیا ہے اور شہنشاہ سے باریابی کا خواستگار ہے"

"پیش کیا جائے" شہنشاہ نے کہا

تھوڑی دیر میں ایک مسلمان دربار میں حاضر ہوا اور اس نے اسلامی طریقے پر بڑے پر وقار انداز میں سلام کیا۔ اور پھر یہ عرض کیا "میرا نام عمر بن امیہ ہے اور میں آپ کی خدمت میں تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام لایا ہوں"

"ہاں ہاں کہو وہ پیغام کیا ہے۔" نجاشی نے کہا

"عمر بن امیہ، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے یہ فرمایا ہے کہ میں ام حبیبہ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ تم میری طرف سے اسے یہ پیغام پہنچا دو۔"

نجاشی کے دل میں پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ اس نے فوراً اپنی ایک کنیز کو طلب کیا۔ نام ابرہہ تھا اور اس سے کہا۔ "اے ابرہہ! تو ام حبیبہؓ کے پاس جا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو پیغام نکاح دے اور یہ بھی کہہ کہ تم اپنی طرف سے کوئی وکیل بھی مقرر کر دو تاکہ یہ تقریب جلد انجام پائے"

ابرہہ نے نجاشی کا پیغام ام حبیبہؓ کو سنایا۔ ام حبیبہ اچانک یہ مسرت انگیز خبر سن کر دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھیں۔ انھوں نے اس پیغام رسانی کے صلہ میں ابرہہ کو انعام سے نوازا۔ ابرہہ جب واپس ہوتی ہے تو اس کے پاس چاندی کے کنگن، چاندی کی انگوٹھیاں اور دونوں پاؤں کے چھلّے تھے۔ اس نے نجاشی کی بارگاہ میں پہنچ کر عرض کیا۔ "جہاں پناہ! ام حبیبہ نے اس رشتہ کے لئے ہاں کر دی ہے اور انھوں نے خالد بن سعید کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے"

[illegible]

نجاشی کے شاہی محل میں حبشہ کے تمام مسلمان جمع تھے۔ ان میں جعفر بن ابی طالب بھی تھے۔ رسم نکاح نجاشی نے انجام دی۔ نکاح پڑھایا اور حضرت نبی اکرم کی طرف سے چار سو دینار بطور مہر خالد بن سعید کو ادا کئے۔

رسم نکاح کی ادائی کے بعد جب لوگ اٹھ کر جانے لگے تو خالد بن سعید نے انھیں روکا۔ اور کہا "بھائیو! یہ انبیاء کی سنت ہے کہ نکاح کرتے ہیں تو کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ چنانچہ سب کو کھانا کھلایا گیا۔ پھر سب رخصت ہوئے۔

یہ ام حبیبہ کی کہانی ہے جن کا نام رملہ تھا اور کنیت ام حبیبہ تھی۔ ان کی ماں کا نام صفیہ تھا۔ جو ابو العاص کی بیٹی تھیں۔ باپ کا نام ابو سفیان تھا۔

حضرت ام حبیبہؓ کا پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ آپ اپنے شوہر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئی تھیں اور شوہر ہی کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں عبید اللہ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ نام حبیبہ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد عبید اللہ نے اسلام ترک کر کے نصرانیت اختیار کر لی تھی ۔۔۔۔ لیکن ام حبیبہ کے دل میں اسلام کا نور پوری طرح پیوست ہو گیا تھا اور ان کی زندگی کا ہر گوشہ نور معرفت سے تابناک تھا۔

ایک روز ام حبیبہؓ نے اپنے شوہر کے چہرے پر نظر ڈالی تو وہ بہت بھیانک اور بے رونق تھا۔ وہ گھبرا گئیں اور انھوں نے یقین کر لیا کہ شوہر نے اسلام سے انحراف کیا ہے۔ دوسرے دن عبید اللہ نے خود ان سے کہا۔

"اے ام حبیبہ! میں نے مذہب کے معاملے میں بہت غور کیا۔ میں نے نصرانیت سے بہتر کوئی مذہب نہیں پایا۔ میں اگرچہ مسلمان ہو چکا ہوں لیکن اب اسے چھوڑ کر پھر نصرانی ہو رہا ہوں"

جب ام حبیبہؓ کو اپنے شوہر کے اس فیصلے سے شدید رنج پہنچا اور انھوں نے [illegible] کی ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ عیسائی ہو ۔۔۔ اسی حالت میں موت آئی۔

حضرت ام حبیبہؓ شوہر سے جدا ہو کر حبشہ میں تنہائی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ عدت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام نکاح بھیجا اور وہ حرم نبویؐ میں داخل ہو گئیں۔ یہ نکاح ۶ھ میں ہوا تھا۔ اس وقت حضرت ام حبیبہؓ کی عمر ۳۶ سال تھی۔ نکاح کے بعد جہاز کے ذریعہ حبشے کی بندرگاہ پر اتریں۔ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خیبر میں تشریف فرما تھے۔

حضرت ام حبیبہؓ بہت پختہ ایمان کی خاتون تھیں اور عقائد کے معاملے میں اتنی سخت تھیں کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے اقارب کی بھی کوئی رعایت نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ ایک بار ابوسفیان کفر کی حالت میں دربار نبویؐ میں حاضر ہوئے۔ وہ صلح کی میعاد میں توسیع کرانے کے لئے آئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپنی بیٹی (ام حبیبہ) کو بھی دیکھنے گئے گھر میں داخل ہو کر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرت ام حبیبہؓ نے فوراً بستر الٹ دیا اور یہ گوارا نہ کیا کہ ان کا باپ حالت شرک میں داعی حق صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھے۔ ابوسفیان کو بیٹی کا یہ طرز عمل سخت ناگوار ہوا۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔

"اے بیٹی! تجھے اپنے شوہر کا بستر اتنا عزیز ہے کہ تو نے اس پر اپنے باپ کا بیٹھنا بھی گوارا نہ کیا؟"

یہ سن کر حضرت ام حبیبہؓ نے جواب دیا "اے میرے باپ! یہ بستر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ آپ مشرک ہیں اور مشرک نجس ناپاک ہوتا ہے۔ اس مقدس بستر کو شرک کی گندگی سے ناپاک کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔"

ابوسفیان نے بیٹی کا یہ بے محابا جواب سن کر کہا۔

"اے بیٹی! تو میرے بعد بہت خرابیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔"

حضرت ام حبیبہؓ احادیث پر سختی سے عمل کرتی تھیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتی تھیں۔ ایک بار ابوسفیان ابن سعید آپ کے گھر پر آئے یہ آپ کے بھانجے تھے، انہوں نے ستو کھا کر کلی کی۔ یہ دیکھ کر حضرت ام حبیبہؓ نے کہا۔

"اے ابن سعید! تم کو صرف کلی نہیں بلکہ باوضو کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جس چیز کو آگ پکائے اس کے استعمال سے وضو لازم آتا ہے۔"

سنت کی ایک ایک بات پر عمل کرتی تھیں اور اس کا بڑا اہتمام بھی [illegible] کہ جو شخص [illegible] رکعت

نوافل پڑھے گا۔ اس کے لئے جنت میں گھر بنایا جائے گا۔ یہ سنتے ہی آپ نے اس حدیث پر عمل کرنا شروع کر دیا اور ساری عمر اس عمل کو جاری رکھا۔ حضرت ام حبیبہؓ میں بڑے اوصاف اور اخلاقی کمالات تھے۔ حدیث میں بڑی دستگاہ رکھتی تھیں، چنانچہ اس فن میں آپ کے کئی شاگرد ہیں۔ آپ کی روایت کردہ احادیث کی تعداد ۶۵ بتائی گئی ہے۔

آپ نے ۷۰ سال کی عمر میں ۴۴ھ میں انتقال کیا۔ یہ امیر معاویہ کا عہد خلافت تھا۔ تدفین مدینے میں ہوئی۔ آپ بے حد صاف دل اور حق گو تھیں۔ مزاج میں تواضع اور انکسار تھا۔ ہمدردی و غم گساری آپ کا شعار تھا۔ عفو و درگزر سے کام لیتی تھیں اور لطف و نرمی سے پیش آتی تھیں۔

جب انتقال کا وقت قریب آیا تو سب سے معافی مانگی۔ حضرت عائشہؓ سے کہا "عائشہ! مجھ میں اور تم میں سوکنوں کا تعلق تھا۔ مجھ سے اگر کوئی لغزش ہوئی ہو تو تم مجھے معاف کر دو اور میرے حق میں دعائے مغفرت کرو۔"

حضرت عائشہؓ یہ سن کر آبدیدہ ہو گئیں اور بولیں "اے ام حبیبہؓ! آپ نے مجھے خوش کیا۔ اللہ آپ کو خوش کرے۔"

حضرت ام حبیبہؓ بڑی خدا رسیدہ خاتون تھیں۔ تقویٰ و زہد میں آپ کا بڑا مرتبہ تھا۔ آپ کی قبر کے بارے میں ایک روایت یہ مشہور ہے کہ امام زین العابدینؒ نے اپنے مکان کا ایک گوشہ کھدوایا تو ایک کتبہ نکلا جس میں یہ تحریر رقم تھی۔

"یہ رملہ بنت صخر کی قبر ہے۔"

جشن آمین سلونوی و نسیم انہونوی کے موقع پر

عالیجناب جسٹس مرزا مرتضیٰ حسین کی افتتاحی تقریر

بتاریخ ۸ رجون سنہ ۱۹۸۱ء

اس ذی علم محفل علم و ادب کے محترم صدر
اور
ادب فہم و ادب شناس حاضرین

فلکِ ادب و صحافت کے دو درخشندہ ستاروں کا ایک ہی جشن دیکھکر مجھے برادرم عمر انصاری صاحب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔ انھوں نے تو پتہ نہیں کس پس منظر میں کہا تھا مگر مجھے اس وقت بڑے کام کا لگا۔ فرماتے ہیں ؎

ہو گیا کافر اسی دن سے عمر
مل گئے تھے صاحبِ ایمان دو

اگر دو صاحبان ایمان سے مڈبھیڑ عمر صاحب کے ایسے شاعر متشرع کو کفر کی راہ دکھا سکتی ہے تو پھر یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ دو ادیبوں، صحافیوں اور فنکاروں سے بیک وقت سابقہ اس تقریب کے افتتاحی مقرر کو کہاں سے کہاں بھٹکا سکتا ہے۔

شاعر اور فنکار۔ صحافی اور ادیب۔ فرمانروائے مملکت نظم اور سربراہ سلطنت نثر دیکھئے میں مختلف کردار نظر آتے ہیں لیکن اگر صحیح راہوں پر ہیں تو یہ ایک ہی کردار یا پیکر کے مختلف رُخ ہیں۔ اس پیکر کی روح کو آدم گری کہئے یا انسان سازی۔ اخلاق نوازی کہئے یا روح پروری۔ تعمیر معاشرہ کہئے یا سماج کی درستی۔

منشاء علم و ادب اور فکر و فن کا یہی ہے کہ اشرف المخلوقات کا عالم قول اور اعمال اعتبار سے وہی مقام شرف پائے جس کا وہ مستحق ہے۔

جس طرح ایک ماہر نفسیات علم اپنے معمار ہاتھوں سے شاگردوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کی پرورش کرتا ہے اسی طرح ایک شاعر اور فنکار ہمارے سازوں کے [illegible] سوتے ہوئے انسان کو جگا

ڈاکٹر ولی الحق انصاری نے بڑے پر اعتماد لہجے میں اور بہت صحیح ارشاد فرمایا ہے۔

غیرتِ رشک جناں، بن نہیں سکتا جہاں
خامۂ شاعر بغیر۔ تیشۂ مزدور بنا

جس طرح کوئی عمارت مزدور کے پھاوڑے کی جنبشوں کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچ سکتی اسی طرح ہماری دنیا کارخانۂ "ممکن نیکون" کی صنعت بے نظیر سے ٹکر لینے والی نہیں بن سکتی جب تک ادیبوں کی ذہنی کاوشیں اور شاعروں کے قلم کی گردشیں اسکی نوک سنوارنے میں مدد نہ دیں۔

ریاکاری کو مذہب کا روپ دینے والوں کو ہم نے بہت کچھ دیکھا۔ بازیگران سیاست کو بھی بار بار پرکھ کے دیکھا۔ کسی نے ہم کو دیر سے ٹکرایا۔ کسی نے بھولے بھالے انسانوں کو شعبدہ و دستار کی [illegible] میں الجھایا۔ کسی نے غیرتِ قومی کا سفینہ ذات۔ پات۔ زبان اور علاقے کی دلدلوں میں پھنسایا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

اب آدمی کی بستی کو ڈھونڈھ کچھ نہ پوچھ
انسان بن گیا مگر انسان نہ ہو سکا

آج انسانیت کی کشتی ذاتی منفعتوں اور وقتی مصلحتوں کے بھنور میں ڈگمگا رہی ہے۔ اس کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے احساس فرائض کے بادبان اور خلوص و محبت۔ انسان دوستی اور خدا ترسی کے پتوار چاہئے ہیں۔ یہ سہارے وہی دے سکتا ہے جس کا دین انسانیت اور مذہب محبت ہو۔ جو اپنی ہستی مٹا کر دوسروں کو زندگی بانٹ سکے جس کا دل قسم انسان کے تقدس [illegible] کر گنجینہ بن چکا ہو جس کا [illegible] سینہ ضمیر [illegible] بشری کی خاطر اپنے ذہن کا سکون دل کا چین [illegible] کر سکے۔ کوئی بتائے کہ شاعر اور ادیب کے علاوہ وہ دل، جگر وہ کس کے پاس ہے۔

کی بجائے صفات کو انسان بنانے کے لئے۔ آدمی کو مقام آدمیت سے پھر سے روشناس کرانے کے لئے بالغ نظر ادیب اور شعور آدمیت رکھنے والے شاعر چاہیئے ہیں، جو انسانی دماغ وضع کریں۔ انسانی دل بنائیں۔

یہ تو صحیح ہے کہ ؎

خرد زنجیر پہناتی رہے گی
جو دیوانے ہیں دیوانے رہیں گے

پھر بھی فرزانوں کا کام ہے کہ دیوانوں کو راہ دکھاتے رہیں۔

ہم سب کے لئے بڑی مسرت کی بات ہے کہ آج کی شام ہم یہاں ایسے ہی دو فرزانوں کی فرزانگی سراہنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک مشرق کی تہذیبی روایتوں اور لکھنوی تمدن کی ثقافتوں کا "امین" ہے تو دوسرا نہ صرف ان روایتوں اور ثقافتوں کا پرستار بلکہ انھیں بانند "نسیم" سطر بیز ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے کا ذمہ دار ہے۔

پیدائشی اعتبار سے امین صاحب اور نسیم صاحب ضلع رائے بریلی کے مختلف قصبات سے وابستہ ہیں۔ ان کو اپنی یہ وابستگی اتنی عزیز ہے کہ انھوں نے اپنے قصبوں کو اپنے نام کا جزو بنا لیا ہے۔

اگر آپ امین صاحب کا نام لئے بغیر سلونوی کہہ دیجئے اور نسیم صاحب کو نام دیئے بغیر انہونوی کہیئے تو شناسا نظریں علی الترتیب ان کی طرف مڑ جائے گی۔

اس پیدائشی دیہاتیت کے باوجود آج یہ دونوں حضرات رفتار و گفتار۔ تہذیب و شائستگی۔ اخلاق و رواداری کے اعتبار سے بالکل لکھنوی لگتے ہیں جس کا ظاہری سبب یہ ہے کہ امین صاحب اس وقت لکھنؤ آئے جب ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور نسیم صاحب یہاں گہوارے پر لائے گئے۔ دونوں لکھنؤ کی آغوش میں پل اور بڑھ کر یہاں کی فضا میں ایسا رچ گئے کہ سلون اور انہونہ کے مستقل لیبلوں کے باوجود آج یہ دونوں بھرپور لکھنوی ہیں۔

امین صاحب ایک بیباک صحافی۔ بدلہ سنج ادیب اور فرض شناس شاعر ہیں۔ ان کی صحافتی کاوش اور ادبیانہ فکر وقف رہی ہے ایسے آدرش سماج اور مثالیہ معاشرے کی تشکیل کے لئے جو اعلیٰ تصورات کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو اور انسان دوستی۔ عزم و حوصلے اور فرد کی ذریع بشر کا مظہر جس کے خد و خال ہوں۔

امین صاحب کی ایک بہت پرانی غزل کے اشعار سنئے جو ان کے خیالات کے آئینے ہیں ؎

میرے سجدوں سے ادا ہوگا یہ کردار ابھی
تجھ کو کعبہ بھی بنانا ہے در یار ابھی

زندگی یوں تو نظر آتی ہے دشوار ابھی
ہے مرے ضبط کا لیکن وہی معیار ابھی

جرأت سنت منصور ہے کس کے دل میں
منتظر کس کے لئے ہیں رسن و دار ابھی

قدر انساں کی نہیں خود ابھی انسانوں کو
ستم و جور کا کچھ گرم ہے بازار ابھی

تشنگی دل کی بجھا میرے لہو سے ساقی
تیرے میخانے میں پیاسے ہو ہیں میخوار ابھی

ایک ہی غزل کے چند شعروں میں کسی شاعر کے پورے مشن کا جگمگا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو بس یہی دھن ہے۔

کچھ مشاہدات ذاتی کی بنا پر اور کچھ "بیوی کے لیکچروں" کے طفیل میں امین صاحب نے دنیا کے "جہنمی" پہلو دیکھے ہیں۔ اس جہنم کو جنت بنانے کے لئے ان کا شاعرانہ عقیدہ ہے۔

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

نسیم صاحب پابند عروض و قوافی شاعر تو نہیں لیکن اگر جذبات دل کا بیساختہ اظہار۔ حسن ادا۔ فکر و نظر کی بلندی۔ گرد و پیش کے حالات کا مشاہدہ۔ سماج کی نباضی اور اپنی دھن میں مستی بھی "لوازمات شاعری" ہیں تو نسیم صاحب اصطلاحی شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی مکمل شاعر ہیں۔

جب کبھی اردو ادب کی اشاعت کی بات آتی ہے تو نظر خود بخود آنجہانی منشی نول کشور پر پڑتی ہے جن کی ادب دوستی کے آگے ہر محب اردو کا سر نیاز خم ہو جاتا ہے لیکن کیا کروں کہ جب ان کی اور نسیم صاحب کی اشاعتی خدمتیں مالی مشکلات اور ماحول کی ناسازگاری کی ترازو پر تولتا ہوں تو ہلکے پھلکے جسم کے باوجود نسیم صاحب بہت بھاری بھرکم نظر آتے ہیں۔ کسی سرمایہ دار کی تجوری یا حکومت کی اعانت کے بغیر محض اپنے ہاتھ پیر کے بل پر پچاس سال کے اندر نسیم بکڈپو سے مختلف موضوعات پر اندازاً ایک ہزار اردو کتابیں چھپوا دینا نسیم صاحب کا وہ زریں کارنامہ ہے جو ہمیشہ تاریخ ادب کی پیشانی کا جھومر بنا رہے گا۔

نسیم صاحب کی بحیثیت صحافی کامیابی کے دو زندہ گواہ "سر پنچ" اور "حریم" ہیں جن کی عمریں نصف صدی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ میں "انکشاف" اور "کلیاں" نامی ماہناموں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں کیونکہ وہ ناموافق حالات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اب ان کی صرف یاد باقی ہے۔

صفحات کے اعتبار سے "سر پنچ" ہمیشہ اختصار کو اپنائے رہا لیکن اس کا کوئی شمارہ ایسا نہ ملے گا جس کے دامن میں علمی جواہر ریزے اور ادبی گلہائے رنگا رنگ نہ ہوں۔

"حریم" نے ہمیشہ اس مہذب اور امن و سلامتی کے ضامن انسانی معاشرے کی تعمیر کے لئے سعی کی جس پر خوف الٰہی کا پہرہ اور تعلیمات اسلامی کی گرفت ہو۔ آیات قرآنی کی تفسیر۔ احادیث نبوی کی تشریح۔ بزرگانِ دین کے ارشادات اور سبق آموز حکایات حریم کے صفحات کو جگمگاتے رہتے ہیں۔ اس کے وہ اداریے جو نسیم صاحب "لمعات" کے عنوان سے سپرد قلم کرتے رہے ہیں بتائیں گے کہ ان کی نظر میں ادب کا اہم مقصد آدم گری ہے۔ ان کی نگاہ پاک بیں طبقۂ نسواں کو حدودِ شرعی میں رہ کر عہد جدید کی لذتوں سے ہم کنار دیکھنا چاہتی ہے۔

انھیں "لمعات" میں نسیم صاحب "پردہ" کے محاذ پر جاری ہوئی لڑائی برابر لڑتے رہے۔ کبھی ہار نہیں مانی۔ ان کی تسکین خاطر کے لئے میں ان کی خدمت میں سید نواب صاحب افسر کا ایک شعر پیش کئے دیتا ہوں ؎

بدلے ہوئے عالم سے پریشان نہ ہو اے دل
بدلا ہوا عالم بھی بدلنے کے لئے ہے

ناول نگاری نسیم صاحب کی ادبی صلاحیتوں کا مخصوص میدان ہے۔ انھوں نے اس دشت کی بادیہ پیمائی قریب ۵۰ سال قبل "طرز زندگی" نام کی ناول سے شروع کی اور ان کے قدم راہ میں ۲۳ ہنگامے سیل ابھارتے ہوئے فی الحال چھبیسویں ناول "آخری تمنا" پہ ٹھہر گئے ہیں۔ میں نے ان کے بہت سے ناول دیکھے ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے ان کی ایک ناول "[illegible]" کے بارہ میں اپنے تاثرات ایک خط کی صورت میں مکرم نسیم صاحب کو بھیجے تھے۔ انھیں نے اس خط کی اتنی قدر کی کہ کئی مرتبہ اسے "سر پنچ" میں شائع کیا۔

[illegible] ہوں کہ نسیم صاحب نے اپنی ناول میں خالص مشرقی کلچر کی عکاسی اور اعلیٰ اقدار انسانی کی پاسبانی کی ہے۔ مجموعی حیثیت سے ہر ناول سماجی اصلاح کی سمت میں ایک ٹھوس قدم ہے کسی میں ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کا سا لب و لہجہ ہے تو کسی میں علامہ راشد الخیری مرحوم کا ساز و قلم۔

بحیثیت انسان امین صاحب اور نسیم صاحب اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ امین صاحب سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۲۰ء یا سنہ ۱۹۲۱ء میں فتح گڑھ کے ایک مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ نسیم صاحب کی خدمت میں مجھے ۲۵ سال سے نیاز حاصل ہے۔

امین صاحب وطن پرستی کے جذبات سے مملو اور انسان دوستی سے بھرے دل کے مالک ہیں۔

نسیم صاحب کو قدرت کے فیاض ہاتھوں نے حساس ذہن۔ وسیع قلب۔ نگاہ فسوں نگیں اور سخن دلنواز کی دولتوں سے نوازا ہے۔ انھوں نے بھی ان بخششوں کو ایسا سنبھال کے رکھا کر خود سرتا پا خلوص و محبت کا پیکر بن گئے۔

یہ بات بھی لطف کی ہے کہ "امین" اور "نسیم" میں تین۔ ی۔ م حروف مشترک ہیں اس کے باوجود "نیم" کی سی ہلکی سی بھی کڑواہٹ مجھے ان کے مزاجوں میں نظر نہ آئی۔ آپ حضرات میں سے کسی کو کوئی تلخ تجربہ ہو تو میں نہیں جانتا۔

اس جشن کے موقع پر میں امین صاحب اور نسیم صاحب کی خدمت میں پر خلوص ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور اس تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ ان دونوں کا سایہ عرصۂ دراز تک ادب دوستوں کے سر پر قائم رہے اور اردو کے صالح ادب کی جھولی ان کی شعری۔ ادبی اور صحافتی کاوشوں سے بھرتی رہے۔

جسٹس مرتضیٰ حسین

شرابی کی شریک حیات

رونق دکنی سیمابی

یہ نظم ترقی پسندانہ ہے، لیکن معنی و مطلب سے خالی نہیں اس لئے اسے شائع کر رہا ہوں۔ مجھے ہمدردی ہے ان بہنوں سے جن کو بدقسمتی سے شرابی شوہر مل جاتے ہیں۔ نسیم انہونوی

باپ جس شخص کے ہاں، تو نے مرا ہاتھ دیا
یہ سمجھ کر کہ بڑا کام کیا ہے تو نے
اپنے ساجن کے گھر راج کرے گی بیٹی
فرض سے تم تو سبکدوش بہر حال ہوئیں
ساعتیں میرے لئے جینے کا جنجال ہوئیں

ہیں یہ انجینیر اور فن میں بڑے لائق بھی
اچھی صحبت کے ہیں یہ شائق بھی
تمہیں معلوم نہ تھا یہ شاید
ہیں شرابی بھی۔ کہوں کیا کہ ہیں، نالائق

رات کا کھانا خدا جانے کہاں کھاتے ہیں
بیشتر نشہ میں دھت، رات گئے آتے ہیں
لڑکھڑاتے ہوئے آتے ہیں تو زن کھوئے
میں سنبھالا انہیں دیتی ہوں چوکے بڑھ کے
بھول جاتے ہیں کئی بار کی صورت مری بانہوں میں
اور میں ان کو لئے فرش پہ گر پڑتی ہوں

[illegible] جاتے ہیں وہ اک شور مچا دیتے ہیں
[illegible] ...... جو... پانی ... میں نے
[illegible] یہ شور شرابا کیا۔

تھا آصف و مجھے پاکے بغل میں اپنے
ادھر اس شور شرابے سے بلک اٹھتا ہے، جاگ اٹھتا ہے

اور ادھر
بڑبڑاتے ہوئے کچھ زیر لب
اٹھنے لگتے ہیں تو دیتی ہوں سہارا ان کو
اور ہو جاتی ہے قے، اور سب آلائش سے
میرے کپڑوں کو بھگو دیتی ہے
فرش پر چاروں طرف گندگی اور سراند
پھیل جاتی ہے کچھ اس طرح کہ اف!
جس کی بدبو سے پھٹا جاتا ہے ذہن اور دماغ

بے بسی پر مرے آنسو جو نکل آتے ہیں
دیدنی ہوتا ہے عالم میری تنہائی کا

[illegible]

دوزخ

عفت موہانی

حسب معمول طوفانی صبح ہوئی۔ اور اماں نے اپنے کان بند کر لئے۔ روز روز کی مصیبت سے وہ بھی تنگ آگئی تھیں۔ سمجھا بجھا کے نوید کو راہ راست پر لائی تھیں۔ بھئی اپنی جانی بوجھی لڑکی تھی۔ صورت اور سیرت کی بھی سن اتری نہ تھی۔ اماں کو تو بس اس کی سیرت ہی پسند تھی۔ خاموش اتنی کہ جیسے بولنا نہ جانے۔ کبھی برا بھلا کہو ایک نظر دیکھے گی، اور سر جھکا کر اپنے کام میں لگ جائے گی۔ ماں باپ تھے نہیں۔ اماں تو یہی کہتی تھیں کہ جب ایئر کریشنگ میں طیارہ تباہ ہوا اور ماں باپ کی خستہ و خراب لاشیں سامنے آئیں تبھی سے اسے سکتہ سا تھا۔ اماں کو اس پر بے حد ترس آتا تھا! اسے اپنے پاس لے آئی تھیں۔ لکھی پڑھی تو وہ پہلے سے تھی۔ اماں نے تربیت دی اور اپنے اکلوتے فرزند رشید کے لئے منتخب کر لیا۔ انہیں دھیان ہی نہ تھا کہ صاحبزادے اس بے زبان مخلوق کو پسند نہیں فرماتے بلکہ گھر کے پالتو جانور کی حیثیت دیتے ہیں۔ اماں کا خیال تھا کہ شتر بے مہار بیٹا شاید مہار پڑنے کے بعد سیدھی راہ پر آجائے گا! اور اس کے پرزور احتجاج کے باوجود سنکھیا کھا لینے کی دھمکی دے کر بالآخر ثروت کو اپنی بہو بنا ہی لیا تھا۔ اور بس اس کے بعد سے گھر کی خاموش فضا میں دھماکے شروع ہو گئے۔

نوید بدستور لاپرواہ اور اکھڑ بنا رہا۔ اس کے دل میں رحم و مروت کا گزر ہی نہ تھا۔ نہ ہی اسے یہ خیال تھا کہ بیوہ ماں کی دلشکنی کر رہا ہے۔ وہ ماں کو جلانے کے لئے بیوی کو ستاتا، اسے دکھ دیتا اور بڑی خوشی محسوس کرتا۔

صبح ہوتے ہی گھر میں آفت آجاتی۔

"غسل کرنے کا پانی اتنا گرم ہے۔ کیا چاہتی ہے بدتمیز عورت۔"

[illegible] ثروت چپکے سے کہتی۔ [illegible]

"آخر اس میں اس قدر اودھم مچانے کی کیا ضرورت ہے؟"
اماں کہنے لگتیں: "ملا لو دو چار لوٹے ٹھنڈا پانی۔ حد نہیں ہے بیہودگی کی۔"

"آپ ہی نے اسے سر چڑھا لیا ہے۔" نوید اماں کی طرف گھوم گیا۔ "خواہ مخواہ کی طرفداری ہے۔"

"زبان سیدھی رکھو۔ وہ تمہارے گھر کی لونڈی نہیں ہے۔" اماں کو غصہ آنے لگا۔

ثروت نے منہ پھیر کر آنچل سے آنکھیں صاف کیں اور ٹھنڈے پانی کی بالٹی اٹھائے باورچی خانے سے نکل گئی۔

خدا خدا کر کے نہانے دھونے کا مرحلہ طے ہوا۔ ناشتے پر [illegible] توسوں پر [illegible] جیسے کو بہانہ بنا کر اس نے دل کا غبار نکالا۔ اور خوب اچھی طرح ماں اور بیوی کو رگید کر [illegible] گیا!——

اماں اس قدر شرمندہ رہتی تھیں جیسے سارا قصور انہی کا ہو۔ اپنے تصور سے گھر کو جنت کا نمونہ بنانے کے لئے انھوں نے گھر ہی گھر میں بیٹے کو بیاہا تھا لیکن ان کی خوش رنگ امیدوں کے بالکل خلاف گھر جہنم بن گیا تھا۔ اب وہ پچھتا رہی تھیں۔ کیا ہوتا اگر وہ ثروت کی طرح [illegible] پسند کرتیں اس کی خاموش آہیں ضرور رنگ لا کر رہیں گی۔ اماں کو یہی خوف کھائے جا رہا تھا! انھوں نے چپکے چپکے نوید کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ ایک نہ سنی۔ بلکہ ماں کی [illegible] نصیحتوں پر اس کی سخت گیری زیادہ [illegible] ہو جاتی۔ اپنی ضعیفی اور چھوٹی موٹی دولت کے بھرم پر وہ اماں کی بھی کوئی [illegible] نہ [illegible]۔ ان کی صحت متاثر ہونے لگی۔

ثروت نے انہیں اطمینان دلایا: "جب مجھے کوئی خیال نہیں تو آپ کیوں اثر لیتی ہیں۔ آپ ان سے کچھ کہا ہی نہ کیجئے۔ آپ خاموش ہو جایا کریں گے۔"

"بیٹی میرا کلیجہ داغ داغ کر دیا کمبخت نے۔" اماں کو رونا ہی آگیا: "کیا سوچا تھا کیا ہوا۔ ارے پہلے ایسا نہیں تھا۔ میں تو اس کی کھال کھنچوا دوں گی۔ کسی نے کچھ کر تو نہیں دیا۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں۔ سیدھی چال چلتا نہیں۔ آخر میرا اتنا بڑا کیا دشمن ہے جسے [illegible] آرام سے رہنا اچھا نہیں لگتا۔"

قسمت ہے دشمن اماں۔ قسمت۔ اور کسی کا کیا پڑی ہے۔

"میرا کیا ہے بیٹی۔ آج گھر میں کل گور میں۔ مجھے تو تمہاری فکر کھائے جا رہی ہے۔ میری آنکھیں بند ہوں گی اور نجانے یہ خبیث کیا سلوک کرے تمھارے!"

دل کو تھوڑا سا پتھر بنانا پڑے گا اماں کہ وہ صبر کرنا سیکھ لے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا!"

صبر ہی تو نہیں ہوتا مجھ سے۔ اللہ نے چار بیٹے دیئے ہوتے تو البتہ صبر آ جاتا کہ ایک ناشدنی نکل گیا تو کیا۔ دوسرے تو سعادت مند ہیں۔

تو اس طرح مت سوچا کیجئے اماں۔ آپ کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ مجھے آپ ہی کا سہارا ہے آپ کو میرے لئے زندہ رہنا ہے"

اماں آہیں بھرنے لگیں۔

ثروت اٹھ گئی"۔ میں کھانا دیکھ لوں۔

شام کو نوید آیا۔ منہ کھنچا ہوا۔ تیوری پر شکنیں۔ آنکھیں سرخ۔ اماں نے لعنت بھیجی، اور ثروت جلدی سے چائے بنانے کچن میں آ گئی۔

کپڑے کہاں ہیں؟" وہ اپنے کمرے سے گرجا۔

دھوبی کو ڈال دیئے" اماں کو طرارہ آ گیا۔

دوسرے کیوں نہیں نکالے؟"

یہ تو مجھ سے پوچھا ہے!"

آپ ہی نے نصیحت کی ہوتی۔

تیرے ہی ہاتھ کرن سے ٹوٹ گئے ہیں۔ نکال لے!"

میرا دماغ خراب ہوا جا رہا ہے۔ اب اس گھر میں میرا گزر مشکل سے ہوگا" نوید بولا۔

دفع ہو جا۔ جہاں تیرا دل چاہے منہ کالا کرے" اماں تو آتش فشاں کی طرح پھٹ ہی پڑیں" اب ہمارا گزر بھی تیرے ساتھ مشکل ہے۔ کمینے ذلیل نے اپنی دوکوڑی کی باتوں سے کلیجے میں ناسور ڈال دیئے ہیں۔ کسی طرح حضرت صاحب کا منہ سیدھا ہی نہیں ہوتا۔ نجانے خود کو سمجھے کیا ہے۔ اللہ تیرے باپ کے مرنے کے بعد میرا رزق بند نہیں ہوا تو تیرے جانے کے بعد کون سی ہماری تقدیریں چھین کر لے جائے گا۔ اچھا ہے تو [illegible] خوش!"

تو آپ یہی چاہتی ہیں؟" نوید کپڑے بدل کر کمرے سے نکلا اور کرسی پر آ بیٹھا۔

اب تو یہی چاہتی ہوں" اماں نے منہ پھیر لیا۔

آپ یہ نہیں سوچتیں کہ میرا ناطقہ بند ہے تو کیوں ہے؟"۔

کیوں ہے؟"۔

آپ نے ایک عذاب منڈھ دیا ہے میرے سر پر—!

اور تم ایک عذاب بن کر مجھ پر مسلط ہو گئے ہو۔

کوئی ایسی تدبیر سوچئے کہ ہم آپ دونوں مشترکہ عذاب سے نجات حاصل کریں۔

تمہیں اجازت ہے نوید۔ لیکن میں جیتے جی کوئی ایسا کام کرنا نہیں چاہتی جو میری عاقبت برباد کر دے۔ جسے تم عذاب کہہ رہے ہو۔ وہ خدا کا انعام ہے۔ ایسی مثالی سیرت کی بیوی ہر کسی کو نہیں ملتی۔ وہ بے زبان مشین ہے۔ چپ چاپ سر جھکائے تمہارا اور گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ تمہاری خدمت اس کا ایمان ہے۔ اور —

آدمی بس خدمت ہی سے مطمئن نہیں ہو جاتا اماں" نوید نے جواب دیا" آپ کو شاید نہیں معلوم کہ میں کیسی بیوی چاہتا تھا۔ اماں۔ کیا ایک انسان صرف مشین ہی کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔؟ میں آپ سے کہے دیتا ہوں کہ مجھے کسی کی خدمت کی بھی ضرورت نہیں۔ میں ہاتھ پاؤں سے معذور نہیں ہوں۔ بیمار بھی نہیں ہوں اور نہ بوڑھا ہوں میں اپنے سارے کام اپنے ہاتھ سے کر سکتا ہوں۔ مجھے بس۔ ایسی عورت —————!"

بولو۔ رک کیوں گئے۔؟"

جو گھر کی زندگی میں نہ سہی۔ باہر کی زندگی میں میرا ساتھ دے سکے۔ جو میرے ایجوکیٹڈ فیشن ایبل اور ترقی پسند دوست احباب سے بے تکلف ہو کر مل جل سکے۔ میرے ساتھ تفریح میں شریک ہو۔ کلبوں میں جا سکے، میرے دوستوں کی مہذب اور کلچرڈ بیویوں کے ساتھ قہقہے لگا سکے، انگریزی بولے، اور نائٹ لباس پہن کے رات کے کلبوں میں رقص کر سکے۔ جھینپے یا شرمائے نہیں!"

اماں یوں منہ کھولے آنکھیں پھاڑے نوید کو تک رہی تھیں۔ جیسے انھیں شک ہو کہ وہ صحیح الدماغ نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی زبان سے اپنی بہو کی مدافعت یا نوید کی مخالفت میں ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

بیوی وہ ہوتی ہے جو شوہر کے احکام کی تعمیل کو اپنا ایمان اور خوشنودی سمجھتی ہے۔ بیوی وہ ہوتی ہے۔ جو شوہر کی ہم دل ہمدم اور ہم دماغ ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ رہ کر جس کے ساتھ [illegible] گزار زندگی

کے کچھ گنے ہوئے لمحات کو خوشگوار بنایا جاتا ہے۔ بیوی وہ نہیں ہوتی اماں، جو صرف کھانا پکا کے سامنے رکھ دیتی ہے اور جوتوں پر پالش کر دیتا ہے یہ کام تو گھر کے ملازم بھی کر سکتے ہیں۔ تو پھر ایسی بیوی کو خواہ مخواہ سر پر منڈھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے! ؟"

یہ کیڑے کب بھرے دماغ میں۔ پہلے تو تم اچھے خاصے تھے" اماں نے حیرت سے پوچھا

آپ کی دنیا بس یہ چہار دیواری ہے" نوید نے بڑی حقارت سے کہا" آپ کیا جانیں۔ باہر کی دنیا کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہے۔ آپ ایک چکر بھی تفریح گاہوں اور نائٹ کلبوں کا لگا لیں تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں اور آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ زندگی محض ڈیڑھ سر پر کس کے جانماز پر بیٹھ جانے کا نام نہیں ہے"

اپنی زبان سے جتنی چاہے غلاظت جھاڑو۔ مگر خبردار اس گندی زبان سے میری نماز کا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا" اماں نے نہایت سرد لہجے اور دو ٹوک انداز میں کہا" اور اب میری بھی سن لو کہ چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے مگر ثروت کو میں اجازت نہ دوں گی کہ وہ تمہارے مرد دوستوں کے ساتھ مل کے ناچے۔ سمجھ گئے۔ اس کے بعد جو تمہارا دل چاہے وہ کرو"

یہ آپ کا قطعی آخری فیصلہ ہے ؟۔

بالکل آخری ۔!

آپ نے ثروت سے بھی پوچھا ؟۔

میں اس کی بزرگ ہوں۔ اس کے سامنے یہ خرافات نہیں بک سکتی۔

تم اس کے شوہر ہو۔ ہماری خدا کا ماشاء اللہ درجہ حاصل ہے۔ پوچھ دیکھو!

اگر وہ نہ مانے۔ تب ؟۔

تب۔ اس کی مرضی ؟۔

تو پھر اس گھر میں وہ کون سے حق سے رہے گی!۔

تمہاری بیوی بے شک نہ رہے گی۔ میرے مرحوم بھائی بہاور کی بچی ہے۔ میرے پاس رہے گی۔ تب اس پر تمہارا کوئی حق نہ ہوگا!"

بہت اچھا۔ آپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب میں کل آپ کو اپنا فیصلہ بھی سنا دوں گا"

ثروت نے ماں بیٹے کی ساری گفتگو سنی تھی۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ اسے نوید پر تعجب تھا۔ بیٹھے بٹھائے اسے کون سے شیطان نے انگلی دکھائی تھی ؟۔ اب وہ کیا کرے ؟۔

اماں نے اپنے سر کے گرد رومال کس لیا اور تکیہ پر گر گرا پڑیں۔ ثروت کچن کی دہلیز پر کھڑی رہی۔ نوید اپنے کمرے میں کھٹ پٹ کر رہا تھا۔

ملازم نے رات کا کھانا میز پر لگا دیا اور اجازت لے کر چلا گیا تب ثروت اماں کے پاس آئی۔ انھوں نے اس کی پژمردہ شکل دیکھی۔ اور آہ بھر کر بولیں "میری طبیعت اچھی نہیں بیٹی۔ تو کھالے"

" چائے لے آؤں۔ اماں "

ابھی نہیں میری بیٹی۔ جب سونے جانا۔ تب دے دینا!"

نوید کو لانا ایک اہم سر کرنا تھا۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ نجانے اسے کیا کیا سننا اور سہنا پڑے گا۔ پھر اس نے دل مضبوط کیا۔ آخر وہ کیوں ڈرتی ہے ؟۔ ترکی بہ ترکی کیا گناہ اس کا ؟۔ اس بزدلی ہی نے یہ دکھایا ہے اسے۔ مزید یہ تباہی لائے گی۔! وہ دل کڑا کر کے کمرے میں آ گئی اور یہ سوچا کہ ہر چہ بادا باد ــــ یا ادھر یا ادھر ــ تنگ آمد بجنگ آمد۔

نوید الماری کے پاس کھڑا کچھ کر رہا تھا۔ آہٹ سن کر مڑا اس کے چہرے پر تنفر کے سائے لہراتے ثروت سے پوشیدہ نہ رہے۔ اس کا دل دھڑکا۔ لیکن اس نے ضبط کر کے کہا۔

" چل کے کھانا کھا لیجئے "

مہربانی۔

کس بات کی ؟

تم نے میری اور اماں کی گفتگو تو سنی ہوگی ؟

سنی تھی!۔

میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔

آپ نے تو اماں کو کل تک کی مہلت دی تھی!

میں جاننا چاہتا ہوں جو اماں کا جواب ہوگا

کیا ہوگا ؟"

نوید کو اس کے جواب دیئے جانے پر حیرت ہوئی۔ لیکن وہ اس کا اظہار کیے بغیر بولا" وہ نہیں اس کی اجازت نہیں دیں گی جو میں تم سے چاہتا ہوں۔

اماں اجازت دے بھی دیں تو میں وہ سب کچھ نہیں کر سکوں گی جو آپ چاہتے ہیں!۔

اچھا ؟!" نوید کی آنکھیں شرربار ہونے لگیں۔

[illegible] جانے کے لئے تیار تھی۔
[illegible] لیا۔
[illegible] اسے دیکھا۔ اسے بھی غصہ آگیا تھا۔
[illegible] بھی خود کو میری بیوی سمجھتی ہو ؟۔
[illegible] کر رہی ہوں ؟ ”
[illegible] !۔
[illegible] جاؤ۔ آج سے تم آزاد ہو“
[illegible] کو حیرت و تعجب کا جھٹکا سا لگا مگر وہ سوچ چکی تھی کہ [illegible] پھر اس کی زبان سے ضرور نکلیں گے ۔ وہ خاموش [illegible] ۔
[illegible] کر اماں پر اختلاج قلب کا دورہ پڑا۔ وہ یہ صدمہ برداشت [illegible] !۔ فروت گھر کی ملازمہ سے یہ کہکر چلی گئی تھی کہ وہ اپنے [illegible] کے پاس جارہی ہے۔ ؟ اب اسس کا اسس گھر میں [illegible] نہیں تھا !۔ اماں کی تدفین کے بعد نوید گھر آیا۔ تو اسے یوں [illegible] تھا جیسے دوسرا دورہ خود اس پر پڑے گا۔
[illegible] کھانا یوں کا توں میز پر رکھا تھا۔ گھر میں ہوائیں سیٹیاں [illegible] رہی تھیں !۔ وہ بے سدھ ہو کر بستر پر گرا۔ مگر وہ یہ کرنے سے [illegible] جا کر اس پر کون سے جذبے حاوی تھے ۔ اپنے چھٹکارے کی مسرت [illegible] سے علیحدگی کی ملامت، اماں کی رحلت ۔ ؟ وہ نجانے کیا کچھ [illegible] رہا تھا اور پھر بھی اس کا دماغ خالی تھا !۔

مس فوزیہ اشتہار کا ذہن کرکیا آئیں کہ پیدا ہوتی نگرانی لے کے [illegible] تھا۔ ہر ایک خود کو جاذب توجہ بنانے کے لئے تیاری کرنے لگا مگر [illegible] کی نظر انتخاب مسٹر نوید پر پڑی تھی۔ وہ مردکی قدر دانی، اسمارٹنس اور مہذب مسم [illegible] کھل لینے اور دینے دونوں کے گر بخوبی معلوم تھے ۔ اس نے چھپکے [illegible] لگا لیا تھا۔ اس کا لڑکے کے پاس خاصی دولت تھی۔ معقول [illegible] پاتا تھا۔ اتنا بڑا سجا سجایا مکان تھا۔ اور بیوی غائب تھی [illegible] نہیں !۔
[illegible] مچھلی گہرے پانی میں ہاتھ آئی ہے۔ لہذا فوزیہ نے بھی جال [illegible] وہ پھنس گئی۔ ترسے ہوئے بھوکے کے سامنے [illegible] ۔ پاؤ بھی شرمائے اور کسی کا پیٹ بھی بھر گیا !۔

اب یہ گھر آپ کا ہے، محترمہ۔ !“ میرج آفس سے دونوں گھر آئے۔ فوزیہ تو غیر اپنی کامیابی پر پھولی نہ سمارہی تھی۔ لیکن نوید صاحب بھی کچھ بچارے پینس رہے تھے ۔ اماں کی موت کا روح فرسا خیال، مظلوم بیوی کی در بدری یاد تک نہ تھی ۔ گویا یہ ستم رسیدہ ہستیاں ان کی زندگی میں آئی ہی نہ تھیں۔
”کانگریٹس !۔ بڑا شاندار مکان ہے“ فوزیہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔
مگر — !“
ہاں ہاں ۔ بولو۔ مگر کیا ؟“ نوید ریشہ خطمی ہوا جارہا تھا۔
تمہارے ملازم کہاں ہیں ؟“
ارے ۔ میں تو ۔ اکیلا تھا نا ڈارلنگ، ملازم کا روگ نہیں پالا میں نے ۔ ایک آدھ دن سنبھال لو۔ پھر ملازم بھی رکھ لیں گے ۔ !“
کیا ؟“ وہ چیخی ”میں سنبھال لوں۔ واٹ ڈو یو مین ؟۔ کیا میں باورچی خانے کے دھوئیں میں آنکھیں پھوڑوں گی۔ اوہ ۔ نو۔ ڈیئر ہم ملازموں کے بند و بست تک کسی ریسٹورنٹ میں انتظام کرلیں گے۔
” لیکن ملازم جلد ہی تو نہیں مل جائے۔“
اخبار میں ایک اشتہار دے دو۔ درجنوں چلے آئیں گے۔ !۔
نوید نے کان دبا کر ایسا ہی کیا۔ اخبار میں اشتہار نکلے اور بعد از تلاش بسیار دو تین ملازم رکھے گئے ۔ لیکن میاں بیوی دونوں ملازم۔ ملازموں کی نگرانی کون کرتا ؟۔ انجام یہ ہوا کہ آئے دن گھر کی ایک آدھ چیز غائب ہونے لگی ۔ نوید ڈھکے چھپے فوزیہ پر الزام رکھتا ۔ فوزیہ دہاڑ نے لگتی۔
” میں گھر گھسنی بیوی کی طرح گھر میں رہ کر تمہاری چیزوں کی حفاظت نہیں کرسکتی ۔ سنا تم نے “
” اب تک گھڑی، سونے کی نب والا قلم اور میرا قیمتی چشمہ کھو چکا ہے !“
تو میں کیا کروں۔ کیا میں نے چرائی ہیں تمہاری چیزیں “
تم نوکری چھوڑ دو ۔ گھر میں رہا کرو ۔ !“
ہوش میں تو ہو۔ بھلا میں بارہ سو روپئے ماہوار کی نوکری چھوڑ دوں ؟ تمہاری فالتو چیزوں کی خاطر ؟“
تم عورت ہو۔ تمہارا کام ہی ہے شوہر کی چیزوں کی حفاظت [illegible] ان پرانے خیالوں کو اپنے فرسودہ دماغ ہی میں [illegible] میں نہیں سن سکتی۔

تو پھر میں نوکروں کو نکالے دیتا ہوں۔

جھاڑو برتن پکانا رینہ مناسب تھی کو کرنا پڑے گا۔ میں کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔

فوزیہ؟؟

اجی یہ دیدے کسی اور پر نکالنا۔ میں تمہاری ذبیل نہیں۔ تمہارا دیا نہیں کھاتی!"

تم اپنا طرزِ عمل بدلو فوزیہ۔ میں بہت ناقابلِ برداشت باتیں سن رہا ہوں۔ برداشت مت کرو۔ میں جس سوسائٹی کی عادی ہوں۔ اسی میں خوش رہ سکوں گی۔!

کلب جانا۔ ناچنا۔ مردوں کے ساتھ مل کر لمبے لمبے قہقہے لگانا نہیں چھوڑو گی؟"

تم بھی تو عورتوں کے ساتھ مل کر شراب پیتے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ناچتے ہو۔ وہ بھی تو آخر کسی کی ماں بہنیں ہوں گی۔!"

" میں تم سے بحث نہیں کر رہا۔ حکم دیتا ہوں۔ خبردار کوئی آوارہ گردی پھر نہ کرنا"

فوزیہ نے قہقہہ لگایا "مسٹر نوید۔ حکم تو میں نے اپنے باپ کا بھی نہ مانا۔ تم کیا چیز ہو۔ اگر میں تمہاری روپیوں پر پڑی ہوتی تو ضرور ڈر جاتی۔ مگر اب۔۔۔ بالکل نہیں۔ جیسا تم چاہو۔ تمہاری راہ الگ۔ میرا راستہ الگ۔ کیا سمجھے؟"

فوزیہ۔؟"

ہاں ہاں۔ آہستہ آہستہ۔ ہمسائے سنیں گے تو کیا کہیں گے" وہ تمسخرانہ انداز سے بولی "اور میں بھی دل میں کیا کہوں گی۔ ایبسرڈ۔ کیا مرد ہے کبھی۔ سانس لیتا ہے آج کی فضا میں۔ باتیں کرتا ہے۔ پرداداکے وقتوں کی۔ سنو نوید۔ وہ عورت ہی کون سی ہوئی جو ترقی پسند ماحول میں کھپ نہ سکے۔ اش۔ بولڈ بنو ڈیئر۔ ہوش میں آؤ۔ مجھے وہ پہلی بیوی مت سمجھنا جو بقول مسٹر ہاشم کے روتی دھوتی چلی گئی۔ میں جب تک اسی اعلیٰ سوسائٹی پر موڈ نہ کروں گی۔ زندہ نہ رہوں گی۔ میں تمہیں بھی تو منع نہیں کرتی۔ جو جی چاہتا ہے کرتے پھرو"

اس نے نوید کے گال پہ پیار بھرا طمانچہ رسید کیا۔ اور مٹکتی لچکتی گھر سے چلی گئی۔

رہا۔!

شادی کے چار مہینے گزر چکے تھے مگر چار پل کی بھی راحت نہ ملی تھی۔ فوزیہ پر سے ایک خول سا اتر گیا تھا۔ اب کیا ہوگا!۔

رات کے ایک بجے کوئی اجنبی گاڑی اس کے لان پر آ کر رکی کسی مردانہ ہاتھ نے پٹ کھولا۔

فوزیہ بہکا ہوا آنچل سنبھالتی سامنے کی نشست سے اتری۔ اور پھر۔ اس ہاتھ نے فوزیہ کے گال پر اسی طرح پیار بھرا طمانچہ مارا جس طرح اس نے نوید کے مارا تھا۔ دو ملے جلے قہقہے فضا میں گونجے۔ گاڑی چلی گئی۔ فوزیہ اوپر آئی۔

فوزیہ" وہ تن کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

اوہ۔ تم جاگ رہے ہو۔!"

ہاں۔ دیکھ رہا ہوں۔ تم کہاں تک بڑھ گئی ہو۔

فضول بکواس مت کرو۔ تمہاری تنگ نظری سے میں بیزار آ گئی ہوں۔ اگر تمہیں میرا ساتھ منظور نہ ہو تو۔ صبح کو فیصلہ کر لو۔ وہ تم سے بڑا افسر ہے۔ سمجھے۔ مجھ پر لاکھوں خرچ کر چکا ہے۔ تمہاری طرح تنگدل کنجوس اور کم ظرف نہیں ہے!۔

تڑاخ سے ایک تھپڑ فوزیہ کے گال پر پڑا۔ چند لمحے وہ بھونچکا رہ گئی اور پھر اس کا جوابی حملہ بھی بڑا زوردار تھا۔ کرسٹل کا وزنی گلدان اس نے اٹھا کر نوید کے سر پر دے مارا۔ اس کے بعد مسلسل جو چیز ہاتھ لگی اٹھا کر اس پر پھینکی گئی۔ ایش ٹرے، قلمدان، تکیے، گلاس، پیپر ویٹ،

خون کی تلی نوید کی پیشانی سے بہہ نکلی۔!

پولیس کو چڑھا لاؤں گی اگر پھر مجھ پر ہاتھ اٹھایا" وہ زخمی شیرنی بن گئی تھی۔

صبح ہوئی۔ نوید نے طلاق نامہ کے ساتھ گیارہ ہزار روپے کا چیک فوزیہ کو پکڑا دیا اور پھر دیوانہ وار ان بڑے میاں کے گھر کی طرف بھاگا۔ جہاں اس کی دانست میں ثروت مقیم تھی!۔

ثروت۔ ثروت۔ وہ رو رہا تھا۔

دروازہ کھلا۔ ایک معمر مفلس چہرہ جھانک رہا تھا!۔

ثروت۔" وہ گڑگڑا رہا تھا "آپ کے پاس آئی تھی۔ وہ میری بیوی ہے۔ خدا کے لئے بلا دیجئے۔ [illegible]

[illegible] رہا تھا۔ وہ بیٹا ہم [illegible]

[illegible] چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں۔
[illegible] شدت کہاں بیٹے : بڑے میاں نے دکھ سے کہا: یہ میرے پاس
[illegible] ماہ بعد اس نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا اور خود بھی چل بسی۔
[illegible] خیال تھا کہ کوئی ناقابل بیان صدمہ ——— !"
یہ بات نوید نے نہیں سنی۔ اپنے لڑکھڑاتے ہوئے وجود کو سنبھالنے
کی کوشش میں چوکھٹ ہی پر گر پڑا —" !

عجائبات افریقہ پر

مظہر الحق علوی

کا ترجمہ کیا ہوا ایک اور شاہکار
جس کے مصنف
دنیا کے مشہور اڈونچرس ناولوں کے خالق
رائیڈر ہیگرڈ ہیں
عجیب و غریب، سنسنی خیز اور حیرت انگیز حالات و
واقعات سے پر ایک ناول

زکالی

جسے
شروع کرنے کے بعد آپ ختم کئے بغیر چین نہ پا سکیں
گی ——— یہ مشہور ساحرہ زکالی اور رائیڈر ہیگرڈ
کے ہر دل عزیز کردار کوا ٹرمین پر
مبنی ایسا ناول ہے جس کے واقعات آپ کو عرصہ تک یاد رہیں گے۔
آج ہی آرڈر دے کر طلب فرمائیں کاغذ کی گرانی کے باعث
ناول کم تعداد میں چھپوایا گیا ہے۔
قیمت مجلد بیس روپیہ

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں جواب طلب
امور کے لئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ روانہ کریں ———

ضروری باتیں

- بجلی کی قلت اور پریس کی دشواریوں کے تحت کوشش کے باوجود حریم اکثر تاخیر سے شائع ہوتا ہے اس لئے اب حریمی بہنیں ۲۵ر تاریخ تک پرچہ نہ ملنے کی صورت میں شکایت لکھیں۔ اب تک شکایت کرنے کی تاریخ ۲۰ر کے بعد ہوا کرتی تھی۔
- اگر آپ کا پتہ تبدیل ہوا ہو تو اس کی اطلاع اس طرح روانہ فرمائیں کہ ۳۰ر تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جائے۔
- اگر آپ سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ فرمانا چاہتی ہیں تو اس طرح روانہ فرمائیں کہ پہلی تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔
- اگر آپ کسی بھی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔
- اگر آپ حریم میں اشاعت کے لئے کوئی مضمون روانہ فرمانا چاہتی ہوں تو اس پر اپنا نمبر خریداری ضرور تحریر فرمائیں۔ اگر مضمون نہ شائع ہو سکے اور آپ اسے واپس منگانا چاہتی ہوں تو مضمون کے ساتھ ہی واپسی کے لئے ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ناپسندیدگی کی صورت میں مضمون تلف کر دیا جائے۔ نمبر خریداری درج نہ ہونے کی صورت میں مضمون پر غور نہیں کیا جاتا۔
- اپنا نمبر خریداری جو ہر اس کاغذ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے جسمیں لپیٹ کر حریم روانہ کیا جاتا ہے۔ اس نمبر کو حفاظت سے رکھیں اور ہر خط میں اسے لکھنا نہ بھولیں۔ نمبر خریداری کے بغیر کسی خط کا یتوں پر غور نہیں کیا جاتا۔

جشن امین سلونوی و نسیم انہونوی

کے سلسلہ میں عفت موہانی صاحبہ نے بھی ایک مضمون روانہ فرمایا تھا، جسے بیگم نسیم اقتدار صاحبہ نے جشن کے موقع پر پڑھا تھا۔ یہ مضمون اگست کے حریم میں شائع کیا جائے گا۔ (ادارہ)

کچھ اپنے متعلق

آخر مئی میں یکایک پھر سانس کا دورہ پڑ گیا تھا، لیکن وہ جلد ہی قابو میں آ گیا اور اب میں دفتر آ کار ہتا ہوں۔ کمزوری بہرحال بہت زیادہ ہے اس لئے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ بیشتر دفتری فرائض عزیزی نسیم سلمہا انجام دیتی رہیں۔

حریمی دسترخوان

ونیلا پڈنگ

انگریزی کھانوں میں سویٹ ڈش شاید پڈنگ سے بہتر کوئی نہیں ہوتی۔ اسے ہم سب بھی بیحد پسند کرتے ہیں۔ آئیے آج آپ کو اسے تیار کرنے کی ترکیب بتاتی ہوں۔ پوری توجہ کے ساتھ ترکیب پڑھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ آپ بھی پہلی ہی بار اسے بنا سکتی ہیں۔

اشیا

اچھا دودھ ا کلو۔ ۲۵۰ گرام شکر۔ ۲۵۰ گرام یا کم جیسی شیرینی آپ پسند فرمائیں۔ جو بہنیں ہلکی مٹھاس پسند کرتی ہیں۔ ۲۰۰ گرام ہی شکر استعمال فرمائیں۔ انڈے چار۔ ڈبل روٹی کے سلائس ۵۔ ونیلا ایسنس چار کے دو چمچے مکھن ۵۰ گرام۔

ترکیب :-

دودھ کو اس طرح جوش کریں کہ ا کلو رہ جائے۔ پھر نصف دودھ میں شکر ڈال کر کچھ دیر تک پکائیں۔ نصف نکالے ہوئے دودھ میں جبکہ وہ ٹھنڈا ہو جائے انڈوں کو پھینٹ کر ملالیں اور اچھی طرح ایک جان کرلیں اس کے بعد شکر ملا کر پکائے ہوئے دودھ کو اتار کر تھوڑی دیر رکھ دیں تاکہ اس کی گرمی کم ہو جائے، لیکن بالکل ٹھنڈا ابھی نہ ہونے پائے۔

اب گرم دودھ کو تھوڑا تھوڑا کوئی ٹھنڈے انڈے ملے دودھ میں ڈالتی جائیے اور کوئی ٹھنڈے دودھ کو پھینٹتا رہے تاکہ انڈے کے باعث پھٹکی نہ پڑنے پائے۔

تمام گرم دودھ اسی طرح ملا کر رکھ لیں اور ایسنس ملا دیں۔ اس کے بعد کسی ایسے برتن میں جس کی دیوار ۳-۴ انچ اونچی ہو اور روٹی رکھنے کا المونیم یا ہنڈالیم کا [illegible] ڈبے میں چار کے چمچے شکر کے ڈالیں اور نصف پیالی چار کا پانی ملا کر گیس یا انگیٹھی پر رکھ کر اچھی طرح پکائیں۔ جب تقریباً پانی جل جائے [illegible] میں پھیلا کر پھر گرم کریں، جب شکر اور پانی کا رنگ [illegible] ہو جائے تو برتن کو اتار کر ٹھنڈا کرلیں اور مکھن کو برتن کی [illegible] دیں۔
[illegible] مکھن لگا کر [illegible] برتن کی [illegible] گر [illegible]

اگر اوون نہیں ہے تو ایک ایسی بڑی پتیلی لیں، جو ڈبے سے کافی بڑی ہو۔ پتیلی کے پیندے میں راکھ پھیلائیں۔ اس طرح کی سطح برابر رہے۔ پتیلی کو گیس کے چولہے انگیٹھی یا اسٹوو پر چڑھا دیں، جب راکھ گرم ہو جائے تو دودھ بھرا ڈبہ راکھ پر رکھکر پتیلی کا منہ کسی برتن سے بند کر دیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ڈھکن ہٹا کر ایک صاف سینک ڈالکر نکالیں اگر سینک میں دودھ کا آمیزہ لگا ہو تو سمجھ لیں کہ ابھی پڈنگ تیار نہیں ہوئی پھر ڈھکن سے پتیلی کو بند کر کے کچھ دیر اور پکائیں۔ پھر سینک ڈالیں۔ جب سینک آمیزہ سے بالکل صاف نکل آئے تو سمجھ لیجئے کہ پڈنگ تیار ہو گئی۔

پتیلی کو اتار کر پڈنگ کا برتن نکال کر رکھ دیں جب ٹھنڈا ہو جائے تو چینی کی بڑی پلیٹ کو ڈبے پر الٹی رکھکر ڈبے کو الٹ دیں۔ پڈنگ پلیٹ میں آجائے گی۔ اوپر کے حصے میں شکر لگی ہوگی۔ جس سے پڈنگ خوشرنگ معلوم ہوتی ہے۔

ڈبے کی دیواروں پر مکھن اس لئے لگایا جاتا ہے کہ جب پڈنگ پلیٹ میں الٹی جائے تو آسانی سے نکل آئے ڈبے میں چپکے نہیں۔

گرمی کا موسم ہو تو پڈنگ کو ریفری جریٹر ہو تو اس میں مکھ [illegible] چٹ میں رکھنا بہتر ہوگا۔ کھانے کے وقت نکال کر میز پر لائیں۔ [illegible] نہ ہو تو برف پر رکھ کر ٹھنڈا کریں۔ جاڑوں میں ٹھنڈا کرنے کی ضرورت نہیں [illegible]

مسز بیگم اسد منصور (باندرہ بمبئی)

”لیڈیز کلب“

نجم اعزاز

مضمون اردو اور عنوان انگریزی ــــــ ہے نا عجیب سی بات۔ لیکن بھئی ہم کیا کریں اردو ہے ہی ایسی ہمہ گیر زبان۔ اپنا وسیع دامن ہے اس کا کہ ہر زبان کے الفاظ سمیٹ لیتی ہے۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجئے ہم کچھ غلط تو نہیں کہتے۔ زبان زد عام ہے بس اسٹاپ۔ اسے عام بول چال میں بس اڈہ کوئی کوئی ہی کہتا ہے۔ ایسے ہی اسپتال۔ لالٹین وغیرہ وغیرہ اور جو ہم نے اپنے مضمون کا عنوان ”لیڈیز کلب“ رکھ لیا تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی کہ سب ہی ناک بھوں چڑھائے بیٹھے ہیں۔ ؟؟ اچھا تو یہ اعتراض ہے آپ کو۔ لیکن یقین کیجئے ہمارا یہ ”لیڈیز کلب“ صرف مسلم خواتین کا کلب نہیں۔ اس کی ممبر تو ہر مذہب وملت کی خاتون بن سکتی ہے ـــ ارے اتنی جلد آپ نے ہماری بات پر بھروسہ کر لیا ـــ ہم تہہ دل سے مشکور ہیں آپ کے۔ آپ کا اعتماد مجروح نہ ہو۔ اس کے لئے ہم اپنی اپنی جان لڑا دیں گے۔ اچھا تو خیر۔ اب آپ اس لیڈیز کلب کے قیام کی وجہ بھی جان لیجئے ـــ جیسا کہ ہر شہر ہر گاؤں ہر قصبہ ہر محلہ میں ہوتا آیا ہے کہ ایک گھر کی خاتون یا خواتین کو دوسری خاتون یا خواتین سے کچھ شکایتیں ہوتی ہیں تو وہ اپنے گھر آنے والی خاتون سے حالِ دل کہہ کر جلے پھپھولے پھوڑ لیا کرتی ہیں۔ اب یہ روزمرہ یا ناغہ سے گھر آنے والی خواتین رجو دھوبن کھنگن۔ ماما۔ نوکرانی ـــــ ترکاری والی ہوتی ہیں) خاتون خانہ کی شکایتوں پر انھیں تسلی دینے کا گر تو اتنا نہیں جانتیں جتنا کہ ان کی شکایتوں کو سارے محلہ اور خود خاتون شکایت تک پہنچانے کا گر جانتی ہیں ـــ پھر آگے کیا ہوتا ہے یہ آپ بھی بخوبی جانتی ہیں ـــ بہرحال اسی لگائی بجھائی۔ جوتم پیزار۔ گالیوں کوسنوں کی بوچھار میں گھری چند صاحب عقل خواتین نے مل کر طے کیا کہ ہفتہ۔ پندرہ روز یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ میں صاحب محلہ خواتین ایک جگہ مل بیٹھیں جہاں شکایتوں کے دفتر کھولے جائیں اور کچھ [illegible] جب تک سب صاف ہو جائیں گے نہیں بلکہ فہمیوں کو جان سکے۔ تجویز معقول تھی لہٰذا فوراً اگلی قدم اٹھانے پر غور کیا جانے لگا۔ بیگم جہاندار صرف نام کی نہیں بلکہ حقیقتاً جہاندار خاتون تھیں۔

ان کے شوہر شہر کے رئیس اعظم نہ سہی لیکن رئیسوں میں ضرور شمار کیے جاتے تھے۔ محاورۃً نہیں سچ مچ بوتڑوں کے رئیس تھے۔ لیکن میاں بیوی دونوں ہی نہایت خلیق ملنسار۔ بیجا اکڑ غرور تو چھو بھی نہیں گیا تھا ہر ایک کی مشکلوں میں کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور ایسی ہی تھیں بیگم ناخدا۔ جب ان دونوں مخیر خواتین کو اس معاملہ کی پیچیدگی سے آگاہ کیا گیا تو دونوں ہی نے اپنی کوٹھیوں کے پھاٹک کھول دیے کہ جس حصہ میں دل چاہے لیڈیز کلب قائم کر لیا جائے۔ خواتین محلہ کی نمائندہ خواتین نے دونوں کوٹھیوں کا جائزہ لیا اور قرعہ پڑا بیگم جہاندار کے نام۔ بیگم جہاندار کو کئی پہلو سے بیگم ناخدا پر فوقیت حاصل تھی اول تو یہ کہ وہ بیگم ناخدا کے مقابلہ میں زیادہ تجربہ کار تھیں دوسرے جہاندار صاحب آئے دن سرکاری فرائض کے سلسلے میں ملک بھر کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ ان کی اپنی کوٹھی میں عدم موجودگی ہی ”لیڈیز کلب“ کے لئے زیادہ مفید تھی۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اپنی کوٹھی میں ان کی اپنی عدم موجودگی خود ان کے لئے مفید تھی ـــ ورنہ اگر وہ عام شوہروں کی طرح باقاعدگی سے کوٹھی میں قدم رنجہ فرماتے تو ”لیڈیز کلب“ کی بے شمار ممبروں کی سریلی مگر نان اسٹاپ آوازیں سن کر انھیں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے ہی بنتی اور خود ”لیڈیز کلب“ کی معزز مہمان ان کی موجودگی کے خوف سے اپنی اپنی واجب شکایت ”دل کھول کر“ سب کے سامنے پیش نہ کر سکتی تھیں۔ ایسی صورت میں ”لیڈیز کلب“ کے قیام کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ غرض جہاندار صاحب کی کوٹھی میں ”لیڈیز کلب“ کا قیام عمل میں آیا اور پہلی میٹنگ کی تاریخ کا اعلان بھی ہوا۔ اسی اعلان کے تحت [illegible] کلب کی پہلی میٹنگ ”جہاندار منزل“ میں ہو رہی ہے۔ آئیے چل کر دیکھتے ہیں کہ کون سے مسائل زیر غور ہیں ـــ ان تو آئیے [illegible] ـــ مگر دبے پاؤں آئیے [illegible] میٹنگ میں شرکت کرنے والی [illegible] ختم ہونے نہ پائیں ورنہ اظہار خیالات میں [illegible] ناز ک ہوتی بڑی شرمیلی ہے جیسے ہی انھیں [illegible]

رہا ہے تو یہ بات کرنا تو درکنار انے اپنے دوپٹہ یا ساڑھی کے آنچل منہ میں ٹھونس کر ایک دوسرے کے پیچھے چھپنے لگتی ہیں ــــ اچھا آپ اس طرح اپنے آپ کو کواڑوں کے پیچھے پوشیدہ رکھ کر سنیئے اور دیکھئے ــــ

ارے یہ تو بیگم جہاندار ہیں جو بیگم ناخدا سے زبردستی کچھ منوانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اے لیجئے وہ بیگم ناخدا اپنی نشست سے اٹھ کر خواتین سے کچھ فرمانے والی ہیں۔ سانسیں روک کر آپ بھی سنیئے۔

بیگم ناخدا:۔ آپ سب بہنوں کی مرضی اور بیگم جہاندار کی زبردستی پر میں "لیڈیز کلب" کی صدارت کے لئے مجبور ہوگئی ہوں۔ حالاں کہ بیگم جہاندار کی موجودگی میں میرا کرسی صدارت پر بیٹھنا گستاخی کے مترادف ہے۔"

ایک ممبر:۔ ہم نے اپنے کلب کی ناخدائی آپ کے سپرد کی ہے

بیگم ناخدا:۔ اگر آپ یوں اپنی نا اہلیت پر اصرار کرتی رہیں گی تو ہمارے جلسہ کا خدا ہی حافظ ہے۔"

بیگم ناخدا:۔ اچھا خیر۔ میں سر تسلیم خم کرتی ہوں۔"

بیگم جہاندار:۔ میں سب ممبرز کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کر کے درخواست کرتی ہوں کہ جلسہ کی کارروائی آگے بڑھائی جائے۔"

بیگم ناخدا:۔ بہت بہتر ــــ جیسا کہ آپ سبھوں نے بیگم خضر کو سکریٹری کے عہدہ کے لئے چنا ہے۔ میں ان سے درخواست کرتی ہوں کہ آج کے مسائل پیش کئے جائیں۔

بیگم خضر:۔ معزز خواتین جیسا کہ آپ سب کو علم ہے یہ کلب کی پہلی میٹنگ ہے لہٰذا جب تک کونسل کے تمام عہدوں کے لئے الکشن نہیں ہو جاتے تب تک پہلے سے طے مسائل (ایجنڈا) پیش کرنا فی الحال ممکن نہیں۔

بیگم ناخدا:۔ ہاں یہ تو ہے (کچھ رک کر) مگر کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی ہے وقت بیکار کرنے سے کیا فائدہ ــــ

ایک ممبر:۔ وقت کا بہترین مصرف یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سب ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف ہو جائیں ــــ

دوسری ممبر:۔ ہاں رائے اچھی ہے۔ ہمارے درمیان چند نئے چہرے بھی ہیں۔ جن سے جان پہچان ضروری ہے۔

بیگم خضر:۔ جو خواتین اپنے ہمراہ یہ نئے مہمان لائی ہیں انھیں تکلیف دی جاتی ہے کہ وہ ان کا تعارف کرائیں۔

ایک لڑکی:۔ یہ میری خالہ ہیں بیگم چودھری۔ ہمارے آئی ہیں چند روز یہاں رہیں گی۔

دوسری ممبر:۔ یہ میری بھابی ہیں بیگم شیخ۔ حیدرآباد سے دہلی آگئی ہیں چھٹیاں گزارنے۔

تیسری ممبر:۔ اور یہ میری بڑی بہن ہیں بیگم قدوائی ــــ کانپور رہتی ہیں۔

ایک لڑکی:۔ میری رائے ہے کہ تعارف کا سلسلہ یہیں روک کر ہمیں ان تینوں خواتین سے ان کے علاقائی مسائل معلوم کرنا چاہئیں کیونکہ یہ چند روزہ مہمان ہیں بقیہ تو اسی شہر کی مکین ہیں۔ جنھیں کبھی بھی سنا جا سکتا ہے۔

بیگم جہاندار:۔ مس سفینہ حیات نے درست کہا۔ دکن بہار اور یو۔پی کی تین نمائندہ خواتین سے ہم بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

بیگم خضر:۔ (بیگم ناخدا کی اجازت لے کر) تو میں بیگم شیخ سے درخواست کروں گی کہ وہ ہمیں اپنے علاقہ کے رسم و رواج کے متعلق کچھ بتائیں۔

بیگم شیخ:۔ (قدرے پس و پیش کے بعد) آپ نے رسم و رواج کی وضاحت نہیں کی کہ یہ رسم و رواج شادی بیاہ سے متعلق ہوں یا ــــ

بیگم خضر:۔ (بات کاٹتے ہوئے) اچھا خیر رسم و رواج کو رہنے دیجئے آپ اپنے کچھ ایسے مسائل پیش کیجئے جن سے ہم کچھ سبق حاصل کریں اور ان مسائل کو سلجھانے میں آپ کی مدد کریں۔

بیگم شیخ:۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) میرا درد سر تو لڑکیوں کی شادی سے متعلق ہے ــــ

بیگم قدوائی:۔ جی نہیں۔ میں تو دونوں لڑکیوں کی شادی کر چکی لیکن شادی کے بعد جہیز کی کمی کو بنیاد بنا کر دونوں ہی کو پریشان کیا جا رہا ہے

بیگم چودھری:۔ مگر دکن میں تو شادی سے پہلے ہی جہیز کی فہرست اور جوڑے کی رقم طے ہو جاتی ہے

بیگم شیخ:۔ جی ہاں دکن میں یہ رسم ہے۔

بیگم چودھری:۔ ہمارے بہار میں بھی یہی طریقہ ہے لیکن [illegible] کے ساتھ تلک کے نام پر ہزاروں کی نوبت آجاتی ہے جہیز کی فہرست [illegible] کے علاوہ ہے۔

بیگم قدوائی:۔ (فخریہ طور پر ہنس کر) یو۔پی میں ایسی کوئی [illegible] نہیں ہے۔

ایک نئی خاتون:۔ سارے بھینس کی [illegible] ہوں [illegible]

[illegible] کرنے سے بچائے۔

بیگم قدوائی :۔ (قدرے غصہ سے) آپ..... آپ

[illegible] :۔ (مداخلت کرتے ہوئے) آپ کی تعریف۔؟

بیگم علی :۔ میں بیگم علی ہوں۔ رہتی تو ہوں حیدرآباد میں لیکن آبائی وطن [illegible]

بیگم قدوائی :۔ ارے۔ پھر بھی آپ یوپی والوں پر لعنت بھیجتی ہیں۔

بیگم علی :۔ جی ہاں بھیجتی ہوں اور بھیجتی رہوں گی۔

بیگم شیخ :۔ مگر بہن اس کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی۔ ورنہ حیدرآباد کی رسم۔۔

بیگم علی :۔ (بات کاٹ کر) حیدرآبادی اور بہاری رسم یوپی کی دھوکہ بازی سے ہزار گنا بہتر ہے ہمارے یہاں جہیز و رقم کے لین دین پر شادی سے پہلے [illegible] جاتی ہے لڑکیاں عمر بھر بیٹھی رہتی ہیں تو کیا ہوا۔ کم از کم شادی کے بعد کی [illegible] کشتوں اور انسانیت سوز مظالم سے تو بچ جاتی ہیں۔

بیگم چودھری :۔ یہ آپ ٹھیک کہتی ہیں۔

بیگم قدوائی :۔ (غصہ سے) ٹھیک کیا خاک کہتی ہیں۔ کسی کی ہمت ہو تو مجھے بتائے کہ ہم یوپی والوں نے کب شادی سے پہلے جہیز کی فہرست چلائی ہے یا کچھ لے دے جوڑے کے نام پر سودا کیا ہے۔

بیگم علی :۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) ہمت تو کسی میں نہیں بہن کہ تم لوگوں کے منہ لگے اور میں تو بالکل ہی کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ اپنی لڑکیاں وہیں بیاہی ہیں۔

بیگم غضنفر :۔ (متاسفانہ لہجہ میں) ارے آپ رونے لگیں۔ آپ کے سمدھیانے والوں نے ایسا کیا سلوک کیا کہ آپ اتنی شکستہ دل ہیں۔

بیگم علی :۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) کیا بتاؤں بیٹی۔ حیدرآبادی رسم سے گھبرا کر ہم نے اپنی لڑکیوں کی شادی حیدرآباد میں نہ کر کے یوپی والوں میں کی اور شادی سے پہلے صاف صاف کہہ دیا کہ ہماری حیثیت کچھ نہیں ہے کچھ دے نہ سکیں گے صرف لڑکی ہی لڑکی ہے۔ ان لوگوں نے الٹے ہمارا [illegible] کی کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے آپ کی جیسی لڑکی کافی ہے۔ اور شادی کے دوسرے مہینے سے ہی لڑکی پر سختیاں شروع کر دیں کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے پر [illegible] خط و کتابت تو کجا ملنے بھی نہیں دیتے۔ گیارہ [illegible] لڑکی کو میکے آئے ہوئے۔ تم خود کہو اس میں ہمارا کیا قصور تھا ہم [illegible] تھا کہ کچھ نہیں دے سکتے۔

بیگم قدوائی :۔ (لاپرواہی سے) یہ تو رواج ہی ہے کہ سب کچھ دیتے ہوئے بھی لڑکی والے یہی کہتے ہیں کہ ہماری کچھ حیثیت نہیں ہم کچھ نہیں دے سکتے۔ یہی آپ کے سمدھیانے والوں نے سمجھا ہو گا کہ کسر نفسی سے کام لے رہی ہیں آپ۔

بیگم چودھری اور بیگم شیخ :۔ (ایک زبان ہو کر) جبھی اس سے اچھی تو ہماری حیدرآبادی اور بہاری رسم ہے کہ صاف صاف مانگ لیتے ہیں۔ دل میں کچھ زبان پر کچھ نہیں لاتے۔ بلا سے بال بال قرض میں بندھ جائے یا لڑکی تمام عمر بیٹھی رہے۔ مگر لڑکی کی جان تو ضیق سے بچ جاتی ہے۔

بیگم قدوائی :۔ آپ...... آپ کے خیال میں ہم لوگ قصائی ہیں۔

مس سفینہ حیات :۔ (تلخی کم کرنے کے لئے موضوع بدل کر) بیگم علی یہ تو بتائیے شادی کے وقت آپ کے دامادوں کی حیثیت کیا تھی۔

بیگم علی :۔ بڑا فینانس ڈپارٹمنٹ میں آفیسر تھا۔ منجھلا ایروناٹک میں انجینئر

بیگم چودھری :۔ ہاں بہن ایسے دامادوں کے دام بھی بہت ہوتے ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا۔ بڑی کی شادی میں ہم نے ڈاکٹر داماد کی مانگ پوری کرنے کے لئے مکان بیچ دیا تھا دوسری کی شادی پر سودی قرض کے جال میں پھنس کر انجینئر داماد پایا تھا۔ اور اب حال یہ ہے کہ کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں اور آدھی تنخواہ کا سود جاتا ہے۔

بیگم شیخ :۔ میرا بھی یہی حال ہے بہن۔ باپ بیٹوں کی تنخواہ لڑکیوں کی شادی پر لئے گئے قرض میں کٹ جاتی ہے آدھی یا اور کم جو ملتی ہے وہ سمدھیانے والوں کی سختیوں سے لڑکیوں کو بچانے پر خرچ ہو جاتی ہے میرے بچے تو کولھو کا بیل ہو گئے ہیں کھانے کو روکھی سوکھی مگر محنت رات دن کی —— (سب ہی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھیں ایسے میں بیگم جہاندار کی آواز یوں ابھری جیسے رات کی تاریکی کو چیرتی سورج کی پہلی کرن)

بیگم جہاندار :۔ (انکساری لہجہ میں) مجھے آپ سب کی تکالیف و پریشانیاں جان کر سخت کوفت و صدمہ ہوا ہے بہنو۔ مگر برا نہ مانیں تو میں یہ کہوں کہ یہ سب دکھ درد آپ کے اپنے خریدے ہوئے ہیں۔

بیگم شیخ :۔ (چونک کر) یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا کوئی اپنے آپ کو یا اپنی اولاد کو جان بوجھ کر مصیبت میں ڈالنا چاہے گا۔

بیگم جہاندار :۔ اگر آپ نے اپنی اولاد کو مصیبت میں نہیں ڈالا ہے تو بتائیے آپ کے لڑکے کس طرح سکھ کی سانس لے سکیں گے۔

بیگم شیخ :۔ ہم بھی اپنے لڑکوں کی شادیاں اسی طرح کریں گے۔
بیگم چودھری :۔ ہاں اور کیا ۔۔۔ جب ہم لے دیا ہے تو لیں گے بھی۔
بیگم علی :۔ اور ہم اس طرح لینے کا حق رکھتے بھی ہیں۔ آخر کب تک ہمارے بچے اپنی بہنوں کی شادیوں کا بوجھ اتارتے رہیں گے۔
بیگم جہاندار :۔ یعنی آپ مزید کچھ بھائیوں کو اپنی بہنوں کی شادیوں کا قرض اتارنے پر مجبور کریں گی۔
بیگم شیخ :۔ بیگم چودھری۔ بیگم علی :۔ (پریشان ہوکر) ایں ۔۔۔ یہ تو ہم نے سوچا نہ تھا۔
بیگم جہاندار :۔ چراغ روشن کرنا اچھی بات ہے بہنو۔ مگر کسی کے گھر جلانے کے لئے چراغ سے چراغ جلانا انسانیت نہیں۔
کئی پریشان آوازیں :۔ پھر اس مسئلہ کا حل کیا ہے۔
بیگم جہاندار :۔ حل میں بتاتی ہوں بہنو۔ بشرطیکہ آپ عمل کریں۔
کئی خواتین :۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں آپ ارشاد کریں۔
بیگم جہاندار :۔ آپ سبھی نے اونچے عہدوں اور اچھی حیثیت کے دامادوں کے لئے اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کیا لیکن آپ کو یا آپ کی لڑکیوں کو پھر بھی سکون نہیں ملا۔ کیا اب بھی آپ کی آنکھیں نہیں کھلیں کہ یہ طریقہ کار غلط ہے۔
بیگم شیخ :۔ مگر کیا کریں ہم لوگ۔ ہم لڑکی والوں کی ہر طرح سے مجبوری ہے۔ نہ تو لڑکی کو عمر بھر بٹھائے رکھ سکتے ہیں نہ ہی شادی کے بعد اس پر توڑا جانے والا ظلم ستم برداشت کر سکتے ہیں۔
بیگم جہاندار :۔ (سرد لہجہ میں) مگر یہ تو آپ کر سکتی ہیں کہ تعلیم یافتہ مگر شریف بیروزگار یا کم یافت والے لڑکے کو اپنا کر اپنی حیثیت کے مطابق نقد رقم سے اس کا کوئی ذاتی کاروبار جاری کرا دیں۔
کئی آوازیں :۔ ۔۔۔ کیا ۔۔۔؟
بیگم جہاندار :۔ جی ہاں ۔۔۔ یوں وہ لڑکا آپ کا داماد بن کر اپنے کاروبار کرنے کے لئے تن من سے جٹ جائے گا اور یہ تو آپ جانتی ہیں کہ محنت رنگ ضرور لاتی ہے۔ اس کو ترقی ملے گی وہ آپ کی بھی عزت کرے گا اور آپ کی لڑکی کی بھی ۔۔۔ کہئے کیا میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں بیگم علی؟
بیگم علی :۔ ایں ۔۔۔ ہاں۔ نہیں تو۔ آپ بالکل درست فرما رہی ہیں۔

بیگم جہاندار :۔ یہ اس مسئلہ کا واحد حل ہے بہنو۔ اگر آپ اونچی حیثیت والوں کے پیچھے بھاگنے کے بجائے کم حیثیت والوں کو اپنا کر دیکھا کریں تو کوئی لڑکی شادی کے بعد غمگین نہیں رہے گی۔
بیگم چودھری :۔ ارے سچ تو ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا اپنے سے کم گھرانے کی لڑکی کی کیا قدر کرے گا جبکہ غریب داماد سسرال والوں کا ہمیشہ احسان مند رہے گا۔
بیگم علی :۔ اس سے ایک فائدہ اور بھی تو ہے بہن کہ امیر یا اونچے عہدوں والے لڑکوں کی خرید و فروخت کا بازار مندا پڑ جائے گا۔
بیگم شیخ :۔ ہاں تب سبھی ٹکے سیر پر آ جائیں گے۔ اور غریبوں کی لڑکیاں ماں باپ کے کولہے سے لگی مدقوق زندگی نہ گذاریں گے۔
بیگم علی :۔ پھر یہ سب رسم و رواج دھرے کے دھرے رہ جائیں گے پھر نہ تو کوئی گھوڑے جوڑے کی بات کرے گا نہ تلک کی۔ وہ بےچاریاں لوٹیں گی نہ ہی دل میں کچھ زبان پر کچھ لاکر لڑکیاں بیاہی جائیں گی۔ مگر بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔
بیگم قدوائی :۔ میرے چھ لڑکے اور ایک لڑکی ہے بہن مگر میں بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی ہمت کر دکھاؤں گی۔
بیگم ناخدا :۔ آفرین ہے بہن تم پر ۔۔۔ بڑا اچھا کیا تم نے۔
مس سفینہ حیات :۔ اگر آپ جیسی کئی کئی بیٹوں کی مائیں جہیز کی اس رسم کو ختم کرنے کے لئے سامنے آئیں تو ہمارے معاشرہ سے یہ لعنت ختم ہوگی ۔۔۔ ہاں تو سب دیکھ اور سن لیا ہے تو آپ نے اس پر عمل بھی کرنے کی ہمت پیدا کیجئے آخر اس معاشرے سے ڈرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ہم ہی نے تو یہ رسم و رواج بنائے ہیں اور ہمیں اگر ان سے ڈرنے لگیں تو ایسا ہی بات ہوئی تاکہ بنے ہی اپنے سے انسان ڈر جائے ۔۔۔ تو پھر آ جائیے خم ٹھونک کر میدان میں ۔۔۔ اور ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ جب ہمارے لڑکے اس قابل ہو جائیں گے تو انشاء اللہ ہم بھی کچھ کر دکھائیں گے۔ فی الحال تو بیچارے دسویں گیارھویں میں پڑھ رہے ہیں اور رہی لڑکی کی بات۔ تو بھئی ہم کیا کریں اللہ میاں نے رحمت سے ہمیں محروم رکھا ہے ۔۔۔
[illegible] ۔۔۔ یہ تو اچھی [illegible] کہیں [illegible]۔ کسی [illegible]
[illegible] شک آپ [illegible] ۔۔۔ [illegible]
[illegible] آپ کو معاشرے [illegible]

عورت عالمی ادب کی نظر میں

شاہجہاں

ٹینی سن

○ مرد میدان جنگ کے لیے، عورت خانہ داری کے لیے۔ مرد تلوار کے لیے، عورت سوئی کے لیے۔ مرد عورت سے محبت کے لیے۔ عورت مرد کو سمجھنے کے لیے۔ اس سے ہٹ کر سب کچھ الجھاوے۔

○ مرد شہرت کے خواب دیکھتا ہے اور عورت محبت کی متلاشی ہے۔ مرد کے پاس دماغ ہے تو عورت کے پاس دل۔

○ مرد خدا کے درخت ہیں اور عورتیں اس درخت کے پھول۔

○ عورت کی آنکھیں خاموش دعاؤں کے گھر ہیں۔

قاضی عبدالغفار

○ آفتاب کی ایک شعاع اور مہتاب کی ایک کرن بھی تم چاہو کہ اپنی ساری دولت دے کر خرید لو، تو نہیں خرید سکتے عورت کے قلب کی گرمی اور روشنی اس سے بھی زیادہ گراں ہے۔

○ تم کیا جان سکو کہ عورت کے آنسو کے اندر موسیقی کی ایک دنیا موجود ہے۔

کپلنگ سے

○ اگر مجھے سب سے اونچی پہاڑی پر پھانسی دے دی جائے تو مجھے معلوم ہے وہ! کس کی محبت میرا تعاقب کرے گی۔ ماں! میری ماں، میری اچھی ماں۔

○ محبت کا تصور، موت کے اتفاق سے زیادہ سچ ہوتا ہے۔

○ نادان ترین عورت بھی ہوشمند مرد کی حریف ہو سکتی ہے لیکن احمق مرد کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے ہوشیار ترین عورت کی ضرورت ہے۔

○ [illegible] تمام چیزوں سے بڑھ کر ہیں۔ عورتیں۔ اقتدار [illegible]

گولسوتھ

○ زندگی بچوں کے بغیر غمگین ہے، بوڑھی عورتوں کے بغیر وحشیانہ۔!

گوئٹے

○ قوموں کی قسمت کا انحصار ان نوجوان مردوں اور عورتوں پر ہوتا ہے جن کی عمر ۲۵ سال سے کم ہو!۔

○ تمام دنیا کی ہر عورت سے یہ کہتا ہوں کہ تم اپنی جوانی کو باقی رکھنے کے لیے روزانہ ایک خوبصورت نظم پڑھو، دلآویز موسیقی سنو، کوئی اچھی پینٹنگ دیکھو۔

○ ہر بلند مرتبہ مرد کی رہنمائی، عورت کے فیض سے انجام پاتی ہے۔

○ عورتوں کا معاشرہ بہترین اخلاق کا سنگ بنیاد ہے۔

○ ایسے لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ عورتیں نہ ہوتیں تو وہ سکون سے زندگی بسر کر سکتے۔ دراصل خوش فہمی میں ہیں۔ ان میں مذاق سلیم نہیں ہے اور ان کے خیالات بھٹکے ہیں۔ وہ ہر نور اور ہر مسرت بخش چیز سے دور بھاگتے ہیں اور سچ بات تو یہ ہے کہ وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔!

○ عورت کی روح ہمیں اونچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔

لوتھر

○ عورت کی محبت میں حیات بخش طاقت ہے۔ وہ انسان میں کام کرنے کا نیا جذبہ، نئی امنگ اور نئی روح پھونک دیتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج کل میری تحریروں میں [illegible] پیدا ہو رہی ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ دنیا نام ہے ایک [illegible] کا۔ کاش، میں تجربہ کے بعد [illegible] [illegible] اور اگر اس سے کوئی بات کرنا چاہتا تو صرف یہی کہ۔

[illegible]

○ کسی شاہانہ تاج سے زیادہ عورت کے مخلص دل میں وقار موجود ہے، لیکن اس کے غصے کی برابری سو بادشاہ بھی مل کر نہیں کر سکتے۔!

○ تیل اور پانی، عورت اور راز۔ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

لانڈ تھ

○ گھریلو مسرتوں کا انحصار اپنی بیوی کی خوبیوں پر اعتماد کرنے میں ہے۔

○ شوہر بیوی سے اس لیے محبت نہیں کرتا کہ وہ گھر کی صفائی کا خاص خیال رکھتی ہے یا اس کے جوتوں پر پالش کرتی ہے۔ اس کے لیے تو وہ نوکر بھی رکھ سکتا ہے۔ وہی عورت شوہر کی محبت کو فتح کر سکتی ہے جو یہ جانتی ہے کہ اسے کس طرح اس بات کا احساس دلائے کہ وہ اس کا ہیرو ہے!۔

لوتھر

○ خوش قسمت ترین ہے وہ شخص جس نے دنیا میں بہترین کردار کی بیوی حاصل کرلی۔

○ جب عورت کے دل میں رحم سا جاتا ہے تو پھر عورت کے دل سے زیادہ کوئی چیز نرم اور ملائم نہیں ہوتی۔

○ ایسا شخص جو "عورت" اور گیت سے محبت نہیں کرتا وہ ساری زندگی بے وقوف بنا رہے گا۔

منٹو

○ عورت مرد کے اعصاب پر سوار ہے اور کیوں نہ رہے؟۔ مرد کے اعصاب پر کیا ہاتھی گھوڑوں کو سوار ہونا چاہیئے؟ جب کبوتر، کبوتریوں کو دیکھ کر گٹکتے ہیں تو مرد عورتوں کو دیکھ کر ایک غزل یا افسانہ کیوں نہ لکھیں۔ عورتیں کبوتروں سے زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور فکر خیز ہیں!۔

منشی پریم چند

○ مرد میں عورت کے اوصاف آجاتے ہیں تو وہ نیک بن جاتا ہے اور عورت میں مرد کے گن آجاتے ہیں تو وہ بد بن جاتی ہے!

○ اگر مردوں کو پیٹ کی خدمت بری معلوم ہوتی ہے تو عورتوں کو صورت کی۔!

○ میاں بیوی کی محبت میں رنج کے چوٹ ہی سے ارتقاء

محمد علی جوہر

○ ماں کی اصل خوبصورتی اس کی محبت ہے۔ اور میری ماں دنیا کی سب سے خوبصورت مخلوق ہے۔

حاد تحر

○ "ماں۔!" اس مختصر لفظ میں کتنی وسیع دنیا پوشیدہ ہے۔

○ میں اپنی زندگی میں کئی نازک لمحات سے گزرا ہوں، لیکن میں نے یہی محسوس کیا کہ نازک ترین وقت وہ تھا جبکہ میری محبوبہ اپنی پر اسرار مست۔ اور نشیلی نظروں کی زبان سے مجھ سے کہہ رہی تھی۔۔

"مجھے تم سے محبت ہے"

○ ایک لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے میں نے اس سے کہا کہ میں اسے اپنی "بہن" سمجھتا ہوں۔ اور پھر میں کسی اور لڑکی کو دل و جان سے چاہنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے اپنا "بھائی" تصور کرتی ہے۔

○ یہ دنیا بڑی پُر اسرار ہے۔ یہ بھی قدرت کا ایک راز ہے کہ اس دنیا میں بوڑھی عورتوں کی تعداد، بوڑھے مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔

○ عورت کی مترنم اور سریلی "آواز" مرد کی زندگی کی سانس ہے۔

○ اپنی پوری زندگی میں ہر عورت جبریہ طور پر صرف ایک بار دیر تک اپنی زبان کو بند رکھنے پر مجبور رہے جب وہ دلہن بنتی ہے۔

○ شوہر کا غصہ، بیوی کی روح کا سرطان ہے۔

○ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ازدواجی زندگی کی تلخیوں کے اسباب کی محرک معمولی باتیں ہوتی ہیں۔ جو معمولی اہمیت اختیار کرلیتی ہیں۔

○ عورت کی پوری حیات، غموں، دکھوں، محرومیوں، ذلتوں، ہچکیوں، سسکیوں، آہوں اور آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں۔ میں سوچتا ہوں، کیا اس وسیع و عریض دنیا میں کوئی عورت خوش بھی ہے!۔

○ عورت زندگی میں ہمیں دو قیمتی تحفے دیتی ہے۔ ذمہ داری کا سچا احساس اور زندگی کے مصائب کا دلیرانہ مقابلہ کرنے کے لیے کوہ شکن عزم اور استقلال۔

○ فرشتوں" اور "نیک عورتوں" میں صرف اتنا فرق ہے کہ تم [illegible] کو دیکھ بھی [illegible]۔ نیک عورت [illegible]

○ میں نے عورت کے روتے روتے اچانک مسکرانے کے منظر سے بڑھ کر حسین منظر اور کوئی نہیں دیکھا۔

○ عورت میں "مسکراہٹ" اور "ظرافت" کے بعد اگر میں کسی چیز سے متاثر ہو سکا تو وہ اس کی "نزاکت" ہے۔

○ عورتو! شکستہ قبروں کے ویران کتبوں کی طرح نظر آؤ۔ تمہارے نرم و نازک اور خوبصورت جسموں میں قوس قزح کے تمام رنگ بھی سمو دیے جائیں تو کم ہیں۔

○ اگر تم کامیاب انسان بننا چاہتے ہو تو "زمانہ شناسی" کے ساتھ "زنانہ شناسی" کے فن کو بھی سیکھو!

○ عورت کے بغیر زندگی کا تصور ایسا ہے گویا زندگی سانس کے بغیر جسم روح کے بغیر۔ اور پھول خوشبو کے بغیر۔

○ غصہ کی حالت میں عورت کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ بندوق کی گولی کی آواز، طوفان کی پھنکار، بجلی کی کڑک اور زلزلے کی شدت سے بھی زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

نپولین

○ عورت کا عظیم روپ ماں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔
○ مجھے اپنی بیوی کے کسی پر مکمل بھروسہ نہیں ہے۔

بقیہ لیڈیز کلب صفحہ ۲۳ کا

"لیڈیز کلب" کی میٹنگ میں رکھا جا سکتا ہے کیونکہ یہ سارے ملک کی خواتین کا کلب ہے اور ہر مذہب و ملت کی خاتون اس کی ممبر بن سکتی ہے ـــ اچھا تو اب ہم آپ کے مسائل آپ کی شکایتوں اور آپ کے خطوط کے منتظر ہیں تاکہ انہیں اگلی میٹنگ کے ایجنڈے میں شامل کیا جا سکے۔ خط و کتابت کے لئے پتہ نوٹ کر لیجئے۔

لیڈیز کلب۔ معرفت ماہنامہ "حریم"۔ ۲۵ لاٹوش روڈ ـــ لکھنؤ

یا آپ بلا واسطہ ہم تک پہنچنا چاہیں تو پتہ دوسرا ہوگا۔

لیڈیز کلب۔ ڈی ۲۰۹ - سروجنی نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

اگلی ملاقات جلد ہی ہوگی بشرطیکہ آپ پسند کریں ـــ اچھا خدا حافظ ـ لیڈیز کلب پائندہ آباد۔

لطیفے

○ مردوں کی ایک طویل قطار جنت کے سامنے لگی ہوئی تھی۔ لوگ اندر جانے کے انتظار میں تھے۔ قطار کے سامنے یہ درج تھا۔ ان مردوں کے لیے جو ساری زندگی اپنی بیویوں کے زیر تسلط رہے۔ یہ قطار تا حد نظر طویل تھی۔ قریب ہی دوسری عبارت درج تھی! ان مردوں کے لیے جو کبھی اپنی بیویوں کے زیر تسلط نہیں رہے۔ اس تحریر کے سامنے صرف ایک آدمی کھڑا تھا۔ ایک فرشتے نے حیرت سے پوچھا تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟:

آدمی نے جواب دیا! "مجھے نہیں معلوم، میری بیوی نے مجھے یہاں کھڑے ہونے کو کہا تھا۔"

○ ایک بزنس مین نے اپنی شادی کی ۲۵ ویں سالگرہ پر ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا۔ پارٹی کے دوران اس کے ایک قریبی دوست نے دیکھا کہ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے ایک کونے میں بیٹھا ہے۔ تمہیں تو اس وقت اپنے دوستوں کے ہمراہ لطف اٹھانا چاہیئے۔ بزنس مین کے دوست نے کہا۔ لیکن تم یہاں اداس بیٹھے ہو۔

بزنس مین نے جواب دیا۔ جب میری شادی کو پانچ ہی برس ہوئے تھے میں اور میری بیوی ہمیشہ جھگڑتے رہتے تھے۔ اس وقت تنگ آکر میں نے سوچا تھا کہ کیوں نہ میں اسے گولی مار دوں لیکن میرے وکیل نے کہا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہیں کم از کم ۲۰ سال کی سزا ہو جائے گی۔ اب تم ہی سوچو اگر میں نے اس وقت بیوی کو گولی مار دی ہوتی تو آج میں ایک آزاد پنچھی ہوتا۔

○ ایک صاحب کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی۔ میں آپ کی بیوی کی بچپن کی سہیلی تھی۔ کیا آپ مجھے مرحومہ کی کوئی چیز بطور نشانی دے سکتے ہیں۔

ان صاحب نے آنسو بھری آنکھوں کو اوپر اٹھایا اور معصومیت سے جواب دیا کہ مجھ سے کام چل جائے گا۔

کفایت شعار بیوی کی تلاش

—— عبدالمجیب سہالوی

ایک صاحب کو شادی کا بہت شوق تھا، سوتے جاگتے اسی کی فکر رہتی جہاں جاتے اسی کا ذکر کرتے۔ کوئی بھی بات ہو رہی ہوتی اپنی شادی کا دکھڑا رونے لگتے۔ شادی کے انتظار میں بال کھچڑی ہو رہے تھے لیکن شادی کا دور دور پتہ نہ تھا۔

وہ کوئی غریب کنگال نہ تھے صورت شکل بھی بری نہ تھی اگر خوبصورت نہ تھے تو برے بھی نہ لگتے تھے۔ تھوڑے بہت پڑھے لکھے بھی تھے۔ انگوٹھا لگانے کے بجائے دستخط کر لیتے تھے۔ الٹا سیدھا خط بھی لکھ لیتے تھے۔ شین قاف درست نہ تھا تو کوئی ایسی تعجب کی بات نہ تھی۔ آج کل کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والے لڑکے سوشیالوجی کو سوسیالوجی کہتے ہیں ایسی صورت میں ابھی تک ان کی شادی نہ ہونا تعجب کی بات تھی۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی شادی اب تک نہ ہو سکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ آدمی کفایت شعار تھے وہ ایسی بیوی کی تلاش میں تھے جو انہی کی طرح کفایت شعار ہو۔ جہاں کہیں شادی کی بات آگے بڑھتی یہ لڑکی کی صورت، شکل سے زیادہ اس بات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے کہ لڑکی فیشن ایبل تو نہیں ہے سینما تو نہیں دیکھتی۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ایسی لڑکی ملنا کوئی آسان کام نہیں جو فیشن ایبل نہ ہو اور سینما نہ دیکھتی ہو۔

ان کے ایک دوست نے بڑی دوڑ دھوپ اور تلاش و جستجو کے بعد ایک لڑکی ڈھونڈھ نکالی جو ابھی حال ہی میں بیوہ ہوئی تھی وہ اگرچہ ان کے معیار پر اچھی طرح پوری نہ اتری تھی لیکن بہرحال اس میں کفایت شعاری کی خوبی تو ضرور پائی جاتی تھی جس کا ثبوت یہ تھا کہ شادی کے چند سال ہو گئے تھے لیکن اس نے کوئی بچہ پیدا کرنے کی فضول خرچی نہیں کی تھی۔ سنا ہے کہ ساس صاحب غم سے اللہ کو پیاری ہو گئی کہ گنڈے تعویذ اور دوا دارو کے باوجود بہو کے پاؤں بھاری نہیں ہوئے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مرحوم شوہر بھی اپنی بیوی کی کفایت شعاری کا شکار ہو گیا۔ وہ جب بیمار پڑا تو اس نے دکھایا تو بہت سے حکیموں اور ڈاکٹروں کو لیکن دوا ہمیشہ اسپتال سے لائی جس میں کہا جاتا ہے کہ کفایت شعاری سے دوا کم اور پانی زیادہ ہوتا ہے۔ مگر بیچارہ شوہر اتنا اطاعت گزار اور سیدھا تھا کہ مرتے مرتے مر گیا لیکن کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لایا۔

دوست نے جب ان کی ہونے والی بیوی کی کفایت شعاری کا پکا ثبوت فراہم کر دیا تو یہ تیار ہو گئے لہٰذا چھوہارے منگا کر بڑی سادگی اور کفایت شعاری سے شادی کی رسم ادا کر دی گئی۔ ماشاء اللہ میاں بھی کفایت شعار اور بیوی بھی... کفایت شعار بقول شاعر ؎

"خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

چنانچہ یہ کفایت شعار جوڑا مزے میں زندگی بسر کرنے لگا۔ دوسری طرف ان کے دوست نے جو شادی کی تو اس کی بیوی بڑی فیشن ایبل اور فضول خرچ نکلی۔ ایک دن جب دونوں دوست ملے تو انھوں نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی کفایت شعار دوست نے کہا اور سب تو ٹھیک ہے مگر یار میری بیوی ہمیشہ اپنے پچھلے شوہر کی بات کیا کرتی ہے۔

اس پر دوست نے کہا یار شکر کرو کہ وہ پچھلے شوہر کی بات کرتی ہے میری بیوی تو ہمیشہ اگلے شوہر کی بات کیا کرتی ہے اس کے بعد دونوں گلے مل کر رونے لگے۔ اور دل کی بھڑاس نکل جانے کے بعد اپنے گھر واپس گئے۔

کی شب میں بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• ناظم انصاری صاحب (ناگپور) کے فرزند [illegible] محمود انصاری سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں حاجی محمد حنیف صاحب مالک حنیف بکڈپو ناگپور نے ایک شاندار دعوت ولیمہ ۱۳ رمئی ۸۰ء کو مومن پورہ ناگپور میں کی جس میں معززین شہر نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• مسٹر محمد یوسف [illegible] (امراوتی) کی صاحبزادی ثریا پروین صاحبہ کی شادی خالد اختر (فرزند محمد حسین صاحب امراوتی) کے ساتھ ۱۳ رجون ۸۰ء کی شام کو بمقام امراوتی بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• شفاعت علی صدیقی سندیلوی (آل انڈیا ریڈیو۔ کلکتہ) کی صاحبزادی [illegible] شاہین سلمہا کا عقد نکاح ہمراہ محمد صدیق سلمہ ۹ رجون ۸۰ء کو بمقام کلکتہ بحسن وخوبی انجام پایا۔ اس مبارک موقع پر ادبا، شعراء اور معززین شہر نے شرکت کی۔ افسوس کہ میں اس روز سانس کی شدید تکلیف میں مبتلا تھا اس لئے شریک نہ ہوسکا۔ بہر حال شفاعت صاحب اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• حبیب الرحمٰن صاحب رکیٹ ملک گیتی۔ لکھنؤ نے اپنے فرزند اشفاق زمان سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں، جو سعیدہ نشاط سلمہا (دختر اجمل صدیقی لکچرر مرزاپور) کے ساتھ ہوئی، ۱۰ رجون ۸۰ء کو اپنے اعزہ اقربا کو ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• عبدالستار طاہر و ترنم [illegible] تبسم (آمبور) ہماری تایازاد بہن شاہانہ انجم (دختر عبدالستار رحمت اللہ صاحب) کی شادی اعجاز احمد (فرزند [illegible] عبدالسبحان صاحب) کے ساتھ ۸ رجون ۸۰ء بروز [illegible] بمقام آمبور بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• [illegible] حسین صاحب کی بھتیجی اور ڈی محمد اعظم صاحب کی دختر نیک اختر [illegible] انجم سلمہا کا عقد نکاح فاروق احمد سلمہ (فرزند [illegible] عبدالمجید صاحب مرحوم، پرنام بٹ) کے ساتھ ۱۱ رجون ۸۰ء [illegible] بحسن وخوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• ایچ ایم زکریا اینڈ برادرس پرفیومرس بمبئی کے روح رواں محمد معروف صاحب کی دختر نیک اختر سعیدہ سلمہا کا عقد نکاح محمد ناصر یا انس سلمہ کے ساتھ ۵ رجون ۸۰ء بمقام جمعہ مسجد جھنجھکر اسٹریٹ بمبئی بحسن وخوبی انجام پایا۔ اسی سلسلہ میں نجم باغ، ڈونگری میں استقبالیہ ۷ بجے شام سے ۹ بجے شب تک جاری رہا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پر ملال کی خبریں

• ابو ظفر صاحب مالک ظفر بک ڈپو گیا کے انتقال کی خبر پڑھ کر افسوس ہوا انتقال ۱۹ رجون ۸۰ء بوقت ۷ بجے شام ہوا۔ مرحوم ایک پرانے کاروباری ہی نہیں، خلیق، ملنسار اور خوش معاملہ بھی تھے۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• تاج پاشا، جونیئر انجینیئر (میسور) افسوس میری ۲۱ سالہ ماموں زاد بہن امۃ المقیت جعفری صرف ۲۴ گھنٹہ علیل رہ کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اردو سے کافی شغف رکھتی تھی۔ حریم کی خریدار تھی۔ حال ہی میں بی۔ اے فرسٹ ایر کا امتحان دیا تھا۔ بڑی خوش اخلاق، نیک، سعادت مند اور ہردلعزیز تھی لیکن افسوس دست قضا کو اس پر رحم نہ آیا۔ عین عالم شباب میں موت سے ہمکنار ہوکر ہم سب کو داغ مفارقت دے گئی (خبر پڑھ کر بیحد تاسف ہوا) اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• چیا سیما یا سیما (صاف پڑھا نہ جاسکا)، ترنم (آمبور) افسوس کے ساتھ تحریر کررہی ہوں کہ میری دادی اماں عائشہ بی صاحبہ ۳۰ رمئی ۸۰ء بروز [illegible] بوقت ساڑھے چھ بجے شام اس جہان بے ثبات سے رحلت فرماگئیں۔ مرحومہ کی عمر ۶۵ سال کی تھی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

• بی عقیلہ انجم راحلہ (پرنام بٹ) افسوس میری خالہ زاد بہن آمنہ بیگم، عمر اکیس سال، زچگی کے [illegible] بعد [illegible] ۸۰ء بروز اتوار بوقت نو بجے شب ہم سب کو [illegible]

فردوس بریں ہوئیں۔ مرحومہ بڑی ملنسار، نیک اور خوش مزاج تھیں۔ اپنی نشانی دو کمسن بچیاں چھوڑی ہیں۔ نوزائیدہ بچی مرحومہ سے ایک دن پہلے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ اللہ پاک جنت نصیب کرے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (ہر جوانا مرگ موت افسوس ناک ہوتی ہے۔ آمنہ بیگم کے انتقال سے مجھے بےحد تاسف ہوا۔ میں بھی شریک غم ہوں۔ نسیم انہولوی

• عزیزی اقبال سلمہ (ادبستان، لکھنؤ) کے خسر احمد علی خاں صاحب فرزند اسد علی خاں صاحب مرحوم رئیس ہڑہا ۸ جون ۸۰ء کو عیش باغ روڈ پر ایک ٹرک سے کچل کر ایسے زخمی ہوئے کہ اسپتال جاکر دم توڑ دیا۔ مرحوم چوک سے قرآن پاک وغیرہ لئے سائکل پر آرہے تھے کہ یہ حادثہ پیش آگیا۔ مرحوم کے خاندان ہی میں نہیں، سارے محلہ میں اس دردناک موت سے ایک کہرام مچ گیا۔ مرحوم۔ بڑے نیک پارسا اور پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ چند ہی ماہ قبل مرحوم نے اپنی بڑی بیٹی کی شادی عزیزی اقبال سلمہ سے کی تھی۔ خدا مغفرت کرے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

نسیم انہولوی

بقیہ اشعار صفحہ ۳۲ کے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے، آخر اس درد کی دوا کیا ہے
مرسلہ:۔ نجمہ حافظ (گونڈہ)

قسمت کے فلک سے ٹوٹے ہوئے بے نور ستارے اور بھی ہیں
اک ہم ہی نہیں اس دنیا میں، دکھ درد کے مارے اور بھی ہیں
مرسلہ:۔ منصورہ احمد (لکھنؤ)

اس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو
قسمت میں جو لکھا ہے، الٰہی شتاب ہو
مرسلہ:۔ قرۃ العین (غندیال)

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزہ ہوتا
مرسلہ:۔ مس روحینہ شمسی (آگرہ)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہر ماہ حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو اور دل پسندیدہ اور پاکیزہ ہو۔ جو اشعار ۱۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں کئے جاتے۔ مثلاً جولائی کی اشاعت میں چلنے والا ۱۰ جون تک دفتر پہنچ جانا چاہیئے۔ اسی لئے دو ماہ کے عنوان شائع کئے جاتے ہیں۔ اگست کے لئے عنوان ہے "چاندنی" ستمبر کے لئے "گھٹا":

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

مرسلہ:۔ عصمت آرا (بانکا)

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا   میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرسلہ:۔ مس زاہدہ حسین (کرنال)

چند دل دور سے ہم تم کو سنائیں کیسے
بھیج دیں ڈاک سے آہوں کی صدائیں کیسے

مرسلہ:۔ قمر لطیف نگار سلطانہ جلیل (لاہور)

چھپنے کا نٹوں کو بھی نرمی سے چھوا ہے لیکن
لوگ بے درد ہیں پھولوں کو مسل دیتے ہیں

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (بنگارا پیٹ)

(یہ شعر شائع کر دیا لیکن یہ عنوان کے تحت نہیں آیا۔ یہ درد بے کا لفظ ہے۔ عنوان صرف درد تھا۔ ادارہ)

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

مرسلہ:۔ بلال فاطمہ (بھاگلپور)
مرسلہ:۔ زاہدہ فضلی (رامپور)
مرسلہ:۔ سراج سلطانہ خطیب
(لاہور۔ حیدرآباد)

کچھ تو ہی مرے درد کا مفہوم سمجھ لے
ہنستا ہوا چہرہ تو زمانے کے لئے ہے

مرسلہ:۔ روحی، زینب اختر

مٹا دیتے ہیں آکر رنج و غم کو۔ مگر درد جگر جاتا کہاں ہے

مرسلہ:۔ ثریا ہدی (پٹنہ)

کبھی ہے جگر میں خلش ہلکی ہلکی، کبھی درد پہلو میں ہے میٹھا میٹھا
میں پہروں شبِ غم یہی سوچتا ہوں، محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے

مرسلہ:۔ محتشم پرویز (اڑیسہ)

دردِ دل طریقے جو صرف بیاں ہوا۔ خونِ جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

مرسلہ:۔ نور جبیں (رجہت۔ نواده)

ہم گئے تھے اس سے کرنے شکوۂ دردِ فراق
مسکرا کر اس نے دیکھا، سب گلہ جاتا رہا

مرسلہ:۔ رانی (آگرہ)

درد کا میرے یقین آپ کریں یا نہ کریں
عرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

مرسلہ:۔ مسز عزیز (بھاگلپور)

درد اپنا ازل کا ساتھی ہے۔ دوستی غم سے عمر بھر کی ہے

مرسلہ:۔ مس رعنان (محمد یہ۔ پادینہ)

ہم چارہ گر کے سامنے خاموش تھے مگر
خود اپنے درد ہی لب گفتار ہو گئے

مرسلہ:۔ نجمہ انصار رضا (جھنگل)

عقبیٰ میں بھی ملے گی یہی زندگی شکیل
مر کر بھی چھٹ نہ پائیں گے اس دردِ سر سے ہم

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لکھنؤ)

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

مرسلہ:۔ نجم السحر (کرنال)

دل ویراں ہے، تری یاد ہے، تنہائی ہے
زندگی درد کی باہوں میں سمٹ آئی ہے

مرسلہ:۔ محمدی بیگم (حیدرآباد)

وہ اٹھ کر پہلو میں بیٹھ گئے۔

"بابا جان کی موت کی پوری تفصیل مجھے سنائیے۔ انھیں کیا ہوا تھا"
"سناؤں گی مگر ابھی نہیں۔ تم اتنے لمبے سفر سے تھکے ہوئے آ رہے ہو۔ تھوڑی دیر آرام کر لو پھر بیٹے کو سناؤں گی!"

"مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آج میں ساری رات آپ سے باتیں کروں گا۔ نہ خود سوؤں گا نہ آپ کو سونے دوں گا"

وہ بے حد پیار سے مسکرائیں "اچھا اچھا!"

دفعتاً پردہ سرکا اور زارا اندر آ گئی۔ اس نے ہاتھوں پر چھوٹی سی ٹرے سنبھال رکھی تھی جس پر فروٹ جوس کے دو خوشنما گلاس رکھے تھے!

ازدر کی آنکھیں ادھر اٹھ گئیں۔ زارا شرمائی۔ ٹرے اس کے ہاتھ سے پر ... دی۔

"بیٹے۔ تم زارا سے نہیں ملے۔ تمہاری جنیا۔ یاد ہے تمھیں؟ بہت چھوٹی سی تھی۔ جب تم گئے ہو۔!" چچا جان نے کہا۔ ازدر کی آنکھوں سے حیرت جھانکنے لگی جیسے انھیں یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا!

"ہم سب اسے جنیا کہتے تھے۔ زارا کہہ کے تو کوئی نہیں پکارتا!"

"جنیا!" ازدر نے دہرایا "لیکن یہ تو ..." وہ ہنسنے لگے "یہ تو وہ چھوٹی سی ... کی بچی لگتی ہی نہیں ہے۔ جنھیں میں ہر وقت گود میں لیے کھلایا کرتا تھا۔"

زارا چپ تھی۔ اس نے جھجکتے ہاتھ سے ایک گلاس ازدر کی طرف بڑھایا اور دوسرا چچی جان کی طرف اور خود ... ایک ... گئی۔

[illegible] ... کر زارا کو ... [illegible]

(پہلی قسط)

ضمیمہ حریم جولائی ۱۹۸۰ء

ایک دلچسپ معاشرتی

ناول

درد آشنا

عفت موہانی

میں کہا: آہستہ آہستہ عادی ہو جائیں گے!:

میں تب تک فروٹ جوس بنا لاؤں۔ [illegible] جواب سنے بغیر چلی گئی۔

دس منٹ بعد از در سیدھے ہال کے کمرے میں آ گئے۔ [illegible] چچی جان پاؤں لٹکائے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ دفعتاً آذر جھکے اور [illegible] گھٹنے ٹیک کر ماں کی گود میں سر رکھ دیا!

امی!! انھوں نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ اور سسکیاں لینے لگے۔ چچی جان کے آنسو ان کے سر پر برس رہے تھے۔ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکیں۔ کچھ دیر تک دونوں ہی بدحواس رہے۔ پھر آذر نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ چچی جان ضبط نہ کر سکیں۔ ان کی پیشانی پر لب رکھ دیے۔!

پھر دو لمحوں کی خاموشی کے بعد آذر نے کہا: امی۔ آپ مجھے کیسے معاف کریں گی؟ میں کیسے آپ کو اپنی شکل دکھاؤں گا۔ میں آپ کا گنہگار ہوں میں نے مسلسل پندرہ برسوں تک آپ کو تنہائی، اداسی اور اکیلے پن کا کرب دیا ہے۔ میں آپ کو اپنے پاس بلا سکتا تھا۔ امی آپ اپنے وجود کا آدھا بھی نہیں رہیں۔ چہرہ پژمردہ ہے۔ بال سفید۔ پہلی نظر میں آپ کو میں نے پہچانا نہیں۔ بابا جان کے بعد آپ نے بہت سے صدمے اٹھائے ہیں!:

بیٹے [illegible] نہ کرو۔ تم آ گئے ہو۔ وہ پندرہ سال چند لمحوں [illegible] چکے۔ میں نے اپنی جنت پالی۔ میرے سارے دکھ ختم ہو چکے۔ میری خوشیوں کا تم اندازہ نہیں [illegible] میرا بیٹا مل گیا ہے۔

مجھے آپ کے [illegible]!

[illegible]

[illegible]

ناشر
نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ
فون: ۳۵۳۲۲۰۲۲۵۵۹

باہتمام، نسیم انہونوی — سرفراز پریس میں چھپ کر شائع ہوئی
بار اول ۱۹۸۲

ہائے بھابی، میرے تو حواس ہی کھو گئے: پھوپھی جان بولیں: یہ پندرہ برس بعد آذر جہاں کو یہاں کیا دکھ آئی۔

معلوم نہیں: اماں بی نے پُرتشویش انداز میں کہا: یہاں سے برابر زبیدہ کے خط جاتے تھے۔ کچھ لکھا ہوگا۔ ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ آذر نے اپنا گھر بسا لیا اور اب اِدھر وطن کی شکل نہ دیکھیں گے۔

پر سنا ہے بچے بھی ہیں: ابا جان نے پوچھا: کچھ معلوم کیا ؟

میں کیوں پوچھتی ؟: اماں بی بولیں۔

خدا نہ کرے کہ وہ آسٹریلیا سے کوئی خاتون لے آئیں: پھوپھی جان نے کہا ہمارے سینے پر وہ نگوڑی سالی دندنائے گی۔

میں تو کہتا ہوں کہ آذر خود بھی یہاں نہیں رہیں گے: ابا جان نے کہا: اپنی ماں سمیت کہیں اور قیام کریں گے۔

بھیا کی باتیں: پھوپھی جان نے ہاتھ نچا کر کہا: کیوں رہیں گے الگ ؟ کیا یہ گھر ان کا اور زبیدہ کا نہیں ہے۔

معاف کیجئے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آذر برسوں بعد آ رہے ہیں۔ ان سے نہایت اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں ہمارے ماحول کا علم ہو۔

ارے تو ان کا یہاں دشمن کون ہے ؟: پھوپی جان نے کہا مگر وہ کچھ گم سم تھیں۔ ایک پرانا قصہ جو دل خوش کن نہیں تھا انہیں اپنی طرف کھینچتا دکھائی دے رہا تھا۔

[illegible]: اماں بی نے پوچھا۔

[illegible] ابا جان [illegible]

چلے گئے۔

گھر خالی ہوا تو نوارا بھی خواب کی دنیا سے نکلی۔ ان لوگوں کی باتیں عجیب سی لگیں۔ آخر سب کے سب متوحش اور پریشان کیوں [illegible] کا تند و تیکھا انداز اسے پسند نہ تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ [illegible] بھائیوں نے عربی ممالک میں قسمت آزمائی کر کے جو دولت ابا جان کو بھیجی تھی۔ اس نے ان کے غرور و تکبر میں اضافہ کر دیا تھا۔ اب ان میں وہ سادگی ہمدردی اور خلوص نہ رہا تھا۔ ان کی زندگی جو ریٹائرمنٹ کے بعد اداس سی گزر رہی تھی۔ یک بیک تر و تازہ اور چاق و چوبند ہو گئی۔ اب وہ [illegible] دوستوں میں بیٹھ کر نہ تو حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے تھے [illegible] میں میر و غالب کے اشعار گونجتے تھے۔ پہلے کبھی ان کے منہ سے [illegible] علی گڑھ اور پریم چند کے نام سے گئے۔ سب کچھ وہ بھول چکے تھے۔ اب وہ دن بھر بڑی بڑی کمپنیوں کے چکر لگاتے تھے۔ پیسہ ان کے [illegible] لے کر دولت کو دوگنی چوگنی کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ نوارا کو ان کی عادتیں قطعی پسند نہ تھیں۔ لیکن وہ خاموش رہا کرتی۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اور ماں باپ کی اسی چہیتی بھی نہ تھی۔ اس کی [illegible] اس کے علاوہ ابا جان کو بہت جلدی غصہ آنے لگا تھا۔

اماں بی کے رنگ بھی بدل گئے تھے۔ پہلے اپنے حالات گرفتار تھیں۔ اگر کوئی پاس پڑوس کی خاتون آ جاتیں تو وہ ان سے کوئی [illegible] اور گھر کے ناقابلِ گرفت بجٹ کا رونا رویا کرتیں۔ مگر اب [illegible] [illegible]۔ اتنی [illegible]

[illegible]

روزہ داروں کے لیے بھی طاقت کا ذریعہ
سنکارا
روزوں میں اپنی صحت کا خاص خیال رکھیے !
سنکارا روزہ داروں کے لیے قوت وتوانائی کا خاص وسیلہ ہے،
سحری وافطار کے وقت اس کی ایک ایک خوراک لینے سے
تھکاوٹ اور کمزوری دور ہوکر چستی وطاقت بحال ہوجاتی ہے۔
سنکارا
وٹامنوں اور قدرتی اجزا سے بھرپور
ہر موسم میں گھر بھر کے لیے مثالی ٹانک
ہمدرد

786

THE AREEM

حریمی بہنوں بھانجیوں اور بھتیجیوں کو

جلد ۵۸ نمبر ۸

اٹھاونواں سال اشاعت

ماہنامہ

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النساء مرحومہ
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ایڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم رودولوی

دفتر
۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
ٹیلیفون:۔ ۲۵۲۲۴۔۲۴۵۵۹

فہرست مضامین اگست ۱۹۸۱ء

قیمت سالانہ [illegible]

[illegible]

ناشر نسیم انہونوی [illegible] دفتر حریم ۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا۔

ایک عبرتناک واقعہ

اس کا تعلق نہ برقعے سے ہے نہ پردے سے، نہ اسلام سے ہے نہ کسی اور مذہب و ملت سے۔ یہ صرف اس تہذیب کی دین ہے جو فرنگی ہندوستان میں اپنے دورِ حکومت کی یادگار کے طور پر چھوڑ گئے ہیں اور جس کی تحریک و تبلیغ کا ایک سیلاب ان انگریزی رسائل کے ذریعہ جاری ہے جو عریاں تصاویر اور مخربِ اخلاق مضامین سے مزین ہوکر ہمارے ملک میں فروخت ہوتے ہیں۔ یہ صرف فیشن کا پرچار کرتے ہیں اور یہ سکھاتے ہیں کہ مشرقی تہذیب ایک دقیانوسی تہذیب ہے۔ دنیا ترقی کر رہی ہے۔ شرم و حیا کا اس میں گذر نہیں، ادب لحاظ بے ضرورت باتیں ہیں۔ ایسے لباس جو مکمل ستر پوشی کریں فطرت کے خلاف ہیں۔ جہاں تک کم سے کم ستر پوشی ہو، معراجِ ترقی ہے۔ گھر گرہستی کے دھندھوں میں پھنسا رہنا معیوب باتیں ہیں، زندگی اس لئے ہے کہ کلبوں، تفریح گاہوں اور ہوٹلوں میں گذاری جائے۔ بچوں کی پرورش و نگہداشت ماں کا کام نہیں اس کے لئے آیائیں ہوتی ہیں۔ غرض ان رسائل کی اشاعت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عورت زیادہ سے زیادہ جتنی عریاں ہو سکتی ہو، رہا کرے، فیشن کر کے صورت کو جتنا زیادہ دلکش اور حسین بنا سکے بناتی رہے۔ اس کے لئے صدہا طرح کے کاسمٹکس کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں۔ انھیں استعمال کرنے والی اشتہاری تصاویر ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں دیکھکر زاہد و پارسا مرد بھی زہد و پارسائی کی کینچلیں اتار دینے پر مجبور ہو جائیں۔ ان غیر ملکی رسائل کو دیکھکر یہاں کے بھی رسائل نے نقلیں شروع کر دی ہیں یہاں بھی اسی طرح کے زہد شکن اشتہارات شائع ہونے لگے ہیں۔ یہاں بھی حسن افزا کاسمٹکس بننے لگے ہیں عریاں قسم کے لباس دیکھکر خواتین متاثر ہونے لگی ہیں، بلکہ ہو گئی ہیں اور اب سے پچاس سال پہلے جب یہاں انگریزوں کا تسلط تھا، انگریز خواتین جس لباس میں باہر نکلتی تھیں ... ان سے کہیں زیادہ عریاں ہوکر ہندوستانی خواتین نکلنے لگی ہیں۔

پھر یہ فیشن اور یہ حسن افزا لوازمات اس لئے ہوئے بھی تو نہیں کہ بن سنور کر گھر میں بیٹھا جائے۔ یہ تو باہر کے لئے ہی ہوتا ہے باہر نہ جانا ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ فیشن کے ساتھ ہی آزادی کا بڑھنا بھی لازمی ہے چنانچہ اب نہ جانے کتنے گھرانے ایسے ہیں جو نوکروں اور آیاؤں کے رحم و کرم پر چل رہے ہیں نہ شوہر کو فرصت، نہ بیوی کو۔ دونوں ہی سروس کرتے ہیں اور جب نوکری سے فرصت ملتی ہے تو مشترکہ یا جدا جدا سیر و تفریح کے لئے نکل جاتے ہیں۔ انھیں گھر کی چنداں فکر نہیں ہوتی۔ بال بچے نہ چھوٹے تو کھانا ہوٹلوں میں کھا لیتے ہیں ورنہ نوکر پکا دیتا ہے —— ایسے والدین کے بچے بھی اس طرح آزاد ہو جاتے ہیں، جن کا انھیں ڈر ہوتا ہے، جب ان سے سابقہ ہی پڑ رہا ہے تو پھر کیا فکر کیا خوف۔ وہ بھی ابتدا ہی سے بے نکیل پھرنے لگتے ہیں۔

آیئے اب آپ کو وہ واقعہ سنائیں۔ جسے پڑھ کر آپ بھی اسے عبرتناک ہی کہیں گی۔ میری ایک ملنے والی خاتون ایک لیڈی ڈاکٹر کے یہاں گئی ہوئی تھیں۔ جن سے ان کے نجی تعلقات بھی تھے۔ اس روز وہ لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کچھ پریشان پریشان سی نظر آ رہی تھیں۔ ابھی وقت ایک مرد اور ایک عورت کے ساتھ ایک جوان لڑکی مطب سے نکل کر جاتی ہوئی نظر آئی تھی۔ میری ملنے والی خاتون نے لیڈی ڈاکٹر سے دریافت کیا "کیا بات ہے دیدی۔ آپ آج کچھ پریشان سی نظر آ رہی ہیں۔"

"ٹھیک ہی محسوس کیا آپ نے" لیڈی ڈاکٹر نے کہا "پوچھو کہ اس وقت میرا کیا حال ہے، میں کئی منٹ سے سوچ رہی تھی کہ دیکھئے موجودہ تہذیب ہمیں کیا دن دکھائے گی۔ تم نے ابھی مطب سے نکل کر ایک مرد، ایک عورت اور ایک لڑکی کو جاتے دیکھا ہوگا۔ میں لڑکی کی راز دار بھی ہوں، اس لئے کہ جانے کتنے ہی اسکینڈل کے کیسز میرے پاس آتے

رہتے ہیں، لیکن اس [illegible] کی تفصیل میں تم کو صرف اس لئے سنا رہی ہوں کہ ایسا کیس میرے پاس کبھی نہیں آیا اور نہ آتا تو اچھا ہی تھا۔ میں مسلسل یہی سوچ رہی ہوں کہ ان والدین کا کیا عالم ہوگا۔ کوئی مداوا بھی تو نہیں ہوسکتا اس کا ـــــ یہ دونوں اپنی بیٹی کو دکھانے لائے تھے، انھیں اندازہ ہوا تھا کہ اس کے پیٹ میں ٹیومر ہے۔ میں نے معائنہ کرنے کے بعد انھیں بتایا کہ ٹیومر نہیں ہے، مبارک ہو کہ تمہاری بیٹی یا بہو جو بھی ہو یہ ماں بننے والی ہے۔

میں نہ جانتی تھی کہ لڑکی غیر شادی شدہ ہے اور اسے لے کر آنے والے اس کے ماں باپ تھے۔ میری بات سنکر ان پر جو کیفیت طاری ہوئی، اسے میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتی۔ بہرحال اپنے اوپر قابو حاصل کرتے ہوئے ماں نے کہا "ڈاکٹر صاحب یہ تو ابھی کنواری ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ اس کی شادی نہیں ہوئی" میں نے کہا "لیکن یہ کنواری نہیں ہے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ یہ شادی شدہ نہیں ہے تو افسوسناک بات ہے۔ آجکل یہ مرض بڑھتا جارہا ہے۔ خدا تم پر رحم کرے۔"

جب بیٹی سے استفسار ہونے لگا۔ پوچھا جانے لگا کہ بتا یہ کس کا بچہ ہے۔ باپ غضبناک ہوکر دریافت کررہا تھا اور ماں بہلا پھسلا کر پوچھ رہی تھی۔ وہ لڑکی گم صم تھی۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ جب لڑکی نے کسی طرح کوئی جواب نہ دیا تو میں اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے کیبن میں لے گئی۔ اس سے بہت ہمدردانہ باتیں کرکے اس کے خوف کو کم کیا اور اس سے کہا "بیٹی اس معاملہ میں خاموشی ٹھیک نہیں۔ اپنے والدین کو اس کا نام بتا دو جس نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ شاید تمہارے والدین اسے راضی کرسکیں اور وہ تم سے شادی کرلے۔ یہی اس کا بہترین علاج ہوسکتا ہے۔"

میری باتوں سے متاثر ہو کر لڑکی نے آخرکار اپنی نگاہیں نیچی کرکے بہت ہی آہستہ سے کہا "مگر ایسا نہیں ہوسکتا۔"

"میں نے پوچھا کیا اس نے انکار کردیا۔"

"جی نہیں۔ اس سے شادی ہو ہی نہیں سکتی۔"

"کیا اس کی شادی ہوچکی ہے۔"

"نہیں" لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ سے مسلتے ہوئے [illegible] صاحب۔ وہ میرا سگا بھائی ہے اس وقت میں اسی طرح تڑپ [illegible] کہ جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو یا بجلی کا تار لگ گیا ہو۔

ایسی بات سننے کو ملے گی، میں سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ مجھے لگا جیسے مجھے سانپ سونگھ گیا تھا۔ کچھ بول ہی نہ سکی۔ ابھی تک مجھے اس لڑکی کے باوجود اس سے ہمدردی تھی، لیکن یہ بات سنکر میری ہمدردی جیسے ختم ہوگئی تھی۔ میرے دل میں نفرت کا ایک لاوا سا ابلنے لگا تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ یہ تو معلوم کروں کہ یہ کیسے ممکن ہوگیا۔ اور میں نے اپنی نفرت کو چھپاتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا "بیٹی! یہ تو بڑی ہی شرمناک بات ہے۔ لیکن یہ ہوا کیسے؟"

لڑکی نے قدرے تامل کے بعد جو کچھ کہا وہ یہ تھا "میرا بھائی مجھ سے چار سال بڑا ہے۔ میں انٹر کررہی ہوں اور وہ لا کر رہا ہے۔ ہمارے والدین سروس کرتے ہیں۔ دونوں ہی سیر سپاٹے کے رسیا ہیں انھیں کوئی وقت نہیں ملتا کہ وہ ہماری خبرگیری کرسکیں۔ میں اور بھائی دونوں ہی آزاد ہیں، جہاں چاہیں آئیں جہاں چاہیں جائیں۔

ایک روز میں اپنے بھائی کے پڑھنے والی میز پر اتفاقاً جاکر انگریزی میگزین دیکھنے لگی۔ میرے بھائی کو انگریزی کے ایسے رسالوں سے عشق ہے جس میں حسین عریاں قسم کی تصاویر شائع ہوا کرتی ہیں۔ نہ جانے وہ انھیں کہاں سے لایا کرتا ہے۔ میگزین میں زیادہ تر اشتہار تھے اور ہر اشتہار میں عورت کو ننگا دکھایا گیا تھا۔ میں نے اشتہار تو نہیں پڑھے، لیکن ان کی تصاویر کو ضرور دیکھتی رہی جو ایسے ویسے انداز میں تھیں کہ کوئی انھیں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میگزین رکھکر میں نے نہ جانے کیوں بھائی کی میز کی دراز کھینچی۔ سامنے ہی ایک لفافہ پڑا تھا، میں نے اسے اٹھا لیا۔ اسی کھوج میں کہ بھیا کسی لڑکی سے محبت تو نہیں کرتے۔ کسی کے خط تو نہیں آئے۔ لفافہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے کوئی تصویر جھانک رہی تھی۔ ان تصویروں میں کیا تھا۔ میں کیا بتاؤں۔ میں نے کبھی ایسی تصویریں نہ دیکھی تھیں۔ یہ بڑی ہی شرمناک تھیں۔ لیکن میں انھیں دیکھتی ہی رہی۔ ہر تصویر کا انداز جداگانہ تھا۔ میں نے سوچا نہ جانے کن بے غیرت عورتوں کی یہ تصاویر ہیں۔ نفرت کے باوجود میں انھیں بند کرکے رکھ نہ سکی، الٹ پلٹ کر دیکھتی ہی رہی۔ محویت ایسی تھی کہ مجھے بھائی کے آجانے کا بھی علم نہ ہوسکا اور جب میری [illegible] تصاویر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئیں۔ اور [illegible]

اسلام میں عورت کا درجہ

صالحہ عابد حسین

ویسے تو ہر سچے مذہب نے انسانیت کے حقوق میں عورت کو حصہ دیا تھا لیکن جب اسلام دنیا میں آیا تو اس وقت مذہبوں کی تعلیم پس پشت ڈالی جا چکی تھی اور خاص طور پر عورت کی حالت تقریباً ساری دنیا میں اور خاص طور پر عرب اور اس کے آس پاس کے ملکوں میں بہت ابتر تھی۔ اس کا درجہ غلاموں سے بدتر اور جانوروں سے بھی گرا ہوا تھا۔ ایسے ایسے مظالم توڑے جاتے ان کی کہیں داد یا فریاد نہ تھی۔ ماں بہن بیٹی بیوی کسی حیثیت سے ان کا کوئی حق مقرر نہ تھا۔ نہ جائداد میں اس کا حصہ تھا نہ روپے پیسے پر اسے کوئی حق تھا۔ شاذ و نادر اس کے خلاف مثالیں بھی مل جاتی ہوں، مگر عام حالت یہی تھی۔ ایک مرد سو سو شادیاں کر سکتا تھا اور عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح باڑے میں بند رکھا جاتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں تک سے شادی رچائی جا سکتی تھی اور وہ احتجاج نہ کر سکتی تھی۔ عرب ہندوستان وغیرہ میں اکثر لڑکی پیدا ہوتی تو اسے زندہ گاڑ دیا جاتا۔ ہند میں ستی کی رسم عام تھی۔ یوں بھی بیوی کی زندگی جہنم سے بدتر بنا دی جاتی تھی!

یہ حالات تھے جب آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب میں اسلام کا ظہور ہوا۔ جناب رسول خدا محمد مصطفے صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر وحی اتری اور کلام خدا نازل ہوا اس میں مذہبی، معاشی و معاشرتی، تمدنی زندگی کے لئے احکام نازل ہوئے اور ایک مکمل نظام حیات قرآن پاک نے پیش کیا۔ اور اسی کی رو سے اسلام میں عورت کو بھی انسان سمجھا گیا اس کو بھی وہ سب حقوق ملے جو دوسرے انسانوں کو ملے اور وہ سب فرائض بھی اس پر عائد کئے گئے جو ایک انسان پر عائد ہوتے ہیں۔ اسلام میں عورت کو بحیثیت انسان اور مسلمان ہونے کے پورا اس کام کی آزادی ہے جس کی مذہب اجازت دیتا اور جو انسان کو انسان بناتے ہیں۔ سب سے پہلے مذہب کو اپنی خوشی سے اختیار کرنے اور ایک خدا کو ماننے اور اس کے احکام پر چلنے کی اسے پوری آزادی ہے کوئی بھی اس سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔ کلام پاک میں ہے کہ تم اپنے ماں باپ کا ہر حکم مانو سوا ایک [illegible] سے منکر ہونے کے حکم کے [illegible] کی حیثیت سے

اسلام نے عورت کا درجہ بہت بلند رکھا ہے۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ تم ماں (اور باپ) کی آواز سے اپنی آواز اونچی نہ کرو۔ بڑھاپے میں ان کی خدمت کرو بچپن میں انھوں نے تمہاری خدمت کی ہے ماں کے پیروں کے نیچے جنت بتائی گئی ہے!

سب سے نازک اور مشکل مسئلہ اس وقت بھی (اور آج تو یہ مسئلہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے) عورت کا بیوی کی حیثیت سے درجہ مقرر کرنے کا تھا جیسا کہ میں نے شروع میں کہا کہ ایک مرد سو سو شادیاں تک کر سکتا تھا۔ عورت کا نہ شوہر کے پیسے پر کوئی حق تھا اور کسی طرح سے اور وہ مرد سے اپنی بات منوا سکتی تھی۔ اسلام نے اول تو شادیوں پر پابندی لگائی کہ ایک مرد زیادہ سے زیادہ چار شادیاں کر سکتا ہے۔ اور یاد رکھئے یہ صرف اجازت ہے کسی مجبوری کے تحت۔ حکم نہیں ہے۔ پھر انصاف کرنے کی اتنی کڑی شرط لگا دی کہ سچا مسلمان اس کے تحت مشکل ہی سے ایک سے زیادہ شادی رچا سکتا ہے سوا کسی عذر شرعی کے شادی کے وقت مرد کو بیوی کا مہر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو لوگ مہر کی اہمیت اور قدر کو نہیں جانتے وہ یہ سمجھتے ہیں اور بعض تو کہتے بھی ہیں کہ صاحب عورت کی قیمت دی جاتی ہے یہ بہت بڑی غلط فہمی یا بدگمانی ہے۔ ہر عورت کا فطری حق ہے کہ وہ اپنی ذات، اپنی دلچسپیوں، اپنے گھر بار، اپنے ماں باپ اور اپنی خوشی کے کاموں کو چھوڑ کر ایک مرد کو اپنا نفس اسے پیش کرتی ہے۔ اور خدمت میں اپنی زندگی گزارتی ہے۔ اسلام نے عورت کی اسی قربانی کے صلے میں مرد کو یہ حکم دیا کہ وہ شادی کے وقت حق مہر عورت کو ادا کرے۔ جیسی کی جیسی حیثیت ہو۔ پیسہ والا اپنی حیثیت کے مطابق دے اور غریب اپنی حالت کے مطابق۔ عام طور پر مرد کی آدھا سال کی آمدنی کا آدھا حصہ عورت کا مہر ہونا چاہیئے۔ اور اسے ادا بھی کرنا فرض ہے۔ احسن تو یہ ہے کہ شادی کے وقت ہی نقد روپیہ ادا کیا جائے۔ اور پھر یہ روپیہ عورت جس طرح چاہے اسے استعمال میں لا سکتی ہے۔ اگر [illegible] کا مسلمان ہر قاضی [illegible]

پرساد:۔ کیسا کاغذ ہے۔ ذرا ہم بھی دیکھیں۔

نواب:۔ ہاں پرساد سے پڑھوائیں گے۔ پرشاد۔ لو پڑھو۔ دیکھو کہ یہ کیا ہے۔ (کاغذ پرساد کو دیتا ہے)

پڑوسن:۔ نکو نواب صاحب نکو بولے تو۔

نواب:۔ ہاں دیکھو یہ بڑا قیمتی کاغذ ہے۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

پرساد:۔ ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھنا چاہیئے اور اس پر فکر کرنا چاہیئے۔ ایک تو یہ کہ یہ بڑا پرانا اور بوسیدہ کاغذ ہے۔

پڑوسن:۔ ہو پرانا تو ہے۔

پرساد:۔ دوسرے اس پر کچھ نقش اور مبہم الفاظ ہیں۔ جیسے یہ شین واؤ رے

پڑوسن:۔ ہو وہ شلوار ہے۔

پرساد:۔ شلوار نہیں بی جانی ماں۔ یہ ضرور کسی خزانے کا نقشہ ہے اور اگر ہم اس کاغذ کو اور اس کی عبارت کو۔ غور سے دیکھیں، اسے حل کرلیں تو ہمیں یہیں آس پاس کوئی نہ کوئی خزانہ مل سکتا ہے۔

پڑوسن:۔ خزانہ۔!

پرساد:۔ ہاں بی جانی ماں یہ بڑا اہم معاملہ ہے" مجھے یاد آیا۔ ہمارے گھر میں بھی دادا جان کہتے ہیں ان کے زمانے میں ایک ایسا ہی کاغذ ملا تھا۔ جس میں خزانے کے نقشے کا پتہ تھا۔

نواب:۔ خزانے کے نقشے کا پتہ۔

پرساد:۔ ہاں نواب صاحب، میں بتاتا ہوں، ایک نہایت پرانے ایسے ہی کاغذ پر اوپر رام رام لکھا ہوا تھا۔ اور رام رام کے ایک طرف سورج بنا تھا۔ پھر دال اور سین اور قدم لکھا تھا۔

پڑوسن:۔ وہ تو معلوم ہے۔ دال سین قدم بولے تو دس قدم۔

پرساد:۔ بی جانی ماں تم بہت ہوشیار نکلیں۔

نواب:۔ ہاں۔ عقل نہ ہو تو کیا ہوا بی جانی ماں بہت ہوشیار ہیں۔

پرساد:۔ اچھا نواب صاحب فرمایئے سورج سے کیا مطلب ہے۔

نواب:۔ سورج سے کیا مطلب ہے سورج اور کیا۔

پرساد:۔ (ہنستا ہے) اچھی طرح سوچیئے۔ غور کیجئے۔ پھر بولئے۔

نواب:۔ بھئی میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

پڑوسن:۔ میں بولوں پرساد بھائی۔

پرساد:۔ ہاں ہاں بولو۔

پڑوسن:۔ نواب صاحب سورج سے کیا مطلب ہے، جدھر سے سورج نکلتا۔

پرساد:۔ بھئی واہ واواہ۔ بالکل صحیح۔ سورج کی تصویر سے یہاں مطلب ہے مشرق۔ اور دادا جی نے جب اس کاغذ کو بہت سے لوگوں کو دکھایا تب کہیں اس کاغذ کا مطلب سمجھ میں آیا اور بجھایا گیا

نواب:۔ کیا مطلب سمجھا گیا۔ رام رام سورج اور

پڑوسن:۔ ہو دس قدم

نواب:۔ ہاں ہاں تو رام رام سورج اور دس قدم سے کیا مطلب سمجھا

پرساد:۔ ایک بڑے گیانی نے کہتے ہیں ہمارے دادا کو بتایا کہ آپ کے وسیع صحن میں کسی طرف ضرور کوئی مندر ہے۔ دادا نے کہا، ہاں ایک طرف چھوٹا سا مندر ہے۔

پڑوسن:۔ ہو۔۔۔؟ ایسا؟

پرساد:۔ پھر اس گیانی نے کہا کیونکہ یہاں رام رام کی سیدھی جانب سورج بنا ہے اس لئے مندر سے مشرق طرف وہ خزانہ ہے۔

نواب:۔ تو صرف مشرق کہدینے سے کیا ہوتا ہے۔

پرساد:۔ تبھی تو کہی، گیانی نے دادا جی سے کہا کہ مندر سے مشرق کی طرف دس قدم چل کر زمین کھودی جائے۔

پڑوسن:۔ اگو، مندر سے دس قدم چل کے کھودے پھر؟۔

پرساد:۔ ہاں کیوں نہیں۔ دادا جی نے جیسا بتایا گیا تھا ویسا ہی کیا۔ واقعی ان کے دادا کا جمع کیا ہوا خزانہ وہاں موجود تھا۔

نواب:۔ واہ واواہ۔

پڑوسن:۔ بھوت روپیہ، دولت، سونا چاندی ہیرے جواہرات ملے ہوں گے یعنی پرساد بھائی آپ کے دادا کو۔

پرساد:۔ (ہنستا ہے)

نواب:۔ ایں تم ہنس رہے ہو۔

پرساد:۔ بڑے مزے کی بات ہوئی، اس زمانے میں ہر طرف چھپے ہوئے خزانے ڈھونڈنے کا اور زمین کھود کر جلد سے جلد بہت سی دولت پانے کا جنون شروع ہو گیا تھا۔ ہر طرف لوگ خزانے کی تلاش میں تھے اپنے گھر میں [illegible] کہیں بھی ہو خزانہ

مل جائے۔

نواب :۔ یہ سب جانے دو تمہارے دادا کو خزانہ ملا یا نہیں!

پڑوسن :۔ ملا ہی ہوں گا۔

پرساد :۔ جب کاغذ کی ہدایت کے مطابق زمین کھودی گئی تو ایک مذاق نکلا۔

پڑوسن :۔ بہت پرانا ہوں گا نہیں۔

پرساد :۔ ہاں بہت پرانا مذاق تھا۔ سارے لوگ اس کے آس پاس جمع ہو گئے، صندوق اوپر نکال کر آہستہ آہستہ کھولا گیا۔ تو۔

نواب :۔ تو۔

پڑوسن :۔ تو۔

پرساد :۔ مذاق میں کچھ نہیں تھا صرف ایک ایسا ہی پرانا کاغذ تھا، بوسیدہ سا، کاغذ پر لکھا تھا علم اور محنت ہی زندگی کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

پڑوسن :۔ اچھا۔

پرساد :۔ اور کیا۔ بالکل سچ ہے، دیانت، ایمانداری، محنت اور علم ہی دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہیں۔

نواب :۔ تو پرساد اب بی جانی ماں کے اس بوسیدہ کاغذ کے خزانے کو بھی ذرا بات کرو۔

پرساد :۔ ہاں یہ بھی بڑا مشکل نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ خیر ڈھونڈتے ہیں یہ ہے واؤ نون، ہوا کیوں۔ دیکھئے نواب صاحب ایک بات ہے اس کا مطلب ہے جہاں ہمیشہ ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی ہے وہاں خزانہ ہے۔ لیکن

پڑوسن :۔ (ہنستی ہے) نہیں پرساد بھائی، یہ واؤ نون، وہ پتلون ہے۔

پرساد :۔ یہ۔ یہ پتلون ہے۔

پڑوسن :۔ ہو۔ یہ کاغذ خزانے کا نقشہ نہیں دھوبن کا حساب ہے، میرا کاغذ ہے۔ پندرہ دن پہلے دھوبن کو کپڑے ڈالے تھی نہیں وہ کاغذ ہے۔

پرساد :۔ یہ دھوبن کو ڈالے گئے کپڑوں کا حساب ہے۔

پڑوسن :۔ ہو بولے تو۔

پرساد :۔ تو سب سے پہلے ایک کام کرو۔

نواب :۔ وہ کیا۔

پرساد :۔ روزانہ شام میں ہمارے گھر کے ڈھالے تک آ جاؤ۔

پڑوسن :۔ روزانہ شام میں آپ کے گھر کے ڈھالے میں آؤں۔ وہ کاہے کو۔

پرساد :۔ ارے بھائی، وہاں بڑے لوگوں کا اسکول چل رہا ہے عورتیں بھی پڑھنے آ رہی ہیں۔

پڑوسن :۔ (ہنستی ہے) اوئی۔ یہ عمر میں پڑھوں گی۔

پرساد :۔ کیوں بڑے بڈھے لوگ پڑھنے آ رہے ہیں۔ تم کو کیا ہوا۔ کچھ نہیں کل شام سے تم کو بھی اس بالغوں کے اسکول میں پڑھنے آنا ہوگا کیوں نواب صاحب۔

نواب :۔ بالکل آنا ہوگا بی جانی ماں۔ پھر پشین واؤ نون سے شلوار کی بات نہیں رہے گی۔

پرساد :۔ اور پھر وہ نہیں سنا کہ جب جاگو جب سویرا ہے۔

نواب :۔ بے شک، بے شک۔

(تینوں ہنستے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

کبھی رو پڑا تبسم ...

مسز رائے۔ اعجاز

محبت وہ حسین جذبہ ہے جو روح کے ساز دل نواز پر جلترنگ کا [illegible] ہے لیکن جب اس عظیم جذبے کو ٹھیس پہونچتی ہے تو یہ [illegible] جاتا ہے۔ اور زندگی کے آنچل پر بدنما دھبوں کی مانند [illegible] ہے۔

حقیقت چاہے کتنی بھی تلخ کیوں نہ ہو لیکن بہرحال پوری سچائیوں کے ساتھ سامنے والا فرد ہی کہ ہر دم ٹیس اور جلن کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

محبت کو ایک ایسا ہی کھیل سمجھ کر کھیلنے والی الہڑ اور نادان زرینہ کو جب عمر بڑھنے لگی [illegible] اس کے ہاتھ میں تنہائی تو اس کے سارے [illegible] مسکراہٹ سی تیر گئی اور یک بیک اپنے چاروں طرف زہریلے ناگ پھنکارتے دکھائی دینے لگے۔ اس نے واپس جانے کو سوچا مگر پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ وہ قریب ہی پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا چکراتا ہوا دماغ ماضی کے ان ہنستے کھیلتے دنوں کی طرف گھوم گیا جہاں پہنچتے ناسور بن گئے۔ وہ ماضی ایک ایسا رستا ہوا زخم بن گیا کہ جس کا مداوا ابھی ممکن نہ تھا۔

اس نے جب [illegible] تھا تب وہ بیت محبت کا کھیل شروع ہو گیا۔ زرینہ نے محض مذاق سمجھا تھا وہ صرف لڑکوں کو بے وقوف بناتی تھی۔ جب [illegible] پیغام محبت ملتا وہ ہر ایک کا پیغام قبول کر لیتی۔ اور چند دن ناٹک رچا کر کسی بات پر جھگڑ کے چھوڑ بیٹھتی اور تب کسی دوسرے کو [illegible]۔ اس کی سہیلیاں اسے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کرتیں مگر وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتی۔

"ارے کیا رکھا ہے ان باتوں میں، چار دن کی زندگی ہے ہنس کر گذار دو۔"

"نہیں زرو! تم غلط سوچتی ہو۔ محبت کو ازل سے مظلوم بنایا گیا ہے۔ [illegible] کر مر جاؤ اگر کبھی جیت ہی جاتا ہے۔"

"ہونہہ" زرینہ جھنجھلا گئی۔ ".... یہ فلسفیانہ باتیں ہیں...." اور وہ [illegible] تھی۔ کیونکہ وہ صرف ہنسنا چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف تقدیر بھی ہنس رہی تھی۔ جب اس نے یہی مذاق ایوب کے ساتھ کھیلنا چاہا کہ اس کے والد کے کارخانے میں نیا نیا ملازم ہوا تھا تو اسے کوئی بھی یہ خیال نہیں تھا کہ یہ محض ناٹک نہیں رہے گا بلکہ سچائی کا روپ دھار لے گا۔ زرینہ ایوب کی جاذب شخصیت میں ڈوبتی چلی گئی۔ چوڑے سینے کسرتی ہوئے جسم سرو قد والا ایوب اس کے دل پر حکمرانی کرنے لگا اور محبت کے اس راستے پر وہ اتنا دور نکل گئے کہ منزل بھی گم ہو گئی۔

زرینہ کو جھرجھری سی آگئی۔ اسے وہ شام یاد آئی۔ جب لڑکوں کو الّو بنانے والی شوخ و شنگ زرینہ خود بھی شکار ہو گئی۔ اس دن پورے آٹھ روز کی مسلسل بارش کے بعد ذرا دیر کو سورج چمکا تھا تو زندگی میں حرارت سی آگئی تھی سڑکوں پر چہل پہل ہو گئی۔ بارش کے دنوں میں یوں بھی ذہنی سکون کم ہو جایا کرتا ہے۔ تب ہی زرینہ کو ایوب کی یاد آئی اور وہ سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے ایوب سے ملنے چل دی۔ آٹھ دس دن بعد زرینہ کو آتے دیکھ کر ایوب باغ باغ ہو گیا۔

"کیا یوں بھی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔؟" ایوب نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" زرینہ اس کی نگاہوں کی گرمی سے گھبرا کر بولی۔

"مطلب یہ کہ ابھی ابھی تم سے ملاقات کا بہانا سوچ رہا تھا ... کہ تم آگئیں" زرینہ جھینپ گئی اور پھر بڑی دیر تک دونوں مختلف موضوعات پر بحث کرتے رہے۔ انھیں نہ وقت گذرنے کا احساس ہوا نہ یہ کہ بارش پھر شروع ہو چکی ہے۔ بڑی دیر بعد جب زرینہ اٹھنے لگی تب ایوب نے یہ خوشخبری سنائی کہ عنقریب اس کی والدہ پہنچنے والی ہیں تب ... باقاعدہ زرینہ کو اس کے ماں باپ سے مانگ لے گا۔

وہ باہر آئی تو بارش ہلکی ہلکی ہو رہی تھی۔ اس نے نکل جانا چاہا مگر ایوب رضامند نہ ہوا۔ زرینہ جانتی تھی کہ اب اگر چند منٹ بھی رکی تو گھر والے پریشان ہو کر آدمی دوڑا دیں گے [illegible] ایوب کو خدا حافظ کہہ کر

پر نکل ہی آئی۔ رات کافی گہری معلوم ہو رہی تھی۔ ایوب بھی زرینہ سے چند قدم پیچھے چل رہا تھا مبادا زرینہ ڈر جائے۔ اور وہی ہوا۔ یکایک جو بادل زور سے گرجے تو زرینہ کی چیخ نکل گئی۔ ایوب نے جلدی سے سنبھالا نہ ہوتا تو وہ گر ہی جاتی۔ وہ نیم بے ہوش سی ہو گئی تو ایوب اسے اپنے ہی کمرے پر لے گیا دونوں چھتری ہونے کے باوجود بڑی طرح بھیگ چکے تھے کمرے میں پہنچ کر زرینہ کے اوسان درست ہوئے تو کیا جائے تو کیسے ....

کپڑے بدن سے چپک رہے تھے۔ گلابی رنگ کے سوٹ سے اس کا گلابی بدن جھلکنے لگا تھا۔ بھیگے اور کنوارے بدن کی مہک۔ اور تنہائی .... ایوب حیران سا ہو کر دیکھنے لگا۔ کوئی چیز ریڑھ کی ہڈی میں سرسراتی گزرنے لگی۔

اور پھر ——————

ایک طوفان آیا اور گزر گیا۔ جب ہوش آئے تو ایوب کو حیرت ہوئی کہ زرینہ کے چہرے پر ندامت کے آثار نہیں تھے بلکہ ایک فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔ ایوب پشیمان سا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ اب، اگر میں اس لڑکی سے شادی کروں گا تو آج کی یہ شام کبھی نہ بھلا سکوں گا اور نہیں اس لڑکی کی زندگی تباہ ہو گی مگر زرینہ اس کے برعکس یہ سوچتی کہ اب ایوب میرے علاوہ اور کسی سے شادی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ ایوب کے مزاج کو جانتی تھی۔

زرینہ پھر تقریباً روز آتی اور جلد شادی کرنے کے لئے تقاضہ کرتی لیکن اس کے جانے کے بعد ایوب وحشیانہ انداز میں اپنے چاروں طرف دیکھتا اسے اس کمرے سے نفرت ہو گئی۔ یہاں کی ہر چیز اسے اس شام کی یاد دلاتی محسوس ہوتی ——————

لیکن

زرینہ کے چہرے پر ایک بار بھی شرمندگی کے آثار نہیں دیکھے وہ بہت مطمئن محسوس ہوتی۔ پہلے سے زیادہ خوبصورت تھی۔ ایوب کو یہ رویہ بڑا عجیب لگا مگر رفتہ رفتہ وہ یہ سمجھنے لگا زرینہ شرمندگی کا اظہار نہ کر کے عقلمندی کر رہی ہے وہ مجھے یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ شادی کے بعد کبھی بھی اس شام کی چبھن کو محسوس کر سکے ایک دوسرے کا شرمندگی کا شکار نہ ہونے دیں گے ——————

اور زرینہ پھر اس کی نظروں میں عظیم ہو گئی۔

اور تب —————— ایک دن اچانک ایوب کی والدہ رشتہ لے کر آ گئیں۔ زرینہ کو [illegible] رشتے میں آ گئے [illegible] کیونکہ وہ [illegible] شادی [illegible] صاحب [illegible] دوسری [illegible] نہیں [illegible] [illegible] آنکھیں [illegible]۔

حلیمہ بیگم نے دولت کی فراوانی دیکھی تو بڑے دن بھول گئیں۔ اور دوسروں کو کمتر سمجھنے لگیں۔ یوں تو زرینہ بھی کم مغرور نہ تھی مگر ایوب کے معاملے [illegible] لیکن وہ جانتی تھی کہ اسی کے والد کے کارخانے میں کام کرنے والے ایک معمولی کلرک سے حلیمہ بیگم ہرگز اپنی بیٹی کی شادی نہیں کریں گی۔

اور پھر وہی ہوا —————— رشتہ کو جواب دیدیا گیا۔ اور اس دن گھر میں بڑا ہنگامہ ہوا جب زرینہ نے اپنی سہیلی عذرا کے ذریعہ صرف ایوب سے شادی کرنے کا پیغام بھجوایا۔ مگر بڑے بھیا اور امی [illegible] بھائی جان اور آپا نیم رضامند تھے۔

اس غم نے زرینہ کو بخار میں مبتلا کر دیا۔ بخار بڑھتا گیا۔ اور زرینہ کا [illegible] بھی نہ رہا۔ سبھی گھر والے گھبرا گئے۔ ڈاکٹر کے آنے کا پتہ بھی نہ لگا۔

بخار کی تیزی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ کانوں سے نکالتے ہوئے کہا۔ لیکن تیز دوا بھی نہیں دی جا سکتی .... کیوں؟ بھیا نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

کیونکہ لڑکی حاملہ ہے۔ لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ زیادہ بہتر ہوگا۔ اور بھیا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ زیادہ شرمندگی اس لئے ہوئی کہ ساتھ میں بھیا کے دوست راشد نے بھی سنا جو خود زرینہ کے امیدوار [illegible] تھے۔ گھر والوں پر کیا قیامت گزر گئی زرینہ کو پتہ نہ لگا۔ لیکن جب اسے ہوش آئے اور یہ خبر اس کے کانوں تک پہنچی تو اسے اپنے چاروں طرف موت کے بھیانک سے لہراتے نظر آنے لگے خوفزدہ ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ایک ہفتہ بعد جب ذرا طبیعت سنبھلی تب وہ چپکے [illegible] ڈاکٹر بانو کے کلینک پہنچی اور آج میڈیکل رپورٹ سے تصدیق بھی ہو گئی۔ اُسے دنیا اندھیری دکھائی دینے لگی وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔

اس کے قدم خود بخود ایوب کے کمرے کی طرف [illegible] [illegible] اور وہ اس کی [illegible] زرینہ کو دیکھ کر اس کے دل میں [illegible] وہ اندھیرے [illegible] جا چکا تھا کہ [illegible] [illegible] کے ساتھ جب زرینہ نے میڈیکل رپورٹ اسے دی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

اور پھر —————— [illegible]
[illegible]

کے کرتوت پر بھاری قیمتی اور کرکے پردہ ڈالوایا گیا ــــــ لیکن قدرت بھی اس گناہ کی اتنی سی سزا پر مطمئن نہ ہوئی۔ بات کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی۔ خاندان میں لعنت ملامت ہو رہی تھی۔ لیکن اس وقت سارا خاندان بھونچکا رہ گیا جب اچانک زرینہ کی منگنی شیخ صاحب سے ہوگئی وہ اگرچہ معمر تھے مگر آج تک خاندان والوں کے اصرار کے باوجود شادی کے لیے آمادہ نہ ہوئے تھے لیکن اب خاندان والوں کی مخالفت کے باوجود زرینہ کو قبول کرنے کو تیار ہو گئے۔

ایک ماہ بعد دونوں کی شادی ہوگئی۔

شیخ مطمئن تھے، وہ زرینہ کا ماضی جانتے تھے مگر انھیں تو محض ایک گھروالی کی ضرورت تھی۔ انھوں نے زرینہ کو بتایا کہ وہ اُسے اولاد جیسی نعمت نہیں دے سکتے تھے۔ اور کیوں کہ زرینہ کو کوئی دوسرا قبول نہ کرتا تھا اس لیے شیخ صاحب نے سہارا دیا۔ کہ انھیں گھروالی مل گئی اور زرینہ کو مرد کا مضبوط سہارا ــــــ یوں وہ سماج میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل بھی ہو سکے۔

لطیفے

○ خاتون کپڑا خرید کر لائیں اور آتے ہی اپنے میاں سے کہنے لگیں۔ دیکھیں کتنا خوبصورت کپڑا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے لیے ایک خوبصورت سا رومال بناؤں۔

شوہر نے حیران ہو کر کہا۔ اس سارے کپڑے سے صرف ایک رومال بناؤ گی۔ یہ تو ہم دونوں کے لیے کافی ہے۔

خاتون نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ایک رومال سے جو کپڑا بچے گا اس سے میری قمیض بن جائے گی۔

○ ایک خاتون نے کسی سے پوچھا میں کتنے سال کی لگتی ہوں؟ بالوں سے ۲۰ سال کی دانتوں سے ۲۵ سال کی اور جسم سے ۱۸ سال کی۔ عورت کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تب وہ شخص دوبارہ بولا۔ ان سب کو جمع کر دو تو ٹوٹل ایکا ون سال بنتا ہے۔

○ ایک صاحب سے ان کے دوست نے پوچھا۔ کل رات جب تم دیر سے گھر پہنچے تو تمہاری بیوی نے کیا کہا؟ ان صاحب نے جواب دیا۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ آگے والے دانت تو ویسے بھی نکلوانا چاہتا تھا

نانی اماں نے ٹی وی دیکھا

(عفت موہانی)

اب تو میں جی میں سوچ لی تھی کہ بھائی دنیا کا بہت حساب زیادہ ہو گیا۔ ساری اللہ میاں کی بے فضول عمر یونہی شب شب میں تیری میری غیابتیں کرتے گزاری ہوں۔ کبھی ساس بہو میں پھس ڈلوائی۔ کہیں میاں بیوی میں سر پھٹول کرایا۔ یہ ساری باتیں گنے گاری کی ہیں۔ اس لئے مرے پیچھے پاک بے نیاز دریافت فرمائیں گے کہ بی عمران نسا، تم نے ہماری دنیا میں کیا اُدھم مچا ڈالا اور اب یہاں کیا اودھم مچانے آئی ہو۔ تو میں حق دق ہو جاؤں گی دنیا جہان کے مالک کے سامنے۔ اور وہاں میں اکیلی بھی تو نہیں ہوں گی۔ ساری مخلوق عالم اکٹھا ہو گی۔ ان سب کے سامنے کیسی جھک بے عزتی ہو گی!۔ وہ لوگ دل میں ٹھٹھے اڑائیں گی کہ ان بڑی بی کو دیکھئے۔ نہ پیٹ میں دانت نہ منہ میں آنت۔ سر کے اوپر سویرا ہے۔ صورت کے قالین پر مار کے شکنیں پڑی ہیں مگر صاحب اللہ میاں کی ڈانٹیں نوش فرما رہی ہیں!۔ تو ایسی خوفناک بے عزتی کا خیال فرما کے میں نے دل ہی دل میں سوچ لی کہ اب بس عمر بھر اللہ ہی اللہ صاحب کی رٹ لگا کے مر جاؤں گی!۔ اللہ صاحب ہی نیک عقل دیدیں!۔

میں نے اپنی جا نماز نکال کے اِدھر اُدھر سے سی لی۔ کونے کھدروں میں تسبی (تسبیح) ڈھونڈی۔ نہ ملی۔ ! مجھ پر نالت۔ نہ وہ نماز کا ہے نہ روزے کا۔ وہ تسبی کیا کھٹکھٹائے گا۔ نہ جانے کہاں پھینک دی۔ اس پر ستر ہزار دنا لتیں پھینک کے میں نے باورچی خانے سے املی کے بیج اکٹھا کر لئے۔ انھیں گنا تو پورے ستر نکلے۔ انھیں دھو دھلا کے ایک کلھیا میں رکھ لئے کہ رات کو پڑھوں گی!۔

دن کو میں نہائی دھوئی۔ عطر لگایا خوشبو لی۔ اللہ میاں کے دربار میں بھی پاک صاف ہو کے جانا تھا!۔

ابھی میں کاجل لگا ہی رہی تھی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور وہ گبڈا نظر آیا۔

" [illegible] کہاں کی تیاریاں ہیں!" وہ میرے پاس آکھڑا

بولا۔

" آج تو خوب چمک رہی ہو۔ اماں!"

" میں عالم بے حیا زنی رہی۔ اب بس بے تیرے بہت کم بولنے لگی ہوں۔"

" اماں تمہاری چاند ایسی شکل اس ہتھیلی بھر کے ورقے ہوئے آئینے میں پوری دکھائی نہیں دیتی" وہ بولا " کبھی ایک کان آئینے کے باہر رہ جاتا ہے تو کبھی آدھا ماتھا اور پر نکلا رہ جاتا ہے۔ اماں مجھے پانچ روپے دو تو میں تمہارے لئے ایک سنگھار میز لے آؤں۔ اماں اس میں تم تلوؤں سے تالو تک سالم نظر آؤ گی!"

" اتنی بڑی تحریکا ہے کے لئے گی؟" میں اُسے گھوری۔

" تم سے تو بات ہی کرنا مصیبت ہے اماں" وہ خفا ہونے لگا۔

" ارے کمینے۔ ! مجھے ضعیفی کے مارے نظر ہی کم آ رہا ہے" میں کہا غصے ہو لی " آئینے میں کیا خاک دیکھوں گی!"

" تو پھر اماں تم نے پہلے سے کہا کیوں نہیں" وہ فکرمندی سے بولا۔

" کیا کرتا تو۔ اگر پہلے سے بول دیتیں۔ کیا مجھ سے آنکھیں درس کر دیتا"

" میں آئی اسپشلسٹ کو دکھوا لاتا!۔"

" کیا کیا؟!۔"

" ماہر چشم!۔"

" ہاں تو وہ کیا کرتا۔ آپ ریشم کر دیتا نا۔ !"

" کیوں کر دیتا آپریشن۔ وہ بتاتا کہ آخر کیا کمزوری ہے؟۔"

" پھر نہ بتاتا۔ دھکے میں رکھ کر چیر پھاڑ ڈالتا۔"

" اماں۔ کمزوری آنکھوں کی ٹھیک نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ شام کو چلو تو میں دکھوا لاؤں۔ !"

" عینک والے کے گا رہے؟" میں کراہ کر بولی۔

" عینک نہیں اماں۔ عینک ! چشمہ!" وہ بولا " کبھی تو تم صحیح لفظ بھی بولا کرو۔ اتنے دنوں سے آپا کی اور میری محنت میں رو رہی ہوں"

" ہاں میاں تم دونوں تو بڑے قادر اور ستم ہو نا"

" یہ وہ قول کون تھے اماں تمہارے؟"

" جیسے کون ہو گے میاں جی۔ بڑے نامی گرامی عالم دین تھے!"

عالم دین نہیں تھے اماں۔

"کیا جانے۔

تم بھی کیا جانو۔

پھر وہ کون تھے جن کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

مثالیں دی جاتی ہیں۔ افلاطون، بقراط، ارسطو، اور سقراط کی"

تجھے کیسے معلوم ہوا؟" میں دنگ رہ گئی۔

تم جا کہاں رہی تھیں۔؟"

کہیں نہیں۔ اللہ صاحب کی درگاہ میں!" میں بولی۔

ارے اماں توبہ۔ ابھی سے اللہ صاحب کی درگاہ میں مت جاؤ"

وہ خبیث ہنسنے لگا!" یہ خواہ مخواہ اللہ صاحب کے یہاں جانے کی تمہیں کیا سوجھی ہے۔ ذرا تو سوچو کہ پھر ہمیں کون پکا پکا کے کھلائے گا!"

ہاں ہاں۔ تیرے لئے بس اتنی ہی اوقات ہے میری کہ میں پکا پکا کے تمہیں بھرا یا کروں۔ اور کیوں رہے۔ اگر تیری جوڑو آ جائے گی تب تو سوچے گا کہ اماں چاہے مریں چاہے جئیں۔ کیوں؟" میں کڑکی!

"تم اس اکو کی پیچی کرلاتی ہی نہیں ہو اماں۔ اس لئے نہ وہ آئے گی اور نہ تم مرو گی۔ بس ٹھاٹھ سے جیو جب تک تمہارا دل چاہے!"

میں نے دل میں سوچی (میں ہر بات دل میں سوچتی ہوں) کہ اچھا ہی ہے۔ نہ اس حرام خور کی جوڑو آئے گی نہ میں مروں گی۔ تب تو اس کی شادی ہی نہ کرو۔ اور اطمینان سے زندہ رہو۔!

نجن مجھ سے بکواس کرنے کے بعد اٹھ کر دالان میں چلا گیا!۔ پھر وہ وہیں سے چیخا۔

"ارے اماں۔ یہ کیا۔ گھر کا کونہ مسجد نظر آ رہا ہے۔!"

اور کیا۔ جیسا تو کافر ہے۔ ویسا ہی دوسروں کو سمجھتا ہے" میں ادھر لپکی۔

یہ پھٹی ہوئی دری بچھا کے کونے میں کھیا کاہے کی رکھی ہے اماں!" بدمعاش کا فرجہنمی مخلوق" میں گرجی "تجھے جانماز پھٹی دری دکھائی دے رہی ہے۔ توبہ کر۔ اور یہ کھیا میں املی کے پورے تنو چنے ہیں۔

کیوں رکھے ہیں؟" وہ بھی گرجا

"تو نے میری تسبیح نہ جانے کہاں غائب کردی۔ درود شریف پڑھنے کے لئے"

چنوں پر درود شریف پڑھوگی۔!" وہ بولا "کیا یہ گناہ نہیں ہے؟ بس

تو پھر کیا کروں؟" میں دھاڑی۔

برسوں سے تم نے نہ نماز پڑھی نہ درود شریف پڑھا ہے۔ سب کچھ خود ہی کہیں رکھ کے بھول گئی ہو۔ اور نام میرا بدنام ہے" وہ بولا اور پھر گھر کی کوٹھریا میں گھس گیا۔ وہاں سے وہ جالوں میں لپٹی میری جانماز اور گرد میں گپّا تسبیح اٹھا لایا۔

"یہ لو۔ رکھو اپنی چیزیں" وہ غرایا۔

تجھے یہ وہاں کیسے ملیں؟" میں نے پھٹ پھٹ کر کے ان کی گرد جھاڑی۔

اب میرا نام مت لینا" وہ بولا۔

"کیا کرے گا۔ تو پے کے منہ پر پھر وہ کپڑا اڑا دے گا؟"

اماں تم جیسے جیسے عمر والی ہو رہی ہو۔ تمہارا ذہن اور کیا کہتے ہیں کہ اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ تم اپنا علاج جم کے کراؤ۔ اماں"

آسیب کیوں آتا مجھ پر؟" میں بگڑ اٹھی۔

آسیب؟ آسیب کا کیا تذکرہ ہے!۔

تو ہی بک رہا ہے کہ آسیب جواب دے رہا ہے!"

میں اعصاب بول رہا تھا۔ نروس سسٹم!! سمجھیں!"

یہ کیا چیز ہوتی ہے" میں بولی۔

"تم یہ بتاؤ کہ عینک کے لئے چلوگی کہ نہیں"

پیسے کہاں ہیں؟" میں منمنائی۔

میں دے دوں گا۔ تم چلو تو۔!'

پھر نماز۔ تلاوت؟۔ (تلاوت) میں بولی۔

آنکھیں بند کر کے کر لینا"

چل ہٹ۔ اندھا یا محتاج لاچار ہو جاؤں گی!" میں کھسیائی" میں نہ مانوں گی۔ نجانے تو کیا کرائے مجھے آنکھوں کے بہانے"

"تمہاری مرضی اماں۔ عینک لگاؤگی۔ بن ٹھن کے چلوگی تو ذرا اسمارٹ نظر آؤگی!"

چل رے مسٹنڈے۔ اب مجھے اسمارٹ نظر آ کے کیا کرنا ہے بڈھی تو ہو چلی ہوں۔ تجھ جیسا ساٹھ اوپر چھ سال۔ توبہ!"

کس کو دکھانا چاہتی ہو؟" وہ غرا کے بولا۔

ارے۔ یہی آس پڑوس کے لوگ کسی کو معلوم تو ہو کہ [illegible] [illegible] حسین خوبصورت ہیں!۔ کوئی [illegible] [illegible] طرف

"تم بکا کرو۔ میں جا رہا ہوں۔ ٹی۔ وی دیکھنے!"
"کیسے دکھائی دے گی ٹی بی" میں چمکاری "وہ تو ڈھوروں (مرتوتوں) کے بدن کے اندر ہوتی ہے!"

بجن حرام خود قہقہے لگانے لگا "اماں۔ یہ باہر ہوتی ہے!"

"تو دیکھ کے کرے گا کیا؟" میں بولی "نگلائے گا بیماری دلمی اور سارے میں پھیلائے گا!"

"تم کو بھی دکھاؤں گا!" وہ بولا۔

"مجھے میرے مولی بچائیں"

"اماں تم نے ٹیلی ویژن کا نام نہیں سنا؟"

"سنا کیوں نہیں" میں بولی "جنت نصیب تیری چھوٹی خالہ کو ہوگیا تھا۔ بری طرح ہوا تھا۔ سر کے بال نوچتی تھیں۔ کپڑے چیر ڈالتی تھیں۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ شادی کردو۔ شادی کردی گر پہلے ہی نفاس میں وہ اللہ کو پیاری ۔۔۔"

"ارے اماں۔ خدا کے لئے۔ سانس لے لو" بجن پر پاگلوں کا سا دورہ پڑگیا "اماں۔ وہ ہسٹریا کہلاتا ہے۔ مگر۔ یہ۔ یہ تو"

"وہ بی چاری ان پڑھی نہ لکھی اسے یہ ہسٹری پسٹری کیا معلوم" میں عالمانہ شان سے بولی۔

بجن بیدم ہو کر پلنگ پر گرا۔ میں اس کی حماقتوں پر ہاتھ ملا کی۔ اے ہاں۔ ایسا اونچا پورا زبردست لڑکا جب ایسا احمق ہو جائے کہ اسے نہ تو ٹی بی کے معنے معلوم ہوں نہ وہ ان کی بیماری جانے۔ تب پھر کیا اس پر رنج نہ کیا جائے گا! معلوم اپنے دفتر میں کیا بونگل پن کرتا ہوگا۔ میں اس کے ساتھ جاتی تو اچھا تھا۔

دو بلٹ (منٹ) بعد وہ اٹھا اور بولا "اچھا اماں۔ ذرا تم میرے ساتھ یہ اپنے ہمسائے بیرسٹر صاحب کے پاس تو چلو۔ ضروری کام ہے"

"نہ بھیا۔ وہ کوئی مقدمہ دھر کے ٹھونک دیں گے۔ خامخواہ" میں بولی۔

"تم چلو تو" وہ ٹھنکا۔

"کاہے کے لئے؟" میں گرجی۔

"وہاں آج اپنے مولوی مرشدی جناب گلبدن صاحب نقش بندی کا وعظ ہے"

"تو پھر میں جھٹ سے وضو اضو بنا لوں"

"بیٹا ۔۔۔ بولا "اماں۔ یوں کیا کرو کہ وضو کرلوں؟"

"چل رہنے دے!" میں نے اسے جھڑکی دی اور جھپٹ کر وضو بنایا۔ پھر اپنے پیر کے بڑے صندوق سے نئی شال نکالی۔ اوڑھ کر اس کے ساتھ چلی۔

بالسٹر صاحب کی بیوی نے آنگن میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا "اے ہے نانی۔ آپ کدھر بھول پڑیں۔ آئیے آئیے۔ با اطمینان سے بیٹھئے۔" خالہ اماں وہ ذرا سے پیچھے سے بجن خبیث بولا اور نجانے کیا اشارہ کیا کہ وہ ہنس دیں۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کے جانے لگیں "آئیے میں آپ کو سب کے آگے بٹھاؤں گی"

"وہاں سے وعظ اچھا سننے کو ملے گا" میں خوش ہوئی۔

ایک بڑا سا کمرہ تھا۔ جہاں کرسیوں پر عورتیں لڑکے بالے اور چھوکریاں ٹھی ٹھی کر رہے تھے۔ میں برا مانی کہ وعظ کی محفل میں یہ کیا چھچھور پن ہے۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر نئی نئی تسبیح پڑھا کی۔

دفعتہً سے ان خبطن بیوی نے کمرے میں اندھیرا کردیا۔

"ارے ارے۔" میں بگڑی "تم نے لائٹ کی روشنی ہاف کیوں کردی؟"

"آپ سامنے دیکھئے۔ چپ چاپ" وہ بولیں۔

"میں تو جناب عالی مولوی سید گلبدن شاہ صاحب کے سامنے نہ آؤں گی" میں منمنائی۔

"گلبدن شاہ صاحب کی ایسی تیسی۔ آپ ادھر دیکھئے!" وہ بولیں۔

دفعتہً دھڑ دھڑ بھڑ بھڑ کی آواز سے میں چونکی سر اٹھایا۔

میرے سامنے جو بڑا سا کالا ڈبہ رکھا تھا۔ (ائے ہائے۔ وہ تو جادو کے زور سے روشن ہوگیا تھا!۔ اور اب اس کے چمکدار پیٹ میں ننھے ننھے بالشتیئے دکھائی دے رہے تھے۔! پھر ایک آدمی سامنے آ کھڑا ہوا۔

"یا خدا" میں چیخی اور شال سے منہ چھپا لیا۔

"اماں۔ خاموشی سے دیکھو۔!" پیچھے سے بجن بولا۔ وہ بھی یہیں کہیں دفن تھا۔

"کیا دیکھوں؟" میں لرزی "ارے یہ کوئی بھوت ہے۔ یہ منے منے لوگ اٹھ کر ڈبے میں کیسے گھس گئے۔ روشنی کرو۔ کہیں میں بھی انکی طرح ہو کے اس میں نہ گھس پڑوں۔ یہ کیا خدا کا قہر الٰہی ہے"

کمرے میں ہنسی ٹھٹھوں کی دھوم مچی۔

"یہ کس چکلی بڑھیا کو پکڑ لائے ہیں" کوئی چھوکری بولی۔

"چپ!" میں گرجی۔

پر سائنسی اعتبار سے تشکیل دیا گیا ہے اور عہد وسطیٰ کی ہندوستانی فلکیات کے بہترین نمونوں میں سے ایک ہے۔

بلندیوں کی پیمائش کے لئے اس کے دو عام نیز اپنی انفرادیت کے اعتبار سے وقتاً ہیں اور انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے آلات کے درمیان بیٹھے ہیں۔

ہوا محل ہندوستان کی حسین ترین اور عجیب ترین عمارتوں میں سے ایک ہے اس کی گہرائی کچھ نہیں ہے یہ کوئی محل نہیں بلکہ صرف سامنے کا حصہ ہے اس کی تعمیر ۱۷۵۱ء سے ۱۷۶۸ء کے درمیان ہوئی تھی یہ راجپوتانہ دربار کی دوشیزاؤں کے لئے موسم سرما کی تفریح گاہ کے طور پر بنایا گیا تھا یہ دوشیزائیں زمین سے عمودی طور پر اٹھتے ہوئے اس کی جھالر نما ساخت پر سے جلوسوں کا نظارہ کرتی تھیں پتھر کی منبت کاری کی وجہ سے اس عظیم الشان پانچ منزلہ عمارت کے تقریباً ہر حصے سے ہوا چھن کر آتی ہے۔

سابق شاہی مہمان خانہ "رام باغ" اب ایک عالی شان ہوٹل ہے اس میں دیدہ زیب لباس پہنے ہوئے ملازمین، مزیدار کھانوں کا انتظام اور دیکھ بھال سے رکھے جانے والے باغات میسر ہیں اعلیٰ فنی معیار کی نایاب تصاویر اور راجپوتی مصوری کے دیگر نمونے اور نوادرات کا بیش قیمت ذخیرہ (جو کسی زمانے میں جے پور کے شاہی خاندان نے جمع کیا تھا) ہوٹل کے تمام حصوں کو پرتکلف طریقے سے سجائے ہوئے ہے۔

رام باغ محل کے جنوب میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک سفید حسین قلعہ موتی محل دکھائی دیتا ہے جو اب سابق حکمرانوں کا گھر ہے۔

قدیم راجدھانی امبر

کوئی شاہراہ پر جے پور سے ۱۱ کیلو میٹر دور امبر کا زبردست قلعہ ہے۔ جے پور ریاست کی سابق راجدھانی تھا۔ امبر جے پور سے بہت زیادہ پرانا شہر ہے۔ اسے بھگوان شیو کے اعزاز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ مقام بہت عرصے تک خونریز جنگیں ہوتی تھیں۔ سیاحوں کو امبر قلعے کی سیر کرانے کے لئے سجے ہوئے ہاتھیوں کا اہتمام ہے۔

امبر کے فن تعمیر میں ہندو مسلم اثرات کا امتزاج نمایاں ہے۔ ہندوانی عمارتوں میں ہندو راجاؤں کی تعمیرات سادگی کا نمونہ ہیں بعد کی تعمیرات ... دیوان عام امبر کے اہم جائے وقوع کا منظر پیش

کرتا ہے۔ جھلکتی ہوئی جھیل میں جھلکتا ہوا محل چاروں طرف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے ان پہاڑیوں رصدگاہ سے متعلق عمارتیں ایستادہ ہیں ان تک جانے کا راستہ دیوار پناہ کے پیچھے گھر زینے سے ہے۔

جے مندر نفیس مرصع کاری کے کام اور چمکتے ہوئے آئینوں کی بدولت اپنے وقت کی فنی شوکت کا بہترین نمونہ ہے۔

سکھ نواس میں سترھویں صدی کی ایر کنڈیشننگ ہے اس زمانے کے انجینیروں نے اس کا نقشہ اس طرح بنایا ہے کہ ہوا پانی کے جھرنے میں سے چھن کر آئے۔ شیلا دیوی مندر سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔

جے پور سے چند کیلو میٹر کے فاصلے پر سورج مندر کے پاس "گلتا" کا مقدس تالاب ہے جس سے کئی مشہور دیومالائی کہانیاں وابستہ ہیں۔ سسودیا رانی کا باغ جے پور۔ آگرہ روڈ پر واقع ہے۔ سسودیا مہاراجہ جے سنگھ کی رانی تھیں۔ باغات سے گھرے ہوئے اس محل میں کئی عمدہ دیواری تصویریں ہیں۔

جے پور کے شمال میں چند کیلو میٹر کے فاصلے پر گائتور ہے جہاں حکمراں خاندان کی یادگاریں پہاڑیوں میں بکھری ہوئی ہیں۔

جے پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے لوگوں نے اپنے لباس میں نمایاں طور پر اصلیت برقرار رکھی ہے جو قدیم و جدید کا امتزاج ہے۔ مرد لمبا چوغہ پہنتے ہیں اور باریک ململ کی لنگی یا دھوتی اور پگڑی باندھتے ہیں جب کہ عورتیں دیدہ زیب رنگدار لباس پہنتی ہیں۔ وہ انگیا کی قسم کا بند آستین دار بلاؤز اور چوڑے گھیر دار چنٹ پڑے ہوئے لہنگے پہنتی ہیں انکے ماتھے پر ایک بڑا سا جھومر لٹکا رہتا ہے اور سینے پر ایک ہنسلی ہوتا ہے کلائیاں اور کان سونے یا چاندی کی بھاری بالیوں اور کنگنوں سے سجے رہتے ہیں عام طور سے عورتیں اپنا چہرہ اپنے رنگین دوپٹے سے ڈھکے رہتی ہیں۔

کسی بھی سیاح کی ہندوستان کی سیاحت دہلی۔ آگرہ اور جے پور کی مشہور مثلث کو پورا کئے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

مسرور جہاں صاحبہ سے نجم اعزاز صاحبہ کا انٹرویو

نجم اعزاز

سوال نمبر۱ ۔ پیدائش ۔ نام ۔ بچپن اور تعلیم کے متعلق کچھ بتائیے۔

جواب ان کا ۔ نام مسرور جہاں ۔ پیدائش ہوئی ۱۹۳۵ء تعلیم سرٹیفکیٹ کے لحاظ سے ہائی اسکول تک ہے ۔ میرے دادا مرحوم حکیم شیخ مہدی حسن ناصری لکھنوی بلند پایہ شاعر و ادیب اور مقبول مدرس تھے ۔ ہر چند ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن گھر میں ان کی علمیت ۔ قابلیت اور بلند کرداری کے چرچے تھے وہ ہمارے خاندان کے آئیڈیل تھے ۔۔۔ والد مرحوم جناب نصیر حسین خیال بھی پرگو شاعر تھے لہٰذا گھر کا ماحول شعر و ادب کے ذکر سے مملو تھا ۔ بچپن کا دور بہت خوشگوار تھا ایسا حسین دور زندگی میں پھر کبھی نہ آیا ۔ والدین کی پہلی اولاد ہونے کے سبب گھر میں بڑی اہمیت حاصل تھی ۔ لاڈ و پیار کی کمی نہیں تھی ۔ ننھیال اور ددھیال کی دلاری تھی خصوصاً میرے والد صاحب مجھ سے بے پایاں محبت کرتے تھے اتنی محبت جس کی مثال ملنا مشکل ہے اور جس اولاد کو یہ نعمت ۔ یہ دولت حاصل ہو وہ بڑی خوش نصیب ہوتی ہے۔

سوال نمبر۲ ۔ ادبی زندگی کی شروعات کب اور کیسے ہوئی ۔ ؟

ج ۔ ادبی زندگی کی شروعات بڑے غیر محسوس طریقہ سے ہوئی ۔ دوسرے بچوں کی طرح میں بچپن میں ۔ جن پریوں اور بادشاہوں کی سنی سنائی کہانیاں کہنے سے اجتناب کرتی تھی اس کے بجائے زندہ کرداروں کی کہانیاں دل سے گڑھ گڑھ کے سب کو سناتی تھی اور یہیں سے میری ادبی زندگی کی شروعات ہوئی ۔۔۔ لیکن اس وقت خود میں اور دوسرے لوگ اس بات سے ناواقف تھے ۔ عمر کا دور ذرا آگے بڑھا تو لکھنے کی صلاحیت اسکول کے زمانے میں اردو، ہندی اور انگریزی کے مضامین میں ابھر کر سامنے آئی ۔ غالباً ساتویں یا آٹھویں کلاس میں تھی جب سے افسانے کہانیاں لکھنا شروع کیں لیکن یہ تحریریں چند قریبی سہیلیوں کے علاوہ کسی کو نہ دکھائیں ۔

س نمبر۳ ۔ پہلی ادبی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی ۔ ؟

ج ۔ پہلی کہانی ۱۹۵۳ء میں روزنامہ قومی آواز لکھنؤ میں مسرور خیال کے نام سے شائع ہوئی اور پہلا افسانہ نالاں روحی کے نام سے جہانستان دہلی میں چھپا ۔ اس لئے کہ افسانہ اپنے نام سے چھپوانے کی جرأت نہیں تھی بلکہ اس کے بعد بھی کئی برس تک اسی طرح دو ناموں سے لکھتی رہی ۔

س نمبر۴ ۔ کس ادیب سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں ۔ ؟

ج ۔ ہر بلند پایہ ادیب سے متاثر ہوں ۔ قرۃ العین حیدر عرف عینی آپا ۔ عصمت آپا ۔ کرشن چندر ۔ منٹو ۔ خواجہ احمد عباس ۔ عزیز احمد اور بھی بہت سے بزرگ ادیب ہیں ۔ ہر ایک کا اپنا الگ انداز ہے اپنا منفرد رنگ ہے اس لئے ان سے متاثر ہونے کی وجوہات بھی الگ الگ ہیں جن کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا ۔

س نمبر۵ ۔ کیا بچوں کے لئے بھی کچھ لکھا ہے ۔ ؟

ج ۔ بچوں کے لئے بہت سی کہانیاں لکھیں جو "کھلونا" دہلی اور "کلیاں" لکھنؤ میں شائع ہوئیں ۔

س نمبر۶ ۔ معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ کی کیا وجہ ہے ۔ اس کے سدھار کے لئے کون سا انداز اپنانا پسند کرتی ہیں ۔ آیا نقاد کا یا مصلح کا ۔

ج ۔ معاشرہ میں گراوٹ کی بنیادی وجہ تعلیم کی کمی یعنی جہالت ہے ۔ جہالت کی جڑ سے متعدد برائیوں نے جنم لیا جیسا کہ مفلسی ۔ خود غرضی ۔ تنگ نظری ۔ تعصب ۔ جاہلانہ رسم و رواج وغیرہ وغیرہ ۔ معاشرے کے سدھار کے لئے واعظانہ طریقہ بے معنی اور بے اثر ہے ۔ اور آج نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر والی بات ہو کر رہ جاتا ہے معاشرہ کی اصلاح کے لئے

ترک کردیں۔ وہ کیوں جائیں مردوں کو پیچھے چھوڑ کی دولت ملیں کے خواہش کی طرح ملی تو عیاشی کے لئے کیوں دروازے کھل گئے جو میرے قوم کی ترقی۔ فلاح و بہبود میں خرچ ہونا چاہیئے تھا وہ پیسہ کے کلبوں اور ہوٹلوں میں خرچ ہونے لگا اور قوم پستی کی طرف لڑھکتی چلی جا رہی ہے۔ خود ہی غور کیجئے اسلام نے کب میں سائنس، ٹکنالوجی، ادب، سیاست، صنعت و حرفت کی تعلیم سے منع کیا ہے۔؟ یہ تو ہم خود ہیں جو بھلا چلے کام کو نہیں کرتے اور جن برائیوں سے دور رہنے کے لئے اسلام نے منع کیا ہے انہیں گلے لگا کر اسلام کو بدنام کرتے ہیں

س ۵۱ "اردو" کی ترقی کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے اور اس میں آپ کا کیا حصہ ہو سکتا ہے۔؟

ج "اردو" کی ترقی کے لئے بنیادی کام اردو کی تعلیم ہے۔ ہم اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں۔ گلی گلی محلہ محلہ اردو کے اسکول کھولیں۔ حکومت سے پورے حق کے ساتھ اردو کے جائز مقام کی مانگ کریں کیونکہ اردو کا سلسلہ جب تک روزی روٹی سے نہیں جڑے گا کوئی اردو نہیں پڑھے گا۔ ایک وقت وہ تھا جب تجربے لوگ سمجھتے تھے کہ اردو کے بغیر وہ زندگی کے کسی شعبہ میں قدم نہیں جا سکیں گے۔ ادب۔ سائنس۔ ٹکنالوجی کی کتب اردو میں شائع ہونا چاہیں۔ یوں حکومت اور محکمہ تعلیم کے تعاون کے بغیر ناممکن البتہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اپنے خاندان اور [illegible] بچوں کو اردو پڑھانے کی مخلصانہ کوشش کریں۔ صرف کہنے سے کام نہیں بنے گا۔ آنے والی نسلوں کو اردو پڑھا کر اس قابل بنانا ہوگا کہ ان کی قرۃ العین ہمت۔ کوشش اور خلوص چاہئے جو اس پیدا ہوں ——

یہ تھا حریم مسرور جہاں صاحبہ سے ایک انٹرویو۔ ان سے متعلق یہ تفصیلات جان کر آپ کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی۔ اں یا نہیں ہر دو صورتوں میں آپ اپنا شکریہ یا اعتراضات ادارہ ذیل پتہ پر لکھا کر وہ ان تک پہنچا سکتی ہیں۔ وہ ایک مخلص مہربان اور مجسم خاتون ہیں یقیناً آپ کو جواب سے نوازیں گی۔

محترمہ مسرور جہاں صاحبہ
گرلز ان ٹیوٹ جیکٹ ٹرانس روڈ لکھنؤ۔ یو۔پی

ایک معذرت

حریم جولائی کے صفحہ ۲ پر ایک مضمون "ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ" کے متعلق شائع ہوا ہے، جس کے ایک پیرے میں موصوفہ کی احادیث پر پابندی سے عمل کرنے کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے کہ ارشاد نبوی صلعم ہے کہ جس چیز کو آگ پکائے، اس کے استعمال سے وضو لازم آتا ہے۔

بہن رفعت اشفاق صاحب بریلی نے میری توجہ اس طرف دلائی ہے کہ درست نہیں ہو سکتا۔

بلا شبہ یہ غلط ہے ممکن ہے اہل حدیث کا کوئی فرقہ ایسی کسی حدیث کو درست مانتا ہو۔ فقہا نے کبھی کہیں ایسی بات نہیں لکھی اور مشاہدہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ وضو کے بعد اکثر اللہ کر کے تناول کرتے ہیں اور افطار میں زیادہ تر وہ اشیا آگ پر پکی ہوئی ہیں۔ میں نے اس سلسلہ میں مولانا ہاشم میاں صاحب فرنگی محلی سے بھی دریافت کیا۔ موصوف نے بھی اسے بے بنیاد بتایا، اس لئے حریمی بہنوں سے معذرت خواہ ہوں۔ وہ ان سطور کو قلمزد کر دیں۔ دراصل یہ مضمون ایک پاکستانی جریدہ سے لیا گیا تھا۔ بعجلت ایسا تھا کہ میں نے اسے مکمل پڑھے بغیر اشاعت کے لئے دے دیا تھا، جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

نسیم انہونوی

حریمی دسترخوان

پھلکیاں

یہ مضمون دراصل جون کے حریم میں چھپنا چاہیے تھا۔ تاکہ رمضان المبارک میں حریمی بہنیں ہر طرح کی پھلکیاں پکا کر افطار کے سامان کو لذیذ تر بنائیں، بہرحال پھلکیاں ہر زمانے میں اور خصوصیت سے موسم برسات میں جب بھی کھائی جائیں لطف دیتی ہیں۔

پھلکیاں بہت طرح کی پکتی ہیں، لیکن سب سے زیادہ بیسن ہی کی پکتی ہیں۔ لیکن بیسن کی پھلکیاں بھی اگر مندرجہ ذیل طریقہ پر پکائی جائیں تو زیادہ لذیذ ہوں گی۔

سب سے پہلے تو بیسن اچھا ہونا چاہیے۔ چنے کی دال لے کر اچھی طرح صاف کر کے چکی پر رکھا کریں اور نوکر کو ہدایت کر دیں کہ اپنے سامنے ہی پسوائے۔ کسی زمانے میں چنا موٹا اناج کہلاتا تھا اور گیہوں سے بہت سستا بکتا تھا۔ لیکن اب چنا گیہوں سے گراں بکتا ہے اس لئے چکی والے اس میں گیہوں ملا دیتے ہیں۔ ایسا بیسن اچھا نہیں ہوتا۔ بازار میں تو ملاوٹ ایک عام بات ہو گئی ہے اگر آپ بیسن خریدیں گی تو کبھی خالص نہ ملے گا۔ اس میں مٹر کی دال کی آمیزش ہو گی اور گیہوں کی بھی، اس لئے خود اپنے سامنے بیسن پسوائیے۔

۲۵۰ گرام بیسن میں کم سے کم ۵۰۰ گرام پیاز کے لچھے ڈالیے۔ پیاز اگر ساگ دار ہو تو کیا کہنے لیکن ساگ دار پیاز ہمیشہ نہیں ملتی۔ بیسن کو اچھی طرح یعنی دیر تک پھینٹیں، اس کے بعد پیاز کے لچھے، نمک اور ہری مرچ کتر کر ڈالیں اور پھر پھینٹیں، تلنے سے پہلے نمک چکھ لیں تاکہ نمک کم زیادہ نہ ہو۔ پھلکیاں گھی یا ڈالڈا میں لذیذ نہیں پکتیں، انھیں کڑوے یعنی سرسوں کے تیل میں ہی تلیں۔ تیل کو پہلے کھولائیں اور دو چار مرچیں ڈال کر جلائیں۔ اس طرح تیل میں جو جھار ہوتی ہے وہ دور ہو جاتی ہے۔

پھلکیاں چٹنی کے ساتھ کھانے سے اور لذیذ ہو جاتی ہیں۔ کھٹائی، ہری مرچ اور ہری دھنیا کی چٹنی بہت موزوں ہوتی ہے۔

قیمے کی پھلکیاں

بیسن سو گرام۔ قیمہ سو گرام۔ پیاز دو سو گرام۔ نمک و ہری مرچ حسب خواہش۔ قیمہ بڑا ہو تو ایک دو دو قیمہ کو ابالیں اور پیاز کے ساتھ سل پر باریک باریک پیس لیں۔ بیسن کو تھوڑے پانی میں خوب پھینٹیں۔ پھر قیمہ اور پیاز ملا کر پھر کا اس نمک و ہری مرچ ملا کر پھر پھینٹیں اور تل کر نوش فرمائیں۔ چٹنی کا استعمال ان کے ساتھ بھی کر سکتی ہیں ویسے یہ بغیر چٹنی کے بھی بہت لذیذ ہوتی ہیں۔

مسور کی پھلکیاں

مسور کی پھلکیاں بیسن کی پھلکیوں سے بھی زیادہ لذیذ ہوتی ہیں۔ مسور کی چھلکے نکلی دال کو چند گھنٹے بھگوئیں اور سل پر باریک پیس لیں۔ بھگونے کا وقت نہ ہو تو مسور کی دال کو تھوڑے پانی میں جوش دیں۔ پانی اتنا ہی ہو کہ جذب ہو جائے۔ اس کے بعد دال کو پیس لیں۔

۱۰۰ گرام دال میں دو سو گرام پیاز ڈال کر پھینٹیں نمک اور ہری مرچ حسب ضرورت آمیز کر کے تلیں۔ نہایت ملائم اور لذیذ ہوتی ہیں۔

پالک کی پھلکیاں

بیسن کی پھلکیوں میں پالک کا ساگ بھی کاٹ کر ملائیں اور پکائیں۔ کافی لذیذ ہوں گی۔ ۱۰۰ گرام بیسن میں ۲۰۰ گرام پیاز اور دو سو گرام پالک ملائیں۔

آلو کی پھلکیاں

بیسن ۱۰۰ گرام پیاز ۲۰۰ گرام۔ آلو سو گرام نمک و ہری مرچ حسب ضرورت

آلو کو چھیل کر باریک باریک تراش لیں۔ جس طرح حلوے میں ڈالنے کے لئے گری (کھوپرا) تراشا جاتا ہے۔ بیسن کو پھینٹ کر پیاز کے لچھوں اور آلو کے تراشے کو ملا کر تلیں اور نوش فرمائیں۔

ٹماٹر کی پھلکیاں

بیسن ۱۰۰ گرام پیاز ۲ سو گرام۔ ٹماٹر ۱۰۰ گرام۔ بیسن پھینٹ کر پیاز کے لچھوں کے ساتھ ہی ٹماٹر کے ٹکڑے کر کے آمیز کریں اور نمک و ہری مرچ ملا کر تلیں۔

عفت موہانی

غریب ہی ہماری حکومت کی توجہ کا مرکز ہے

پہل حکومت کی
خدمت عوام کی

کسان بھائیوں کے لئے

گنّے کی سب سے زیادہ قیمت اور کسان دوست سل کا قیام

ہریجن بھائیوں کے لئے

نجی سرمائے کے بغیر بھی اپنی صنعت اور کاروبار شروع کرنے کا بندوبست
اور ۱۸۴ کروڑ روپیہ کی سب سے بڑی خصوصی اسکیم۔ پہلے سے چھ[illegible]

بوڑھوں کے لئے

پنشن کی رقم پچاس روپیہ سے بڑھا کر ساٹھ روپیہ

مزدور بھائیوں کے لئے

سرکاری کارخانوں کی انتظامیہ میں شرکت یقینی اور کھنڈساری و جنگلات کے
مزدوروں کی کم سے کم اجرت کا تعین

صفائی مزدوروں کے لئے

جب تک انھیں تنخواہ نہیں، تب تک کوئی دوسرے مصارف نہیں

طلبا کے لئے

پانچ کروڑ روپیہ کا خصوصی فنڈ اور چار سال میں پہلی بار امتحانات کا ٹھیک وقت پر انتظام

اقلیتوں کے لئے

۱۹۸۱ء کے آخر تک اردو کو دوسری ریاستی زبان کا درجہ اور ریاستی یکجہتی
کمیٹی کی تشکیل

ملازمین کے لئے

مشترکہ مشاورتی کمیٹی کی تشکیل۔ مجبوری راحت اور نقدی کرن چھٹی کے
قواعد اور زیادہ ادوار۔

ٹیچروں کے لئے

چھ ہزار اردو ٹیچروں کی مستقلی

سال ایک ۔ کامیابیاں انیک

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں، سنجیدہ اور معیاری ہو ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ جو اشعار ۰ ہر تاریخ کے بعد دفتر میں وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں کیے جاتے۔ ستمبر کے لئے عنوان "بچے گھٹا" اور اکتوبر کے لئے "ملال"

اس سلسلہ میں کوئی خط و کتابت نہیں کی جاتی۔ ہر ماہ کا شعر علیحدہ علیحدہ کاغذ پر آنا ضروری ہوتا ہے۔

تو طلب گو ہے تو میرا بھی یہی دستور ہے
چاندنی ہے نور تیرا، عشق میرا نور ہے

مرسلہ:۔ مومنہ مختار (میسور)

بدلیوں میں ترا چاند سا پیکر چمکے
چاندنی رات میں جس طرح سمندر چمکے

مرسلہ:۔ نگار سلطانہ جلیل قر لطیف (آمبہ)

چاندنی روشنی کو کیا جانے
آدمی آدمی کو کیا جانے

مرسلہ:۔ فریدہ ۰۰ احمد فریدہ (بہشور)

ہزار پیرہن نور سر سرا نے ہیں
ترے فراق میں جب چاندنی نہیں ہوتی

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (منگار ایسٹ)

ڈوب کر تیرے غم میں کب کوئی سنبھلتا ہے
دھوپ کی گرمی نے ہے چاندنی میں جلتا ہے

مرسلہ:۔ روحی ازنیب (آرہ)

نے پہ جس کی جگہ ہے کوئی درد کی بات
چاندنی پھرتی ہے اس پیارے ویرانوں کو

مرسلہ:۔ [illegible] (محمدیہ۔ پارینہ)

[illegible] چاند کے [illegible] کی — مرسلہ:۔ [illegible] شوکت

[illegible] (رامپور)

کو چۂ شہر بتاں کی محفل آرائی گئی
تم گئے کیا، چاندنی راتوں کی رعنائی گئی

مرسلہ:۔ نجمہ انصار شا (شکل)

یہ چاندنی بھی جن کو چھوتے ہوئے ڈرتی ہے
دنیا انہیں پھولوں کو پیروں سے مسلتی ہے

مرسلہ:۔ عذرا نقوی (بکلاوہ۔ بجنور)

یہ ہوا، یہ رات، یہ چاندنی تری اک ادا پہ نثار ہے
مجھے کیوں نہ ہو تری آرزو تری جستجو میں بہار ہے

مرسلہ:۔ شمیا پروین، ثریا خالد (امراوتی)

وہ پھیلنا خوشبو کا وہ کلیوں کا چٹکنا
وہ چاندنی مدھم وہ سمندر کا چھلکنا

نور جبیں (رجہت نواد ۰)

حد بھی کوئی انتظار کی ہے
اب چاندنی دھوپ ہو چلی ہے

مرسلہ:۔ زاہدہ حسین (کرنول)

ہمیں تو شام غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
جہاں وہ ہیں ادھر ہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی

مرسلہ:۔ زینب عامر (الہ آباد)

روپہلی چاندنی میں رات کو کھلی چھت پر
ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے۔

فیروزی قسیم اشرفی (لکھنؤ)

- خریداری نمبر ۵۰۱۹ آپ کا شعر موزوں نہیں۔ اپنے چاند کی جگہ چاندنی کردیا ہے۔

حقوق اشاعت دائمی طور پر بحق
نسیم بک ڈپو لکھنؤ
محفوظ ہیں

قیمت

ناشر
نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
فون: ۴۴۵۵۹ ۰ ۴۵۳۲۲

نسیم انہونوی نے سرفراز پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

دوسرے دن امرینہ کو اختیاری تعطیل تھی۔ جب وہ [illegible]
اپنے جھروکے سے بائیں باغ کی سجاوٹ دیکھا کرتی تھی۔ اب [illegible]
بے حد شغف تھا۔ کبھی کبھار تو باغبان بھی دل ہی دل میں [illegible]
جب صاحبزادی بی بی مالی بن جاتی ہیں تو ہمارا اس کا رنگ
کیوں پالا ہے۔

مگر اس روز کی تعطیل بلائے جان بن گئی۔ گھر بھر بھاگ رہا اور
گھر سے باہر کوئی ایسا ٹھکانا نہ تھا جہاں اسے پناہ مل سکے۔ [illegible]
کے سامنے برآمدے میں اپنی خاص کین چیر نکال لائی اور اس میں
دھنس کر باجی کے افسانوں کا مجموعہ پڑھنے لگی جس کی اجرا [illegible] دھوم
پچھلے ہفتے ہوئی تھی اسے افسانے [illegible] پسند نہیں تھے مگر وقت تو گزارنا
ہی تھا۔ اندر جانا اسے گوارا نہ تھا جہاں سے ننھے کی شریر بہار [illegible]
گویا اسے ستانے کے لیے کچھ زیادہ ہی گونج رہی تھی۔

چچی جان گھومنے پھرنے کی بے حد شائق تھیں۔ اکثر چچا جان زیادہ
دنوں کے لیے باہر چلے گئے تھے۔ اور غالباً کافی رقم بیوی کو دے گئے تھے
لہٰذا وہ رقم ان کے پاس فضول خرچ ہو جانے کے لیے بے تاب [illegible]
رہی تھی [illegible]
مستقبل سے مایوس تھی [illegible]
اور چچی جان [illegible]

اب خواتین ہیرو ہیروئن کی خوبصورتی دکھانے کے چوکے میں کہیں اتنی ادھوری کیا ہو جاتی ہیں۔

کیا بک رہے ہو؟ ادھوری؟ باجی نے جھڑکی دی۔

امرینہ نے ادھر جھانک کے دیکھا۔ دونوں کی پیٹھ اس طرف تھی۔ اس نے اور سرا دبا لیا اور اطمینان سے ان کی باتیں سننے لگی۔

جی ہاں! سجو بولا: ہیرو اور ہیروئن خدانخواستہ خوبصورت نہ ہوں تو پھر ناول کا لکھنا ہی کیا۔ ارے معاذ اللہ۔ کہیں ہیرو کی خوبصورتی کے ایسے قصیدے ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے حسن یوسف اس کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ آج تک کسی اُلو کے پٹھے ہیرو کو میں نے کالا کلوٹا لنگڑا لولا نہیں دیکھا جناب، کہیں وہ انجینئر ہے، کہیں ڈاکٹر ہے۔ کہیں جو [illegible] ہے۔ رو [illegible] ہوتا ہے۔ ایک ایک وقت میں ہزار دل [illegible] کی [illegible] کرتا ہے۔ اور ہیروئن کی تو خیریت ہی مجھ سے نہ پوچھئے۔

وہ توبہ توبہ کرکے خاموش ہو گیا۔

نہیں نہیں۔ اس بیچارے کے بھی بخیے ادھیڑ دو۔ باجی کو غصہ آ گیا۔

بیچاری! سجو تمسخرانہ انداز میں ہنس دیا۔ ارے ایک آفت کی پڑیا۔ جنت کی حور نعوذ باللہ بیچاری کیسے ہو سکتی ہیں۔ ایمان سے بتائیے۔ آپ نے کہیں بدصورت ہیروئن بھی دیکھی ہے۔ آہا۔ وہ تو ایسی حسین ہوتی ہے کہ اگر غالب صاحب خاک میں [illegible] کو پانے شرماتے تو بھی [illegible] کر رہ جاتے۔ [illegible]

جوان ہوا ہو۔

امرینہ کو دونوں کی یہ نوک جھونک بازی بالکل پسند نہ تھی۔ دونوں ہی میں سے اوپر ہو چکے تھے۔ مگر بیوقوفی کر کے اونچے درجوں میں جھک مار رہے تھے اور پھر ننھے منوں کی سی بھولی بھولی منھ سے دودھ ٹپکانے والی اوقات بھولا باتیں امرینہ کو علانیہ احساس ہوتا تھا۔ جب وہ چھوٹے بچوں کی سی باتیں کرتا تو اسکے مونچھ داڑھی چہرے پر شرارت بھری مکاری برستا۔ مگر باجی تو عقل سے قطعی کوری تھیں۔ کھلتی ہی نہ تھیں۔ پھر امرینہ تو اتنی احمق اور بے وقوف بھی نہ تھی۔ چچی جان رشتے میں ممی کی دیورانی لگتی تھیں۔ اور ادھر ادھر کے ناطے سے ان کی کوئی سگی بہن بھی ہوتی تھیں۔ لہٰذا دونوں میں روایتی دیورانی جٹھانی کی سی محبت تھی۔ دشمنی قطعی نہ تھی۔ چچا جان اکثر دورہ پر رہا کرتے تھے۔ اور چچی جان اکیلے پن سے گھبرا کر یہاں بھاگ آتی تھیں۔ وہ صاحبزادے ہو چچی جان کی آنکھوں کا نور دل کا سرور تھے۔ اکلوتے تھے۔ ان کی محبتوں کا مرکز بھی تھے اور ممی اور باجی کے بے تکے عشق کے حقدار بھی۔

البتہ چچی جان امرینہ کو بہت پسند تھیں۔ بڑی ہنس مکھ زندہ دل اور خوش مزاج خاتون تھیں۔ امرینہ سے انھیں بے حد محبت تھی۔ وہ اتنی سادہ لوح تھیں کہ ہر چھوٹی بڑی بات پر صدق دل سے ایمان لے آتیں۔ چچا جان ان کے پیٹھ پیچھے انھیں کودن کہا کرتے تھے۔ اگر منھ پر بھی کہہ دیتے تو وہ بیچاری برا ماننے کی بجائے ہنس دیتی تھیں۔

دشمنی امرینہ کو تجربے سے نہ تھی۔ اگر وہ اسے آ جانے کی کوشش کرتا تو امرینہ کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوتی۔ آخر وہ اس کا بھائی اور [illegible]

ہاں وہ پارسال ۔ چچی جان ہنس دیں کچھ نہ سمجھیں۔ اور کوئی بھی سمجھ
نہ سکا کہ یہ بے ڈھنگی بات سنجر نے خواہ مخواہ کیونکر دی تھی۔ ان میں تو کوئی ایسا
مسئلہ چھڑا تھا۔ وہاں سب ہی بے عقل تھے۔ مگر امرینہ کے آگ لگ گئی تھی
وہ اس کی سانولی رنگت پر چوٹ کس رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی لکیریں
بہنے لگیں۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چائے کی پیالی سنجر کے منہ پر دے مارے؛
خود اس کا چہرہ دھک سے اٹھا۔ اور وہ جل کر بول دی۔
"آپ بھی ایسے گلفام نہیں۔ پھپھوندی تو آپ کی شکل پر لگی ہے:"
وہ معصوم اور بے قصوروں کی طرح ایک ایک کا چہرہ تکنے لگا جیسے
سب سے اپنے لیے رحم و انصاف طلب کر رہا ہو۔! چنانچہ باجی نے اس کی
پشت پناہی کی۔
"ارے وہ تمہارا نام لے رہا ہے کیا۔ چلتی ہوا سے لڑتی ہو!"
منجھو صاحب میں یہ وصف بھی تھا کہ وہ موقعہ پر خواتین کے اسٹائل
سے بھی گفتگو فرمالیتے تھے۔ اس لیے بولے۔
"بی بی تم تو منہ میں بارہ ہاتھ کی زبان لیے پھرتی ہو۔ میاں لگوڑے کا تو
ناطقہ ہی بند رہے گا:"
"تم دونوں کی لڑائی تو عمر بھر نہ چکے گی"۔ چچی جان بولیں: "شاید اسی لیے
تمہارا دل گھر میں نہیں لگتا۔ یہاں بھاگ کے آتے ہو امرینہ سے جھگڑنے کے
لیے کچھ خیال بھی نہیں آتا۔ پورے چھ سات سال بعد ہوا ہے سے!"
پھر انہوں نے امرینہ کے سر پر ہاتھ پھیرا: "بیٹی تم اسے بخش دیا کرو۔ کالج کے
[illegible]

قسم کھلوا لیجئے۔ اگر میں نے ان کا نام بھی لیا ہو۔ سنجر نے کانوں کو ہاتھ
لگایا۔ مگر اتنی چخ چخ کے بعد امرینہ کو تو بے اختیار رونا آیا جا رہا تھا۔
زہر سے بدتر گھونٹوں میں اس نے چائے حلق سے اتاری اور اٹھ کر
چلی گئی۔
اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ قد آدم آئینے پر نگاہ پڑی۔ اور وہ
سکتہ زدہ سی آئینے کے شفاف سطح پر منعکس شبیہ کو تکتی رہی!۔
آہستہ آہستہ اس کے محسوسات پر اپنی نفرت کا کہرا چھانے لگا۔ اپنی ذات
سے نفرت۔ چہرے سے نفرت!۔
قدرت کی ستم ظریفی۔! اسے خود پر غصہ آگیا۔ کیا ضرورت تھا کہ وہی کالی
بن گئی تھی۔ باجی کی رنگت آتشی شفاف ہے۔ ان کی خوبصورتی بڑی پرکشش
اور جاذب توجہ تھی۔ لیکن صرف اسی کو رنگت دینے کے معاملہ میں قدرت
نے کیوں بخل سے کام لیا تھا۔ رنگت ہی کی کمی نے خدوخال کی دلکشی پر بھی
پانی پھیر دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ۔ احساس کمتری میں بھی مبتلا ہو جاتی۔ کئی
دفعہ اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ باجی کے مقابل بیٹھا نہ کیا کرے گی۔ اکثر
اس نے یہ دعائیں بھی دل کی گہرائیوں سے مانگی تھیں کہ باجی جلد سے جلد
سسرال چلی جائیں تاکہ اس کی انفرادیت قائم ہو جائے۔ لیکن فی الحال
دعاؤں کی قبولیت کے امکان بھی کم تھے۔ باجی کے منگیتر وقاص بھائی
ٹریننگ پر تھے۔ اور شادی اس وقت ہونی تھی جب وہ [illegible]
بن جاتے!
اور اب فی الحال وہ زخم [illegible]
[illegible]

The Hareem Lucknow August 1981 (Phones : 44559 45534) Regd. ...

PRICE Rs. 20

ٹیلیفون نمبر آفس ۵۵۳۳۴۴

ٹیلیفون نمبر رہائش ۴۵۲۳۴

گذشتہ ۵۱ سال سے پابندی وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور اردو میں ہندوستان کا سب سے پرانا رسالہ ہے

جلد (۵۹) نمبر (۹)

ماہنامہ حریم لکھنؤ

ایڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی
معاونین
شوکت جہاں بیگم غزالہ
جانی بیگم ردولوی

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
شفیق النسار
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

فہرست مضامین

ماہ ستمبر سنہ ۱۹۸۱ء

قیمت سالانہ ۔ اعزازی ۔ منی آرڈر سے پچیس روپیہ ۔ مخصوص خریداری منی آرڈر سے تینتیس روپیہ ۔ معمولی خریداری ۔ منی آرڈر سے بیس روپیہ وی ۔ پی سے پرچہ منگانے پر چار روپیہ زائد ۔ فی پرچہ ایک روپیہ تیس پیسے ۔ غیر ممالک سے ۵۵ روپیہ یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی ۔ میل ۔ ایئر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں ۔ آفس اور ترسیل زر کا پتہ ۔ نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ

ناشر ۔ نسیم انہونوی نے باہتمام سید انصار حسین سرفراز قومی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم ۲۳ لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع کیا

ایک سوال

محترم ماموں جان۔ آداب۔ میری امی نہ جانے کب سے آپ کے قدیم رسالہ حریم کی خریدار ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا۔ حریم کو دیکھتی رہی۔ اب میں بھی اسے پڑھتی ہوں۔ آپ جس طرح اپنی بہنوں اور بھانجیوں کے خطوں کا جواب دیتے ہیں وہ قابل داد ہے اور اسی وجہ سے آج میں بھی آپ سے ایک سوال کر رہی ہوں۔ امید ہے ضرور جواب دیں گے۔ یہ خط میں چھپا کر لکھ رہی ہوں اس لئے کہ میرے سر میں بال بہت کم ہیں، کہیں امی اور ابو کو میرے اس سوال کا علم ہو گیا تو جو بال ہیں، وہ بھی نہ رہ جائیں گے۔

تو ماموں جان میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ شادی کے سلسلہ میں آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ اسے اچھا سمجھتے ہیں یا برا۔ میرا مطلب عورتوں کی شادی سے ہے مردوں کی نہیں۔ معاف فرمائیے گا۔ میں دیکھتی ہوں کہ شادی کے بعد عورتوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری جاننے والی چند سہیلیاں، جو عمر میں مجھ سے بڑی ہیں اور ان کی شادیاں ہو چکی ہیں، رو رو کر اپنی بپتا سنایا کرتی ہیں۔ اسی لئے میں ڈرتی ہوں، شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اللہ ماموں جان آپ ہمیں نیک مشورہ دیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ غلط صلاح نہ دیں گے۔

عزیزہ بھانجی دعائیں۔ جو ا بنجو رہا ہوں کہ شادی ایک مقدس فریضہ ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں شادی کا رواج رہا ہے۔ متمدن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں انسان یعنی مرد اور عورتیں شادی کے رشتہ میں منسلک ہو کر ہی زندگی گزارتی رہی ہیں۔

اللہ تعالے نے انسانوں میں دو جنسیں، مرد اور عورت اسی لئے پیدا کی تھیں کہ افزائش نسل ہوتی رہے اور افزائش نسل کا یہی بہترین طریقہ قدرت کی نظروں میں تھا، جس کی ابتدا آدم و حوا سے ہوئی تھی۔

اگر شادی کا رواج نہ ہوتا تو انسانوں کی حالت بالکل ویسی ہی ہوتی جو آزادانہ جنگلوں اور میدانوں میں پھرتے ہوئے افزائش نسل کا کام انجام دیا کرتے ہیں۔ آپ غور کریں کہ ان میں اور انسانوں میں کتنا فرق ہے۔

پہلے بچوں کے سامنے ایسی باتیں نہیں کی جاتی تھیں، لیکن موجودہ دور کی تعلیم اور آزادی نے بچوں میں بھی بے باکی پیدا کر دی ہے۔ اور اسی کا طفیل ہے کہ آپ نے شادی کرنے یا نہ کرنے کے سلسلہ میں سوال کر دیا ہے، ورنہ لڑکیاں تو شادی کا ذکر سننا بھی پسند نہ کرتی تھیں، جہاں بھی ان کی شادی کی بات چھڑتی، چپکے سے کھسک جاتی تھیں۔ اس لئے اب بے تکلفی سے آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ قدرت نے افزائش نسل کے لئے مردوں اور عورتوں میں ایسی خواہشات بھی فطری طور پر پیدا کی ہیں جو ان کے میل سے ہی پوری ہو سکتی ہیں اور یہ خواہشات بھوک پیاس ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ جن سے انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ مستثنیات کا ذکر نہیں، ویسے ہر مرد اور ہر عورت اتصال کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ اگر شادی کے بندھن میں انہیں نہ جکڑا جائے تو نفس انہیں حیوانوں ہی جیسا بنا دے گا۔

شادی سے انکار فطرت کے خلاف بغاوت ہے، شادی کرنا چاہیئے اور ضرور کرنا چاہیئے، ورنہ انسان پاکیزہ زندگی سے دور ہو جائے گا اور فتنہ فساد کا در کھل جائے گا۔ جس میں انسان درندوں سے بھی بدتر ہو جائے گا۔

آپنے اپنی سہیلیوں سے، جن کی شادیاں ہو چکی ہیں ان کی بپتا میں سنی ہیں اور اسی لئے سمجھتی ہیں کہ خدانخواستہ شادی کے بعد آپ کو بھی مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ اکثر بیویوں کو شوہر کی جانب سے شکایتیں ہوتی ہیں۔ مردوں کی زیادتی کوئی نئی بات نہیں ان کا رویہ سخت اور جابرانہ ہوتا رہا ہے۔ وہ تو کہئے کہ اسلام نے اس سلسلہ میں بہت کچھ اصلاحات کیں، عورتوں کو ایسے حقوق دئے جیسے کبھی کسی مذہب نے نہیں دئے تھے۔ اس کے باوجود آپ کہہ سکتی ہیں کہ آج بھی عورتوں پر مردوں کے ظلم و ستم جاری ہیں۔ لیکن میں کہ

ایک حقیقت ہے کہ شادی نہ کرنے سے عورت مردوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتی، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ شادی کے بعد صرف ایک ہی مرد کی سختیاں عورت کو برداشت کرنا پڑتی ہیں لیکن اگر وہ شادی نہ کرتی تو اسے ایک سے زائد مردوں کے ناروا سلوک کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ شادی شدہ عورت ایک طرح سے محفوظ ہو جاتی ہے اور اس کی مثال اس کشتی کی سی ہوتی ہے جس کا ملاح موجود ہو لیکن شادی نہ کرنے والی عورت اس کے برخلاف ایک ایسی کشتی ہوتی ہے جس کا ناخدا نہ ہو اور وہ تھپیڑوں کے رحم و کرم پر ہو۔

عورت کو قدرت نے صنف نازک بنایا ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت و سلامتی کے لئے مرد کے سہارے کی متلاشی رہے۔ ایسا بھی تو ممکن تھا کہ خالق ارض و سماں عورت کو بھی مرد ہی کی طرح جری اور طاقتور بناتی لیکن مشیت سمجھتی تھی کہ ایسا کرنے سے وہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا جس کے لئے انسان کو تخلیق کیا گیا ہے۔

آپ دیکھتی ہوں گی کہ مرد بے خوف و خطر رات برات ہر جگہ چلا جاتا ہے، اسے کبھی یہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا کہ کہیں عورتیں اسے لوٹ نہ لیں، لیکن عورتیں ایسا نہیں کرتیں، انھیں ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں اسے لوٹ نہ لیا جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عورت کو ایک مرد کا سہارا لینا ضروری ہے اور وہ مرد شوہر ہی ہو سکتا ہے۔ وہ خود بیوی پر چاہے جیسے ظلم کرے، لیکن اسے دوسروں کی دست و برد سے ضرور بچاتا ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں کہ سب ہی مردوں کا سلوک اپنی بیویوں کے ساتھ جابرانہ ہو۔ ویسے تو بعض عورتیں بھی مردوں کو ناکوں چنے چبوا دیتی ہیں۔ اور یہ بھی مثل مشہور ہے کہ عورتیں مردوں کو انگلیوں پر نچاتی ہیں۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ ایسے مردوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، عورتوں کی کم بلکہ بہت ہی کم۔ لیکن ظلم و ستم کے ساتھ ہی مرد پیار و محبت بھی کرتا ہے بیوی کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اس کی خوشنودی کے لئے معلوم نہیں کیا کیا جتن کرتا ہے۔

یقیناً چند فیصدی مرد ایسے ضرور ہوتے ہیں جو بدکردار ہوتے ہیں، بے غیرت ہوتے ہیں، جو بھلے آدمیوں کی بیویوں کو بس ستاتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسے بھی ہوتے ہیں جو بیویوں کو ہر طرح کا آرام پہنچاتے ہیں۔ ان سے محبت کرتے ہیں اور انھیں اپنے گھر کی ملکہ بنا کر رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورتوں کی غلطی سے مردوں کا سلوک اچھا نہیں ہوتا۔ شوہر کیا پسند کرتا ہے، کیا چاہتا ہے۔ بیوی کو اس کا احساس ہونا چاہیئے اس لئے کہ مساویانہ حقوق دینے پر بھی مرد کو فوقیت حاصل ہے۔ جو بیویاں شوہر کی فوقیت کو تسلیم نہیں کرتیں۔ انھیں یقیناً شوہر کی سختیاں اٹھانا پڑیں گی۔

ہاں ایسی عورتیں جو قدرت کی ستم ظریفی سے بہت زیادہ بدصورت ہوں اگر شادی نہ کریں تو بہتر ہی ہوگا، اس لئے کہ مرد بہر حال حسن پرست ہے۔ کمتر ہی وہ بدشکل عورتوں کو پسند کر پاتا ہے۔ ایسی عورتیں تعلیم حاصل کر کے پیشۂ تعلیم سے متعلق ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ میں ان والدین سے درخواست کروں گا جن کی بیٹیاں بہت زیادہ بدصورت ہوں کہ وہ انھیں ابتدا ہی سے ایسی تعلیم دلائیں، جن سے وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ انسانی اخلاق اس مادی دنیا میں اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ پہلے شادیاں والدین کرتے تھے اب لڑکے بلکہ لڑکیاں بھی خود ہی اپنے رشتے طے کر لیتی ہیں اس لئے کہ تعلیم اور آزادی نے انھیں اس کے مواقع دے رکھے ہیں۔ پہلے صبر و شکر کے ساتھ مرد ہر صورت کو برداشت کر لیا کرتا تھا، خاندان اور عزت کا پاس و لحاظ ہوا کرتا تھا لیکن اب ایسا کمتر ہی ہوتا ہے۔

معذرت

افسوس کہ کوششوں کے باوجود گذشتہ چند ماہ سے حریم کسی نہ کسی باعث بتاخیر شائع ہوتا ہے۔ کبھی بجلی کی عدم فراہمی، کبھی پریس کی دشواریاں، کبھی کاتب کی علالت۔ گذشتہ ماہ حریم ۱۰ کو روانہ ہو سکا۔ پہلے عید کے سلسلہ میں پریس چار روز بند رہا۔ پھر پریس کا موٹر جل گیا کئی روز اس کے بننے میں صرف ہوئے، درست ہوا اور پھر جل گیا۔ بجلی کے نظام میں جو تبدیلی ہوتی ہے اس کے باعث بھی کچھ گڑبڑ رہی۔ ہماری ساری کوششیں رائگاں گئیں اور پرچہ ہر ماہ سے زیادہ تاخیر کے ساتھ شائع ہو سکا۔ چونکہ ہمارے پاس معذرت کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں، عزیز بہنوں کو جو تکلیف ہو رہی ہے اس کا مجھے احساس ہے اور میں اور بھی کوشش کروں گا کہ آئندہ پرچہ وقت پر ہی شائع ہو سکے۔ لیکن اس کی امید کم ہے۔ اس ماہ کاتب صاحب علیل ہو گئے۔ دوسرے کاتب سے لکھوا رہا ہوں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

گذشتہ ہفتے جانشین رسولؐ، خلیفہ اول امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یوم وفات منایا گیا اور آپ کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ خراج عقیدت پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے اصول، ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے کارناموں اور خدمات کو اپنے لئے بھی مشعل راہ سمجھتے ہیں اور اپنے لئے بھی ان ہی اصولوں کو بہتر سمجھتے ہیں جن پر اس عظیم شخصیت نے عمل کیا، لیکن صرف زبانی خراج عقیدت پیش کرنا اور اپنی عملی زندگی میں اس کے برعکس طور طریقے اختیار کرنا محض ایک رسم سے زیادہ نہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہی ایمان و عمل کا تضاد ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہؐ کے دوست رفیق تھے۔ آپؐ کی علالت کے دنوں میں آپؐ ہی کی ہدایت پر نماز کی امامت بھی فرمائی تھی چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے پردہ فرمایا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تو اسلامی ریاست کی سربراہی اور رہنمائی کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب عمل میں آیا۔ ربیع الاول ۱۱ھ میں وہ خلیفہ مقرر ہوئے اور جمادی الثانی ۱۳ھ میں انتقال فرمایا۔ اس طرح ان کی خلافت کا دور تقریباً سوا دو سال رہا، لیکن اس مختصر مدت میں اسلامی انقلاب کو مستحکم کرنے اور نظام و معاشرے کو اسلامی خطوط اور قرآن و سنت نبوی کے مطابق برقرار رکھنے اور اس کے فروغ کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ بے مثال ہیں، ان میں نہ صرف ان کی اپنی صلاحیت و صائب رائے بلکہ اسلام پر یقین کامل اور محبت رسول کا واضح عکس نظر آتا ہے۔ ان کے اس مختصر دور خلافت نے تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

رسول اللہؐ کی وفات کے فوراً بعد ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جو کردار کھل کر سامنے آیا اور ان کی عظیم شخصیت نمایاں ہوئی وہ تاریخ اسلام کا [illegible] باب ہے۔ آپؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی [illegible] [illegible] محبت سے بوسہ دیا اور [illegible] کر فرمایا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان [illegible] کی قسم [illegible] [illegible]

یہ کہا اور چہرۂ مبارک پر چادر ڈال کر باہر آئے تو دیکھا کہ ہجوم بپا ہے۔ عمر فاروقؓ تیغ بے نیام لہرا رہے ہیں اور عالم وارفتگی میں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہؐ وفات نہیں پائے، جو کہے گا کہ وفات پا گئے ہیں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ ابوبکر صدیقؓ نے عمر فاروقؓ کے اسی جذباتی انداز کو دیکھ کر کئی مرتبہ انہیں خاموش ہو جانے اور بیٹھ جانے کو کہا مگر انہیں کسی بات کا کہاں ہوش تھا۔ وہ تو بس یہی کہے جا رہے تھے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے۔ تب ابوبکر صدیقؓ نے مسجد نبوی کے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

لوگو! سنو، جو شخص اللہ کے رسول محمدؐ کی پرستش کرتا تھا، تو اسے جان لینا چاہئے کہ محمدؐ وفات پا چکے ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی پرستش کرتے تھے انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ موجود ہے، وہ کبھی وفات نہیں پائے گا۔ پھر انھوں نے قرآن مجید کی وہ آیت تلاوت کی جس میں کہا گیا ہے کہ "محمدؐ ایک رسول ہیں جن سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا وہ وفات پا جائیں تو تم پیچھے پھر جاؤ گے؟"

صحابہ کرام کا بیان ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کی اس مختصر سی تقریر اور اس آیت کی تلاوت کے بعد ایک سناٹا سا چھا گیا اور یوں لگتا تھا کہ یہ ایک آیت ابھی اسی موقع پر نازل ہوئی ہے۔ عمر فاروقؓ بھی یہ سنتے ہی ہوش میں آ گئے اور سر جھکا کر رسول اللہؐ کی وفات کی حقیقت کا اعتراف کرنے کو تیار ہو گئے۔ اس طرح ابوبکر صدیقؓ نے رسول اللہؐ کی وفات کے فوراً بعد آزمائش کی اس گھڑی میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور قرآن مجید کی تعلیمات کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور بعض ذہنوں میں جاہلیت کے عقائد اور شخصیت پرستی کے دوبارہ رواج کے خطرے کا سدباب کرتے ہوئے توحید خالص کا علم بلند کر دیا جو اسلامی تعلیمات کی بنیاد [illegible]

خلیفہ منتخب ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور [illegible] ہے۔ آپ نے فرمایا:

حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد لوگو! میں تمہارا امیر بنا دیا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح [illegible] [illegible] میری مدد کرو اور اگر غلط [illegible] [illegible]

کہ تم میں جو کمزور ہے، وہ میرے نزدیک طاقت ور ہے جب تک کہ میں اس کا حق نہ دلا دوں اور اس کی شکایت نہ دور کر دوں اور تم میں جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے دوسروں کا حق نہ وصول کر لوں۔ یاد رکھو کہ جب کوئی قوم اللہ کی راہ میں جہاد ترک کر دیتی ہے تو اللہ اس پر ذلت و خواری مسلط کر دیتا ہے اور جس قوم کے اندر فحاشی اور بے حیائی پھیلتی ہے تو قانون خداوندی کے تحت اس پر طرح طرح کی مصیبتیں اور بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ تم میری اطاعت و فرمانبرداری کرو جب تک کہ میں اللہ و رسول کی فرمانبرداری کروں اور جب میں اللہ و رسول کی نافرمانی کرنے لگوں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

یہ خطبہ اسلامی جمہوریت حق کی پاسداری کی تعلیم، اللہ کی بندگی، رسول کی اطاعت اور خاکساری و عجز کے ساتھ خدمت خلق اور حق و انصاف مساوات اور عدل و توازن قائم کرنے کے عزم صمیم کا ایسا اعلان ہے جو آج بھی عظمت انسانیت کا منشور ہے، کمزوروں کے لئے حوصلے کی نوید اور بااثر و طاقتور لوگوں کے لئے تنبیہ ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مختصر دور خلافت میں اپنے اس وعدے اور اعلان پر حرف بحرف عمل کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا یہ مختصر دور خاص کر ابتدائی دور بے حد آزمائش اور ابتلا کا دور تھا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد ہی منافقین اور دشمنان اسلام کے گروہ سرگرم عمل ہو گئے۔ جھوٹے مدعیان نبوت پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنی شر انگیزی سے اسلام کو نفاق میں مبتلا کر کے کمزور کرنے کی کوشش کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایسے پاکھنڈ مدعیان نبوت اور ان کے فتنے کو ختم کر کے لوگوں کو اسلام پر مجتمع کیا۔ خود مسلمانوں میں ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور کہا کہ زکوٰۃ کی ادائیگی رسول اللہؐ کی زندگی تک تھی۔ اب ہم پر واجب نہیں۔ ان کے خلاف کارروائی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ کیونکہ یہ اپنے کو مسلمان بھی کہتے تھے لیکن حضرت ابوبکر کی دور رس نگاہوں نے اسلام کے خلاف اس فتنے کی سنگینی کو دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اعلان کر دیا کہ منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا جائے گا اور انہوں نے سختی استعمال کر کے اس فتنے کا سدباب کیا کیونکہ اگر ایک بار اسلام کے کسی ایک حکم کی نفی کرنے کی اجازت [illegible] اللہ کے احکام میں تبدیلی یا ترمیم کا اختیار کسی فرد کو حاصل نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نرم مزاجی اور رحمدلی کے باوجود اللہ کے احکام نافذ کرنے میں کتنے سخت اور مستقل مزاج تھے۔ اس معاملے میں وہ کسی مصلحت بینی کو گوارہ نہ کرتے تھے۔

رسول سے محبت اور آپ کے فیصلوں کو اپنے لئے ایمان کا درجہ رکھنے کا ان میں کیسا جذبہ تھا اس کا اندازہ لشکر اسامہ کے واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ رسول اللہؐ نے جہاد کے لئے یہ لشکر ترتیب دیا تھا اور اس کا نوجوان اسامہ بن زید کو سپہ سالار مقرر فرمایا تھا۔ لیکن آپ کی علالت کی وجہ سے ابھی لشکر روانہ نہیں ہوا تھا، مدینہ کے باہر پڑاؤ ڈالے اگلے اقدام کا منتظر تھا۔ آپ کی وفات کے بعد صحابہ کا خیال تھا کہ اندرونی استحکام اور تحفظ کے لئے دارالخلافہ میں لشکر کی موجودگی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایسا نہ ہو کہ فوج کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر دشمن حملہ کر دے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ خدا کی قسم اگر بھیڑیے اور کتے بھی ہمیں گھسیٹ کر لے جائیں تب بھی اس فیصلے کو نافذ کر کے رہوں گا جسے رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسامہ کی سپہ سالاری اور قیادت پر بھی کچھ لوگوں کو اعتراض تھا کہ روم و ایران کی سرحدوں کی طرف جانے والے لشکر کے لئے معزز اور تجربہ کار لوگوں کو نظر انداز کر کے ایک نوجوان وہ بھی غلام زادہ کی قیادت مناسب نہیں لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس کے جواب میں بھی وہی کہا کہ جب رسول اللہؐ نے خود اسامہ کو سپہ سالار مقرر کیا تھا تو ہم اس میں تبدیلی کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ چنانچہ اسامہ ہی کی قیادت میں لشکر روانہ ہوا اور چالیس دنوں کے بعد کامیاب و کامران واپس آیا۔

حضرت ابوبکرؓ مکہ میں پیدا ہوئے وہ رسول اللہؐ سے تقریباً چار سال چھوٹے تھے لیکن ان کی آپس میں دوستی بہت تھی۔ بالغ مردوں میں سب سے پہلے قبول اسلام کا سہرا بھی ابوبکر صدیقؓ ہی کے سر ہے۔ وہ ہر مشکل اور ہر حال میں رسول اللہ کے رفیق اور ہمنوا رہے۔ واقعہ معراج کی بلا جھجک تصدیق کی اس لئے ان کا خطاب ہی صدیق ہو گیا۔ رسول اللہ نے جب مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی تو ابوبکرؓ ہی ساتھ تھے اور غار ثور میں [illegible] قرآن مجید میں [illegible] جنگ تبوک کے

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

دعائے قلب

ـــــ عفت موہانی

آپ نے آج تک حریم میں بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں۔ کچھ ان میں فرضی کچھ نیم حقیقی ہوں گی لیکن آج جو قصہ آپ پڑھیں گے وہ سو فی صدی حقیقی ہے۔ اور موضوع کے لحاظ سے کوئی اسے فرضی کہنے کی گستاخی اور بے ادبی نہیں کر سکتا! اس حقیقی واقعہ سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ انسان اگر چاہے تو دعاؤں کی طاقت پر تقدیر کو بھی بدل سکتا ہے جیسا کہ ایک حدیث شریف میں آیا ہے کہ دعا موت کو ٹال دیتی ہے!۔ اور میرا خیال بھی یہی ہے۔ دعا تقدیر کو بدل دیتی ہے۔ بشرطیکہ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہو۔ اور ہم نے سنا بھی ہے کہ ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اس کے علاوہ ؎

یہ تیری خام خیالی ہے جلد باز بشر
دعائے قلب کبھی بے اثر نہیں ہوتی

۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ جب بی۔ اے آنرز میں تھی۔ میرے ساتھ میری ایک سہیلی پڑھتی تھیں۔ ایک روز ہم میں مذہب کے تعلق سے گفتگو ہونے لگی۔ دعا اور بددعا کے مفید و مضر اثرات کا ذکر چل نکلا کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ تب میری سہیلی نے اپنی خالہ محترمہ پر گزرا ہوا یہ واقعہ سنایا۔ میری سہیلی اس وقت شادی شدہ اور چار بچوں کی ماں تھیں۔ اور بہت مہذب اور سنجیدہ بھی۔ لہٰذا اس واقعہ میں کسی قسم کے غلو یا مفروضہ کا شائبہ نہیں ہے!۔

ان ہی کا بیان تھا کہ

"میری خالہ بہت خوشحال گھرانے کی فرد تھیں۔ انھیں بجز اولاد کے اور کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ خالو صاحب نیک سیرت اور مذہبی انسان تھے۔ دونوں میاں بیوی اولاد کے نہ ہونے سے بہت اداس اور دلگرفتہ رہتے تھے۔ ان پر انگلیاں اٹھتی تھیں، کبھی خالو کی ذات موضوع بحث بنتی اور کبھی خالہ میں عیب تلاش کئے جاتے!۔

بہرکیف اللہ کی دعا نے نیم شبی اور آہ سحرگاہی نے اپنا اثر دکھایا۔ خدا نے انھیں شادی کے بارہ سال بعد ایک بچی دی۔ اس کا نام انھوں نے برکت و حرمت کے خیال سے عائشہ رکھا۔ بہت ناز و نعم سے اس کی پرورش کی۔ عائشہ اکلوتی تھی۔ اس کا بھائی بہن کوئی نہ تھا۔ والدین کی تمام تر توجہ اس کا کردار اور سیرت کے نکھارنے اور سنوارنے پر صرف ہوتی تھی۔ اسے خالہ خود اسکول لے جاتیں اور گھر پر خالو مذہبی تعلیم دیتے تھے!۔

عائشہ چودہ برس کی تھی۔ تب اس کے والدین کو حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس عرصہ میں عائشہ کے دادا دادی ختم ہو چکے تھے خاندان میں بٹوارے ہو گئے تھے۔ اور فی الحال کوئی ایسا گھر بھی نہ تھا جہاں عائشہ والدین کی واپسی تک قیام کر سکتی۔ لہٰذا والدین نے فیصلہ کیا کہ عائشہ کو بھی ساتھ ہی لے چلیں۔ چنانچہ وہ بھی ماں باپ کے ساتھ گئی۔

حج بخیر و خوبی گزر گیا!۔ ان کی واپسی کے بہت کم دن رہ گئے تھے کہ دفعتہ عائشہ بیمار ہو گئی۔ پہلے پہل یہ خیال ہوا تھا کہ شاید موسم اور آب و ہوا کی تبدیلی نے اس پر اثر کیا ہے۔ معمولی علاج سے فائدہ ہو جائے گا لیکن یہ خیال غلط نکلا۔ عائشہ کا مرض بڑھنے لگا۔ اس کا معمولی بخار بہت خوفناک صورت اختیار کرنے لگا!۔ خالو عرب کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو اور حکیموں کو دکھایا گیا۔ متواتر علاج بدلے گئے۔ لیکن سب بے فائدہ ثابت ہوئے۔

عائشہ بخار میں تپتی رہی۔ ایک تو ریگزار عرب کی گرم ہوا۔ گرم ماحول اور صحرا۔ اس کا بخار۔ وہ گھلتی گئی رنگ روپ جلتا گیا۔ ہفتہ بھر ہی میں وہ پوست استخواں رہ گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا جاتا۔ آخر اس پر کوئی علاج کارگر کیوں نہیں ہو رہا تھا۔ خدا کی کیا مرضی تھی۔

ماں باپ بدحال تھے۔ فکروں کے مارے نیم جان، ان کی اکلوتی بچی ان سے جدا ہوتی نظر آ رہی تھی۔ خالو حرم نبوی میں جا کے آنسو بہاتے۔ خالہ دربار رسولؐ میں جھولی پھیلائے رہتیں۔ یا نبی اللہ عرصہ تک جیس سالی کے بعد اولاد کی نعمت ملی ہے۔ اسے واپس لینا ہے تو پھر دی کیوں تھی۔ تب محرومی بے شک تھی لیکن غم تو نہ تھا۔ اور اب ـــــ یہ غم ناقابل برداشت ہوگا۔ آپ کے در سے ہم کچھ لینے آئے ہیں ہم کھو کر نہیں جائیں گے۔ بخش دیجئے ہماری بچی ہمیں۔ یا سید کونین۔ واسطہ

حریمی دسترخوان

دہی بڑے ایک عام چیز ہے جسے ہر گھر میں بنایا جاتا ہے اسلئے آپ سے معذرت کرتے ہوئے اسے تیار کرنے کی ترکیب لکھ رہی ہوں اسے پڑھ کر ہو سکتا ہے کہ آپ یہ سمجھ سکیں کہ جس طرح آپ دہی بڑے بناتی ہیں یہ ترکیب اس سے کچھ مختلف ہے اور اس ترکیب سے دہی بڑے بنانے کے بعد مجھے یقین ہے کہ کھا کر آپ ضرور داد دیں گی۔

میٹھے دہی بڑے

غزالہ بیگم سید انہونوی

سامان کی تفصیل ایک جا نہیں لکھ رہی ہوں۔ اجزا کا علم آپ کو ترکیب کے ساتھ ساتھ ہوتا جائے گا۔

بیس دہی بڑے آپ کو بنانا ہوں۔ اوزان کم و بیش کر سکتی ہیں۔ سب سے پہلے آدھ سیر چھلکے والی ماش کی دال کو رات میں اتنے پانی میں بھگو دیں کہ دال پانی میں ڈوبی رہے۔ صبح دال کو مسل کر چھلکے علیحدہ کر دیجئے اور دال کو سل پر پسوا لیجئے۔ یہ خیال رہے کہ دال باریک نہ پیسی جائے۔ کچھ دردری رہے۔

۱۰۰ گرام کشمش اور ۱۰۰ گرام چرونجی کو دھو کر صاف کر لیجئے تھوڑی ہری مرچ، تھوڑی ادرک باریک باریک کاٹ کر کشمش اور چرونجی کے ساتھ پیسی ہوئی دال میں ملا دیں نمک بھی حسب ضرورت شامل کریں پھر تھوڑا پانی ملا کر دال کو اچھی طرح پھینٹیں پانی نہ اتنا کم ملائیں کہ دال زیادہ گاڑھی رہے نہ اتنا زیادہ کہ بالکل پتلی ہو جائے بس ایسی ہو کہ اسے ہتھیلی پر رکھ کر گول ٹکیا سی بنا سکیں۔ اور دو انگلیوں سے اٹھا کر تل سکیں۔

اب کڑوے تیل یعنی سرسوں کے تیل میں بڑوں کو تلیں۔ لیکن اتنا کم تلیں کہ وہ زیادہ سرخ نہ ہونے پائیں۔ تلنے کے بعد بڑوں کو پانی میں ڈال کر دس منٹ تک بھیگنے دیں۔ اس کے بعد انھیں نکال کر ہتھیلی سے دبا کر پانی نکال دیں۔

بڑے تلنے سے پہلے ہی ایک کلو تازہ دہی (کھٹا نہ ہو) لیں اس میں ۲۰۰ گرام شکر اور تھوڑا سا پانی ملا کر متھنی ہو تو اس سے اچھی طرح متھ لیں ورنہ چمچے سے ملا لیں اور اسی دہی میں بڑوں کو اچھی طرح

لت پت کر کے کسی ٹرے یا پلیٹوں میں سجا لیں۔ ہری دھنیا، ہری مرچ اور ادرک کتر کر چھڑک دیں اور انھیں اگر آپ کے یہاں ریفریجریٹر ہو تو اس میں ٹھنڈا کرنے کے لئے رکھ دیں۔ اگر نہ ہو تو آئس بکس میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔ آئس بکس بھی نہ ہو تو بڑے کو برف پر رکھ کر بڑوں کو سرد کر لیں لیکن اگر برف بھی نہ ہو تو ٹھنڈا کئے بغیر بھی نوش فرما سکتی ہیں ٹھنڈے ہو جانے سے لذت دوبالا ہو جاتی ہے۔

چٹنی۔ ان بڑوں کا جزو اعظم میٹھی چٹنی ہے ترکیب لکھ رہی ہوں یہ چٹنی بڑوں، تلے ہوئے پالک کے پتوں اور پکوڑیوں کے ساتھ بھی استعمال ہوتی ہے۔ ویسے اسے روزانہ کھانے کے ساتھ بھی استعمال فرمائیں کچالو یا مٹر وغیرہ بنائیں تو ان میں اسے ڈال کر نوش فرمائیں۔

۲۵۰ گرام پکی املی کو تھوڑے پانی میں تمام رات بھیگنے دیں اس کے بعد مل کر اسے باریک چھلنی یا کپڑے سے چھان لیں۔ ایک کلو گڑ لے کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے تھوڑا پانی ملا کر ایک دو جوش دیں۔ جب گڑ گل جائے تو اسے بھی چھان لیں۔

گڑ کے گاڑھے شربت میں املی کے رس کو ملا لیں۔

ایک بڑا چمچہ زیرہ ایک بڑا چمچہ کلونجی اور ایک چھوٹا چمچہ میتھی کو صاف کر کے برائے نام گھی میں ذرا دیر بھون کر نکال لیں۔ پھر دو بڑے چمچے دھنیا اور حسب ضرورت سرخ مرچ کو بھی ذرا سے گھی میں بھون کر نکال لیں (گھی نہ مل سکے تو ڈالڈا استعمال کریں)

ان پانچوں چیزوں کو گھی میں بھوننے کے بعد ایک ساتھ باریک باریک پیس لیں۔ پھر ایک بڑا چمچہ گھی میں ایک چٹکی ہینگ ڈال کر بگھاریں اور املی گڑ کے آمیزے کو ڈال کر پکائیں، جب دونوں چیزیں ایک جان ہو کر گاڑھی ہو جائیں تو اس میں پسی ہوئی میتھی، کلونجی، زیرہ، دھنیا اور مرچ ملا دیں۔ حسب ضرورت نمک بھی شامل کر لیں۔ ایک جوش دے کر اتار لیں چٹنی تیار ہو گئی۔ خیال رہے کہ اتنا زیادہ نہ پکائیں کہ چٹنی بہت زیادہ گاڑھی ہو جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو تھوڑا پانی ڈال کر ایک جوش اور دے لیں۔

دہی بڑوں پر ہری مرچ، ادرک اور ہرا دھنیا کاٹ کر چھڑکیں اور پھر کھاتے وقت میٹھی چٹنی ڈال لیں اور حسب خواہش پسا ہوا مسالہ بھی چٹکی میں لے کر چھڑک لیں۔

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

چھوٹی سی بات

محسن ملیح آبادی

اسے محسوس ہوا۔ کوئی آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر سے لحاف ہٹا رہا ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی نیند سے بوجھل آنکھیں نہ کھول سکا۔ پھر اسے اپنے چہرے پر کسی کی سانسوں کی گرمی کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے کے بہت قریب اپنا چہرہ جھکائے ماں کھڑی تھی۔

"کیا ہے ماں؟" اس نے نیند سے بوجھل اور گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹا" ماں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے چہرے کے قریب سے اپنا چہرہ ہٹا لیا۔

"کوئی بات تو ضرور ہے ماں" اس نے اٹھ کر تشویشناک لہجے میں دوبارہ پوچھا:

"بس ایسے ہی۔ مجھے خیال ہوا گرمی زیادہ ہے اتنے موٹے لحاف میں"

"گرمی.... اتنی سخت سردی ہو رہی ہے۔" اس نے ماں کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اسے بڑا تعجب ہوا وہ مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ ماں بولی۔ "شاید تمھیں نہیں لگ رہی ہوگی۔ مجھے تو...." اور وہ اپنے پلنگ پہ دراز ہو گئی۔ بیٹے نے ایک بار پھر ماں کی طرف دیکھا۔ ماں آنکھیں کھولے کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی تھی وہ کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن نیند کے غلبے اور سردی کی شدت نے اسے لحاف اوڑھنے پر مجبور کر دیا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو اس نے دیکھا۔ خلاف معمول ماں کے چہرے پر وہ شگفتگی اور تازگی نہ تھی جو ہر روز ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر کی گہری لکیریں نمایاں تھیں اور وہ کچھ بے چین اور مضطرب سی نظر آ رہی تھی۔ آنکھیں بھی سرخ سرخ تھیں جیسے اس نے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی ہو۔ وہ کچھ خاموش خاموش بھی تھی۔

ماں کی سرخ سرخ آنکھیں، بے چینی اور فکر سے بوجھل چہرہ دیکھ کر اسے تشویش ہوئی مگر وہ خاموش رہا۔

جب وہ ناشتے کی میز پر ناشتہ کر رہا تھا تو اس نے اندازہ لگایا

ماں کا ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا وہ کچھ تھکی اور مضمحل نظر آ رہی تھی۔ وہ برابر اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھی جیسے اس کے چہرے میں کچھ تلاش کر رہی ہو۔ وہ خاموشی سے ماں کی کیفیات کا جائزہ لیتا رہا۔

ناشتہ کر کے وہ خاموشی سے اٹھا اور کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ جب وہ کپڑے تبدیل کر رہا تھا اس وقت اسے اپنے پیچھے ماں کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے دیکھا پیچھے ماں کھڑی تھی۔ افسردہ افسردہ سی فکر کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی۔

"کہاں جا رہے ہو بیٹا۔" ماں نے اس طرح پوچھا جیسے وہ بھول ہی گئی ہو کہ ہر روز وہ کالج بھی جاتا ہے۔

"کالج جا رہا ہوں ماں۔" اس نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر بیٹا...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا ماں"؟ وہ ماں کے قریب آ گیا

"آج تم کالج نہ جاؤ بیٹا" ماں نے بڑے ہی حسرت بھرے لہجے میں کہا

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟" اس نے تشویشناک نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میرا دل ڈر رہا ہے بیٹا" ماں نے بہت گمبھیر آواز میں کہا۔

"کیوں آخر کیا بات ہے۔ آج تم اس قدر پریشان کیوں ہو ماں!" اس کے لہجے میں قدرے جھنجلاہٹ تھی۔

"نہ جانے کیوں آج میرا دل بہت گھبرا رہا ہے"۔ ماں کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی"

"لیکن آج کالج جانا بہت ضروری ہے۔ آج فیس جمع کرنا ہے اور پھر آج تو آدھے دن سے چھٹی ہو جائے گی۔ میں دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔" وہ عجیب بے خیالی میں کھڑی سنتی رہی

اور جب اس نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی اٹھا کر کلائی پر باندھنا چاہی تو ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھڑی کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے وہ گھڑی نہ ہو۔ اس کے ہاتھ پر ایک دم کوئی بھوڑا ابھر آیا ہو۔ "یہ گھڑی.... یہ گھڑی آج باندھ کر نہ جاؤ بیٹے"۔

"کیوں اس گھڑی میں کیا ہے" اس نے حیرت سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اب اسے ماں کے ذہنی توازن بگڑ جانے کا شک

ہونے لگا تھا۔

"یہ گھڑی تیرے باپ کی نشانی ہے۔ کہیں ٹوٹ نہ جائے بیٹے"۔ ماں نے بڑے اضطراب سے کہا

"کیوں کیا آج میں پہلی بار باندھ کر جا رہا ہوں جو تم ایسا سوچ رہی ہو"۔ وہ ماں کی کسی بات سے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا جواب سن کر ماں خاموش ہو گئی تو وہ بولا "اچھا ماں۔ وقت بہت ہو چکا ہے اب میں چلتا ہوں"۔

ماں نے جو کسی خیال میں کھوئی ہوئی تھی چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ اور بہت آہستہ سے بولی۔

"وقت بھی تنگ ہو چکا ہے"۔

ماں دروازے تک بیٹے کے پیچھے آئی۔ جب بیٹا دروازے سے باہر نکل گیا تو وہ دور تک اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ اس وقت کسی خیال سے وہ بڑی طرح لرز رہی تھی۔

دوپہر آہستہ آہستہ گزر رہی تھی وقت کے ساتھ ماں کا اضطراب بھی بڑھتا جا رہا تھا وہ اب تک کیوں نہیں آیا۔ وہ تو کہہ کر گیا تھا دوپہر تک واپس آ جائے گا۔ کہیں اس کا خواب ...... نہیں نہیں۔ خدایا۔ کہیں میرے بچے کو بھی میرے شوہر کی طرح۔ ان خیالوں نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ ایک سال پہلے ایکسیڈنٹ سے اس کے شوہر کی موت واقع ہو گئی تھی بس تب ہی سے وہ ایکسیڈنٹ سے بہت ڈرنے لگی تھی۔

آج اس نے ایک ایسا ہی خواب دیکھا تھا۔ کالج جانے کیلئے جب اس کا بیٹا گھر سے نکلتا ہے خلاف معمول وقت بہت تنگ ہو چکا ہے۔ جلد کالج پہنچنے کے لئے وہ تیز تیز قدم بڑھاتا اور کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتا جب سڑک پار کر رہا ہوتا کہ اچانک ایک تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا جاتا ہے بس اسی خواب نے اسے بے چین کر دیا تھا

ابھی وہ پلنگ پر لیٹی خواب کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر چونک پڑی اس نے تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف دیکھا سامنے بیٹا آ رہا تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا وہ دوڑ کر اس کے قریب گئی اور اسے کلیجے سے لگا لیا۔ اب اس کے چہرے پر فکر و افسردگی کی جگہ تازگی اور بشاشت آ چکی تھی۔ اچانک ماں کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات اور اپنے تئیں اس قدر پیار کا جذبہ دیکھ کر اس نے حیرت بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے۔ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے ماں!"

اور ماں نے رات میں دیکھا ہوا خواب بیٹے کو سنا دیا۔ خواب سن کر بیٹا زور سے ہنسا اور بولا "تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو ماں۔ خواب بھی کہیں حقیقت ہوتے ہیں۔ اتنی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر تم اس قدر پریشان ہو جاتی ہو"۔

اس نے نظریں اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس وقت ماں کی آنکھوں میں وہ موٹے موٹے آنسو لرز رہے تھے۔

(بقیہ ابوبکرؓ صفحہ ۶ کا)

موقع پر جب رسول اللہؐ نے مالی اعانت کی اپیل کی تو ابوبکرؓ نے اپنا سارا مال و متاع حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا اور جب آپؐ نے پوچھا کہ ابوبکر اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑا تو انھوں نے فرمایا کہ ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ وہ تمام غزوات میں شریک ہوئے ان کی زندگی میں سادگی اور قناعت مثالی حیثیت رکھتی ہے پیشے کے اعتبار سے تاجر تھے۔ محنت و مشقت پر یقین رکھتے تھے۔ حد یہ ہے کہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد بھی حسب دستور تجارت کا مال بازار میں لے جا کر فروخت کرتے رہے لیکن حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ نے اصرار کیا کہ اب آپ پر خلافت کی ذمہ داریاں ہیں اور اس کے لئے وقت بھی درکار ہے اس لئے اب آپ خود بازار جا کر مال فروخت نہ کیا کریں بلکہ اپنے گزارہ کے لئے بیت المال سے رقم لے لیا کریں۔ چنانچہ محض گزر بسر کے لئے بیت المال سے رقم لینے لگے۔ ابوبکرؓ کو ایک شرف یہ بھی حاصل ہے کہ وہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے باپ بھی ہیں۔ (ماخوذ)

(بقیہ حریمی دسترخوان صفحہ ۹ کا)

چٹنی کے ساتھ دو چمچے کلونجی ایک چمچہ میتھی بریاں (بھون کر) کر کے ایک ہی میں پیس لیں۔ اس طرح زیرہ ایک چمچہ اور دھنیا دو چمچہ علیحدہ علیحدہ بھون کر پیس لیں۔ سرخ مرچ بغیر بھونے ایک چمچہ پیس لیں اس طرح یہ تینوں پسی ہوئی چیزیں تیار کر کے رکھیں۔ بڑوں پر چٹنی ڈالنے کے بعد انھیں حسب خواہش چھڑک کر نوش فرمائیں

چٹنی بچ جائے تو کھانے کے ساتھ استعمال فرما سکتی ہیں۔ بجد لذیذ ہوتی ہے۔ کافی دنوں تک خراب نہیں ہوتی۔

عورت کا رومان اور اس کا المیہ

جارج ایلیٹ: حیات خیالات اور فن

از نعیم امروہوی

قسط اوّل، تعارف

کاش میں ان غیر مرئی ہستیوں میں شامل ہو جاؤں جو انسانوں کے ذہن میں رہتی ہیں اور اپنے وجود سے انکو بہتر بناتی ہیں" ـــــ جارج ایلیٹ

آج دنیا کا حال یہ ہے کہ اس میں جتنی بھی برائیاں ہیں ان کا ذمہ دار پورا سماج ہے اور جو تھوڑی بہت اچھائی باقی رہ گئی ہے وہ صرف افراد سے منسوب ہے۔ ہمارا سماجی شعور اتنا ناقص ہو چکا ہے کہ ہم اکثر سچے عقیدوں کو سراب قرار دیتے ہیں اور سچے جذبات پر گناہ یا غلطی کا الزام عائد کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم کسی ایسی زندگی کی کہانی سے واقف ہوں جس سے سماج کا افراد کا پر اثر ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی انسان ایسا نہیں جس کی اندرونی ہستی اتنی مضبوط ہو کہ جو کچھ اس کے باہر ہے وہ اس سے متأثر نہ ہو سکے ـــ اور جس کے سچے عقیدے اور جذبات کی حقیقت اور سچائی سے انکار کرنا خود سراب اور گناہ ہو۔ خاص طور سے حریم کی بہنوں کے لئے یہ کہانی بے حد راحت بخش اور افادی ہوگی اور انتہائی دلچسپ بھی کیونکہ یہ ایک عورت کی کہانی ہے۔

کسی زندگی کو اچھی طرح جاننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کے اس المیے سے [illegible] ہوں جس کے اردگرد وہ زندگی گھومتی ہے۔ عورت کا المیہ اس کی تنہائی ہے۔ شاید ہی کوئی مرد اسے صحیح طور سے سمجھ پاتا ہے۔ عورت ہونا کیا معنی رکھتا ہے وہ کیا چاہتی ہے اور کیا بن سکتی ہے یہ ہم بہت ہی کم جانتے ہیں۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تو ہم سنتے ہیں مگر ان میں جو نغمہ چھپا ہے اسے کون سنتا ہے؟ اس کی آنکھوں کے اشاروں کو تو خوب پہچانتے ہیں مگر انھیں آنکھوں کے وہ آنسو جو شاید کبھی باہر نہیں آتے اور وہ آہیں جو ہر عورت بھرتی ہے۔ انھیں کون دیکھتا اور سنتا ہے؟ اس کے جسم کی حرارت تو ہم محسوس کرتے ہیں مگر اس کی جلتی ہوئی روح کی تپش کا احساس کس کو ہوتا ہے! شاید عورت کو مرد سمجھ ہی نہیں سکتے کیونکہ مرد زندگی کا صاف اور شفاف آئینہ اور اس کی سادگی ہیں اور عورت اس کی پراسرار پہیلی۔ مرد زندگی کے جیتے جاگتے دن ہیں اور عورت اس کی راحت افزا رات۔ اسی لئے شاید مرد اور عورت کا سچا ملن اتنا ہی خوبصورت ہوتا ہے جتنا شام و سحر کا اتصال یعنی جب رات اور دن ایک دوسرے کی باہوں میں ہوتے ہیں۔

عورت کا رومان یہ ہے کہ وہ حسن آفریں ہے اور محبت بخشتی ہے۔ مگر اس کا رومان اس کے المیے سے جدا نہیں ہوتا۔ عورت کے حسن کا سب سے دلفریب عنصر اس کی پراسراری و گہرائی ہے ـــ وہی پراسراری جسے مرد سمجھ نہیں پاتے وہی پہیلی جسے وہ بوجھ نہیں پاتے ـــ اور جس وجہ سے یہ رومانی پراسراری اس کا المیہ بھی بن جاتی ہے۔ پراسراری حسن کا ایک لازم عنصر ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی حسن ایسا نہیں ہوتا جس میں تھوڑی بہت اجنبیت نہ ہو۔

عورت کے حسن کے دو عنصر اور ہیں۔ حسن صورت اور حسن سیرت۔ مجھے جسمانی خوبصورتی کی دلکشی سے انکار نہیں اور نہ ہی اس گہرے رشتے سے جو جسمانی حسن اور حسن سیرت میں ہوتا ہے مگر اگر ہم عورت کے حسن کو صرف جسمانی خوبصورتی تک محدود کر دیں جیسے ـــ اور جیسا کہ ہم عموماً کرتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا تصور حسن نامکمل اور ناقص ہے۔ حسن سیرت نہ صرف اس کا ایک لازم حصہ ہے

سے ہمدردانہ محبت میں ہر شے کا حسن تلاش کرنے کی کاوش اور ہر قسم
کی خوبصورتی کی قدر میں، ایک شاعرانہ تخیل اور فلسفیانہ ذہنیت ہے۔ ایک
تقاضا سے پیدا احساس خودی اور مطالعہ باطن میں خدا کی روحانی بندگی اور
اس سے حاصل ہونے والی زندگی کے احساس میں ہوتا ہے۔ یہ جذبہ کبھی تقلیدی
نہیں ہے کبھی تخریبی نہیں ہوتا صرف حساس اور تخلیقی ہوتا ہے۔ اس
مزاج میں مہر و سپردگی اور خود کو تج دینے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ ہمیں
غرور، تکبر، نفرت اور بغض سے پاک کرتا ہے۔ ہمارے جذبات اگر اس نسوانیت
سے خالی ہیں تو وہ زندگی میں صرف تلخی پیدا کرتے ہیں اور
ان میں صرف جوش و خروش ہوتا ہے۔ وہ دن کے
سورج کی تپش کے مانند ہوتے ہیں مگر نسوانیت ان میں رات کی چاندنی
کا سا کیف اور سکون پیدا کرتی ہے۔ اس جذبہ نسوانیت کا ہمارے اندر ہونا
خدا کی رحمت ہے۔ آپ کو ہر بڑے شاعر اور ادیب ہر عظیم آدمی اور
اچھے انسان میں یہ جذبہ نسوانی ملے گا۔ اور حالانکہ بیشتر مرد اور عورتوں میں
یہ بیدار نہیں ہوتا پھر بھی اس کو ہم جب چاہیں بیدار کر سکتے ہیں اور
اس کی بیداری اور برقراری سے اگر ہمیں اپنی زندگی اور دنیا سے جتنی
بھی بیزاری ہے وہ دور کرنی ہے تو۔ ہر انسان کا فرض ہے کیونکہ اس
جذبہ نسوانیت سے محروم رہنا خدا کی دی ہوئی زندگی کی احسان فراموشی
ہے اور اس کے تئیں ناشکری ہے۔ اس سلسلے میں شاید گوئٹے کی دی ہوئی
ہدایت سب سے موثر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم کو روزانہ کوئی
حسین تصویر دیکھنا یا کوئی دلکش نغمہ سننا چاہیے یا کوئی منتخب نظم پڑھنی چاہیے۔
اس طرح یہ جذبہ ہمیشہ بیدار ہوگا اور ہماری زندگی کے ہر دن کو
خوشگوار بنا دے گا۔

ایک اور وجہ جو اکثر زوجین کے درمیان تلخی پیدا کرتی ہے وہ ایک دوسرے
سے [illegible] ہے اور باعث لغزش بھی ثابت ہو سکتی ہے وہ دونوں
کی ناواقفی پر مبنی ہے یہ ناواقفی ہماری تہذیب کی کچھ جاہلانہ اور غیر فطری اور
غیر حساس روایتوں سے پیدا ہوتی ہے جن کا ذکر بہر حال اس مضمون
کے دائرے کی حد میں نہیں آتا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے روحانی اور
جنسی تعلقات میں تنوع چاہتا ہے۔ مثلاً ہر مرد کا جی چاہتا ہے کہ وہ عورت جسے پسند آتی
ہے [illegible] کی سی شوخی اور بے باکی ہو کبھی اسے دلہن جیسی شرم و حیا اور
[illegible] کبھی وہ بیوی سے ادا اور بناؤ کا طالب ہوتا
[illegible] فطری خواہشات ہوتی ہیں۔

رہنا اگر زوجین کو ایک دوسرے کی اس ضرورت کا احساس ہو اور
اور کس وقت شریک زندگی انہیں کس روپ میں اپنانا چاہتا ہے یہ وہ
محسوس کر کے وہی روپ اختیار کر لیں تو ازدواجی رشتے میں ابدی
مسرت اور آسودگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خوش اور صحت مند ازدواجی
زندگی بسر کرنے والے اس حقیقت سے واقف ہوں گے خواہ انھوں
نے کبھی اس بات کو واضح طور پر سوچا نہ ہو۔ شاید یہ بات مبہم معلوم ہوتی
ہے کہ کس طرح ایک انسان اتنے مختلف روپ لے سکتا ہے مگر سچ تو یہ
ہے کہ میاں اور بیوی کے رشتے میں انسانیت کا ہر رشتہ قائم ہے
اور اس میں ساری کائنات سموئی ہوتی ہے۔ قدرت کا ہر راز اس
رشتے میں پنہاں ہوتا ہے اور یہی فطرت کے ہر تقاضے کا ذریعہ اظہار
ہے۔ اس کی آرزو میں اچھائی اور پاکیزگی کو پانے کی کاوش چھپی
ہے اسی کے مکمل ہونے کا نام زندگی ہے۔ اس رشتے میں اگر کشیدگی
ہو تو دوئی کی بو آنے لگتی ہے مگر اس کے [illegible] میں وحدت کی خوشبو
ہوتی ہے۔ اس کے عمل میں پوری ہستی کا اظہار ہے اور اس کی تکمیل
سے انسان کو تکمیل ہوتی ہے۔ یہ جس گھر میں صداقت کے ساتھ
ہوتا ہے وہ عبادت گاہ بن جاتا ہے اور اس کی مقدس محبت کے
چاروں طرف خدا اپنی سچی بندگی کا ہالہ کھینچ دیتا ہے۔

ناولوں کی ایک قسم کو رومانی ناول کہا جاتا ہے۔ یہ رومانی
ناول دنیا کی بیشتر زبانوں میں لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ ایک مصدقہ
حقیقت ہے کہ ان کے پڑھنے والوں میں ۹۰ فی صدی لڑکیاں ہوتی
ہیں۔ میں اکثر ان ناولوں کے آخری صفحات پڑھ لیا کرتا ہوں۔ ان
میں سے بیشتر پر یہی خوبصورت اختتام ہوتا ہے کہ شب عروسی ہے
اور لڑکی نے اپنے سہاگ کی سچی محبت کو پا لیا ہے۔ یہ صفحات عموماً
پیار کی خوشبو سے مہکے ہوتے ہیں۔ شاید پریوں کی داستان کا جز
معلوم ہوتے ہیں مگر یہ کوئی غیر فطری کہانیاں نہیں ہیں۔ ہر لڑکی اپنے
دل میں ایسے رومانی خواب رکھتی ہے اور ہر مرد ہر ایک عورت کے ان
خوابوں کو شرمندۂ تعبیر کر سکتا ہے ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا
جا سکتا اور اگر ان میں کوئی سراب ہوتا ہے تو وہ صرف ان معصوم
پڑھنے والیوں کی وہ امید کہ شاید یہ صفحات کبھی ان کی بھی زندگی
بن جائیں گے۔ کیونکہ بہت کم ایسی ہوتی ہیں جو اپنے ان خوابوں کو
بھی پاتی ہیں ورنہ بیشتر کی زندگی ایسے [illegible] کی محتاج رہتی ہے۔

قربانی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم اپنی روزمرہ کی معمولی زندگی کو بھی عظیم بنا سکتے ہیں اگر اس کے تئیں سنجیدگی اور تقدس پیدا کر لیں۔ ہمدردی، محبت، عفو و درگزر، صبر اور شکر، بردباری اور ایمانداری میں بھی یہ چھپی ہوتی ہے۔ یہ بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور بے لوث خدمت میں بھی چھپی ہے اور ہر نیک نیت اور سچی بیوی اور ان کے ساتھ اسکے گھر میں رہتی ہے۔

اپنے عظیم ناول "مڈل مارچ" میں جارج ایلیٹ اس حقیقت کو ہمارے لئے ہمیشہ کے لئے لکھ گئی ہے۔ اپنی ہیروئن کے متعلق اختتام پر وہ لکھتی ہے۔

"بے شک اس کی زندگی کے معین کردہ اعمال عملی اعتبار سے خاطر خواہ نہ تھا اس جد و جہد کا جو ایک معصوم اور ادبی فطرت نے ناقص سماجی حالات میں کی۔ اس نے کوئی عظیم کارنامہ انجام نہیں دیا نہ کوئی بے مثال قربانی دی۔ ایسی وسعت بہت کم لوگوں کی زندگی دیتی ہے۔ مگر ہم معمولی انسان اپنے روزمرہ کے الفاظوں اور اعمال سے ایسی ہی کسی زندگی کو تیار کرتے رہتے ہیں جس کا ساتھ شاید اس سے زیادہ افسوس ناک ہو۔

اس کی لطیف اور نازک روح کے باریک تار عام آنکھوں کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اس کی مکمل سیرت اس دریا کی طرح تھی جو چھوٹی چھوٹی نالیوں میں بٹ جاتا ہے۔ اور زمین پر کوئی نام نہیں اختیار کرتا۔ مگر اس کی صفات کا اثر ان لوگوں میں بھلائی بنا کر پھیلا ہوا تھا جو اس کے قریب رہے تھے کیونکہ دنیا کی بڑھتی ہوئی بھلائی کافی حد تک ان چھوٹی چھوٹی نیکیوں اور قربانیوں کی دین ہے جو کبھی تاریخ کا حصہ نہیں ہوتیں اور میرے اور تمہارے ساتھ آج زندگی اتنی دشوار کن نہیں ہے کہ جتنی ہو سکتی تھی تو آدھی حد تک ان کی بدولت ہے جنھوں نے وفاداری سے ایک چھپی ہوئی زندگی گزاری اور ان قبروں میں دفن ہیں جن پر کبھی کوئی نہیں جاتا۔" (مڈل مارچ صفحہ آخر)

لوگ کہتے ہیں کہ خدا ہر انسان کے دل میں رہتا ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ خدا محبت ہے۔ خدا محبت بنکے دلوں میں رہتا ہے جیسا ہماری جارج ایلیٹ کے سینے میں محبت بنکر دھڑکتا تھا۔

خوش رہنے کے گُر

(ارسال مسز محتشم پرویز)

عبادت کریں ۔۔۔	اخلاص کے ساتھ
منصوبہ بنائیں ۔۔۔	فراست کے ساتھ
خرچ کریں ۔۔۔	میانہ روی کے ساتھ
کھائیں ۔۔۔	اعتدال کے ساتھ
بیٹھیں ۔۔۔	آہستگی کے ساتھ
ورزش کریں ۔۔۔	باقاعدگی کے ساتھ
کام کریں ۔۔۔	خوش دلی کے ساتھ
عطا کریں ۔۔۔	فیاضی کے ساتھ
جئیں ۔۔۔	حوصلے کے ساتھ
چلیں ۔۔۔	وقار کے ساتھ
پڑھیں ۔۔۔	انتخاب کے ساتھ
بولیں ۔۔۔	اختصار کے ساتھ
غور کریں ۔۔۔	گہرائی کے ساتھ
مقابلہ کریں ۔۔۔	جرأت کے ساتھ
خدمت کریں ۔۔۔	خلوص کے ساتھ
بحث کریں ۔۔۔	دلیل کے ساتھ

یہی زندگی ہے

عطیہ ہدایت اللہ

سیٹی کھنچ گئی، دیوہیکل طیارہ حرکت میں آ گیا دروازے کی اوٹ میں ان کا لاڈلا بیٹا اسد نامعلوم مدت کے لئے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ریلنگ سے سر ٹیکے شاہینہ بیگم کا نازک وجود ہولے ہولے کانپنے لگا۔ آنسوؤں کے گولے حلق میں پھنسنے لگے ایسے میں ان کے شوہر آگے بڑھے۔ آہستہ سے اپنی بیوی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور آواز کو نارمل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے: "بیگم ضبط سے کام لو ہمارا اسد بہتر مستقبل کی تلاش میں نکلا ہے۔ ہم اس کی کامیابی کے لئے دعا کریں گے، چلو گھر تم نے رات بھی جاگ کر گزاری ہے" رومال سے اپنی جلتی آنکھیں رگڑتے ہوئے شاہینہ بیگم اشفاق احمد کے سہارے کار کی طرف بڑھ گئیں۔

سارے راستے وہ خاموش، کھڑکی کھولے سی شیشے کے باہر خلا میں گھورتی رہیں۔ اشفاق بھی ضبط کی شوریدہ سر خیالوں سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ مرد تھے اور اپنے مخفی جذبات کا اظہار آنسوؤں یا الفاظ کی شکل میں کرنا مردانگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ اسی لئے تو ان کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔ گھر پہنچ کر شاہینہ لاؤنج میں بچھے صوفے پر ایسے گر کر ہانپنے لگیں۔ جیسے ساری زندگی میدانِ جنگ میں لڑ کر ابھی ریلیز ہو کر آئی ہوں۔ گھر پرسکون، خاموش اور ویران تھا۔ یہی کمرہ تھا جہاں صبح کے وقت چاروں طرف بکھری کتابوں، فلمی کیسٹوں، موزوں، چلغوزے اور مالٹوں کے چھلکے سنبھالتے ہوئے شاہینہ بیگم مسلسل بڑبڑاتی رہتیں۔ اپنی بیٹی اور بیٹوں کو خوب خوب ڈانٹتیں لیکن مجال ہے جو ان کے کانوں پر جوں بھی رینگ جائے۔ امی کی جھنجھلاہٹ پر بچوں کے ساتھ ساتھ اشفاق بھی چائے کی پیالی پر جھک کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے۔

"ارے بھئی بیگم جانے بھی دو، بچے ہیں، کیوں ڈانٹتی رہتی ہو مزہ تو اپنے ہی گھر میں ہے جیسے چاہو جس طرح چاہو رہو، مکمل آزادی ہوتی ہے اور پھر یہی تو دن ہیں ان کے۔"

"ہاں ہاں آپ ہی نے تو ہمیشہ ان کی سائیڈ لے کر بگاڑا ہے۔ غضب خدا کا اتنے بڑے بڑے بچے اور حرکتیں دیکھو جی جل کر رہ جاتا ہے۔ آپ کی ہی عادتیں سرایت کر گئی ہیں: ان میں زمانے بھر کے پھوہڑ لاپرواہ اور — اور آرام طلب۔"

"ہیں ... ہئیں۔ لو بھئی بچو اب یہ بھی بات ہے کچھ ہمارے نام کی لاج رکھ لو۔ امی کو زیادہ شکایت کا موقع مت دو۔" اشفاق احمد مصنوعی خفگی اور مسکراہٹ بھری سرزنش کرتے اور جوں ہی تینوں بھائی بہنوں میں کالج یا اسکول کی کسی ڈیبیٹ پر بحث چھڑ جاتی یا اسد کا انڈے کا حلوہ اشعر کی آملیٹ سے بدل جاتا تو میز پر وہ زور کا رن پڑتا کہ وہ چلاتی رہ جاتیں اور گرم گرم چائے کی پیالیاں لڑھک کر نیچے بچھے غالیچے کا جگر داغ داغ بنا جاتیں۔

اب جب تک باپ کی غصیلی آواز آتی مسکین سی صائمہ کے لمبے لمبے بال میز پر گراتے ہوئے کسی بھائی کے ہاتھ میں ڈھیر کی شکل میں پکڑے ہوتے۔ بعد میں میز کا پلاسٹک اور غالیچے کے داغ دھبے رگڑتے ہوئے شاہینہ غصے میں اول فول سناتی رہتیں۔

صوفے کے سامنے دیوار کے ساتھ بڑا سا ٹی وی رکھا تھا جس کو لگانے کے بعد ایسی آوازیں آتیں۔ جیسے فضا میں طیارے گذر رہے ہوں۔ یا سمندر کے سینے پر چلتی موٹر بوٹ اشفاق احمد بڑی مشکل سے سیکنڈ ہینڈ ٹی وی لانے پر آمادہ ہوئے تھے۔ ایک ہی رٹ کہ بچوں کی پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔

"امی نماز پڑھ لی آپ نے؟" بڑا بیٹا اشعر اس کے قریب آ بیٹھا۔

"ہاں۔ کیوں؟"

"امی دعا کیجئے۔ آج رات چور آ جائیں"

"کیا دماغ خراب ہو گیا ہے" شاہینہ تڑپ کر بولی۔

"آہ امی میں کہتا ہوں یہ منحوس ٹی وی کوئی لے جائے تو پیچھا

چہرے۔ دیکھیں نا تصویر ٹھیک کراتے ہیں تو آواز غائب۔ آواز کا علاج شروع تو سکرین چٹیل میدان بن جاتا ہے۔ ایسے تو یا یا دوسرا لیکر دینے والے نہیں۔ اشعر کی رونی صورت کا سوچ کر اسے ہنسی آگئی۔

"اف۔ فوہ۔ بیگم آپ جب سے یہیں بیٹھی ویڈیو کو گھور رہی ہیں۔ چلو ایک کپ گرم گرم چائے کی ہو جائے"۔ ہلکے نیلے رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس اشفاق احمد سیڑھیوں سے اترتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔ شاہینہ نے ایک اداس سی نظر اپنے شوہر پر ڈالی اور کچن کی سمت تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھی۔

"اور ہاں بیگم ساتھ میں ایک آدھ ٹوسٹ بھی بنا لانا۔ صبح سویرے اسد کے ساتھ خالی چائے پی تھی"۔ تھوڑی دیر میں شاہینہ دو پیالیاں چائے، دو چمچ شکر اور دودھ لے کر آئیں۔

"بیگم سبزی، گوشت ختم ہو چکے ہوں گے اور آج بیپر ہے۔ آج تو تم گزارہ کر لو۔ شام کو ساتھ سب کچھ لیتا آؤں گا۔"

"ہم دو ہی تو ہیں اب کچھ بھی پک جائے فرق کیا پڑتا ہے۔ کون پسند اور ناپسند کرنے والا رہ گیا ہے اب" ٹھنڈی سانس بھر کر شاہینہ بولی

"ارے تو گویا اس حقیر پر تقصیر کو آپ نے اپنی لسٹ سے خارج کر دیا ہے کیا یعنی ہماری تو کوئی پسند ہی نہیں رہی۔ یاد ہے شادی کے شروع دنوں میں تم کتنے اہتمام سے میرے پسندیدہ کھانوں کا انتظام کرتیں۔ وہ تاش کے پتوں کی شیپ کے شامی کباب کتنے مزیدار ہوتے تھے اور ہر شام سفید چاولوں کے ساتھ کڑھی۔ واہ واہ کیا مزہ ہوتا تھا"۔ اشفاق احمد کی آواز میں کتنی اپنائیت بھرا شکوہ تھا۔

شاہینہ نے خالی خالی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا اور سر جھکا کر میز کی پالش کھرچنے لگیں۔

وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر گلا صاف کر کے نرم لہجے میں بولے۔

"دیکھو بیگم بچے سدا کسی کے پاس نہیں رہتے۔ اپنی ممتا کی تسکین کیلئے ہم انھیں کب تک گھونسلے سے لگا کر بٹھا رکھتیں۔ ہمارے بچوں کو بھی اس وسیع کائنات میں اپنے حصے کے بکھرے رزق کو تلاش کرنا ہوتا ہے"

"لیکن اتنی جلدی میرے پیارے بچے آغوش کو سونا کر کے وہ ایک ایک کر کے چلے جائیں گے۔ یہ میں نے سوچا نہ تھا"۔ شاہینہ بیگم کی پلکوں پہ آنسوؤں کے قطرے لرز رہے تھے۔

"جلدی کا کیا مطلب۔ اشعر پچیس سال کا ہے۔ یہاں صرف ایم بی بی ایس کے لئے کیا اسکوپ ہے۔ وہاں امریکہ میں اسپیشلائز بھی کرے گا اور نوکری بھی اچھی مل رہی ہے۔ اپنے اسد میاں تو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش رہے گا۔ وہاں باہر آتے جاتے ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ اپنی بزنس کی فیلڈ میں اس کا تجربہ بڑھے گا۔ فکر کس بات کا ہے" اشفاق احمد نے بیوی کو دلاسہ دینا چاہا۔ لیکن جیسے شاہینہ نے سنا ہی نہ ہو۔ گرم بھاپ اٹھتی پیالی پر نظریں جمائے جیسے وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ "چاند کی سیڑھیاں چڑھتے ہمارے بچے ایسے خوش تھے جیسے کسی نے ان کے لئے لمبی کالی راتیں جاگ کر نہیں کاٹیں۔ کسی نے جوانی کے قیمتی سال ان کے سکھ پر قربان نہیں کئے"۔ "اور تو اور ہم پر جان نچھاور کرنے والی صائمہ بھی دولہا کے سنگ ایسی خوشی خوشی گئی جیسے اسے برسوں کی قید و بند کے بعد رہائی ملی ہو"۔

"بیگم وہ ہمیشہ کے لئے تو باہر نہیں گئے۔ وہ سب لوگ اب ملنے آتے ہی رہیں گے"۔ ٹوسٹ کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے اشفاق احمد بولے۔ "ہاں زندگی کے سفر میں کبھی کبھی چند گھڑیاں گزارنے اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہر جایا کریں گے۔ اور بس۔ یہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایسا کیوں؟" پلکوں پر اٹکے آنسو گالوں پر بہہ نکلے۔

"اچھا چلو تم اس وقت ڈیپریشن کا شکار ہو۔ دفتر سے واپسی پہ بات ہوگی مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"

"تمہارے لئے اس دنیا میں پہلے ہی کی طرح دلچسپیاں اور رنگینیاں قائم و دائم ہیں لیکن عورت کے بچے جوان ہو جائیں تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ریٹائر ہو جاتی ہے"۔ شوہر کے پیچھے داخلی دروازہ بند کرتے ہوئے شاہینہ بیگم نے تلخی سے سوچا۔ اشفاق پچپن سال کے ہونے والے ہیں لیکن ان کے چہرے کی تازگی شگفتگی آواز کا کرارا پن اسی طرح برقرار ہے اور میں صرف ۵۰ سال کی ہو کر بھی کس قدر اداس، بوجھل اور شکستہ دل ہوں۔ شادی کے دو سال بعد اشفاق نے یہ گھر خریدا ان کے بچوں نے یہاں پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔ پہلے دن آنکھیں ملتے اسکول گئے۔ یہیں جوان ہوئے۔ ان کے کمروں میں صائمہ کی سہیلیوں کے دبے دبے قہقہے سنائی دیتے۔ اشعر اور اسد کے [illegible] دوستوں کے [illegible] بیگم [illegible]۔ اسد [illegible] میری

سپنوں کا محل

عارفہ اصغر بریلوی

شاہدہ باجی اپنے حسن و خوبصورتی کی وجہ سے سارے خاندان میں مشہور تھیں۔ گلاب کی پتی جیسے ہونٹ پھول جیسے رخسار [illegible] بڑی بڑی کٹوروں جیسی آنکھیں گول چہرہ اور متناسب جسم [illegible] شاہدہ باجی ایک [illegible] تھیں۔ خاندان کے سب ہی لڑکوں کے دل میں شاہدہ باجی کو پانے کی تمنا تھی لیکن نصیب کی ستم ظریفی کس کو معلوم تھی کہ یہ اتنا خوبصورت ہیرا کسی پتھر سے ٹکرا جائے گا۔ شاہدہ باجی کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا [illegible] کیوں نہیں بلا کی ذہین تھیں ہر سال فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوتی تھیں ان کے حوصلے بلند تھے اور وہ اپنا مستقبل شاندار بنانے کے خواب دیکھا کرتی تھیں لیکن ایک دشواری ان کی راہ میں حائل تھی کہ ان کی اماں پرانے خیالات کی مستورات تھیں وہ زیادہ پڑھائی لکھائی کی قائل نہیں تھیں اور خاص طور سے لڑکیوں کی پڑھائی کے تو بالکل خلاف تھیں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر بے شرم ہو جاتی ہیں [illegible] ان کا خیال تھا کہ تعلیم لڑکیوں کو [illegible] پھر بھی شاہدہ باجی کو تعلیم دلانے پر مجبور تھیں۔ کیونکہ شاہدہ باجی کے والد صاحب کے [illegible] ٹھیک نہیں تھے۔ وہ بے چاری ہر وقت اپنی [illegible] زندگی [illegible] جس دن سے اس گھر میں آئی تھیں [illegible] تھے۔ وہ بے چاری شوہر کی عیش [illegible] اور بے پرواہی سے بے حد پریشان تھیں وہ ایک شریف عورت [illegible] تھیں اس لیے ہر حالت میں شوہر کی خدمت گزار [illegible] رہیں وہ خوب جانتی تھیں کہ اس طرح بہکے ہوئے آدمی کو راہ راست پر لانا آسان کام نہیں ہے اور پھر دولت کا نشہ انسان کو بالکل اندھا کر دیتا ہے۔ خان صاحب پر دولت کا نشہ اس طرح چھایا تھا کہ ان کی آنکھیں گھر والوں کی طرف سے بالکل بند ہو چکی تھیں

شاہدہ باجی کی خوبصورتی کی وجہ سے بچپن ہی سے ان کے رشتے آنا شروع ہو گئے تھے ان کی امی جب بھی کوئی اچھا اور مناسب رشتہ دیکھتیں تو اپنے شوہر سے مشورہ کرتیں اور کہتیں کہ لڑکا بہت اچھا ہے پڑھا لکھا ہے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسے لڑکے کم ہی ملتے ہیں اس لیے میرے خیال میں تو اب آپ کو ہاں کر دینا چاہیے کیونکہ لڑکی بھی جوان ہو گئی ہے جوان لڑکی کو زیادہ دن گھر رکھنا ٹھیک نہیں اور ہمیں آخر زیادہ پڑھا کر کرنا بھی کیا ہے کوئی نوکری تھوڑی ہی کرانی ہے۔ زیادہ پڑھائی بھی لڑکیوں کو خراب کر دیتی ہے بس اتنا ہی کافی ہے لیکن خان صاحب کے کان تلے جوں تک نہ رینگی وہ اپنی دولت کے نشے میں مست تھے۔

وہ اپنی بیگم کی باتیں سن کر ہنس دیتے اور بات آئی گئی ہو جاتی۔ وہ سمجھتے [illegible] دولت [illegible] شاہدہ [illegible] اور پھر خان صاحب کا خیال تھا کہ میری دولت کی وجہ سے ضرور کوئی شہزادہ میری بیٹی کو بیاہ کر لے جائے گا۔

شاہدہ باجی نے بی۔ اے (B.A.) پاس کر لیا اور وہ بھی فرسٹ ڈویژن سے۔ سب کو بہت خوشی ہوئی خان صاحب کا سر بھی فخر سے بلند ہو گیا۔ وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ شہرت ہو۔ نام ہو آج ان کی اکلوتی بیٹی نے بی۔ اے پاس کر لیا تھا۔ امتیازی نمبر حاصل کیے تھے اس خوشی میں خان صاحب نے بڑی دھوم دھام سے جشن منایا۔

ان کی کوٹھی اس طرح جگمگا رہی تھی جیسے اس کو دلہن بنایا گیا ہو اور واقعی کوٹھی کو اسی طرح سجایا گیا تھا جس طرح دلہن کا سنگار کیا جاتا ہے [illegible] کوٹھی بے حد خوبصورت [illegible]

کھلائے پھر رہی تھیں۔ امرینہ کو اپنی باجی کی جانی بوجھی مکاری پر بے تحاشہ غصہ آگیا۔ تنہائی میں اتنے پیار سے دقاص بھائی کی باتیں کریں گی۔ اب دیکھیے جیسے کہ بڑا ناگوار گزر رہا ہو۔ اس نے سوچا کہ وہ ہرگز ان سے مخاطب نہ ہوگی۔ اور دوبارہ ان کی بکواس بھی نہ سنے گی۔ اسے رومان زدہ چھوکریوں سے سخت چڑ ہوتی تھی۔ باجی تو تھیں ہی رومان پرست۔ خیال پرست خواب دیکھنے والی۔ افسانہ نگار۔ اور اب وہ ناول لکھنے کا بھی مبارک اقدام کرنے والی تھیں!۔ امرینہ کو ہنسی آگئی۔ بھائی پہلے ہی ملک میں ناول نویس خواتین کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ روز ایک نئی خاتون ناول نویس کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ اب اور کیا گل کھلائیں گی۔ کہاں سے کوئی نیا موضوع فراہم کریں گی۔! بہرحال وہ ان کی دھمکی کے عملی جامہ پہننے کی سخت منتظر تھی۔ کیونکہ باجی نے بے حد نفیس ایک کاپی لا رکھی تھی۔ اور سوچ رہی تھیں کہ قبل اس کے کہ دقاص صاحب باجے بجاتے آدھمکیں وہ اپنا کوئی شاہکار اپنے پیچھے چھوڑ جائیں!۔ تاکہ لوگوں کو عبرت ہو۔!

ناشتے کے بعد ممی نے پچھلے دنوں کی خدنگ کا سارا الم غلم تختوں پر ڈھیر کر دیا اور ملازمہ کو چائے بنانے کا حکم دے کر چچی جان سے باجی کے بیاہ کی باتیں کرنے لگیں!۔

بڑی آپا نے تو حکم دے دیا ہے کہ نکلتے جاڑوں میں بیاہ کی تاریخ طے کر دیں گی۔ شاید دقاص بھی آنے ہی والے ہیں۔ میں نے ڈھنگ سے سنا نہیں تھا۔ شادی کی تاریخ کی بات ہی سن کر میرے پیٹ میں کبوتر سے اڑنے لگے تھے۔!"

کہہ رہی تھیں کہ ایک ماہ بعد دقاص میاں آ رہے ہیں انکی ملازمت پہلے ہی سے تیار ہے۔

سب لڑکے جوان تھے۔ کچھ سرکاری عہدوں پر کام کر رہے تھے اور کچھ زیر تعلیم تھے۔ لوگ ان کی غیبت میں صاف کہتے تھے کہ بڑی آپا کو مرحوم شوہر کے سرکاری عہدے، اپنے آٹھ لڑکوں اور ان کی کمائی کا غرور ہے۔ مگر ان کے منہ پر ہمیشہ سب کی بتیسی ہی نکلی دکھائی دیتی تھی۔ ان میں یہ بڑی خوبی تھی کہ کبھی وہ کسی کے دست سوال کو مایوس نہیں لوٹاتی تھیں۔ اگر کوئی ان کے پاس اپنی ضرورت لے کر جاتا اور ان کے پاس نقد رقم نہ ہوتی تو وہ اپنا کوئی چھوٹا موٹا زیور تک دے دینے میں پیچھے نہ ہٹتی تھیں!۔ اسی لیے اگر لوگ ان کی برائی کرتے تو تعریف کرنے پر بھی مجبور رہتے۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو ان کے مرہون منت نہ تھے۔ ویسے سب کی گردنوں پر ان کے احسان تھے!۔

وہ کل جگت کی آپا تھیں۔ بڑی بارعب خاتون، بے حد سنجیدہ، فضول باتوں سے انہیں نفرت تھی۔ دیندار بیوی تھیں۔ پانچ بہوئیں اچھے اچھے خاندانوں سے چھانٹ کر لا چکی تھیں۔ دو لڑکوں کی منگنی کر دی تھی۔ ایک پڑھ رہا تھا۔ ان کے چوتھے صاحبزادے دقاص احمد تھے۔ ان سے چھوٹے بھائی کی شادی ہو چکی تھی۔ تب دقاص ملک سے باہر تھے۔ چھوٹے بھائی نے ایم اے کر کے اسی کالج میں لیکچررشپ اختیار کر لی۔ اور چونکہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کی شادی نہ کر دی جاتی لہذا مطلق العنان بڑی آپا نے اتنی جلدی اپنی سہیلی کی نواسی سے ان کی شادی کر دی کہ بے چارے ایاز احمد کو سانس لینے کی مہلت تک نہ دی۔! اور اب وہ بے چارے ایک گول مٹول چھ ماہ کے ننھے کے باپ تھے!۔

ممی نے مصنوعی ریشم بالوں میں رکھ کر جوڑہ باندھا اور دامن پر زیر جینڈ لپیٹتی ہوئی بولیں: "سچ تو یہ ہے آمنہ کہ میرا دل ابھی تک دھڑکتا ہے۔ یہ تو بھائی صاحب نے ناحق حکم دے دیا تھا۔ ورنہ اتنے بڑے خاندان میں نوشینہ

کھپ سکے گی ؟؟ "

اے ہے۔ بھابی۔ آپ کے اندیشے" چچی جان تنک اٹھیں۔ "ماشاء اللہ اتنی ہونہار ہنسی خوشی وارے رہ رہی ہیں کہ نہیں۔ سب ہی تعلیم یافتہ ہیں اور کوئی بڑی آپا بھی ایسی ظالم نہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ کسی کے کارخانے میں دخل ہی نہیں دیتیں۔!"

اچھا چلو۔ میاں ذرا ٹھہرو کے رکشا لے آؤ" ممی نے سنجر سے کہا۔ "جلدی جا کے جلدی آنا ہے"

آپ لوگ بن ٹھن کے کہاں جا رہی ہیں" سنجر بولا۔ "نہ برقعہ نہ نقاب نہ چادر۔ زمانے نگوڑے میں آگ لگ رہی ہے۔ جا رنگا ہیں ابھی جا رہی" ممی تو ہنس پڑیں۔ مگر چچی جان کو ناگوار گزرا۔ "دلاریں چھوکرا بالکل ستیاناس ہو کر رہ گیا ہے نصیحت کرنے چلا ہے۔ اس عمر میں کون ہمیں اغوا کر کے لے جائے گا ؟"

آپ دونوں کے سر میں ایک بال بھی سفید نظر نہیں آتا" سنجر نے کہا۔

پھر کہتی ہوں کہ اب پیدل ہی چلی جاؤں گی" چچی جان نے دھمکی دی۔

مگر میں رکشا نہیں لاؤں گا۔

کیوں نہیں لاؤ گے ؟" وہ چیخیں۔

رکشے والے آپ لوگوں کو پہچان گئے ہیں۔ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ پھاٹک والے گھر میں ہم نہیں آئیں گے۔ سواریاں موٹی ہیں"

بھیا شاباش۔ واپسی میں دیر ہو جائے گی" ممی نے اسے چمکارا۔ "تمہاری باجی کے جہیز کا کچھ سامان بھی تو لانا ہے" انھوں نے گویا اسے رشوت دی۔

اچھا ٹیکسی لیے آتا ہوں" وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "رکشے کے کرائے میں پکا تا نہیں

یہ سنجر آخر کیوں باجی ہی کے اردگرد پھرا کرتا تھا۔ اگر باجی کچن میں ہوتیں تو وہ وہاں بھی پہنچ جاتا! ماں کے ساتھ ماسی کے وہاں کے خانوادے بھی پہنچ جاتے اور ایسی گرما گرم بحث ان میں ہوتی کہ چولہا تک سرد ہو جاتا غلطاں پناہ مانگ کر دور کھڑا ہو جاتا۔

امرینہ کو دونوں کے حد سے بڑھتے ہوئے خلوص پر زور کا غصہ آجاتا پھر وہ سوچتی کہ یہی بہتر ہے۔ وہی دونوں آپس میں الجھے رہا کریں۔ کم سے کم اس کی جان پر نہیں آ بنتی!۔

بڑے ابا دس بجے دن تک گھر پر رہتے تھے۔ ان کی موجودگی میں گھر قبرستان ہوا کرتا۔ کیا مجال کہ کوئی زور سے سانس تو لے لے۔ اگر کوئی دودھ پیتا پھرتا تھا تو ان کا خصوصی ملازم شوکت۔ اور بس، دونوں خواتین کمرے ہی سے نہ نکلتیں۔ نوشینہ بڑی گم صم سی باورچی خانے میں رہا کرتی۔ سنجر صاحب کی بھی آواز سنائی دیتی۔ اور امرینہ تو تھی ہی عزلت گزیں۔ کیا مجال کہ اس کا سایہ تک کہیں نظر آئے۔!

دس بجے کہیں کسی ادارے سے گاڑی آتی تھی۔ اس کے انتظار میں بڑے ابا لبوں میں سگار دبائے برآمدے میں ٹہلا کرتے۔ تب بھی ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی جب وہ چلے جاتے۔ اور گاڑی سڑک کے موڑ پر پہنچ کر اوجھل ہو جاتی تب گھر والے اس طرح اپنے اپنے مقام سے باہر نکلتے جیسے تیز بارش کے بعد بھیگے ہوئے پرندے اپنے گھونسلوں سے برآمد ہوں!۔

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس گھر میں بھی لوگ رہتے ہیں! سنجر کے جاندار قہقہے، نوشینہ کا معصوم غصہ، امرینہ کی ستمناہٹ۔ اور خواتین کی زندگی سے بھرپور ... اسی بیچ کچھ گفتگو نوشینہ کی شادی کے متعلق ہو رہی تھی ماسی لیے وہ غصہ

پھر دل گا۔ وہ کہے گا باسٹھ پیسے۔ میں کہوں گا ساٹھ پیسے۔!"
ہاں اور کیا۔ دو نئے پیسوں میں ہم محل کھڑا کر لیں گے۔ خبردار۔ ٹیکسی ٹیکسی نہ لانا۔ تم رکشا لے آؤ۔ ہم آپ چکا لیں گے۔!" ممی نے کہا۔

سنجر باہر نکلا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ادھر سے خانساماں آرہا تھا! اس کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا! سنجر نے اس سے کہا۔

واہ بھیا بڑے موقع سے آئے۔ میں تو تمھیں دیکھنے جا رہا تھا۔ وہ بیگم صاحب رکشا منگوا رہی تھیں۔ مہربانی کر کے ایک لے آؤ"

"صاحب۔ قورمہ کا گوشت چڑھا کے باہر گیا تھا۔ ابھی مصالحہ پینا ہے رکشے یہاں سے دور ملتے ہیں۔ دیر ہو جائے گی۔"

میں مصالحہ پیس رکھوں گا۔" سنجر نے لگھیا کر کہا۔ "تم ذرا لپک جاؤ" اور اس کے ہاتھ سے تھیلا لے لیا۔ بے بسی سے خانساماں نے اسے دیکھا اور پھر باہر مڑ گیا۔

سنجر کچن میں پہونچا۔ کچن میں گیس کا چولہا آن تھا۔ دونوں طرف بھگونے چڑھے تھے۔ اس نے تھیلا ایک طرف رکھ کر دست پناہ اٹھایا اور باری باری بھگونے کھول کر دیکھے۔ سنجانے ان میں کیا کیا تھا۔ گیس کا شعلہ ایک دائرہ میں ہموار جل رہا تھا۔ سنجر گھبرایا۔ پتہ نہیں کوئی چیز جل جائے۔ اس نے مٹکے سے پانی لیا اور آدھے آدھے بھگونے لبریز کر کے مسکرایا۔ پھر تھیلا الٹا۔ بہت سے آلو، بیگن اور ٹماٹر نکل کے بھاگے۔ وہ ان کے پیچھے لپکا اور سب کو بمشکل سمیٹ کر اکٹھا کیا۔ پھر ہوا دان کے ڈبے ٹٹولے۔ اور مصالحوں کو اکٹھا کر کے مکسی میں ڈالا۔ اوپر سے آدھا مگ پانی انڈیل کے مشین آن کر دی۔!
پھر وہ اطمینان سے اونچے اسٹول پہ جا بیٹھا اور سرکس کا تماشا دیکھنے لگا!

"بچہ؟" امرینہ نے حیرت سے آنکھیں چوڑی کر دیں۔ "تیس برس کا بچہ۔ وہ پہلوان آپ کو بچہ لگتا ہے۔؟ ہونہہ!۔ مثلاً گنبد کہیں کا۔ سانچی کا ٹوپ!"
وہ اسے بد دعائیں دینے بیٹھ گئی!۔

تعطیلات تو یوں بھی امرینہ کے لیے عذاب جان بن کر آتی تھیں۔ مگر یہ چھٹیاں جو اپنے ساتھ دوسری پریشانیاں لائی تھیں۔ ممی نے اسے مشورہ دیا کہ ایسی طویل بیکاری میں وہ سوزن کاری سیکھ لیا کرے۔ لیکن اسے پرانی بوڑھیوں کی طرح کپڑے پر سر جھکا کر گوڑ سینا قطعی پسند نہ تھا!۔ امتحان بھی سر ہی پر تھا لیکن وہ جس طرح ہمیشہ پڑھے بغیر پاس ہو جاتی تھی۔ ایکی دفعہ بھی پاس ہو جاتی۔

گھر بھر میں ایسی عجیب سی درجہ بندی ہو گئی کہ بس۔ ممی اور چچی جان ایک دوسرے کی دلچسپ رفاقت میں حد درجہ مگن تھیں۔ ان میں یہ ایک خوبی اللہ رکھ کی تھی کہ دونوں اگر ایک جگہ بیٹھیں تو کسی تیسرے کی غیبت نہیں کرتی تھیں۔ ان میں وہ باتیں ہوا کرتیں جو خود ان کے زمانۂ تعلیم، شادی بیاہ، گھر کی الجھنوں سے متعلق تھیں اور فی الحال کوئی موضوع نوشیبہ کی شادی سے زیادہ دلچسپ اور پر کشش نہ تھا۔

دوسرا گروہ دو سوا فراد کا الگ تھا۔ سنجر اور نوشیبہ۔ امرینہ کا خیال تھا کہ وہ تنہا ایک ایک ڈیڑھ سوا فراد کا مجموعہ تھا۔ ایسے ذہین۔ بکواسی، ہنسوڑ اور بیم دماغ لوگ امرینہ نے اپنی عمر بھر میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ حیران رہتی تھی

بڑے ابا کسی طرح ستر سال سے کم نہ تھے۔ لیکن اپنی شاندار تندرستی کی وجہ سے پچاس پچپن سے زیادہ کے نہ لگتے۔ بڑے بارعب تھے۔ لحیم شحیم ڈیل ڈول، کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ آدھے سینے پر پھیلی ہوئی خوب زبردست داڑھی، ان سے نظریں ملا کر بات کرنا بھی بڑا دل گردے کا کام تھا۔ بے حد حکومت پسند اور سخت گیر تھے۔ انھیں کسی سے زیادہ گفتگو کرنا گوارا نہیں تھا اور نہ یہ اچھا لگتا تھا کہ کوئی ان کے سامنے ٹائیں ٹائیں کرے۔ سنجر کا خیال تھا کہ وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے!

اسے ملازم کشتی لے کر باہر بھاگتا دکھائی دیا۔ سنجر کو ہنسی آگئی۔! امرینہ بھی کمرے سے نہیں نکلی۔ اسے تو بڑے ابا کی آواز ہی سے خوف لگتا تھا۔ البتہ باجی کا دل مضبوط تھا کہ ان سے کبھی کبھار انگریزی کا پڑھ لیتی تھیں اور زندہ سلامت واپس چلی آتی تھیں!

مغرب کے بعد دونوں خواتین لدی پھندی آئیں تب چھوٹتے ہی امرینہ نے شکایت کی کہ سنجر نے دوپہر کے کھانے کا کباڑہ کر دیا تھا۔ ادھر خانساماں نے شکوہ کیا کہ امرینہ بی بی نے آج اس کا کام خراب کیا تھا۔ ممی نے اسے ڈانٹ پلائی تھی۔ تب امرینہ نے زور زور سے روتے ہوئے سنجر کی شکایت کی۔! آخر وہ کیوں اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ ممی نے سنجر کی پیٹھ پر دو ہاتھ جمائے تھے۔ اور بجی جان الگ جوتی لے کر اٹھی تھیں تب وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

باجی البتہ ہنستی رہی تھیں: ارے تجھے ہوا کیا ہے آخر؟ مذاق کا برا مانتی ہو۔ میری تو تفریح ہو جاتی ہے۔ ایسا اچھا خوش مزاج بچہ ہے وہ۔ اس کی ذات سے گھر باغ و بہار بن جاتا ہے!

دیکھ تو آؤ بیٹی: ممی نے برآمدے میں جھانک کر امرینہ سے کہا: یہ دین محمد آخر کیا کر رہے ہیں۔ اتنی دیر سے مشین چل رہی ہے۔ نگوڑی کو خراب کر کے ہی دم لیں گے۔

وہ کتاب رکھ کر چلی گئی۔

کچن میں خانساماں دکھائی نہیں دیا۔ اسٹول پر سنجر کو براجمان دیکھ کر امرینہ ٹھٹکی۔! وہ شرک پر دیکھ رہا تھا اور مشین سے بے خبر تھا! امرینہ نے جل کر سوئچ آف کر دیا۔

سنجر چونک کر پلٹا۔ پھر وہ غوخیایا: کیوں بند کر دی۔؟ میں نے دین محمد صاحب سے وعدہ کیا ہے کہ مصالحہ پیس رکھوں گا۔!

وہ کہاں گئے!۔

اپنے لیے بیڑیاں لانے!

اپنی خدمت آپ کے سپرد کر گئے ہیں!۔

کسی سے کہنا مت۔ صرف ایک بیڑی کے عوض یہ کام کر رہا ہوں!

مجھے کیا پڑی ہے۔ بیڑی پیجئے چاہے حقہ: اس نے برا سا منہ بنایا مشین میں کیا ڈالا آپ نے؟

ناریل مونگ پھلی الائچی لونگ دارچینی اور ــ! اس نے کہنہ مشق بنئے کی طرح فر فر کہا۔

تب یکبارگی چونک دیا؟؟ امرینہ لال پیلی ہوئی۔

تو رمہ کا بھی تو مصالحہ ہوتا ہے!۔

بھونا بھی تھا۔

گوشت میں ڈالوں گا تو خود بخود بھن جائے گا!۔

اور کسی کا دماغ کھانا تو بالکل ہی بری بات ہے۔"

"اچھا اچھا۔"

مگر وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔ سنجر کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

دفعتہً دالان میں ایک بار جب آواز گونجی۔ ابا اور بڑے ابا کی آواز سُن کر وہ اچھل پڑا۔ ایک طرف سے ملازم دوڑا۔ سنجر کو تو سامنے آنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔!

"کہاں ہیں یہ سب کے سب؟"

"جی۔ حضور۔ بیگم صاحبہ کچھ خریدنے باہر گئی ہیں!۔"

"کھانا لے آؤ۔"

"جی سرکار۔"

کیا خاک کھانا لائے گا وہ بے وقوف۔ سنجر کا دل سینے میں قلابازیاں کھانے لگا۔ بجانے خانساماں نے کیا پکایا ہے۔ اسے اپنی راحت خطرے میں نظر آنے لگی۔ ناممکن ہے کہ محترمہ امرینہ صاحبہ اس کا کارنامہ سب کے سامنے بیان نہ فرمائیں۔!

بڑے ابا سے گھر بھر کا دم نکلتا تھا۔ وہ اپنی بیوہ چھوٹی بھاوج ہی کے یہاں رہتے تھے۔ مجرد آدمی تھے۔ لوگوں سے بچوں نے سنا تھا کہ اپنی جوانی میں بڑے ابا نہایت حسین تھے۔ اور اسی لیے خود پرستی میں مبتلا تھے۔ شادی نہیں کی کسی کے ناز سہنے کا دماغ نہ تھا۔ پہلے جاگیردار کالج کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائرمنٹ کے بعد تصنیف و تالیف کرتے تھے۔ ہر وقت ان کے ہاتھ میں کتاب رہتی۔ جب کوئی دیکھتا کتاب پہ سر جھکا دیکھتا۔ ممی اور چچی جان ان سے کا نام پردہ کرتی تھیں وہ خود بھی زنانے حصے کی طرف بہت کم آتے تھے۔

سب ستیاناس کر دیا۔ اب میں جا کے ممی سے کہوں گی!۔

"کچھ جل رہا ہے شاید؟" سنجر نے ناک سکوڑی۔

امرینہ نے ڈھکنا کھول کر دیکھا اور اچھل پڑی۔ "ہائے سب چاول بیٹھ گئے۔ آپ نے ان سے کہا نہیں کہ پسا کے جائیں!۔"

"خدا کی پناہ۔ یہ چاول تھے۔ گھُٹ بد کر رہے تھے۔ میں سمجھا کہ ماش کی دال ہے اس خیال سے کہ رنگ نہ جائے۔ پانی ڈال دیا تھا۔"

"یہ آپ سے کہا کس نے تھا؟" امرینہ چیخی۔ اور اس نے ستیاناس ہانڈی اتار کر الگ دھر دی۔ چولہا آف کر دیا۔

"اچھا اب دوسرے بھگونے کی نبض بھی دیکھ لو" سنجر مردہ لہجہ میں بولا۔

"اس میں کیا کیا؟"

"پانی اس میں بھی ڈالا تھا!۔"

امرینہ نے دوسرے کی نبض دیکھی، قورمہ کا گوشت ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ سالم بوٹی ایک نہ دکھائی دی!۔ اس نے قہر آلود نظروں سے سنجر کو گھورا۔ وہ اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"کیا یہ بھی جل بسا؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"آخر آپ کو کچھ بھی کیا تھی" امرینہ اسے کھانے دوڑی۔ "یہاں آئے ہی کیوں تھے۔ بلا سے دین محمد کچھ دیر اور بڑبڑانہ پکاتے۔"

"میں کیا جانوں" وہ تیز ہو کر بولا۔ "کہہ رہے تھے کہ طلب کے مارے جبڑے بیٹھے جا رہے ہیں۔ مجھے ان پر ترس آ گیا۔ میں نے کہا کہ اچھا آپ بیڑیاں لے آئیے میں باورچی خانہ دیکھ لوں گا۔ گناہ بے لازم کی گرمی میں پھنکنے کا یہ انعام۔ تم آنکھیں دکھا رہی ہو"

ابھی معلوم ہو جائے گا۔" امرینہ نے کہا اور تنتناتی چل دی۔ اور تبھی خانساماں نے کچن میں قدم رکھے۔ دیکھا کہ سنجر چولہے پاس کھڑا سر کھجا رہا تھا۔

"کیا ہوا۔ میاں؟" اس نے پوچھا۔ ہانپ رہا تھا۔

"کتنا ملا؟"

"مشکل سے ملا۔ صاحبزادے۔ میں بھر چلنا پڑا۔ مگر آپ کو کیا ہوا۔"

"ارے۔ مجھ سے پہلے چھوٹی بٹیاں یہاں آ گئیں۔ مجھ سے کہنے لگیں کہ آپ بھلا پکانا کیا جانیں۔ مجھے الگ ہٹا کر نجانے کیا الٹ سلٹ کر کے رکھ دیا۔"

"غضب ہو گیا" خانساماں نے جھپٹ کر کھانوں کا جائزہ لیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا "اب۔ دوپہر کو بڑے سرکار آتے ہوں گے۔ انھیں کیا دوں گا؟"

"چھوٹی بٹیا نے سب کچھ ستیاناس کر دیا نا؟" بے حد ہمدردی سے سنجر نے پوچھا "حد ہے۔ آج کل کی لونڈیاں بس ناولیں دیکھنا اور انگریزی پڑھنا جانتی ہیں۔ دال تک پکانا نہیں جانتیں۔ اپنے میاں کے گھر کیا کریں گی؟ اسی لیے تو سارے مردوے موڈی کا ٹونے کو تین تین طلاقیں دے کر گھر سے نکال باہر کر رہے ہیں!"

اس کے بڈھے لب و لہجہ پر خانساماں کو ہنسی آ گئی۔ پھر وہ بولا "میاں آپ یہاں سے جائیے۔ میں جلدی جلدی کچھ پکاتا ہوں۔ بڑے سرکار کہیں آ ہی نہ جائیں۔"

سنجر کچن سے نکلا۔ پتہ تھا کہ امی اور چچی جان جا چکی ہیں۔ وہ بیٹھی

"میں افسانے نہیں لکھتی۔ مجھے بکواس سے دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے بس غالب پسند ہیں۔ کتنے پیارے شعر کہتے ہیں!"

"اب بھی کہتے ہیں؟" اس نے بھولپن سے پوچھا۔

"جہالت کی باتیں مت کیجئے۔ مجھے غصہ آ جاتا ہے!"

"مجھے اقبال صاحب پسند ہیں۔ بارعب۔ گھن گرج۔ تمکنت۔ واہ واہ۔"

"واہ" امرینہ تارم میں آ گئی۔ اس کا پسندیدہ موضوع چھڑ گیا تھا۔ بولی۔ "یہی تو فرق ہے دونوں میں۔ غالب کتنے معصوم اتنے پیارے ہیں کہ ان سے محبت لگتی ہے۔ اور اقبال کے یہاں وہ رعب اور متانت۔ کہ ان کے سامنے مودب رہنا پڑتا ہے۔"

"خوب موازنہ ہے" وہ خوش ہو کر بولا "مثلاً غالب صاحب کا یہ شعر کتنا پیارا لگتا ہے مجھے۔"

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل

امرینہ پر غصہ چھا گیا "آپ بالکل گھامڑ ہیں۔ یہی عمدہ شعر یاد ہے آپ کو۔"

"دوسرا سناؤں؟!"

"مجھے نہیں سننا ہے۔"

"کیا کہا ہے شاعر نے۔ قلم توڑ دیا ہے۔"

جن ڈھونڈا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ
میں باپن ایسی جلی کہ گئی کنارے بیٹھ

"مرحوم شاعروں کا مذاق اڑا کر کیا ملتا ہے؟ اچھی بات نہیں ہے" وہ خفا

میری اجازت لے کے جاؤ گی۔ صدقے تمہاری سعادت مندی کے۔" وہ بیحد خوش ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ سنانا نہیں ہے۔ میرا وقت بھی آپ خراب کر رہے ہیں!" وہ پھر اٹھنے لگی۔

کیا سنا رہا تھا میں؟"

اچھے اشعار۔!

ہاں ہاں یاد آیا۔ بیٹھ جاؤ۔ اشعار سناتا ہوں۔ ذرا یاد کر لوں۔ ذہن پر فکروں کا بار ہے۔ ضعیفی کا تقاضہ بھی ہے۔ اب مشکل ہی سے کوئی بات ذہن میں سماتی ہے!۔

بائیس سال کی عمر میں آپ ضعیف ہو گئے؟

کوئی دانت غارت گیا ابھی تک نہیں نکلا۔ بال البتہ سفید ہو گئے۔

امرینہ نے اس کے چمکیلے سر پہ نظریں دوڑائیں اور پھر یک بیک بے تعلق دکھائی دینے لگی!۔

ابھی کل باجی نے دماغ کا گودا نکال لیا۔! اس نے شکایت کی۔

میں سب سن رہی تھی۔ بکواس کر کے باجی کا دماغ آپ نے خراب کیا۔ باجی نے نہیں!"

بڑا افسوس ہوا ان کے خیالات سن کر۔ ایم۔ اے کر رہی ہیں۔ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ مگر بالکل الّو ہیں۔!

کون، باجی؟" وہ للکاری۔

اور کیا۔ اسے سیر و تفریح کا شوق ہے [illegible]

[illegible]

بجاتا برآمدے میں آیا اور وہاں امرینہ کو بیٹھا دیکھ کر ٹرے لٹکے پھا سے دیوار کو آنکھ ماری اور سیٹی کی آواز میں تیزی آ گئی۔

آپ اپنے کمرے میں جائیے۔!" غصے سے کھول کر امرینہ بولی۔

آہا۔ بی مینڈکی!"

کیا مطلب؟۔

اس جگہ تمہارا نام لکھا ہے کیا؟۔

آپ لفنگوں کی طرح سیٹی کیوں بجا رہے تھے؟" لمحہ بہ لمحہ امرینہ کا غصہ تیز ہو رہا تھا!۔

ہوش میں تو ہو۔ میں تو تمہارے لہجے ہی کا مطلب نہیں سمجھا۔ سیٹی کیوں بجا رہے تھے۔ واہ بھئی۔ پھر کہو گی۔ آپ سانس کیوں لے رہے تھے۔ آپ جی کیوں رہے تھے۔ کیا خوب۔ واہ!"

مجھے یہ باتیں چھوٹی آنکھ پسند نہیں۔ اور آپ پر زیب بھی نہیں دیتیں۔"

تمہاری آنکھ کب پھوٹی؟ دیکھوں تو۔؟" وہ گھبرا کر اس پر جھکا اور وہ بوکھلا کر پیچھے کھسک گئی۔

مذاق کرتی ہو؟" وہ کھسیا کر ہنسنے لگا۔ "ڈرا دیا تھا مجھے۔ بھلا ایک آنکھ والی سے کون بیاہ کرتا!"

آپ بالکل احمق ہیں۔" امرینہ نے اس پر کتاب کھینچ ماری۔ "بہت مت اترائیے۔ میں چچی جان سے سب کچھ کہہ دوں گی۔

سنجر نے کتاب واپس بڑے ادب سے اسے پیش کی۔ مگر امرینہ نے ہاتھ مار کر گرا دی اور منہ پھیر لیا۔

کتنی بڑی [illegible]

"کیا؟" وہ شیرنی کی طرح پلٹی۔

"اللہ رکھے شادی بیاہ کی عمروں میں ہو۔ ابھی سلیقہ نہ سیکھا تو کب سیکھو گی؟"

آپے سے باہر ہو کر امرینہ نے اس کے بازو پر دو ہتڑ رسید کر دیا اور خود منھ چھپا کر رونے بیٹھ گئی۔

"واہ بھئی۔ یہ زبردستی یعنی کہ خود ہی مارا اور خود ہی رونے دھونے لگیں قاعدے سے تو رونا مجھے چاہیے تھا۔ مگر یاد۔ تم نے ہاتھ کس کے دیے۔ دل پر چوٹ لگی ہے۔ اب وہ زندگی بھر دکھے گی۔ شاید ایک سو پچیس برس کی عمر میں ہارٹ ہی فیل ہو جائے۔ نوجوانوں کا بھی کچھ بھروسہ نہیں۔ دادا جان کے ایک دوست تھے مشکل سے نوّے برس کی عمر ہو گی۔ نجانے کیا حماقت کی تھی کہ ان کی اہلیہ نے روٹی پکاتے پکاتے ایک بیلن سر پر رسید کر دیا۔ بس بے چارے کم سنی کی عمر ہی میں بیکس سے ہو گئے۔ ہائے ہائے ان کی ننھی سی قبر پر جا کر ان کی اہلیہ نیا نا رونا رو رہی تھیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ بھی پھٹ کے کرچی کرچی ہو جاتا تھا۔ میں نے کہا محترمہ ایسا مکا اپنے میاں کے نہ رسید کر دیجیئے گا۔ وہ بے چارہ بھی کہیں بچوں سے نہ ہو جائے۔!"

"آپ کی بلا سے۔" امرینہ کو اس کی بکواس پر ہنسی! نہ رونا ساتھ ساتھ آ رہا تھا۔ مجیث نے منانے سمجھانے اور آنسو پونچھنے کی بجائے نجانے کیا بکنا شروع کر دیا تھا!۔

"جی۔" غلطی میری ہی ہے۔ میں ہی اس جگہ گیدڑ آ کے مرتی ہوں ایسے ہوتے ہیں!"

اچھے شعر امرینہ کی کمزوری تھے۔ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔ اور ناک سے سوں سوں کر کے بقیہ آنسو پی لیے۔ سنجر نے چوری چوری بے حد پیار سے اسے دیکھا۔ اور جب امرینہ نے اس کی طرف نظریں اٹھائیں تو اس نے بے حد سنجیدہ شکل بنالی اور مرعوب کن انداز میں کھنکھارا۔

"پسند کرتی ہو نا اچھے شعر؟"

"کیوں کیا مجھ میں ایستھیٹک سنس نہیں ہے؟" اس نے خشک لہجے میں کہا

"کاہے کا سنس؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"جمالیاتی ذوق!" امرینہ کا سرد لہجہ برقرار تھا۔

"ارے ہاں۔ سنا ہے کہ جمالہ باجی کے یہاں جڑواں لڑکے ہوئے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔" وہ چہک کر بولا پھر بوڑھی عورتوں کی طرح دعائیں دینے لگا۔ "بعضی جنم جلی خانہ خراب بیویوں کے یہاں ہزار ماتھا پیٹنے پر بھی چوہے کا بچہ نہیں ہوتا اور بعضی جنت نصیب بیویوں کے یہاں ایک ساتھ دو دو۔ اے ہاں۔ اور کیا۔ پاک بے نیاز جیسے چاہے نواز دے۔ اس کے یہاں دیر ہے پر اندھیر نہیں۔"

بے ساختہ ہنسی لگنے کے مارے امرینہ کو اچھو ہو گیا۔ "یہ آپ کیا بکواس کرنے لگے۔"

"تم سے کئی سال بڑا ہوں۔ کچھ تو ادب کرو۔"

"مجھے نہیں کرنا ادب قرینہ۔ اشعار سنانا ہے تو سنایئے۔ ورنہ مجھے جانے دیجیے۔"

"بکم

The Hareem Lucknow September. 1981 (Phones : 44559 45334) Regd. No. LW/NP 32

PRICE Rs. 20/-

THE HAREEM
Oct 81
Rs. 1.30
ایڈیٹر
نسیم انہونوی

THE HAREEM
حریم
Oct 81
Rs. 1.30
ایڈیٹر
نسیم انہونوی

گذشتہ ۵۱ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ایڈیٹر و نگراں: نسیم انہونوی

معاونین: شوکت جہاں بیگم
جانی بیگم ردولوی

فی شمارہ کی قیمت ۱-۳۰
چندہ سالانہ منی آرڈر سے: ... ۲۰
چندہ سالانہ اعزازی ۲۵-۰۰
چندہ سالانہ مخصوص ... ۲۳
وی پی سے منگوانے پر چار روپئے زائد
غیر ممالک سے ۵۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ بمطابق سی پی ایل اپریل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

ناشر: نعیم انہونوی

فہرست مضامین ماہ اکتوبر ۱۹۸۱ء جلد (۵۹) نمبر (۱۰)

آفس و ترسیل زر کا پتہ: نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس :- ۴۴۵۵۹ رہائش ۲۲۲۲۱
نعیم انہونوی نے باہتمام۔ سید انصار حسین، سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

قابل توجہ محکمہ تعلیمات

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ملازمت کے سلسلہ میں خواتین سب سے زیادہ محکمہ تعلیمات سے منسلک ہیں اس لئے کہ یہی ایک ایسا ڈپارٹمنٹ ہے جس میں خواتین کو مردوں کے دوش بدوش کام نہیں کرنا پڑتا۔ میں جانتا ہوں کہ بڑے کالجوں اور یونیورسٹیز میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں خواتین لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کو پڑھاتی ہیں اور مرد لکچررس سے بھی بہر حال ان کا رابطہ رہتا ہے، لیکن ایسی خواتین پورے صوبہ میں شاید سو دو سو سے زائد نہ ہوں گی، جبکہ گورنمنٹ گرلس کالجز، گرلس اسکولوں میں ان کی تعداد ہزاروں تک ہے۔ اس لئے کہ ایسی تعلیم یافتہ خواتین کے لئے جو ملازمت کرنا چاہتی ہیں۔ سب سے زیادہ عافیت کی یہی سروس ہوتی ہے، لیکن اس میں سب سے بڑی جو دشواری ہے، وہ یہ ہے کہ سروس ٹرانسفرایبل ہے تبادلے پورے صوبہ کے کسی بھی ضلع میں ہو سکتے ہیں۔ گورنمنٹ اسکول اور کالج صرف شہروں ہی میں نہیں، ایسے قصبات میں بھی ہیں جو شہروں سے کافی فاصلے پر ہوتے ہیں ان میں سے صدہا ایسی آبادیوں میں ہیں جہاں ریلوے اسٹیشن نہیں، بس سے جانا پڑتا ہے۔ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں بس بھی نہیں جاتی۔ بہت میں تبادلوں کے بعد خواتین کو سخت ترین دشواریاں پیش آتی ہیں۔ تبادلے کے بعد جب وہ اپنے نئے مستقر پر پہنچتی ہیں تو سب سے دشوار مسئلہ قیام کا ہوتا ہے۔ کہاں رہیں اور کیسے رہیں۔ مرد تو پھر بھی کسی کے یہاں تعلقات پیدا کر کے رہ سکتے ہیں، لیکن خواتین کے لئے ہر کسی کے یہاں قیام کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محکمہ تعلیم میں پچاس فی صدی سے زیادہ کنواری لڑکیاں اور غیر شادی شدہ خواتین ملازم ہیں۔ وہ کسی نئی جگہ پہنچ کر بے حد پریشان ہوتی ہیں۔ کرائے کے مکان تو کہیں بھی آسانی سے نہیں ملتے۔ بیشتر اوقات ہفتوں، مہینوں مکان کی تلاش میں گذر جاتے ہیں اور تاوقتیکہ کوئی مناسب جگہ نہ مل جائے ان کی زندگی اور عزت خطرے میں رہتی ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ یا تو محکمہ تعلیم ہر اسکول اور کالج سے متعلق اتنی قیام گاہیں اسکول و کالج سے ملحق ہی تعمیر کرائے کہ تبادلے کے بعد سروس کی جگہ کے ساتھ ہی رہائش کی جگہ بھی فوراً مل جائے اور وہ سکون سے رہ سکیں۔ تعلیمی اداروں سے ملحق اگر ایسے رہائشی کوارٹرس ہوں جن میں متعلقہ ادارہ کی تمام ٹیچرس قیام کر سکیں تو نہ صرف یہ کہ وہ محفوظ رہیں گی، ان کی ایک سوسائٹی بھی ہوگی۔

میں دیکھتا ہوں کہ اسی قیام کی دشواری کے باعث ہزارہا ٹیچرس اور لکچررس کا تقرر اگر ان کے گھروں سے دس بیس پچاس میل تک فاصلے پر ہوتا ہے تو وہ ڈیلی پسنجری کرتی ہیں اور روزانہ ریل یا بس سے سفر کرنے کی صعوبات اٹھاتے ہوئے اپنے اسکولوں اور کالجوں کو جاتی ہیں۔ کیا یہ روزانہ کا سفر صنف لطیف کے لئے دشوار ترین نہیں ہوتا۔ اکثر خواتین صبح تین بجے بیدار ہو کر ۴ بجے اپنا سفر شروع کر دیتی ہیں اور راتوں کو ۸-۹ بجے اپنے گھروں کو واپس آتی ہیں۔ کیسی المناک ہوتی ہے ایسی خواتین کی زندگی ــ ذرا تصور کیجئے۔ یہی نہیں کہ ان کے شب و روز سفر ہی میں گذرتے ہیں، بلکہ ان کی تنخواہوں کا ایک اچھا خاصہ حصہ کرایہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اگر ان کے قیام کی سہولتیں محکمہ تعلیم مہیا کر دے تو شاید ۹۰-۹۵ فی صدی خواتین ڈیلی پسنجر بننا پسند نہ کریں گی۔

کتنی المناک بات ہوتی ہے کہ لکھنؤ شہر کی رہنے والی کسی لڑکی یا خاتون کا تبادلہ لہری گڑھوال جیسی دوسری دور دراز جگہوں پر ہو جاتا ہے۔ شادی شدہ خواتین کے بچے بھی ہوتے ہیں جنھیں وہ تبادلہ ہو جانے پر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں۔ اس لئے کہ شوہر بھی ملازم ہوتے ہیں اور بچے اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر وہ تنہا دور دراز جگہوں پر جانے کے لئے مجبور ہوتی ہیں۔

محکمہ نے ایک ایسا قانون بنایا ہے کہ جہاں شوہر ملازم ہو وہیں بیوی کو بھی پوسٹ کیا جائے، لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو بہت ہی کم ہوتا ہے۔

یہ بھی قانون ہے کہ بلا سبب تین سال تک کسی جگہ سے تبادلہ نہ کیا جائے لیکن ان قوانین پر عمل درآمد برائے نام ہی ہوتا ہے۔ حال ہی میں ایک ایسی خاتون کو ایسی ہی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ شوہر لکھنؤ میں سروس کرتے ہیں۔ بچے یہیں پڑھتے ہیں، لیکن ماں کا تبادلہ کسی دوسری جگہ کا کر دیا گیا۔ لکھا پڑھی کی گئی۔ محکمہ کو ان قوانین کے حوالے سے لکھا گیا، مگر کوئی داد فریاد نہیں ہوئی۔ تبادلہ برقرار رہا۔

اس محکمہ سے زیادہ اندھیر گردی تبادلوں کے سلسلہ میں شاید کسی دوسرے محکمہ میں نہ ہوگی۔ اس میں تبادلے مذاق بنکر رہ گئے ہیں۔ اکثر ٹیچرس کے تبادلے سال میں کئی کئی بار ہو جاتے ہیں اور ان بیچاریوں کو خانہ بدوشوں کی طرح سامان لئے لئے پھرنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی جگہ کے تبادلہ کا آرڈر لے کر کوئی ٹیچر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے ہی کسی دوسری کو وہاں بھیج دیا گیا ہے۔ اس بیچاری کو پھر سامان لادپھاند کر واپس ہونا پڑتا ہے۔ یہ محکمہ کی نااہلی ہی ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہیں رہتی کہ کسی ایک ہی جگہ پر دو کیسے آرڈر دے دیا گیا۔

سعی سفارش کا اس محکمہ میں زور ہے، جس کے اثرات ہوتے ہیں وہ بآسانی اپنا تبادلہ حسب منشا کرالیا کرتا ہے۔ ایک دلچسپ تبادلہ کی روداد ایک صاحب نے کچھ عرصہ قبل بیان کی کہ ایک صاحبہ کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ دوسری کو چارج دے کر چلی گئیں، لیکن سعی سفارش کے بعد فوراً ہی پھر انھیں اپنی جگہ پر واپسی کا آرڈر مل گیا۔ دوسری نے چارج تو دے دیا، لیکن کوئی ذریعہ ان کے ہاتھ نہیں آگیا اور وہ پھر پروانہ لے کر آگئیں۔ ایسی مضحکہ خیز باتیں کسی بھی محکمہ کو زیب نہیں دیتیں۔ خصوصاً خواتین کے سلسلہ میں تو یہ ایک طرح کا ظلم ہی کہا جا سکتا ہے۔

محکمہ کے کارپرداز بالائی آرڈرس کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ اثر و رسوخ کے تحت بعض خواتین پوری پوری زندگی ایک ہی جگہ گذار دیتی ہیں۔ ایسی بھی ہوتی ہیں جو حسب پسند جگہوں پر ہی پوسٹ رہتی ہیں۔ انھیں کبھی کوردہ یا دور دراز دور تکلیف دہ مقامات پر نہیں بھیجا گیا، لیکن جن کے اثرات نہیں ہوتے وہ گیند کی طرح لڑھکتی پھرتی ہیں۔

خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے صوبہ کی باگ ڈور وشوناتھ پرتاپ سنگھ جیسے عالی دماغ، منصف مزاج، ہمدرد، خلائق اور صحیح معنوں میں انسان کے ہاتھوں میں ہے، جنھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ پوری ایمانداری کے ساتھ اپنی وزارت کو چلانا چاہتے ہیں اور اصلاحات کے لئے انھوں نے کافی جد و جہد کی ہے۔ کاش موصوف اس طرف بھی توجہ فرمائے کہ محکمہ تعلیم جیسے اہم محکمہ میں ایسی اصلاحات ہو جائیں کہ اس صیغہ میں ملازمت کرنے والی خواتین کی دشواریاں مکمل طور پر دور نہ ہو سکیں تو بڑی حد تک کم ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اصلاحات اشد ضروری ہیں۔

۱۔ خواتین کی تقرریاں ان کے وطن کے اداروں میں یا کم از کم اس سے قریب ترین جگہ پر ہی کی جائیں۔

۲۔ شوہر ہونے کی صورت میں جہاں شوہر ملازم ہو اس مقام پر بیوی کا بھی تقرر ہو۔ کسی مجبوری کے تحت تبادلہ کیا جائے تو وہ بھی اسی مقام کے کسی دوسرے ادارے میں کیا جائے یا قریب ترین مقام پر کیا جائے۔

۳۔ تبادلہ تین سال سے پہلے صرف اسی حالت میں کیا جائے جبکہ کوئی محکمہ جاتی دشواری ہو۔

۴۔ سعی سفارش کا در بند کیا جائے۔ یہ ایک طرح کی رشوت کا معاملہ سمجھا جا سکتا ہے، جو ایک صاف ستھرے انتظامیہ کے لئے خطرناک ہے۔ ہر گورنمنٹ گرلس اسکول و کالج سے ملحق ٹیچرس کے لئے آرام دہ کوارٹرس یا فلیٹ تعمیر کئے جائیں اور ایسا انتظام ہو کہ تبادلہ کے سلسلہ میں چارج لینے کے ساتھ ہی رہائشی کوارٹر کا بھی چارج مل جائے۔

۵۔ کلاس اے کے افسران کا تناسب وہی ہونا چاہئے جو خواتین اور مرد ٹیچروں کا ہو۔ سردست کلاس اے کے افسران میں خواتین کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ جس کی وجہ سے خواتین کو مردوں کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا ہے۔ تناسب کی یہ کمی کیوں ہے۔ کیا کلاس افسری کے قابل خواتین نہیں ملتیں۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے صوبہ کے وزیر اعلیٰ جناب وشوناتھ پرتاپ سنگھ صاحب ان تجاویز پر غور فرما کر ممکنہ اصلاحات کریں گے۔

ایک قابل شکریہ بہن

پوسٹ آفس کے [illegible] انتظام کے تحت [illegible] وقت پر نہیں

پہنچتے، خطوط اور رسائل و اخبارات تو تار جیسے اہم بھی نہیں ہوتے۔ حریم ۲۰-۲۰ روز بعد اکثر خریداروں کو ملتا ہے۔ اس لئے شکایتی خط آجاتے ہیں اور دفتر سے دوسرا پرچہ روانہ کر دیا جاتا ہے تو پہلا بھی پہنچ جاتا ہے۔ لیکن شاذ ہی بہنیں ایسی ہیں جو دوسرا پرچہ ملنے کے بعد ایک واپس فرما دیں۔ اگست کے دو سو پرچے دوبارہ روانہ کئے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دفتر میں اب اگست کے حریم بالکل ختم ہو گئے۔ آج کلکتہ کی ایک خریدار بہن مس اے۔ سی حسن صاحبہ نے چالیس پیسے کے ٹکٹ لگا کر اگست کا پرچہ جو زائد پہنچ گیا تھا واپس فرما دیا ہے۔ بہن موصوفہ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسری حریمی بہنوں سے درخواست کروں گا کہ وہ بھی بہن حسن صاحبہ کی تقلید فرمائیں گی۔

ستمبر کا حریم

ستمبر کا حریم بڑی کوششوں کے بعد امید تھی کہ کسی تاخیر کے بغیر شائع ہوگا، لیکن عین وقت پر شیعہ سنی مناقشے کے تحت اس کی حصہ شہر میں کرفیو لگ گیا جس میں پریس ہے۔ اور اس طرح پھر حریم تاخیر کے ساتھ ہی روانہ ہوا تھا۔

● بیگم صاحبہ: ہم نے شرابیوں کی اصلاح کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ کیا آپ ہمیں کوئی عطیہ دینا پسند کریں گی؟

: آپ گیارہ بجے رات کو آکے میرے شوہر کو لے جائیے گا:

درخشاں ملیح آبادی

مسافر جو سوئے حرم جا رہے ہیں
سکونِ دلِ پُرالم پا رہے ہیں

ہوئی ان پہ جو رحمتِ کبریا ہے — شرف حج کعبہ کا ان کو ملا ہے
نہیں دل میں اب کچھ خیال آ رہا ہے — کہ وہ عشرتِ دہر سے پھر گیا ہے

تو اب بہرِ سیرِ ارم جا رہے ہیں

چلے شان و عظمت سے جب وہ یہاں سے — تو روشن تھے رخ نورِ ربِّ جہاں سے
جھکے مہر و مہ بہرِ دید آسماں سے — چلیں پھول برسانے حوریں جناں سے

ملک ان کے لینے قدم آ رہے ہیں

مبارک یہ ان کا مقدس سفر ہے — مسرت کا ہر دل پہ بے حد اثر ہے
محافظ جو وہ خالقِ بحر و بر ہے — نہ طوفاں کا غم اور نہ موجوں کا ڈر ہے

سفینے پہ ابرِ کرم چھا رہے ہیں

مشرف جو ہوں دیرِ بیتِ خدا سے — یہ پیغام میرا کہیں التجا سے
بنے تیرے مہماں جو فضل و عطا سے — بھرے ان کے دامن درِ بے بہا سے

مرے دل پہ کیوں ابرِ غم چھا رہے ہیں

نہ محرومیوں کا درخشاں تو غم کر — نہ کچھ شکوۂ جورِ اہلِ ستم کر
تو مایوس ہو کر نہ اب چشم نم کر — رہیں گے ضرور اشک خوں تیرے تھم کر

تسلی کو شاید امم آ رہے ہیں

انٹرویو —— رفیعہ منظور الامین صاحبہ سے

از نجم اعزاز (دہلی)

سوال نمبر ۱۔ نام ۔ پیدائش، بچپن اور تعلیم کے متعلق کچھ بتایئے۔

ج ۔ نام رفیعہ منظور الامین ۔ پیدائش ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد دکن کی ہے۔ والد صاحب محمد عبد الحمید صاحب پولیس کے اعلیٰ آفیسر تھے اضلاع پر پوسٹنگ ہوا کرتی تھی ۔ چونکہ اضلاع میں اچھے اسکول نہیں ہوتے تھے اس لئے گھر پر ہی استادوں نے پڑھایا۔ جب اسکول جانا ناگزیر ہو گیا تو امی اور ہم سب بھائی بہن حیدر آباد چلے آئے نارمل اسکول میں داخلہ لیا اور میٹرک وہیں سے کیا۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی ویمنس کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا۔ بچپن میں مجھے لڑکیوں والے کھیلوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی ۔ گھنٹوں میں سر دیئے میں نے کبھی گڑیا گڈی کے کپڑے سیئے۔ بھائیوں کے ساتھ ہی کھیلا کرتی تھی گھوڑ سواری کا پاگل پن کی حد تک شوق تھا۔ بچپن بےفکری سے گذرا ۔ والدین کی روشن خیالی کی وجہ سے کبھی ذہنی گھٹن کا شکار نہیں ہوئی۔

س ۲ ادبی زندگی کی شروعات کب اور کیسے ہوئی ——؟

ج میری پہلی کہانی "پیام تعلیم" رسالہ میں اس وقت چھپی جب میری عمر سات سال تھی۔ پھر لمبے عرصہ تک کچھ نہیں لکھا کیونکہ آرٹ اور SCULPTURE (مجسمہ سازی) کی طرف رجوع ہو گئی تھی۔ کالج میگزین ROSHNI کے اردو حصہ کی ایڈیٹر رہی۔ لیکن ادبی زندگی کا ٹھوس دور شادی کے بعد ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا۔

س ۳ معاون و مددگار کون ثابت ہوا ——؟

ج میرے شوہر منظور الامین صاحب نے (جو خود ایک بلند پایہ شاعر اور نثر نگار ہیں) مجھے لکھنے کی ترغیب دی اس کے علاوہ ایک پرخلوص عزیز دوست [illegible] صاحب نے مجھے سائنس پر مضامین لکھنے کے لئے اکسایا۔ چنانچہ کچھ عرصہ تک میں اردو میں سائنسی مضامین لکھتی رہی جو مختلف رسائل میں چھپے پھر مجھے ڈرامے اور افسانے لکھنے کا شوق ہوا۔

س ۴ کس ادیب سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں ——؟

ج اردو کے مختلف ادیبوں کی عزت و توقیر تو میں کرتی ہوں لیکن کسی نے میری اعلیٰ کاوشوں کو متاثر نہیں کیا۔ اس کے برعکس چند مغربی ادیبوں سے بیشک متاثر ہوئی جن میں البرٹ کاموا، ہنری اور پی۔ جی۔ وڈ اوس شامل ہیں۔ بظاہر انداز کے اعتبار سے یہ سارے نام ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے لیکن چونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں تنوع کی قائل ہوں اس لئے ان سب کا مجملہ اثر میرے انداز فکر پر ضرور پڑا ہوگا۔

س ۵ پہلی ادبی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی ——؟

ج یوں تو میری پہلی ادبی تخلیق ایک اسٹیج ڈرامہ تھا "اندھیرا اجالا" جو میں نے یو پی گورنمنٹ کی فرمائش پر ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا لیکن میں اپنا پہلا طبع شدہ افسانہ "درد اور درماں" کو مانتی ہوں جو ۱۹۶۲ء میں ہی آندھرا پردیش رسالہ میں چھپا۔

س ۶ کیا آپ نے بچوں کے لئے بھی کچھ لکھا ہے ——؟

ج جی ہاں۔ بچوں کے لئے کچھ ریڈیو ڈرامے لکھے ہیں چند کہانیاں رسالہ "کھلونا" کے لئے لکھیں اور ایک ڈرامہ "آؤ ناٹک کھیلیں" انگریزی سے ترجمہ کیا۔

س ۷ معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ کی وجہ آپ کیا سمجھتی ہیں اور اس کے سدھار کے لئے کون سا انداز اپنانا پسند کرتی ہیں ۔ آیا واعظانہ یا مصلحانہ

ج میرے خیال میں کسی معاشرہ میں دو برائیاں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو جنسی بے راہ روی۔ دوسرے اخلاقی برائیاں۔ سو جنسی بے راہ روی کوئی آج کی بات نہیں۔ صدیوں سے یہ شغل چلا آرہا ہے۔ ہاں پیراہن بدلتے جاتے ہیں۔ کوٹھے تب بھی تھے آج بھی ہیں۔ EXTRA-MARITAL RELATIONS تب بھی ہوا کرتے تھے آج بھی ہیں۔ نقطہ نظر کی بات ہے۔ کچھ لوگ پہلے ان چیزوں کو برا سمجھتے تھے آج بھی ایک طبقہ اسے برا سمجھتا ہے جو لوگ اخلاق کی پرواہ نہیں کرتے انھیں آج تک نہ واعظ سدھار پائے ہیں نہ مصلح۔ رہی اخلاقی برائیوں کا جیسے رشوت۔ بداخلاقی دھوکہ دہی۔ چوری جعلسازی وغیرہ) کی بات تو اس کی وجہ میرے خیال سے معاشی پسماندگی ہے۔ آج کے ایک عام آدمی کی شکستی آلودہ جبیں پہ جھلاہٹ زیادہ عیاں ہے جو اسے لڑائی جھگڑے ۔ چوری ڈاکے جھوٹ

اور فریب میں مبتلا کرتی ہے۔ اور بدقسمتی سے آج کا کوئی واعظ یا مصلح بے غرض یا پرخلوص نہیں ہے جو اس طوفان سے آنکھ ملا سکے۔ اس لئے واعظ اور مصلح کو تو خود فریبی کی مسند سلار کھیئے کام ان سے نہیں بنے گا۔ اگر کام بن سکتا ہے تو عوام کی تعلیم سے جو انھیں خود شناسی سکھائے گی۔

۸۔ آپ کے خیال میں نئی نسل کی بے راہ روی کی بنیادی وجہ کیا ہے۔ آیا ملازمت پیشہ مصروف ماں کے پیار کی بچپن سے محرومی یا مشرق میں تیزی سے بڑھتی مغربی تہذیب ———

ج میں نئی نسل کو بے راہ رو نہیں سمجھتی۔ البتہ وہ ایک ذہنی خلفشار سے دوچار ضرور ہے۔ جس کے ذمہ دار ہم خود پچھلی پیڑھی کے لوگ ہیں کیونکہ ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے ہم خود زمانے کی بدلتی قدروں کو صحیح روشنی میں دیکھنے سے انکار کرتے ہیں۔ میں کئی ایسی ملازمت پیشہ ماؤں کو جانتی ہوں جن کے بچے ذہنی اور جسمانی نشوونما میں ان ماؤں کے بچوں سے بہت آگے ہیں جن کے لئے زندگی ایک اکتا دینے والی جمائی ہے۔ ایسی مائیں حالات حاضرہ سے بے خبر۔ اپنے بچوں سے INTELLECTUALLY (ذہنی طور پر) بہت زیادہ پچھڑی ہوئی ہیں ——— اب رہا مشرق میں تیزی سے بڑھتی مغربی تہذیب کا سوال۔ تو اس بارے میں وسیع النظر ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مغرب سے ہمارے معاشرہ میں سرائیت کی ہوئی برائیوں کو من وسلوا سمجھ کر قبول کیا جائے۔ برائیاں تو خود ہمارے معاشرہ میں بھی موجود ہیں جن سے ہمیں بچنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوپر سونک عہد میں مختلف معاشروں کو ایک دوسرے میں مدغم ہونے سے نہیں روکا جا سکتا۔ مغرب کی SEX SHOPS میں میں نے کھجوراہو کو بکتے دیکھا ہے۔ دراصل مغربی تہذیب کو محض جنسی بے راہ روی سے تعبیر کرنا زیادتی ہے۔ ہمارے اپنے ملک کا سائنسی معاشرہ خود مغرب کی دین ہے کھلے بازار ہر جنس بکتی ہے لیکن "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" والی بات ہے۔ لہٰذا نئی نسل کے ذہنی انتشار کا علاج میرے خیال میں تعلیم یافتہ اور ہوشمند ماں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خواہ ملازمت پیشہ ہو یا ہاؤس وائف (گرہستی) لیکن اس قابل ضرور ہو کہ اپنے بچے کی ایسی ذہنی نشوونما کرے کہ اسے کمسنی ہی سے صحیح اور غلط کی تمیز آجائے۔

۹۔ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوتی ۔ ؟

ج جی نہیں۔ مجھے دقت محسوس نہیں ہوتی اتفاق سے میرے شوہر کے ساتھ پارٹیوں میں جانا پڑتا ہے گھر پر بھی دعوتیں ہوتی رہتی ہیں مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوتا بلکہ یہ مصروفیت مجھے ذہنی طور پر بیدار رکھتی ہے نہ صرف یہ بلکہ اس طرح مجھے اپنی کہانیوں کے لئے تھیم (مرکزی خیال) بھی ملتے ہیں۔

۱۰۔ آپ نے پہلی کہانی۔ افسانہ اور ناول کب تحریر کیا۔ کب شائع ہوا۔ اور اب تک تحریر شدہ و طبع شدہ کہانیاں افسانے اور ناولوں کی تعداد کتنی ہے؟ کا پتہ ہی ایسا ہے جہاں مجھے ان کی سوشیل ہمرکابی کرنا پڑتی ہے۔ ان

ج میری پہلی کہانی (افسانہ) (جیسا کہ میں اوپر لکھ چکی ہوں) ۱۹۶۳ء میں چھپی۔ پہلا ناول میں نے کشمیر میں لکھا جو سنہ ۱۹۷۰ء میں "سارے جہاں کا درد" نام سے نسیم بکڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا اس پر یوپی اردو اکیڈیمی نے انعام بھی دیا تھا۔ اس کے علاوہ میرا دوسرا ناول "عالم پناہ" آج کل بانو دہلی میں قسط وار چھپ رہا ہے سائنسی مضامین کا ایک مجموعہ "سائنسی زاویے" نام سے چھپا ہے جس پر آندھرا پردیش گورنمنٹ نے ایوارڈ دیا ہے۔ پہلے ناول کے تیلگو اور کنڑی تراجم ہو چکے ہیں۔ ایک ناول زیر تحریر ہے یہ انگلستان میں IMMIGRATION کے مسئلہ پر لکھ رہی ہوں۔ اب تک تقریباً سو کہانیاں اور ڈرامے لکھ چکی ہوں جو یا تو چھپ چکے ہیں یا ریڈیو اور T.V پر براڈکاسٹ کئے جا چکے ہیں۔

۱۱۔ آپ کے پسندیدہ مشاغل کیا کیا ہیں ۔ ؟

ج خدا کا شکر ہے زندگی ایک خوشگوار مصروفیت ہے ہاں اس کا نکھار جب "تصویر کشی" یا "مجسمہ سازی" کروں تو بڑھ جاتا ہے۔ باغیچہ لگانے کا شوق ہے۔

۱۲۔ قلمی دوستی کو آپ کیسا سمجھتی ہیں اور کس حد تک نبھا سکتی ہیں۔؟

ج قلمی دوستی ایک نہایت خوشگوار فریضہ ہے جسے میں بدقسمتی سے نبھا نہیں پاتی۔ کیونکہ خطوط کے جواب دینے میں تساہل کر جاتی ہوں۔

۱۳۔ آپ کے قارئین کو آپ سے کیسی امید [illegible] وابستہ رکھنا چاہئیں اور آپ اپنے قاری سے کس بات کی تمنی ہیں۔ ؟

ج مجھے معلوم نہیں میرے قارئین مجھ سے کیا امیدیں رکھتے ہیں لیکن جو خطوط میری کہانیوں کے چھپنے کے بعد مجھے موصول ہوتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ میں نے انھیں مایوس نہیں کیا ہے۔ اپنی حد تک یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں اپنی کہانیوں کے کرداروں کی عزت کرتی ہوں اور جہاں تک ہو سکے ان کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

کوئی کردار خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو اسے تشنہ نہیں چھوڑتی۔ ساتھ
ہی کہانی کے ماحول کو میں بہت اہمیت دیتی ہوں کیونکہ کردار کا ماحول
سے راست تعلق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ میرا عقیدہ ہے کہ کوئی کردار
مکمل طور پر اچھا یا پوری طرح برا نہیں ہوتا۔ کہانیوں میں تنوع کی قائل
ہوں STEREO TYPED (فارمولا) کہانیاں مجھے بور کرتی ہیں۔
لکھا نہیں جاتا۔ شکر ہے میرے زیادہ تر قاری میری کہانیوں کو صحیح
PROSPECTIVE (پس منظر) میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں
اور مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میری بات ان کے دل و دماغ کو چھو گئی۔ ان
سے التماس ہے کہ اپنی دلچسپی برقرار رکھیں۔ ان کے خطوط مجھے تقویت
بخشتے ہیں۔

۱۲ مشرقی خواتین کو کس حد تک مغربی دھارے میں بہنا چاہیئے۔؟

ج مشرقی بسی۔ کھٹا میں دھنسی۔ ہاں چاہتی لیکن خالص مشرقی عورت پر
میں اس مغرب زدہ عورت کو ترجیح دیتی ہوں جو آج کی دنیا اور آنے والے کل کی
دنیا کے تقاضوں سے واقف ہو۔ جس کا تھوڑا بہت سائنسی شعور ہو۔ جو اپنی
مشرقی بنیادی قدروں کی پابند ہوتے ہوئے بھی مغرب سے کچھ سیکھنے کی کوشش
کرے مثلاً محنت۔ صفائی۔ وقت کی پابندی اور احساس ذمہ داری وغیرہ۔
اب زندگی میں اتنا وقت نہیں رہا کہ مشرقی عورت "دست حنا مالیدہ" لئے بیٹھی
رہے۔ اس لئے لباس اور اپنی آرائش میں بھی کسی حد تک مغرب سے سیکھا
جا سکتا ہے رہن سہن کے مغربی طور طریقے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے
کیونکہ ان میں سہولت ہے۔

۱۳ کیا مذہب۔ مسلم قوم کی ترقی رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔؟

ج صحیح مذہب مسلم قوم کی ترقی میں ہرگز رکاوٹ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس
پر کاربند رہتے ہوئے ایک ترقی پسند مسلمان زیادہ توقیر اور عزت کا مالک بن جاتا
ہے۔ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کے قطع نظر بہت سے احکام ایسے ہیں جن میں
اجتہاد کی گنجائش ہے جن کا اطلاق آج کے بدلے ہوئے حالات پر سہولت کے
ساتھ ہو سکتا ہے پھر بھی ان میں زیادہ ردوبدل کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۴ اردو کی ترقی کے لئے کیا کیا کیا جا سکتا ہے اور اس میں آپ کا کیا
حصہ ہو سکتا ہے۔؟

ج اردو کی حالت ایک ایسی حسین بیوہ کی ہے جس کی اداؤں کے متوالے
سبھی ہیں لیکن کوئی اسے بیوی بنانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اردو اپنی
تحریک میں کسی کی دست نگر کبھی نہیں رہی اب کرم فرما صرف اس کے
سر سے چادر کھینچنے پر مصر نہ ہوں تو کافی ہے یہ اپنی زندگی آپ جی لے گی۔
ایک طرح سے اردو ادارے والوں ہی کے ہاتھوں رسوا ہوتی آئی ہے۔ ادیبوں
اور شاعروں کی بچگانہ حرکتوں کی وجہ سے جہاں وہ ایک دوسرے کو زک
دینے کی کوشش میں اردو کے CAUSE (مقصد) کو
نقصان پہنچاتے ہیں GUNTHER گنتھر کے الفاظ میں:۔

WHEN TWO ELEAHANS FIANT , ITS THE CRASS THNT SUFFERS.

(جب دو ہاتھی لڑتے ہیں تو گھاس روندی جاتی ہے۔ یعنی نزلہ بر عضو ضعیف)
اردو کی ترقی کے لئے اردو میں ایسے لٹریچر کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہئے
جسے آج سے پچاس سال بعد اتنی پیاری زبان کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔
اس کی ذمہ داری نہ صرف آج کے ادیبوں پر عائد ہوتی ہے بلکہ ان کے
قارئین اور ان رسالوں پر بھی جو اردو کا کمرشیل استحصال کرتے ہیں۔
اپنی حد تک میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں میں
DIGNITY (وقار۔ معیار) کی قائل ہوں جہاں تک ممکن ہو کوشش کروں
گی کہ میرے قلم سے کوئی رکیک اور بے مقصد لٹریچر جنم نہ لے پائے۔

"انٹرویو" سلسلہ کی دوسری کڑی آپ کو کیسی لگی۔؟ "ایڈیٹر حریم" کو اپنے
تاثرات سے آگاہ کریں اگر محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ کو بھی اس سلسلہ
میں خط لکھنا چاہیں تو پتہ حاضر ہے۔

محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ
ڈی II ۷۷، قدوائی نگر ویسٹ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔

"پانچ سو روپے"

از شاہدہ بانو بلگرامی

کپڑے تو سب کے کسی نہ کسی طرح درست کر لئے گئے تھے مگر جوتوں کا سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ منا تو خیر ایک سال کا تھا اسے تو گود میں بھی لیا جا سکتا تھا مگر باقی چار بچوں کے جوتے کہاں سے لائے جائیں۔ زرینہ چھ مہینے سے ننگے پیر گھوم رہی تھی اس کی چپلوں پر اتنے ٹانکے لگے تھے کہ اب موچی نے مرمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حامد کا ربڑ کا جوتا چھوٹا ہو گیا تھا جو رفیق کے کام آ رہا تھا خود اس کے ایک سال پرانے جوتے کی شکل تو اتنی بگڑ چکی تھی کہ اسے سوائے چمڑے کے دوسرا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ مسئلہ کسی طرح سلجھتا نہیں نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے طے کیا کہ سلمہ کے یہاں میلاد میں نہ جایا جائے۔ اور یہ فیصلہ کر کے اس کو بڑا دکھ ہوا۔ وہ ایک مدت سے کسی کے یہاں نہیں گئی تھی ـــ یہ بچے غربت کا سائن بورڈ بن کر ہمیشہ اس کے گلے میں لٹکے تھے کہ ان کی وجہ سے وہ کہیں جا ہی نہیں سکتی تھی۔ لباس میں ایک سوراخ ہو تو اس کو چھپایا جا سکتا ہے مگر جب پچاس سوراخ منہ سے بول رہے ہوں تو کوئی کہاں تک چھپا سکتا ہے اس سے تو بہتر ہے کہ اپنی عزت اور شرافت لئے گھر ہی میں بیٹھا رہے۔

شام کو چار بجے جب اس کا شوہر ریاض آفس سے لوٹا تو وہ باورچی خانہ میں بیٹھی چاول چن رہی تھی۔

"ارے تم گئیں نہیں میں تو سوچ رہا تھا کہ تم سلمہ کے یہاں چلی گئی ہوگی۔"

"کیسے جاتی میرے پیچھے اتنی لمبی فوج جو ہے۔"

"تو کیا ہوا فوج لئے جاتیں بڑے آدمیوں کے پیچھے ہمیشہ ایک پلٹن چلتی ہے۔"

"ویسی پلٹن نہیں ہوتی جن کے تن پر نہ کپڑا ہو نہ پیر میں جوتا۔"

"ارے بھئی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں سب کے درست ہیں" [illegible] ہوئے بولا۔

"کپڑے تو میں نے سب کے سب کسی نہ کسی طرح ٹھیک کر لئے تھے مگر جوتوں کے [illegible] ہمت نہیں ہے۔"

"ہوں ۔۔۔" ریاض نے اچکن کی جیب سے تہہ کیا ہوا اخبار نکالا اور بے تعلقی کے ساتھ پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ بات روٹی اور کپڑے کے تلخ اور فرسودہ موضوع کی طرف بڑھ رہی تھی اس سے تو بہتر تھا کہ خاموشی سے اخبار پڑھا جائے۔ دنیا کے بڑے بڑے مسائل کے آگے ذاتی مسئلوں کی کیا حقیقت۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی بیوی ان مسائل کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتی تھی۔ وہ باورچی خانہ سے چاول کی سینی اٹھائے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی اور چاول کریدتے ہوئے بولی۔

"آج جوتے نہ ہونے کی وجہ سے سلمہ کے یہاں نہیں گئے۔ دل مار کر بیٹھ رہے کل عید ہوگی تو کیا ہوگا تب تو بچے نئے کپڑے بھی مانگیں گے اور جوتوں کے لئے بھی ضد کریں گے۔"

"کیوں کب ہے عید" ریاض نے چونک کر پوچھا۔

"ابھی تو دو مہینے ہیں۔ مگر دو مہینے میں بھی کیا ہو جائے گا۔"

"ہوں ۔۔۔" ریاض نے پوری توجہ سے اپنی نظریں اخبار پر گاڑ دیں وہ چاول چننے لگی۔ اس کا سب سے چھوٹا بچہ چلتا ہوا آیا اور گود میں آنے کی ضد کرنے لگا اس نے اس کو اٹھا کر کمر کی ہڈی پر ٹیک لیا اور چاول کی سینی اٹھائے باورچی خانہ میں چلی گئی۔ بمشکل سے پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ ریاض کی آواز سنائی دی۔

"ارے کہاں گئیں بھئی"

جب تک وہ جواب دیتی ریاض اچھل کر باورچی خانہ میں پہنچ گیا۔

"دیکھو کتنی اچھی خبر ہے تمہیں ایک منٹ کی دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ فوراً لکھنا شروع کر دو" اس نے جھوم کر خوشی سے چٹکی بجائی۔

"کیا ہے"

"گھر بیٹھے پانچ سو روپے کا انعام ہو گیا عید بھی ہو جائے گی اور [illegible] اچھے کٹ جائیں گے ۔۔۔ بھئی تم یہ کھانا وانا پکانا بند کرو ۔۔۔ [illegible]

"آخر ہے کیا؟"

"تو پڑھو۔ کتنا ڈھونڈھ کر رکھا ہے۔ انگیٹھی بجھاؤ۔۔۔ باہر آؤ بی"

ریاض دھوئیں سے گھٹ کر لمبی سانس لیتا ہوا باورچی خانہ سے باہر آ گیا اس کے پیچھے وہ بھی باہر آ گئی۔

"یہ دیکھو کیا شاندار خبر ہے طبیعت خوش ہو گئی۔ انشا کیفی نیو دہلی کا کل انڈیا اور بچوں کی کانفرنس ہو رہی ہے پروگرام میں ایک انعامی مقابلہ بھی شامل ہے جس افسانہ نگار کا افسانہ سب سے اچھا ہوگا اسے پانچ سو روپئے ملیں گے۔ میں کہتا ہوں تمہیں یہ موقع کسی قیمت پر نہ کھونا چاہیئے اگر پانچ سو مل گئے تو سمجھو چاندی ہی چاندی ہے۔"

"دیکھیں تو" اس نے بیٹے کو نیچے اتارا اور اخبار لیکر دیکھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی دوسرے ہی لمحہ وہ سنجیدہ ہو گئی اور اخبار واپس کرتے ہوئے بولی۔

"کوئی ضروری تھوڑی ہے کہ مجھے ہی انعام مل جائے"

ریاض تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کو بالکل تیار نہ تھا۔

"تم ہمیشہ کی قنوطی ہو۔ کیوں نہیں ملے گا انعام! کوشش کر کے تو دیکھو۔ کل نیاز صاحب ملے تھے تمہارے افسانے "زنداں" کی بڑی تعریف کر رہے تھے عشی جی بھی بڑے مداح ہیں۔ مجھے تو پورا یقین ہے کہ اگر پہلا نہیں تو دوسرا انعام ضرور مل جائے گا۔ تین سو بھی کم تھوڑی ہیں عید کے لئے سب بچوں کے جوتے اور کپڑے آ جائیں گے ساتھ ہی ہم دونوں کے بھی"

"...... تم اونچی ایڑی کی سینڈل لے لینا اور وہ جارجٹ کی ساری بھی جو اس دن سیل کے کاؤنٹر پر پسند آئی تھی۔ بڑی شاندار ساری ہے جان پڑ جائے گی"

ریاض نے بچوں کی طرح چٹخارہ لے کر آنکھ ماری جیسے سچ مچ پانچ پانچ سو روپئے ہاتھ آ گئے ہوں۔ نئے کپڑوں میں ملبوس ہنستے مسکراتے بچے۔ اپنی پسند کی اونچی ایڑی کی سینڈل۔ سرخ بوٹوں کی جارجٹ کی ساری۔ ریاض کے پاس بوسیدہ اچکن کی جگہ نیا گرم سوٹ۔ سلمہ کے یہاں جانے کی تمام آسانیاں ـــ تصور بڑا ہی بھلا معلوم ہوا اور وہ مسکرا دی

"کس دن ہے کانفرنس"

"اٹھائیس فروری کو تم آج ہی سے لکھنا شروع کر دو ـــ ایک اچھی سی کہانی ـــ [illegible] ـــ"

وہ باورچی خانہ میں واپس جانے لگی۔

"اب کھانا پکانے کو رہنے دو۔ ہوٹل سے آ جائے گا۔"

وہ ہنس دی "آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتے ہیں۔ ابھی ایک مہینہ باقی ہے!"

وہ کیا جانتی تھی کہ ایک مہینہ ایک پل میں گذر جائے گا۔ روز آدھی رات بھی جب بچے سو جاتے اور دن کے ہنگامے سے ذرا سی فرصت ملتی۔ لکھنے بیٹھتی تو وہ سوچتی کیا لکھے۔۔۔ کوئی اچھی سی کہانی جس کا پلاٹ اچھوتا ہو۔ خیالات میں روانی ہو۔ اظہار بیان میں ندرت ہونا شرط ہے ورنہ انعام نہیں ملے گا۔ پانچ سو۔ سو سو کے پانچ نوٹ۔۔۔۔ ہاتھ میں آتے ہی وہ پہلے جارجٹ کی ساری خرید لے گی کتنی خوبصورت ساری تھی اور اس دن کتنی شرمندگی ہوئی تھی جب اس نے ساری کے دام پوچھے تھے اور دکاندار بھی راضی ہو گیا تھا ورنہ عام طور سے یہ ہوتا تھا کہ وہ تفریحاً کپڑوں کے دام پوچھتی تھی اور پھر اتنے دام گھٹانے کو کہتی جتنا دکان دار کبھی بھی گھٹانے کو تیار نہ ہو۔ وہ اسی دام پر لینے کو اصرار کرتی اور دکاندار دینے کو راضی نہ ہوتا۔ سودا کبھی نہ پٹتا اور وہ گھر لوٹ آتی۔ شاپنگ بھی ہو جاتی اور پیسہ بھی نہ خرچ ہوتا مگر اس دن نہ جانے کیا شامت تھی کہ وہ دکاندار فوراً منہ مانگے داموں پر دینے کو تیار ہو گیا۔ وہ گھبرا گئی تھی اور اس وقت تو اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا جب دوبارہ پرس کے خانے سے اس کا ہاتھ ڈال کر بتایا کہ اس کے پاس تو دو سو پچاس روپئے کم ہیں۔ اب تو وہ بڑے رعب سے دکان میں جا کر بیٹھے گی۔ جتنی ساریاں چاہیں دیکھنے کے بعد ایک ساری پسند کرے گی پھر بٹوا کھول کر نکالے گی۔ پانچ سو۔۔ سو سو کے پانچ کھڑکھڑاتے ہوئے نوٹ۔ دکاندار بھی سمجھ جائے گا کہ بٹوا خالی نہیں رہتا۔ اس دن روپئے میرے پرس میں بھولے سے چلے گئے سیاہی کی اچکن کی جیب میں نہیں اور پھر ریاض کی اچکن ـــ اللہ کسی کو نہیں بھاتی۔ بابا آدم کے وقت کی اچکن۔ آج تک پتہ نہ لگا کہ کس رنگ کی تھی۔ گردن کے پاس تو کالے رنگ کی معلوم ہوتی ہے سینے پر بھورے رنگ کا شبہ ہوتا ہے۔ دامن سرمئی مائل کتھئی رنگ کی شہادت دیتا ہے۔ جیبیں داغوں کا اشتہار بن کر رہ گئے ہیں۔ قسم قسم کے دھبے، سفید، کالے، بھورے، سرخ، زرد۔۔۔ کیوں نہیں ایک اچھا سا نئے فیشن کا سوٹ بنوا لیتے۔ بڑے کیسے چار خانہ اور سادہ پیٹ۔ کیا ان کا دل نہ چاہتا ہوگا کہ وہ اچھے کپڑے پہن کر بہترین سوٹ میں باہر نکلیں۔ کیا ایک بوسیدہ شیروانی اچکن پہن کر ان کو شرمندگی نہ ہوتی ہوگی اور ہو گا کسی کے وقت کا کوئی ساتھی مل جاتا ہوگا اف! ـــ پہلے انہیں کے کپڑے بننے چاہئیں۔ میرا کیا ہے میں تو گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ میرے خیال میں ایک معمولی سوٹ تین سو روپئے تک بن جائے گا۔

[illegible] نے ایک کپ [illegible] بہت ہلکی ہو گی [illegible] کر رونے لگا۔ [illegible] جب [illegible] آنکھیں جھپکا کر دیکھا تو وہ کرسی پر بیٹھی لکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر چلا گیا۔

"تم لکھ رہی ہو؟" اس کا لہجہ ایک دم ماتم ہو گیا۔ "میں بیٹھ کر بہلا لیتا ہوں" وہ بچے کو گود میں لیکر تھپکنے لگا۔ وہ بڑی عجیب ہوئی۔ ریاض سوچ رہا ہوگا میں بہت ہی بہترین افسانہ لکھ رہی ہوں میرا دل [illegible] نہیں ہونا چاہئے اسے کیا معلوم میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ میں کبھی افسانہ نہیں لکھ سکتی۔ مجھ میں یہ صلاحیت ہی ختم ہو گئی۔ صبح ریاض نے کہا تھا کہ بہترین موقعہ تھا ——— کیا فن اور کیسی صلاحیت اسے تو کچھ آتا ہی نہیں وہ بالکل بدھو۔ بے عقل اور بے وقوف ہے

کانفرنس کے دفتر میں اس کا نام بھیجا جا چکا تھا آج شام کو اسے افسانہ پڑھنا تھا۔ بچوں کو اسکول بھیج کر اور منے کو پڑوسن کے سپرد کرکے وہ ایک بار پھر قسمت آزمانے اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔ دو تین گھنٹے کی کاوش کے بعد جو اس نے سر اٹھایا تو بڑی سروشنائی سے گھسیٹے ہوئے پانچ چھ صفحے اس کے سامنے بکھرے تھے نظرثانی کے لئے اس نے پڑھنا شروع کیا آخر صفحہ تک پہونچتے اس کا دل ڈوب گیا اور سانس گھٹنے لگی اس پر پانچ سو روپے کیا پانچ پیسے بھی نہ ملنے چاہئیں۔ جذبات اور کیفیات سے عاری ایک پھیکا اور پھسپھسا قصہ تھا پرانی تشبیہوں اور استعاروں کا ایک ایسا مرکب تھا جس کے مزے سے خود اس کا منہ خراب ہو گیا ——— اس نے سارے صفحات پھاڑ کر چولہے میں رکھ دیئے۔ اور لکڑیاں سلگا کر چائے کا پانی رکھ دیا دفتر سے ریاض کے واپس آنے کا وقت ہو گیا تھا وہ منے کو پڑوسن کے یہاں سے لینے چلی گئی۔

واپسی میں ریاض باہر ہی مل گیا اس کو دیکھتے ہی بولا۔

"لکھ لیا؟ مکمل ہو گیا۔ چھ بجے تک چلنا ہے کھانا واپس آکر پکانا۔ میرے خیال میں وہ [illegible] ———"

"میں نے نہیں لکھا ——— کچھ نہیں لکھ سکی۔"

"کیا؟" ریاض پر جیسے بم گرا۔

"نہیں لکھا۔"

"کیوں نہیں لکھا؟"

وہ [illegible] کہ وہ لکھ ہی نہیں سکی تھی [illegible] کیوں نہیں لکھ سکی [illegible] رہتی

سمجھ رہا تھا۔ نمائش کر رہی تھیں۔ مجھے بہلا رہی تھیں [illegible] سے بیکار [illegible] کئے جاتے ہیں آج اس رسالے میں افسانہ جا رہا ہے کل اس میں جا رہا ہے تم نہیں لکھتے روپئے ڈاک کی نذر کر دیئے اور جو وقت برباد کیا [illegible] ایک لائن لکھ سکیں۔"

ریاض بڑبڑاتا ہوا کمرے میں چلا گیا اور وہ بوجھل دل کے ساتھ چائے بنانے چلی گئی۔ ابھی وہ کیتلی میں پانی ہی ڈال رہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ ریاض کوٹ پہنے ہوئے پھر باہر چلا گیا اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے یہ کس بات کا غصہ تھا یہ کیسی سزا تھی۔

رات کے گیارہ بجے تک ریاض واپس نہ آیا۔ وہ ذلت اور دکھ کے احساس سے بے دم ہو کر بستر پر پڑی آنکھوں کے سوتے سوکھ چکے تھے دل بے چین تھا اس نے بےچینی سے کروٹیں بدلیں اور پھر اٹھ کر اپنی میز پر آ بیٹھی۔ دل ستاتا رہا۔ کراہتا رہا تڑپتا اور قلم آگے بڑھتا رہا۔ بارہ بجے ریاض واپس آ گیا اور بڑی بے نیازی سے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سر جھکائے لکھتی رہی ماحول سے بے نیاز وقت سے بے فکر ——— اور جب گھڑی نے دو بجائے تو اس نے قلم رکھ دیا۔ تھکے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں چٹخا کر اس نے صفحات الٹے۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم سی طمانیت پھیل گئی اس نے کاغذات سمیٹ کر احتیاط سے پیپرویٹ کے نیچے دبائے اور بستر پر آکر لیٹ گئی تھوڑی ہی دیر میں وہ اس معصوم بچے کی طرح سو گئی جو اپنی کامیابی کا نتیجہ سن کر آیا ہو مگر انعام کی توقع نہ ہو۔

نئی نیک راہ

زبیدہ خاتون صدیقی بارہ بنکوی

افسردہ افسردہ سی اماں بی نے دالان میں آکر پنکھے کا پلنگ لگایا اور اُس کا رخ اپنی جانب موڑ کر پلنگ پر لیٹ گئیں اس وقت وہ انتہائی پژمردہ معلوم ہو رہی تھیں۔ اتنے میں باہر سے اسکوٹر کی آواز سنائی دی۔ اماں بی نے سر اٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔ جمال اسکوٹر برآمدے میں کھڑا کر کے انھیں کی طرف آرہا تھا۔ دالان میں آکر اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولا اماں بی.... آپ تو گھر ہی پر موجود ہیں۔ صدیقی صاحب کے یہاں نہیں گئیں؟۔

انھوں نے خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ کر ایک لمبی سانس لی اور غمگین لہجہ میں بولیں "اب وہاں ان بیچارے کے یہاں بیٹھ کر اپنا خون جلانے سے کیا فائدہ تھا میں گھر چلی آئی"

"کیوں کیا ہوا" جمال حیرت بھرے انداز میں بولا: "ان کے یہاں دروازے پر بھی سناٹا لگ رہا تھا شامیانے تلے مجھے گنتی کے چار ہی چھ آدمی دکھائی پڑے"

اماں بی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور انتہائی رنج و غم سے بولیں: "بارات لوٹ گئی"

"کیوں... آخر کیوں۔ یہ بارات کیوں واپس گئی" جمال نے سوالیہ انداز میں پوچھا "کیا کچھ جھگڑا ہو گیا تھا"

"جھگڑا کیا ہوتا" اماں بی افسردگی سے بولیں "وہی جہیز کا مسئلہ تھا۔ لڑکے والے اسکوٹر مانگ رہے تھے تو پھر....."

جمال تجسس سے بولا۔

"تو پھر کیا" اماں بی اٹھ کر بیٹھ گئیں اور قدرے غصے سے بولیں "تم کو نہیں معلوم کہ صدیقی بیچارے کی اتنی حیثیت ہے کہ وہ ان ناہنجاروں کے لئے اسکوٹر خریدے... جبکہ ابھی تین لڑکیاں اور بیاہنے کو موجود ہیں۔ توبہ توبہ کیا بُرا وقت آگیا۔ بیچاری لڑکیوں کی جہیز کے بغیر کوئی قدر ہی نہیں"

جمال انھیں کے برابر بیٹھ گیا اور مسکرا کر بولا "میں نہیں تھا ورنہ اپنا ہی اسکوٹر دیدیتا۔ ایک بلپ کے سر سے بار اتر جاتا ایک لڑکی کی قسمت بن جاتی۔"

"چلو بیٹھو..." اماں بی سادگی سے بولیں "کوئی خیر یہ کرلے ہی کیوں لگا" جمال اُن کے پاس سے ہٹ کر کپڑے بدلنے لگا اور پھر کچھ سوچ کر بولا "صدیقی صاحب کی لڑکی ناک نقشہ کی تو اچھی خاصی ہے۔"

"ہاں اور کیا" اماں بی بولیں "دس بیس میں ایک ہے اس کے علاوہ گُن ڈھنگ کی۔ کام کاج اور خدمت گذار تو اتنی ہے کہ میں کہتی ہوں جس دن وہ گھر میں نہ ہوگی کسی کو وقت پر چائے ناشتہ یا کھانا وغیرہ نہ ملے گا۔ سارے گھر کی ذمہ داری اُسی کے اوپر ہے۔ صدیقی کی بیوی سارا دن آئے گئے سے باتیں ملایا کرتی ہیں۔ دوسری لڑکیاں اسکول سے آکر اپنے اپنے فیشنوں میں لگی رہتی ہیں۔ وہی غریب ثروت کولھو کے بیل کی طرح سارا دن گھرداری میں لگی رہتی ہے۔ لیکن اگر اللہ پاک نے اُس کی قسمت بھی اچھی بنائی ہوتی تب تو بات تھی..... پھر ذرا کچھ رک کر بولیں "سچ کہتی ہوں اگر میں اُسوقت چلی نہ آتی تو میرا ہارٹ ہی فیل ہو جاتا۔ اس وقت اُن کے یہاں کا منظر اتنا غم انگیز تھا کہ خدا کسی ماں باپ کو نہ دکھائے مارے دکھ کے اماں بی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں خود ہی اُن کے دروازے کا سناٹا دیکھ کر چونک اٹھا تھا" جمال نے کہا دل میں فوراً یہ خیال آیا کہ خدا نہ کرے کوئی

نہ کوئی بات ہے ضرور۔۔۔۔ ورنہ دو تین دن سے ان کے یہاں کتنی چہل پہل تھی۔

"ہاں اور کیا" اماں بی نے کہا "بیچارے صدیقی صاحب عیالدار آدمی تھے مگر پھر بھی یہ پہلی شادی بہت دھوم دھام سے کر رہے تھے۔۔۔ اب یہ قسمت کی بات ہے۔ سب کیا کرایا مٹی ہو گیا اور بیچاری لڑکی کی قسمت پھوٹی وہ الگ۔ سچ کہتی ہوں کہ مجھ سے تو لڑکی کے کمرے میں جایا بھی نہ گیا۔ صدیقی کی بیوی کے رونے ہی سے پتھر پانی ہوا جا رہا تھا" اماں بی افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولیں۔

"آپ کے اوپر اس واقعہ کا بہت اثر پڑا" جمال نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہاں بیٹا" اماں بی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری "مجھے اپنی غربت یاد ہے۔ جب میں نے اپنی نگار کی شادی کی تھی۔ تب بہت کسمپرسی کی حالت تھی۔ لیکن خیر میری بچی کو گھر اور آدمی اچھے ملے ورنہ یہ بڑھاپا سکون سے نہ کٹتا۔"

جمال نے اپنی ماں کو یوں ملول اور افسردہ دیکھ کر اُن کا دھیان دوسری طرف بٹانے کے خیال سے کہا۔ "اماں بی مجھے تو بھوک لگی ہے۔ گھر میں کچھ کھانے کو بھی نہ ہوگا؟"

"یہ تو سچ ہے" اماں بی قدرے مسکرا کر بولیں "کل شام سے تو ہم سب لوگ انھیں کے یہاں دعوت میں تھے۔ اب اگر لڑکے والے منحوسوں نے اپنی یزیدی نہ دکھائی ہوتی تو اب کھانا کھانے کا وقت تھا"

"سچ شام میں اتنا کم وقت ہوتا ہے کہ پھر آنے کو دل ہی نہیں ہو رہا تھا" جمال نے قدرے خفگی سے کہا "مگر آپ نے اتنی تاکید کر دی تھی اس لئے مجبوراً ہاف ڈے کی چھٹی لے آیا تھا کہ بلا بار جانا نہ پڑے۔ مگر یہاں تو کھانے کا قصہ ہی ختم ہو گیا" وہ افسردگی سے ہنس دیا۔

"یہ تو وہی قصہ ہوا" اماں بی زیر لب مسکرا کر بولیں "جہاں جائے بھوکا۔ وہاں پڑے سوکھا"

"سچ اماں بی" جمال زور سے ہنس دیا اور بولا "اب تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں"

"خیر چلو" اماں بی اٹھتے ہوئے بولیں "فی الحال دودھ میں بسکٹ ڈال کر کھا لو۔ پھر ذرا ٹھہر کر کچھ نہ کچھ پکاؤں گی۔ میں نے تو آج نوکرانی کو بھی چھٹی دے دی تھی" وہ کچن کی طرف چلی گئیں اور ذرا دیر بعد ایک پیالے میں دودھ اور بسکٹ لے آئیں اور جمال کے سامنے رکھ دیا۔

جمال نے مسکرا کر کہا "اماں بی۔ آج سوچا تھا کہ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماریں گے۔ مگر قسمت میں تو یہ مریضوں والا کھانا لکھا تھا" وہ ہنس دیا۔

"ارے بیٹا۔۔۔" اماں بی غمگین لہجہ میں بولیں "لڑکی رخصت ہو جاتی۔ کھانے کو چاہے کچھ بھی نہ ملتا۔۔۔ مجھے تو بیچاری لڑکی کے نصیب پر افسوس ہو رہا ہے۔۔۔ ہائے کیسی خدمت گزار سونا ایسی لڑکی۔۔۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ صدیقی کے یہاں مہمانوں کی عزت اور قدر ثروت ہی کے دم سے ہے۔ بعد میں کوئی انھیں پانی کو بھی نہ پوچھے گا۔"

جمال پیالے میں چمچ چلاتے ہوئے بولا "آپ اس کی خدمت کی بہت معترف ہیں"

"ہاں بھیا سچ بات زبان پر آ ہی جاتی ہے" اماں بی محبت بھرے انداز میں بولیں "آج تک جب کبھی بھی صدیقی کے یہاں گئی۔ ثروت نے مجھے بغیر چائے پانی کے نہ آنے دیا۔۔۔ پچھلے سال جب تم چار کرتوں کا کپڑا لائے تھے۔ اسی ثروت نے سب کرتے سی کر کاڑھ دے تھے۔ ایک پیسہ بھی سلائی کڑھائی کا نہیں لیا۔ میں نے بہت کہا تو کہنے لگی کیا پاس پڑوس والوں سے خلوص محبت نہیں ہوتی۔ مجھے ایک کام آتا تھا کر دیا۔"

جمال یہ سن کر دل ہی دل میں اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوا اور دھیرے سے بولا "آپ نے مجھے پہلے یہ نہیں بتایا؟"

"تجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی" اماں بی پاندان کھولتے

پہنچے گی جب بات آئی تو کہہ دیا ہو جا بھاگ کر سلام کرائی میں سو روپے دیدوں گی۔ مگر وہ منحوس لالچی لوگ اس سے پہلے دفعان ہو گئے سلام کرائی کی نوبت ہی نہ آئی۔"

جمال نے پوچھا امّاں بی آپ کو بھی بھوک لگی ہوگی؟۔

"نہیں بیٹا۔ تم میری فکر نہ کرو" امّاں بی نے ایک لمبی دکھ بھری سانس لی۔ اور پان لگاتے ہوئے بولیں اس واقعہ کا میرے دل پر اتنا اثر ہے کہ میں شاید رات کو بھی کھانا نہ کھاؤں بھلا کسی لڑکی کی بارات لوٹ جانا کوئی معمولی بات ہے۔ خدا دشمن کو بھی ایسی ذلت نہ نصیب کرے۔"

ذرا کچھ رک کر جمال نے مدھم لہجے میں پوچھا: امّاں بی کئی دن ہوئے آپ نے کانپور خط لکھا تھا جواب آیا؟۔

"ہاں کل ہی آگیا تھا" امّاں بی بولیں۔

"کیا لکھا تھا" جمال نے پوچھا۔

"بس وہی پہلی والی باتیں" امّاں بی اداس ہو کر بولیں کہ جب تک ان کے دونوں لڑکے بحرین سے واپس نہ آجائیں گے وہ شادی کرنے سے مجبور ہیں۔

جمال دل ہی دل میں جل کر قدرے غصے سے بولا: اب آپ یہ پتہ کرائیے کہ ان کی لڑکی ہے بھی یا کہیں بھاگ گئی۔"

"ہائے غضب۔ امّاں بی غصے سے آنکھیں پھاڑ کر بولیں: خدا نہ کرے یہ کیا فال منہ سے نکالتا ہے۔

"فال کا ہے کی" جمال بگڑ کر بولا آپ خود سوچئے کون ایسا عقلمند ہوگا جو دو سال سے لگی نسبت آج کل کر کے ٹالے [illegible] پھر کے یہی ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ لڑکی کہیں بھاگ گئی ہوگی اور وہ ہم لوگوں کو آج کل کر کے بیوقوف بنا رہے ہیں۔"

"توبہ کرو بیٹا" امّاں بی ملامت بھرے لہجہ میں بولیں کسی جوان لڑکی کے لئے ایسی غلط بات زبان سے نہیں نکالا کرتے کون پریشان ہوگی۔ ابھی تو وہ لوگ لڑکوں کے آنے پر شادی کرنے کو کہہ رہے ہیں لیکن میں سوچتی ہوں کہ شاید تمھارے سر سہرا دیکھنے کے ارمان میں دل ہی لے چلی جاؤں گی۔"

جمال نے پیار بھری نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا وہ چار منٹ گو مگو کی حالت میں کچھ سوچتا رہا پھر ان کے پیر دباتے ہوئے چپکے سے بولا: امّاں بی آپ اتنی مایوسی کی باتیں کیوں سوچتی ہیں ثروت ہی کو اپنی بہو کیوں نہ بنا لیجئے۔

"کیا کہا" امّاں بی یوں اچھلیں جیسے بجلی کا شارٹ لگ گیا ہو۔ جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگیں۔

جمال نے ایک نظر انھیں دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا کر دھیرے سے بولا کیا آپ نہیں جانتیں کہ آپ کا بڑھاپا اور میری زندگی آرام و سکون سے گزرے۔ ثروت کی خدمت گزاری کی آپ خود معترف ہیں۔ پھر ایسی خلوص کی لڑکی آپ کو کہاں ملے گی؟۔ اور پھر جو آج صدیقی صاحب کی ذلت سے آپ کو دکھ پہونچا ہے اس کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنا دست تعاون بڑھا کر ان کی ذلت کو خوشی و مسرت سے بدل دیں۔ یہ بات آپ کے امکان میں بھی ہے۔ اور آپ مجھے ہمیشہ یہی نصیحت کرتی رہی ہیں کہ۔

"مشکل میں کام آنا اللہ کی خوشی ہے"

"چل شیطان کہیں کے" امّاں بی اپنی حیرت پر قابو پا کر کسی قدر مسکراتے ہوئے بولیں: میری ہی بات سے مجھے مارتا ہے۔"

"ہاں امّاں بی" جمال خوشامدانہ انداز میں بولا: آپ سوچئے تو سہی۔ ایک طرف اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اور دوسری طرف لوگ آپ کے خلوص ہمدردی کے معترف ہو جائیں گے آخر آپ کب تک کانپور والوں کی مرضی پر ٹکی رہیں گی۔ اب مجھے اُن کی بات پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔"

"تمھارا کہنا ہے تو ٹھیک" امّاں بی کسی قدر آمادگی سے بولیں: مگر صدیقی کے یہاں ملنا ملانا ٹھیک نہیں۔

"لعنت بھیجئے ملنے ملانے پر" جمال [illegible] بولا۔

آپ تو خود جہیز کے خلاف تھیں پھر اب کیا بات ہے کیا بس دوسروں ہی کے سلسلے میں یہ خیالات تھے ؟"

"اُوں نہ مجھے جہیز لے کر کیا قبر میں جانا ہے": اماں بی قدرے بگڑ کر بولیں : "میں تو تمہارے ہی لئے کہہ رہی ہوں کہ ابھی وقتی خلوص کے مارے کچھ نہ سوچو ... اور بعد میں جب اس بات کا احساس کرو تو میاں بیوی میں بدمزگی پیدا ہو۔ مجھے تو خود اس بات سے دکھ ہوتا ہے کہ اچھی گُن ڈھنگ کی اور شکل صورت کی لڑکیاں جہیز کی وجہ سے والدین کے گلے سے لگی بیٹھی ہیں۔"

"یہ بات ہمارے معاشرے کے لئے ایک مہلک بیماری اور کوڑھ سے کم نہیں": جمال نے سنجیدگی سے کہا "مگر اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ صرف ہمارے آپ کے افسوس کرنے سے یہ لعنت دور نہیں ہو سکتی۔ جب تک عام لوگوں کی ذہنیت نہ بدلے۔ لیکن ہمیں پہل کرنا چاہئے، ممکن ہے دوسرے بھی ہماری تقلید کریں۔"

اماں بی نے دل ہی دل میں فخر کے ساتھ بیٹے کے ان خیالات کو کافی سراہا اور خوش ہو کر دبی دبی مسرت سے بولیں "واقعی ہم کو اپنے عمل سے مطلب ہے۔ مگر آج میں اکیلی کیا کر سکتی ہوں میری نگار بھی تو نہیں ہے۔"

"آپ نگار کی فکر مت کیجئے": جمال دل میں خوش ہو کر نہایت مستعدی سے بولا "میں صبح ہی پہلی بس سے جا کر اُسے لے آؤں گا"

"اور ولیمہ" اماں بی نے پوچھا۔

"وہ بھی ہو جائے گا": جمال نے کہا۔

"اچھا خیر" اماں بی اٹھتے ہوئے بولیں : "تم گھر ہی میں رہنا۔ میں صدیقی کے یہاں جا رہی ہوں اگر بات بن گئی تو انشاء اللہ ... شام تک اپنی بہو کو رخصت کرا لاؤں گی"

وہ خوشی خوشی چلی گئیں۔

صدیقی کے یہاں سارے گھر پر ایک ہیبت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پاس پڑوس کے اور مقامی مہمان اس واقعہ سے دل برداشتہ ہو کر چلے گئے تھے۔ صدیقی باہر برآمدے میں مغموم بیٹھے تھے۔ ان کی بیوی رونے دھونے کے بعد اب خاموشی سے سر پکڑے بیٹھی لمبی لمبی آہیں بھر رہی تھیں۔ اماں بی کے آنے کی آہٹ پر انھوں نے سر اٹھایا اور دکھ بھرے لہجے میں بولیں "آیئے خالہ .... آپ نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا کھا لیجئے"

اماں بی انھیں کے برابر بیٹھ گئیں اور محبت سے بولیں "اے دلھن اس وقت کھانے کا بھلا کون سا موقع ہے۔ ذرا اپنے میاں کو باہر سے بلاؤ۔ مجھے ان سے کچھ کہنا ہے۔"

انھوں نے کسی قدر حیرت اور تعجب سے اماں بی کو دیکھا اور اپنی چھوٹی بیٹی سے کہا کہ "باہر سے اپنے ابّو کو بلا لاؤ"

مرے مرے قدموں سے صدیقی صاحب اندر آئے۔ اماں بی اُٹھ کر ان کے پاس آئیں اور بولیں "بھیا۔ مجھے اس وقت تمھاری ذلت سے جتنی تکلیف ہوئی ہے اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میرا جمال گھر میں موجود ہے ابھی اسی وقت اس سے دو بول پڑھا دو۔ اللہ نے چاہا تو شام تک لڑکی کو رخصت کرا لوں گی۔"

صدیقی صاحب مارے حیرت کے ہکا بکا سے ہو کر انھیں دیکھنے لگے۔ ان سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ ان کی بیوی جلدی سے اٹھ کر اماں بی سے لپٹ گئیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں "سچ کہہ رہی ہو خالہ .... کیا میری بچی کے نصیب اتنے بلند ہو سکتے ہیں"

"اے دلھن! میں تمھاری بزرگ ہوں": اماں بی بُرا مان کر بولیں "کیا تم سے جھوٹ بولوں گی۔ تمھاری ہاں کی دیر ہے۔ ان منحوسوں نے جو تمھاری ذلت کی ہے وہ اسی وقت مسرت میں بدل جائے گی"

صدیقی صاحب نے تشکر بھری جذباتی ہوتی نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے "آپ کی بزرگی اور پرخلوص ہستی میرے لئے باعث صد عزت ہے

آپ کی بات سر آنکھوں پر۔ آخر اللہ پاک کو میری مجبوری اور بے بسی پر ترس آ ہی گیا... مجھے فخر ہے کہ میری لڑکی کی خوش قسمتی ہے جو اسے آپ جیسا گھر ملے گا۔ آپ جمال میاں کو فوراً بھیجئے۔ دو چار مہمان جو اب جانے کے لئے بالکل تیار رکھے ہیں ان کو روکے لیتا ہوں

وہ دلی مسرت سے بےخود تیز تیز قدموں سے باہر چلے گئے۔ ان کی بیوی اماں بی کی طرف دیکھ کر جذبۂ تشکر سے بولیں خالہ! آپ نے میری ثروت کو زندہ درگور ہونے سے بچالیا۔ اللہ جانتا ہے کہ وہ بڑی غیرت والی لڑکی ہے۔ اس ذلت سے بے موت مرجاتی۔ اُس وقت سے اب تک تین چار بار بےہوش ہوچکی ہے اب تو دراصل مجھے اپنی ذلت سے زیادہ اس کی زندگی کی فکر ہوگئی تھی"۔

اماں بی محبت سے بولیں: "دلھن اللہ پاک بہت رحم و کرم والا ہے اُس سے ہمیشہ اچھی ہی امید رکھنی چاہئے۔ وہ اٹھیں اور جلدی جلدی اپنے گھر آئیں۔

"جمال... ارے او جمال... آخر کہاں چلا گیا" انھوں نے برآمدے سے آواز دی۔ جمال کچن سے باہر آیا اور بولا: "اماں بی بہت زور کی بھوک لگی تھی آملیٹ بنا رہا تھا۔

"ارے واہ رے بے صبر کہیں کے" اماں بی پیار سے بولیں: "جلدی سے تیار ہوکر چل۔ نکاح کے بعد اطمینان سے کھانا کھانا۔ مجھے خود بھوک لگ رہی ہے"

"مگر اماں بی!" جمال ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ تو آج شام کا کھانا بھی کھانے کو نہیں کہہ رہی تھیں۔"

اماں بی مسکرادیں اور پھر جلدی جلدی اندر جاکر ایک چڑھاوے کا سرخ سوٹ اور دو تین زیور اٹیچی میں رکھے اور اُسے تالا لگاکر باہر لائیں۔ اُن کے یہاں جمال کی شادی کے لئے سال دو سال سے سب انتظام فٹ تھا بری کے جوڑے وغیرہ ان کی لڑکی نگار سی ٹانک کر رکھ گئی تھی۔

انھوں نے اٹیچی جمال کے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "خدا کا شکر ہے کہ میری زندگی میں آج یہ دن آیا۔ لو تم جلدی سے کپڑے بدل کر یہ اٹیچی لے کر ان کے دروازے آجانا۔ میں جا رہی ہوں" ان کا لہجہ خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا اور جمال...

اس کے تو دل کی دھڑکنیں مانو سارے بدن میں گونج رہی ہوں۔ دھک دھک کرتا ہوا دل اس نے زور سے تھام لیا جمال کے وہاں پہنچتے ہی فوراً نکاح ہوگیا۔ شادی کے سوئے ہوئے ہنگامے از سر نو پھر جاگ اٹھے۔ صدیقی صاحب نے پاس پڑوس اور نزدیک کے جانے والے سب مہمانوں کو پھر بلا لیا تھا۔ ان کی بیوی دل میں نہ سمائی ہوئی خوشیوں کو دبائے مہمانوں کو کھلانے پلانے میں لگ گئیں اور سب لڑکیاں خوشی خوشی ثروت کو دلھن بنانے لگیں۔ مغرب بعد ہی اماں بی دلھن کو رخصت کرالائیں۔ مارے خوشی کے ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ انھیں امید بھی نہیں تھی کہ اتنی جلدی بہو گھر میں آجائے گی۔

اور جمال..... اس کی خوشیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا لگتا تھا کہ بیوی نہیں، ہفت اقلیم کی دولت اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

رات کے دس گیارہ بجے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ ثروت سر جھکائے مسہری پر بیٹھی تھی۔ جمال نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سرگوشی میں کہا: "ثروت!"

"جی" اسے بہت دھیمی اور گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"تم نے پچھلے سال میرے کرتے سے کاڑھے تھے" جمال نے پُر محبت لہجہ میں کہا: "یہ اماں بی نے مجھے آج ہی بتایا۔ سچ کہتا ہوں میں تمہارے اس خلوص سے بہت متاثر ہوا ہوں... سچ کہنا تم نے سلائی کیوں نہیں لی تھی۔"

"سلائی کیوں لیتی۔ ایسا کرتی تو آپ کیسے ملتے مجھے۔" ثروت شرمیلے انداز میں چپکے سے بولی۔ "اسی بات کے صلہ میں تو اللہ پاک نے یہ انعام دیا... ورنہ کہاں آپ اور کہاں میں"!

اس نے اپنے شانے پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور تشکر کے گرم گرم آنسو اس پر گر پڑے۔ لڑکی کے لئے اچھا گھر، اچھا شوہر واقعی قدرت کا انعام ہی ہے۔

اُبلے ہوئے انڈوں کا کمال

شمیم اختر صاحبہ

مجھے اپنی زندگی میں کھانے پینے کی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک کہ میرا اس [illegible] سے ساتھ نہیں چھوٹا تھا۔ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں گلوکوز کی ٹکیلوں پر پلنے لگا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ جو کچھ مجھے کھانا پڑا اس خوراک سے گلوکوز کم تکلیف دہ ثابت ہوتی۔ اُبلے ہوئے انڈے اور ابلی ہوئی گاجریں کھا کھا کر میں زندگی کے آفاقی مسائل پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اگر میری جگہ کمزور ارادے کا آدمی ہوتا تو شاید اپنے ہاتھوں اپنی زندگی کا گلا گھونٹ چکا ہوتا۔ دوزخ کے عذابوں میں اگر یہ عذاب شامل ہوتا کہ وہاں ابلے ہوئے انڈے اور گاجریں کھانے کو ملیں گی تو جنت میں داخلے کی کوشش کرنے والوں سے یہ دنیا آج بھری ہوتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کا ارادہ کتنا ہی فولادی کیوں نہ ہو ابلے ہوئے انڈے کھا کر اس کی بنیادوں میں دراڑیں پڑ سکتی ہیں۔ مگر میں ایک باعمل آدمی ہوں۔ اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کے بجائے میں ان اسباب کے خاتمے پر غور کرنے لگا۔ جنھوں نے مجھے ابلے ہوئے انڈے کھانے پر مجبور کیا تھا۔ جسے اپنی زندگی میں اُبلے ہوئے انڈے کھانے کا اتفاق نہیں ہوا، وہ ان اسباب کو زندگی کے حسین و رنگین واقعات سمجھے گا۔ جب میرے ہاتھ میں بریانی کی پلیٹ تھی اور نگاہ کھیر کے پیالے پر تھی تو میں بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوا تھا۔ خوشی کے مارے میرا ذہن دل تک بغلیں بجا بجا کر ناچ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس ایک خوشی پر زندگی کی ہزاروں خوشیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ بریانی اور قورمہ کھا کر آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو کسی بات میں سوچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اگر ایک اچھی شکل کی لڑکی آپ کی طرف مسکرا کر دیکھے اور معنی خیز انداز میں کہے کہ [illegible] اچھی خاصی صورتوں کو بریانی اور کھیر کھانے کے شوق [illegible] کیا کر رہے ہیں؟ [illegible] میں نے [illegible] بریانی کی پلیٹ [illegible] رکھا اور کھیر

کھیر پیالے کو دو چمچوں میں سمیٹ کر صحیح جگہ پر پہنچانے کے بعد میں نے کہا: میری بدقسمتی ہے کہ مجھے کل تک صحیح تنقید کرنے والی لڑکی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن آج کا دن میرے لیے خوش قسمتی لایا ہے۔

محبت اندھی ہو یا نہ ہو۔ محبت میں مبتلا شخص کی عقل کو اندھا کر دیتی ہے۔ وہ مجھ سے کہتی: میں اس شخص سے شادی کروں گی جس کا وزن ایک سو پچاس پونڈ سے زیادہ نہ ہو۔ اس کی یہ بات سن کر میرا جی چاہتا کہ میں قریبی کارخانے میں جا کر آرا مشین کے ذریعہ اپنے جسم کے فالتو سالے کو چھیل ڈالوں، بلکہ ایک دن تو جذبات کی رو میں آ کر میں نے اسے کہا: اگر میں اپنی ایک ٹانگ کٹوا لوں تو میرا وزن ڈیڑھ سو پونڈ رہ جائے گا:

مگر شاید قدرت نے اس کے دل کی جگہ وزن جانچنے کی مشین لگا رکھی تھی۔ میری توقع کے برعکس وہ کہنے لگی: بھلا ایک لنگڑے سے کون شادی کرے گا: وہ ہر بات اس انداز سے مسکرا کر کہتی تھی کہ میں اسے مذاق سمجھنے لگا تھا۔ میں اس بات کو بھی مذاق سمجھا کیونکہ میرے خیالات کی محبوبہ میں قربانی کا یہ جذبہ تھا کہ محبوب کی ٹانگ کٹ جائے تو وہ اپنی ٹانگ بھی کٹوا دے۔

میں نے ایک بار اسے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میرا قد چھوٹا ہوتا تو ممکن ہے کہ میرا وزن [illegible] سو پونڈ ہوتا۔ اس پر وہ بڑی لاابالی سے سر ہلاتے ہوئے بولی تھی: جس شخص سے میں شادی کروں گی اس کا قد چھ فٹ سے اونچا ہو سکتا ہے۔ مگر کم نہیں ہو سکتا:

میں نے خوشی سے کہا: میں اس شرط پر پورا اترتا ہوں۔ وہ بولی: اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمھارا وزن کم ہو جائے [illegible] کہا: مگر تم لنگڑے آدمی سے شادی کر سکتے [illegible]

تیار نہیں ہوتے۔

وہ اٹھلا کر بولی "تمہاری یہی سادگی مجھے اچھی لگتی ہے اور پگلے ناک سکڑوائے بغیر وزن کم ہو سکتا ہے"۔

جب میں نے پوچھا کیسے تو وہ عابدہ نرجس کے افسانے "طلوع" کی ہیروئن کی طرح مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "ڈائٹنگ کے ذریعے"۔

اس ڈائیٹنگ کے نتائج سے میں پہلے ہی آپ کو آگاہ کر چکا ہوں۔ جوں جوں میرے بدن میں "بینڈے" سے حاصل ہونے والی غذائیت کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی، میرا دل زندگی کے ان حسین واقعات سے اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ ابلے ہوئے "بینڈے" کھانے والا شخص اگر اپنے پلنگ پر لیٹ جائے تو وہ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر سکتا ہے کہ وہ بیمار ہے لیکن مجھے محبت کی کڑی سزا ملی تھی۔ کھانے پینے کی وہ تمام اشیاء جن کی خاطر آدمی جینے کی تمنا کرتا ہے۔ میرے لیے شجر ممنوعہ تھیں۔ اس پر صبح یا شام تین میل کی دوڑ لگانا ضروری تھی۔ اس دوڑ کو رنگین بنانے کے لیے وہ کہتی تھی "تم دوڑ پر جاتے وقت میرے گیٹ کی گھنٹی بجا دیا کرو۔ میں تمہیں کھڑکی سے دیکھا کروں گی"۔

اگر میں "بینڈوں" کی بدمزگی کی شکایت کرتا تو وہ کہتی: "کیا تم نے خود کو کبھی آئینے میں دیکھا ہے؟ ان "بینڈوں" نے تم کو ایک اسمارٹ آدمی بنا دیا ہے"۔

اپنی شکل و صورت کی خوبیوں کے بارے میں "بینڈے" کھانے سے پہلے بھی مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔ ایک ماہ کی اس خوراک نے میری آنکھیں کھولنا شروع کر دی تھیں۔ میں سوچنے لگا تھا کہ آخر میں نے اس کی شکل و صورت پر توجہ کیوں نہیں دی؟ اسمارٹ بننے کے شوق میں اس نے اپنے گال پچکا لیے تھے۔ میں نے تین "بینڈے" کھانے کے بعد سوچا کہ آج اسے کہوں گا کہ مجھے سوکھی ہوئی لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔ وہ بریانی اور کھیر کھایا کرے۔ بریانی اور کھیر کی یاد آنے پر میرے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ چوتھا "بینڈا" کھاتا۔ ممکن ہے کہ اس کا کہنا صحیح ہو کہ "بینڈے" کھا کر میں اسمارٹ نظر آنے لگا ہوں۔ مگر میں نے یہ دیکھا تھا کہ میں کچھ چڑچڑا رہنے لگا ہوں اس چڑچڑاہٹ کا مظاہرہ اس وقت عروج پر تھا جب میں حسین بننے کے شوق میں دوڑ لگا رہا تھا بلکہ اس وقت میں صرف اسی سے نہیں، دنیا کی ہر لڑکی سے نفرت کر رہا تھا۔ اس نفرت کے اظہار کا موقع مجھے اس وقت خوب ملا جب پانچ فٹ ندگی ایک سو تین پونڈ وزنی ایک لڑکی مجھ سے ٹکرائی۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ میں اس سے آن ٹکرایا ہوں۔ اس نے کینوس شوز پہنے ہوئے تھی اور شلوار کے پائنچوں کو لپیٹ کر اوپر ربر بینڈ چڑھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ ان دنوں تنگ پائنچے کی شلواروں کا فیشن آ گیا تھا مگر عام نہیں ہوا تھا۔

وہ بولی: "نظر نہیں آتا؟ اندھے ہو؟"

میں نے کہا: "اب تک تو نہیں تھا مگر شاید اب ہو گیا ہوں"۔

وہ بولی "اوں"۔

میں نے کہا "اوں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر میں اندھا نہیں ہوا تو آنکھوں میں کوئی خرابی ضرور ہو گئی ہے۔ ورنہ میں کیوں سمجھتا کہ آپ کے چہرے پر آنکھیں موجود ہیں"۔

وہ بولی: "میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں اپنی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے مرنے کا الزام تمہارے سر پر آ جائے"۔

میں نے کہا: "کیوں درزی نے تنگ پائنچوں والی شلوار وقت پر سی کر نہیں دی۔"

وہ بولی: "تم انتہائی بے وقوف ہو کیا ورزش کرنے اور دوڑ لگانے کے بعد مجھ میں اتنی قوت رہے گی کہ میں درزی کے ہاں جاؤں اور اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ میں آج کل کیا کھاتی ہوں، تو تمہاری آنکھوں میں آنسو آ جائیں"۔

یہ کہتے وقت اس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈبڈبا رہی تھیں۔

میں نے کہا: "ابلے ہوئے بینڈے"۔

وہ بولی: "تم کو کس نے بتایا؟"

میں نے کہا: "یہ ایک طویل داستان ہے۔ کل میں اس وقت یہاں ملوں گا۔ باقی باتیں کل ہوں گی"۔

اس کی بھولی بھالی صورت میری نگاہوں کے سامنے پھرتی رہی اس کے پچکے ہوئے گال دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ وہ بھی زندگی سے پورا

لطف اٹھانے والوں میں سے ہے۔ ایک خیال نے مجھے دہلا دیا کہ کیا اس کی شادی کا رفت طے ہو چکا ہے۔ زنانہ رسالوں میں یہ مسئلہ اکثر میری نگاہ سے گذرتا تھا کہ باجی میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا وزن میرے منگیتر کی توقع اور استطاعت سے زیادہ ہے۔ آپ کسی سے مت کہیے گا۔ ہمارے یہاں ایک رواج یہ ہے کہ رخصتی کے وقت دولہا، دلہن کو گود میں اٹھا کر ڈولی میں بٹھاتا ہے۔ میں اپنے ہونے والے شوہر کی جگ ہنسائی سے ڈرتی ہوں۔ خدارا مجھے کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ میں دبلی ہو جاؤں۔ جواب جلدی دیں۔ کیونکہ میری شادی میں صرف دس دن رہ گئے ہیں۔

دلہن کو گود میں اٹھا کر ڈولی میں بٹھانے والی رسم کی بیہودگی پر اداریہ لکھنے کے بعد رسالے کی مدیرہ دبلے ہونے کی جو ترکیبیں بتاتی ہیں ان کو پڑھ کر مارے خوف کے بیس پونڈ وزن کم ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ مجھ سے ٹکرانے والی لڑکی کے بدن کی چربی اتنی آسانی سے چھٹنے والی نظر نہیں آتی تھی اس لیے وہ پینڈے کھا کر اور دوڑ لگا کر خود کو دولہا کے وزن اٹھانے کی قوت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اگلے روز مقررہ وقت پر جب وہ مجھے پارک میں ملی تو اس کے پاؤں میں کینوس شوز کے بجائے اونچی ایڑی والی سینڈل تھی۔ اس کا لباس بھی اسی مناسبت سے تھا۔ بال اس طرح سنورے تھے کہ قد کچھ اونچا نظر آ رہا تھا۔ دراصل میری پہلی محبت نے مجھے مرد، زن کا جائزہ پڑتال میں ماہر بنا دیا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر اپنے ہونٹ بھینچ کر یوں مسکرائی کہ کیا اس کا اس طرح مسکرانا مناسب ہے یا نہیں۔ چونکہ ہمارا درد مشترک تھا اس [illegible] کی پریشانی سے نجات دلانے کی خاطر میں نے مسکراہٹ کے مناسب یا غیر مناسب ہونے کے سوال پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اس سے پوچھا،

"وہ کتنا وزن اٹھا سکتا ہے؟"

لڑکی نے پھولے ہوئے چہرے میں سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کو حیرت سے جھپکایا جیسے میرا سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ وضاحت کے لیے میں نے کہا "میرا مطلب ہے تم نے کسی ذریعے سے معلوم تو کیا ہوگا کہ وہ کتنا وزن اٹھا سکتا ہے"۔

وضاحت کے باوجود اس کے چہرے کے تاثرات وہی رہے جو میرا سوال سن کر پیدا ہوئے تھے۔ میں نے سوچا یہ لڑکی ہے۔ حال دل بیان کرتے ہوئے شرماتی ہے۔ کیوں نہ پہلے میں اسے اپنی افتاد سناؤں تاکہ وہ مجھے اپنا ہمدرد سمجھے۔ بات بڑھانے اور بنانے کے لیے میں نے کہا۔ "اس روز میں تم سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے گھر جا کر غور کیا تو پتہ چلا کہ غلطی میری تھی"۔

وہ بولی۔ "اگر تم وہیں غور کر لیتے تو بات آگے نہ بڑھتی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ مردوں کو دوڑ لگانے کی کیا ضرورت ہے میں نے دیکھا ہے اور سنا ہے کہ مرد جیسے بھی ہوں ان کی شادی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ پھر جان جوکھوں میں کیوں ڈالی جائے"۔

جواب دینے کے لیے میں نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا۔ کیونکہ اس نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ مگر اس نے میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چہک کر کہا۔ "اب بھی تمہیں ضرور کسی سے محبت ہوگی"۔

میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "محبت تھی ..... ہے نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ محبت تھی اور ہے بھی۔ دراصل آدمی ہر وقت محبت میں مبتلا رہتا ہے۔ اگر ایک کے ساتھ نہیں تو دوسرے کے ساتھ"۔

وہ حیران ہو کر بولی۔ "تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں"

میں نے کہا۔ "میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ دراصل آج کل اپنی باتیں میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتیں۔ تم خود سوچو کہ آدمی اُبلے ہوئے پینڈے کھا کر کس طرح باتوں کو سمجھ سکتا ہے یا سمجھا سکتا ہے"۔

وہ بولی۔ "یہ محبت کا شاخسانہ ہے"۔

میں نے کہا۔ "مگر آج میں نے اُبلے ہوئے پینڈے نہیں کھائے زندگی اور جینے کے بارے میں، میں نے اپنے خیالات تبدیل کر لیے ہیں۔ اگر میں کل تم سے نہ ٹکراتا تو ممکن ہے کہ آج پینڈے ہی کھاتا"۔

وہ اپنے سینڈلوں کی ایڑی کو آپس میں ٹکراتے ہوئے بولی "میں بھی ایسی تبدیلیوں سے واقف ہوں"۔

میں نے کہا "دراصل یہ میری بیوقوفی تھی کہ میں اس کی باتوں میں آ گیا اور بریانی کی پلیٹ چھوڑ کر پینڈے کھانے لگا۔ پینڈے کھانے سے بھلا یہ ہوا کہ محبت نے میری عقل پر جو پردہ

• لوگوں نے ایک بوڑھے سے پوچھا۔
"تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"
اس نے جواب دیا "مجھے بوڑھی عورت پسند نہیں ہے۔"
لوگوں نے کہا۔
"تمہارے پاس تو مال و دولت ہے۔ تم جوان عورت سے شادی کر سکتے ہو۔"
وہ بولا "جب میں بوڑھا ہو کر بوڑھی عورت کو پسند نہیں کرتا تو میں کس طرح توقع کر سکتا ہوں کہ جوان عورت مجھے پسند کرے گی۔" (شیخ سعدی)

• عورت کے لیے بہتر ہے کہ وہ اس شخص سے شادی کرے جو اسے چاہتا ہو۔ نہ کہ اس شخص سے جسے وہ خود چاہتی ہو۔
(عربی ادب سے)

• عورت اس وقت زیادہ دلکش معلوم ہوتی ہے جب اس کی گود میں بچہ ہو! (ایک چینی مصنف)

• ایک خوبصورت عورت، دوسری خوبصورت عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو۔ (مرزا رسوا)

لطیفے

• ایک سہیلی دوسری سہیلی سے کہہ رہی تھی "مجھے نازلی کی یہ عادت سخت ناپسند ہے کہ جب بھی وہ مجھے کوئی نیا لباس پہنے ہوئے دیکھتی ہے، تعریف کرنے کے بجائے ہمیشہ اس کی قیمت پوچھنے لگتی ہے۔"
"اسی کی نہیں بہت سی عورتوں کی یہ بڑی عادت ہے۔ مجھے ایسی عورتیں زہر معلوم ہوتی ہیں۔
میرا بس چلے تو میں ایسی عورتوں کو سمندر میں پھنکوا دوں وہ اسی قابل ہیں" دوسری سہیلی نے ہاں میں ہاں ملائی "چھوڑو ان... باتوں کو خوامخواہ خون جلتا ہے یہ بتاؤ کہ تم جو کرتا پہنے ہوئے ہو، اس کا کپڑا تم نے کہاں سے کس بھاؤ لیا تھا؟"

• پادری نے بچے سے پوچھا۔ "بیٹے ڈاک خانہ کہاں ہے؟"
بچے نے اس کو اشارے سے بتایا۔ پادری خوش ہوا اور کہنے لگا "بیٹے کل گرجا آنا میں تمہیں جنت کا راستہ بتاؤں گا۔" بچے نے کہا "آپ کو ڈاک خانہ کا پتہ نہیں آپ جنت کا راستہ کیا بتائیں گے۔"

• خاتون: تمہارا نام؟
نیا ڈرائیور: جناب شجاع الدین شاکر
خاتون: میں اپنے ڈرائیوروں کو ہمیشہ ان کے گھر کے نام سے پکارتی ہوں۔ تمہارے گھر کا کیا نام ہے۔؟
نیا ڈرائیور: پیارے میاں
خاتون: کار باہر نکالو شاکر۔

• ہوسٹل میں رہنے والے بیٹے کی بیماری کی اطلاع پا کر باپ مزاج پرسی کے لیے پہنچا۔ اس کے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی دروازے سے باہر نکل کر چلی گئی۔ باپ نے بیٹے کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو بیٹے نے کہا "بخار نے ابھی ابھی پیچھا چھوڑا ہے"
باپ نے تائید کی۔ "ہاں میں نے اسے دروازے سے نکلتے دیکھا تھا"

• "اس سے پہلے کہ ہماری شادی ہو، لڑکے نے اپنی ہونے والی بیوی سے کہا "میں اپنے ماضی کی چند غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں"
"لیکن تم مجھے ابھی دو ہفتے پہلے ہی اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکے ہو" لڑکی نے کہا۔
"ہاں ڈیر" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن وہ تو دو ہفتے پہلے کی بات تھی"

• ایک پادری نے منبر پر چڑھ کر بالکل وہی تقریر کی جو سات روز پہلے کی تھی۔ تقریر کا جملہ یہ تھا "یہودی مسیح کی تلاش میں نکلے وہ باغ زیتون میں تھا اسے گرفتار کر لیا گیا"
حاضرین میں سے ایک بول اٹھا "قصور اسی کا ہے۔ جب وہ پچھلے ہفتے بھی اسی باغ میں پکڑا گیا تھا تو دوبارہ وہاں کیوں گیا۔"

• مسلسل پچاس روز تک زہریلے سانپوں کے ساتھ رہنے کا ریکارڈ... یہاں لوگ تیس تیس سال سے بیوی کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

عورت کا رُومان اور اس کا المیہ

جارج ایلیٹ حیات خیالات وفن

قسط دوم: پیدائش اور بچپن ——— از فہیم انہونوی

سابقہ قسط میں میں نے 'جذبہ نسوانیت' کے سلسلے میں لکھا تھا کہ گوئٹے نے ہی اس کی تفریق کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے لیکن دراصل گوئٹے نے اس کی طرف اپنے مقولے میں صرف اشارہ کیا ہے۔ اس کی اصطلاح و تشریح میری ذاتی ترجمانی پر مبنی ہے۔ اسی سلسلے میں پریم چند نے بھی اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں 'مرد میں جب عورت کے اوصاف آجاتے ہیں تو وہ دیوتا بن جاتا ہے۔ زیر نظر قسط میں لفظ 'قدرت' سے مراد NATURE ہے۔ حالانکہ میں میری این کے بچپن کے حالات کے لئے دوسری کتب کا رہین منت ہوں اس کے احساس طفلی کی عکاسی میں نے اپنے ذاتی تصور سے کی ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون میں جو اصطلاح 'بصارتی' لفظ کی بنائی گئی ہے وہ میری ایجاد کردہ ہے اور اس کا خاص مفہوم اور 'ردمالویت' سے فرق میرے اپنے خیالات پر مبنی ہے۔ جہاں دوسرے کے خیالات پیش کیے گئے ان کی نشاں دہی کر دی گئی ہے۔ اس قسط سے جارج ایلیٹ کا اصلی نام میری این استعمال کیا جائے گا۔

'جنّت سے بھی سوا مجھے اُلفت چمن کی ہے'

انگلینڈ کی کاونٹی وارو کشائر میں ایک قصبہ آربری ہے۔ یہاں آربری ہال نام کی ایک حویلی ہے جو انگلستان کے ایک قدیم اور اعلیٰ خاندان نیوڈی گیٹ کی آبائی رہائش گاہ ہے۔ ۱۸۰۶ء میں اپنے لاولد چچا کے بعد فرانسس پارکر نے اس میں رہائش اختیار کی اور ——— متعلقہ ریاست کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لیں فرانسس پارکر اپنے مدارالمہام رابرٹ ایوانز کو بھی ساتھ لے آئے اور اس نے آربری ہال کے قریب ہی ساؤتھ فارم کے بنگلے کو اپنا گھر بنا لیا۔

رابرٹ ایوانز اس وقت تینتیس (۳۳) سال کا ایک وضع دار توانا اور مثالی تندرست انسان تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھا پھر بھی اپنی خداداد ذہانت اور محنت سے اس نے اپنے آپکو پوری طرح سے ایک ہمہ گیر اور اہل کاروباری آدمی بنا لیا تھا۔ ریاست کا ہر کام بخوبی انجام دیتا اور ساتھ ساتھ اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال بھی کرتا۔ ریاست کا ذہن اور ہلاکی قوت انتظامیہ کے ساتھ ساتھ اپنے عملی تجربات اور دیانت داری سے اس نے سب کی نگاہوں میں عزت حاصل کر لی تھی اور اکثر اختلافات میں لوگ اسے متفقہ طور پر ثالث بنا لیتے تھے۔

رابرٹ ایونز کی بیوی ہیریٹ تھی اور ان کے دو بچے بھی تھے۔ لڑکا رابرٹ (۴ سال) اور فرانسس لوسی یا فینی (۱ سالہ)۔ ۱۸۰۹ء میں ہیریٹ کا انتقال ہو گیا تو رابرٹ ایوانز نے کچھ عرصے بعد ۱۸۱۳ء میں کرسچینا پیرسن سے شادی کر لی۔ کرسچینا ایک بڑے کسان کی بیٹی تھی اور اس کے گھرانے کی سماجی حیثیت ایوانز سے کہیں زیادہ تھی۔ رابرٹ ایوانز کو بھی یہ احساس تھا کہ اس نے کرسچینا سے شادی کر کے اپنا درجہ سماج میں ذرا بلند کر لیا ہے۔ بہت جلد کرسچینا کے اپنے بچے بھی ہو گئے۔ کرسی (۱۸۱۴ء) اساق (۱۸۱۶ء)۔ میری آین کی پیدائش کے چند ہی ماہ بعد رابرٹ ایوانز نے نیا گھر لے لیا اور اس میں رہائش اختیار کر لی۔

اس گھر سے زیادہ خوبصورت تحفہ خدا میری آین کو دے سکتا تھا۔ لال اینٹوں سے تعمیر کیا ہوا وہ ایک خوشنما اور کشادہ دو منزلہ مکان تھا۔ اس کے سامنے ایک باغیچہ تھا جس میں کچھ پھول کے پودے بھی تھے اور پھل دار درخت بھی دیوار سے چڑھتی ہوئی بیلیں تھیں اور کھڑکیوں سے اندر جھانکتے ہوئے سرو اور لیو کے پیسٹر کسی

فلسفی کی طرح بردبار اور معصوم جو مسکرانے اور پھلنے لگتے جب کبھی ہوا کا جھونکا انھیں گدگداتا اور میری آئن سمجھتی کہ وہ اسے بلا رہے ہیں اور وہ دوڑ کر کھڑکی سے جھانکنے لگتی۔ اسے محسوس ہوتا کہ انکی لہراتی ہوئی شاخیں اسے اپنی باہنوں میں لینے کے لئے بلا رہی ہیں اور وہ من ہی من میں مچل کر رہ جاتی۔ گھر کے پیچھے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے۔ میری آئن ان میں کام کرتے ہوئے آدمیوں کو دیکھا کرتی اور اس کا بھی جی چاہتا کہ وہ بھی جلدی سے اتنی بڑی ہو جائے کہ ان کے ساتھ ان کھیتوں میں کام کرے۔ گھر کے برابر ہی سبزہ زار تھا جس میں میری آئن اپنے بھائی اساق کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دئے گھوما کرتی تھی قریب ہی ایک دریا بھی تھا جس کے کنارے دونوں بیٹھے رہتے۔ اساق دریا کے پاس جاتے ڈرتا تھا حالانکہ وہ بڑا تھا مگر میری آئن اسکے نزدیک کبھی چلی جاتی۔ یہ خوبصورت مناظر پہلی پہلی یادیں بن کر اس کے ذہن پر مرتسم ہو گئے۔ بہت سال بعد اپنی ایک ناول میں اس نے لکھا۔

" ہر انسانی زندگی کو ہمیشہ کسی ایسے کُنج سے جڑا رہنا
چاہیئے جہاں اس کا بچپن بیتا ہو۔ ایسا کُنج جہاں کی پہلی پہلی
یادیں خوشی اور چاہت کے احساس سے مملو ہوں "۔

جب وہ بڑی ہو کر تیس سال تک لندن میں رہی تو اس کی پوری ہستی انھیں نیلے آسمانوں کھلی فضاؤں ننھے پھولوں بوڑھے پیڑوں لمبی گھاس سے بھرے ہوئے سبزہ زاروں اور جھاڑیوں میں چھپی ہوئی پگڈنڈیوں کے لئے تڑپتی رہتی۔ زندگی بھر وہ جدھر سے بھی گزرتی اس کی آنکھیں ہمیشہ مٹی کی قوت نمو فصل کی حالت کو تجسس سے محسوس کیا کرتیں۔ اسے ہمیشہ لہلہاتی ہوئی فصل دیکھ کر خوشی ہوتی۔ اچھی طرح کاشت کئے ہوئے کھیت اسے مسرت بخشتے۔ اس کے لئے رومانی قسم کے قدرتی مناظر کم پرکشش ہوتے۔ پیڑوں سے بھری پہاڑ عجیب و غریب چٹانیں طوفانی موجیں لیتے ہوئے سمندر برف سے ڈھکے کوہسار اسے کم بھاتے۔ مگر کتنے خوبصورت تھے وہ ہرا بھرا جو معصوم اور سیدھے سادھے مویشیوں کے چراگاہ تھے۔" کبھی موسم کا خیال آتا تو یہ سوچتی کہ یہ فصل کو فائدہ پہنچائے گا یا نہیں۔ جب گھٹا چھاتی اور بادِ آوارہ ہوائیں چلتیں تو بجائے تصور جانان کے گاؤں میں پھیلی ہوئی سوکھی گھاس اور بکھرے ہوئے اناج کی ڈھیریاں ہوں کے سامنے آجاتی۔ کیونکہ یہی تو وہ چیزیں تھیں جو دیہاتی انسانوں کی خوشی کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ یہی تو وہ مناظر تھے جن کی دیکھ بھال میں وہ بڑی ہوئی تھی "۔ وہ زمین کیسی جو بنجر ہو، وہ بستی کیسی جہاں زندگی نہ ہو، وہ زندگی کیسی جو شادماں نہ ہو۔

تیرے ہاتھوں ملا گلچیں کو زر معشوق کو زیور
نگس نے آنکھیں، بیمار بلبل نے شفا پائی "

پھولوں کو دیکھ کر یہ خیال آتا ہے۔ مگر یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ

" تجھی سے قیدیانِ عشق نے جامہ دری سیکھی
تجھی سے گل رخوں کو کچھ نہ سننے کی ادا آئی "

اب دیکھئے یہ دونوں شعر ایک ہی انسان کے ہیں۔ پہلے میں سچی محبت کا ملن ہے، ملن سے پیدا ہونے والی زندگی ہے۔ دوسرے میں محبوب کی خوبصورتی کا احساس ہے یا ملن کی آس ہے، مگر آس میں تنہائی ہوتی ہے تخیل ہوتا ہے تصویر ہوتی ہے لیکن ملن نہیں ہوتا۔ تنہائی بیزاری بن جاتی ہے تخیل تخیل ہو جاتا ہے تصویر دھندلا جاتی ہے خوبصورتی مرجھا جاتی ہے۔ مگر جب ملن ہوتا ہے تو تنہائی بس جاتی ہے تخیل تخلیق بن جاتا ہے تصویر زندہ ہو جاتی ہے۔ خوبصورتی اچھائی بن جاتی ہے۔

یہ احساسِ حسن قدرت کی ہی دو قسمیں ہیں جو پوری زندگی پر چھائی رہتی ہیں۔ چاہے وہ مزاج ہو یا کوئی ادب ہو، وہ کوئی پورا دور ہو خواہ پورا سماج ہو۔ یہ دو قسمیں ہر جگہ پائی جائیں گی۔ دوسرے شعر اور اس کی وضاحت سے جو قسم سامنے آتی ہے اسے رومانوی کہا جاتا ہے (ادب میں رومانوی ازم۔ تحریک بجائے ختم ہونے کے مختلف روپ میں اب بھی زندہ ہے) دوسری قسم جو پہلے شعر اور اس کی وضاحت سے سمجھ میں آتی ہے اسے میں بصارتی کہوں گا (یہ اصطلاح لفظ بصارت سے بنائی ہے) رومانوی ادب، رومانوی مزاج کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ وہ جینیس (GENIUS) تک تو پہنچ جاتا ہے مگر کبھی بصیرت نہیں حاصل کر پاتا۔ اس کی پیاس تو سچی ہے مگر افسوس کہ وہ سراب کو بھی سچ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ خارجی اور ظاہری ہوتا ہے۔ اگر خود محو بھی ہوگا تو ساری دنیا اپنے اندر ہی محسوس کرنے لگے گا۔ اپنے اندر تو جھانک سکے گا مگر دوسرے کے دل میں نہ داخل ہو سکے گا۔ اس کے لئے ساری دنیا آئینہ ہو جاتی ہے۔ اسی کو خود غرضی بھی کہتے ہیں۔ اسمیں سچی ہمدردی اور انسانیت کبھی نہیں ہو سکتی۔ مگر بصارتی میں تو صرف بصارت ہوتی ہے۔ لہذا اسی میں سچائی بھی ہوتی ہے افادیت بھی ہوتی ہے نیکی بھی ہوتی ہے اور انسانیت بھی ہوتی ہے۔ لہذا خوبصورتی بھی ہوتی۔ رومانویت اس کا حصّہ ہوتی ہے مگر صرف حصّہ)۔ جارج ایلیٹ اس قسم کی سچی نمائندہ ہے۔ (اردو ادب میں سوائے پریم چند کے شاید اور کوئی نہ ملے) میں یہاں

ان کی مکمل وضاحت نہیں کرسکتا اس سلسلے میں میں ایک مضمون علیحدہ تیار کر رہا ہوں)

پہلی قسط میں جس جذبہ نسوانیت کا ذکر کیا گیا تھا وہ اسی لبھاؤنی قسم سے منسلک ہو جاتا ہے۔ اور اس کو لبھاؤنی کہنا زیادہ مکمل ہوگا۔ عورتوں میں لبھاوٹ زیادہ ہوتی ہے خواہ وہ ظاہر نہ ہو سکے جس کی ذمہ داری ان پر نہیں بلکہ ان حالات اور ماحول پر ہوتی ہے جس میں وہ جیتی ہیں۔ جب بہار ہی نہ ہوگی تو پھول کیسے کھلے گا۔ کیونکہ لبھاوٹ رومان سے بالاتر اور انسانی شعور کی سب سے اچھی صورت ہے لہذا زیادہ تر لوگوں کو دلالت بھاتی اور لبھاتی ہے۔ انھیں دو قسموں میں جہنم کی وجہ، جنت کا راستہ چھپا ہے۔

یوں سمجھئے کہ عاشق اپنی محبوبہ کی خوبصورتی پر فریفتہ ہوتا ہے، اس کے وصال کا خواب ملن پر ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ پرسکون نیند سو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف عورت اس کی سیرت کو سراہتی ہے اس کے وصال کا خواب ملن سے پیدا ہونے والی جیتی جاگتی زندگی سے جڑا ہوتا ہے بے شک اس کی آنکھوں کو بھی عاشق کی خوبصورتی بھاتی ہے اسے بھی ملن لبھاتا ہے مگر جہاں مرد اتصال سے آسودہ ہو جاتا ہے وہاں عورت بیدار ہو جاتی ہے۔ پودا اسی سے رونما ہوتا ہے بیج کا درد اسے ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے دھرتی ماں ہے۔ اسی لئے سچی محبت بھی ہمیشہ پہلے عورت سے ابھرتی ہے۔

عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود
تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود

یہی سچی محبت کی پہچان ہے۔ تبھی ہماری شاعری میں عاشق ہمیشہ عورت ہوتی ہے۔ رادھا کرشن کی دیوانی تھی۔ تبھی دھرتی ماں ہے تبھی عورت دیوی ہے۔

قدرت میں سب کچھ ہے۔ ساری خوبصورتی ساری فطرت سارا فلسفہ ساری سیرت۔ خدا نے پہلے زمین بنائی پھر بادل اڑائے، پہاڑ کھڑے کئے دریا بہائے، پودے اگائے پھول کھلائے، اور تب انسان کو بنایا۔ قدرت ہی سب سے پہلی پیغمبر ہے وہی سب سے پہلی کتاب ہے۔ وہی سچی دولت فلسفی اور راہبر ہے۔ جب ہم خوش ہوتے ہیں تو وہ فرحت بخش ہو جاتی ہے جب ہم دکھی ہوتے ہیں تو وہ تسلی بخش بن جاتی ہے۔ انگریزی شاعر بلیک نے کتنی سچی بات کہی ہے کہ ایک گیہوں کے دانے میں دنیا دیکھی جا سکتی ہے اور ایک جنگلی پھول میں جنت کا نظارہ ہو سکتا

ہے دیکھئے ہندو مذہب کے کتنے ہی تیرتھ استھان وادیوں کی گود میں پھولوں کی مہک سے معطر ہوتے ہیں۔ ہندو اپنے دیوتاؤں پر پھول چڑھاتے ہیں۔ ان کی ناری گجرا بناتی ہے پھول بالوں میں لگاتی ہے تلسی کی پوجا کرتی ہے۔ ان کے تہوار موسمی ہوتے ہیں۔ جب بیج بوتے ہیں تو بھگوان کو یاد کرتے ہیں جب فصل کاٹتے ہیں تو اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ساون میں گاتے ہیں گنگا میں نہاتے ہیں ہمالیہ میں مالا جپتے ہیں۔ پیڑوں کے سائے میں بیٹھ کر گیان حاصل کرتے ہیں۔ کپڑوں سے جسم کو چھپاتے نہیں کپڑوں سے جسم کو سجاتے ہیں۔ شانتی کو پریم مانتے ہیں۔ پریم کو دھرم جانتے ہیں۔

کاش آج بھی ہندو ایسے ہی ہو جائیں۔

(میرے اس طویل انحراف موضوع کو قارئین معاف فرمائیں۔ دراصل یہی باتیں اس مضمون کے لکھنے کی محرک ہیں)

میری آنٹی کی بڑی بہن کرسی جلد ہی ایک قریب کے بورڈنگ اسکول میں داخل کردی گئی میری اور اساق پاس کے اسکول میں جاتے۔ دونوں ہمہ وقت ساتھ رہتے۔ دن بھر ساتھ کھیلتے۔ کبھی دریا کے کنارے بیٹھتے کبھی سبزہ زاروں میں چوکڑیاں بھرتے اور کبھی باغیچوں میں پھول چنتے۔ میری کو اساق سے بے پناہ محبت تھی۔ اسے کوئی گڑیا یا کھلونا نہ بھاتا۔ وہ تو بس اساق کے ساتھ ہی خوش رہتی۔ وہ جو کہتا وہ وہی کرتی وہ جہاں جاتا وہ اس کے پیچھے جاتی۔ بچپن کی یہ پہلی محبت وہ کبھی فراموش نہ کرسکی۔ بہت سال بعد اپنے پہلے ناول "مل آن دی فلاس" جو دو بہن بھائیوں میگی اور ٹام کی محبت کی کہانی ہے) میں اس نے اس معصوم محبت کا حال لکھا ہے۔

" میگی نے اس میں اپنی چھوٹی سی دنیا بنالی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی وہ چاہتی تھی۔ ٹام کبھی اسکول نہ جاتا اور اس کے سوا کسی اور کے ساتھ نہ کھیلتا۔ وہ دونوں ہر روز کہیں نہ کہیں گھومنے جاتے اگر میگی کچھ لے جانا بھول جاتی تو ٹام اس پر ناراض نہ ہوتا۔ وہ اس سے کہنا خیال رکھتا اور سب سے پیاری بات تو یہ تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اتنی محبت کہ شاید وہ خود اس سے اتنی نہ کر سکتی

تھی۔ اتنی کہ وہ کبھی اسے چھوڑنا نہ چاہتا تھا"

اپنے بھائی کے لئے یہ محبت میری آئن کی اس ہمیشہ رہنے والی ضرورت کا پہلا اظہار تھی جو اسے زندگی بھر ترساتی رہی۔ اسے ہر لمحہ کسی ایسے انسان کی ضرورت رہتی جو اس کے لئے سب کچھ ہو اور جس کے لئے وہ سب کچھ ہو۔ اسے ہمیشہ عورتوں سے زیادہ مردوں کی دوستی سکون دیتی (خدا کے لئے دوستی کا مطلب صرف دوستی لیجئے) کیونکہ وہ سچی عورت تھی اس لئے اسے یہ سچا احساس بھی تھا اور اس کا اعتراف بھی کہ آدم کی تنہائی دور کرنے کے لئے خدا نے عورت کو بنایا۔ بچے اور بچیاں ہی بچپن کے سچے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں ہی جوانی کے سچے دوست اور مرد اور عورت ہی زندگی کے سچے ہم سفر ہوتے ہیں۔

مگر باہمی چاہت کی مسرت تو اس سے ابھی بہت دور تھی۔ اساق جب آٹھ سال کا ہو گیا تو اسے بھی بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا گیا اور ننھی میری آئن بھی اپنی بہن کے بورڈنگ اسکول میں بھیج دی گئی۔ اس کی ماں کی صحت اچھی نہ رہتی تھی۔ اس طرح ان کے سر سے بچوں کا بار اتر گیا۔ میری آئن اس پہلی جدائی کو کبھی نہیں بھولی۔ بورڈنگ میں وہ سہمی سہمی سی خاموش رہا کرتی۔ رات کو اسے ڈر لگتا اور سردی میں آگ کے چاروں طرف بیٹھی لڑکیوں کے درمیان وہ ٹھٹھرا کرتی۔

چھٹیوں میں بچے گھر آجاتے۔ مگر اب چھٹیوں میں بھی میری آئن اداس رہتی۔ اساق اب بڑا ہو گیا تھا۔ اسے اپنی سے ذرا دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ بچاری میری آئن اس کے ساتھ کھیلنے کو ترس جاتی۔ اساق اپنے چھوٹے سے ٹٹو پر بیٹھ کر دور نکل جاتا اور وہ کھڑی دیکھا کرتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے جیسے وہ جان گیا ہو کہ اب اساق اس سے ہمیشہ کے لئے دور نکل گیا ہے۔

اب میری آئن کو صرف کتابوں میں ساتھی ملتے۔ کیونکہ اب تک وہ اساق کے ساتھ کھیلنے میں لگی رہتی تھی اس لئے اسے پڑھنا دیر اور دقت سے آیا۔ رابرٹ ایوانز تجارتی آدمی تھا۔ گھر میں کتابیں تھیں نہیں آخر اس نے میری کو کچھ کتابیں لا دیں ———— میری آئن نے جب اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں پہلی بار کتاب لی تو اسے بہت اچھا لگا — میری آئن دن رات ان میں محو رہتی۔ ایک کتاب میں رنگین تصویریں بھی تھیں۔ وہ اسے بہت اچھی لگتیں۔ جب میری آئن نو سال کی ہو گئی تو اس نے پہلی بار ایک ناول پڑھا۔ یہ والٹر اسکاٹ کا ناول تھا جو تاریخ کو افسانہ کی طرح لکھتا تھا۔ میری کو اس کی ناولیں بے حد پسند تھیں اور عمر بھر وہ انہیں پڑھا کی۔ اس کے والد کو بھی یہ ناول بہت پسند آئے اور اکثر میری آئن انھیں پڑھ کر سنایا کرتی۔ ایک بار ایک پڑوسی نے اسکاٹ کا ایک ناول پڑھنے کو دیا مگر میری اسے ختم نہ کر پائی تھی کہ وہ واپس مانگ لے گیا۔ بیچاری اپنے خیالوں میں اس ناول کے مختلف انجام سوچا کرتی اور اس طرح اپنے تجسس کو بہلاتی۔

۱۸۲۹ء میں جب میری آئن دس برس کی ہو گئی تو اسے ایک نئے بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہ اسکول ایک بیوہ چلاتی تھی اور وہ بہت کامیاب تھا۔ میری آئن کے ساتھ اس میں تیس لڑکیاں رہتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں بیوہ کا ہاتھ ایک نوجوان لڑکی بٹاتی تھی جس کا نام ماریا لوس تھا۔ اسے سادہ اور خاموش میری آئن سے محبت ہو گئی اور میری آئن کو اس کی محبت میں پہلی بار ماں کا پیار ملا۔ انسان کو زندگی بھر ماں کی ضرورت رہتی ہے کبھی کبھی غیر فطری مائیں فطری ماؤں سے زیادہ سکون دیتی ہیں۔

ماریا لوس نے میری آئن کو بہت متأثر کیا۔ وہ پہلی انسان تھی جس نے اس کی نیکی اور سچائی کو محسوس کیا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی جو عرصے تک قائم رہی۔ ماریا لوس نے جس طرح میری آئن پر اثر ڈالا اس کا ذکر اگلی قسط میں ہوگا۔)

میری آئن کو اس کی ماں نے کبھی محبت نہ دی۔ وہ اپنے دوسرے بچوں کو زیادہ سراہتی۔ حالانکہ وہ ایک نیک اور سلیقہ مند عورت تھی پھر بھی نہ جانے کیوں میری آئن اپنی ماں سے ہمیشہ ڈرتی رہی۔ اپنی ماں سے بچپن میں ہی جدائی بھی اچھی ثابت نہ ہوئی۔ بعد میں میری آئن نے کبھی اپنی ماں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کئے۔ اس کے ناولوں میں بھی ہمیں اس کے باپ بھائی بہن وغیرہ کے عکس ہمیں ملتے ہیں مگر کسی بھی کردار میں بھی اس کی ماں کا عکس نہیں ہوتا۔ یہ بات ہی بہت کچھ ظاہر کرتی ہے۔

میری آئن خوبصورت نہ تھی۔ اس کے بالوں میں وہ گھنگھرالی لہریں نہ تھیں جو اس کی بہن کرسٹی کے بالوں میں تھیں۔ اس میں وہ تبسم نہ ہو کرسی میں چھلکتا رہتا تھا۔ اسے اپنے کپڑوں کا ذرا احساس نہ رہتا اور تو بس اساق کے ساتھ کھیلنے میں مست رہتی چاہے کپڑے گندے ہو جائیں یا پھٹ جائیں ——— وہ تو خوش تھی۔ اس کی ماں اسے ہمیشہ پڑوں کے

میں تبدیل کیا کرتی ۔ اسے عمدہ مگر غیر آرام دہ لباس پہنا دیتی اور اس کے بالوں کی چٹیاں بنا دیتی ۔ سبزہ زاروں میں آزاد دوڑنے والی میری آئن جیسے قید ہوجاتی ۔ اس کے برخلاف کرسی سجی بنی رہتی ۔ مہمانوں کے درمیان بیٹھ کر انھیں اپنے معصوم تبسم اور پیاری باتوں سے لبھائے رہتی ۔ مگر میری آئن کو تو باغیچہ میں پیڑ پودوں کے درمیان بیٹھے رہنے میں ہی مزہ آتا یا پھر وہ اپنی کتابوں میں کھوئی رہتی ۔

کرسی بنانی سیکھتی گڑیاں کھیلتی گھر میں اُدھم مچایا کرتی ۔ مگر سادہ اور خاموش میری آئن دریا کے کنارے بیٹھی رہتی جیسے بہتا ہوا پانی اسے کوئی کہانی سنا رہا ہو کبھی کھڑکی میں کھڑی سامنے لگے درخت کی الجھی ہوئی شاخوں میں کھوئی رہتی جیسے وہ کوئی پہیلی ہوں ، جنھیں وہ بوجھ نہ پا رہی ہو ، کبھی معصوم گایوں کے پاس کھڑی رہتی جیسے وہ اسے نیک باتیں بتا رہی ہوں کبھی سبزہ زاروں میں دوڑا کرتی نہ جانے کس لئے اتنی خوش کبھی کتابوں کو گڑیوں کی طرح گود میں دبائے باغیچہ میں گھوما کرتی ، شام کو آگ کے پاس زمین پر اس سکون سے بیٹھی رہتی جیسے ماں کی گود میں بیٹھی ہو اور رات کو اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی پتوں کی سرسراہٹ سنتے سنتے سو جاتی جیسے انھوں نے اسے لوری سنا دی ہو ۔

اسمیـ نے اپنے ناول " مل ان دی فلاس " میں اپنے بچپن کو اپنی ننھی ہیروئن میگی کے روپ اور احساسات میں کس طرح بیان کیا ہے ۔ اس طرح کہ وہ سچ کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا میگی کے بارے میں وہ لکھتی ہے ۔

" ایک عجیب سے شئے جو ہر خوبصورتی اور فرحت کے لئے بہتی رہتی ہر چیز کو سمجھنے کے لئے بیقرار رہتی ۔ کان لگائے کسی ایسے پیارے گیت کو سنا کرتی جو اس سے دور ہوتا چلا جاتا اور پھر سنائی نہ دیتا اسکو ایک معصوم اور لاشعور پیاس رہتی ' کسی ایسی دنیا کے لئے کسی ایسے لمحے کے لئے جو اس کے اندر کے پر اسرار اور لاجواب احساسات کو اس کی ظاہری زندگی سے ملا دے اور جس میں اس کی روح کو گھر مل جائے " ۔

ایسی تھی ہماری چھوٹی سی میری آئن ۔ قدرت ہی اس کی ماں تھی قدرت نے ہی اس کی پرورش کی قدرت ہی اس کی سہیلی تھی ۔ کتنا تاثر تھا اس میں کہ کوئی خوبصورتی ایسی نہ تھی جو ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھوں میں بس نہ جاتی ہو ہر پھول کی خوشبو سانسوں میں زندگی بھر مہکی رہتی ۔ کتنی حساس تھی ۔ کوئی پیار سے مسکرا دے تو اس کی صورت ہمیشہ یاد رکھتی ، کوئی نیکی ایسی نہ تھی جسے اس نے کبھی فراموش کر دیا ہو کوئی زندگی ایسی نہ تھی جس کی دھڑکن عمر بھر کانوں میں گونجا نہ کرتی رہی ہو کوئی آنسو ایسا نہ تھا جس کا درد اس نے کبھی بھلا دیا ہو ۔

محبت صرف تاثر ہے ۔ زندگی صرف احساس ہے ۔ جس میں جتنا تاثر ہوگا اتنی ہی اس میں محبت ہوگی جو جتنا حساس ہوگا اتنی ہی اس میں زندگی ہوگی ۔ (باقی آئندہ)

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاسکتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو اور کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو ساتھ ہی نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ روانہ کی گئی ہو۔ ۲۰ر تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کتابت کی کسی بھی غلطی کی ذمہ داری ادارے پر نہ ہوگی۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔ ایک سے زائد خبر روانہ کریں تو یہ ضرور لکھ دیں کہ پہلے کون سی خبر شائع کی جائے۔ ہر خبر الگ علیحدہ کاغذ پر لکھیں اور ان پر اور کسی طرح کی کوئی عبارت نہ ہو۔

ولادت اطفال کی خبریں

• امامہ ہاجرہ (آمبور) میری باجی سعیدہ یاسمین و بہنوئی محمد انور صاحب بی کام (وانمباڑی) کو اللہ برتر نے ۱۱ر جون ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بوقت بارہ ۱۲ بجے شب ایک ننھی سی گڑیا عطا فرمائی۔ نام "رشدہ جوہر" قرار پایا۔ بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ وہ اپنے والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

• ثروت نازلی، مسرت راشدہ (پرنام بٹ) ہماری باجی سلطانہ شبانہ و جیجا مشتاق (ویلور) کے چمن حیات میں دوسری بار ۱۱ر اگست ۱۹۸۱ء کو صبح دس بجے ایک فرزند تولد ہوا۔ نام عبید اللہ اور پیار کا نام عمران احمد رکھا گیا۔ دعا ہے کہ خدائے لایزال بچے کو والدین کی رحمتوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔

• شگفتہ یاسمین، سمیہ پروین (میل وشارم) ہمارے بھیا جاوید احمد و بھابھی شہنتاج پروین کے بطن سے ۱۵ر جولائی ۱۹۸۱ء کی شام کو ۵ بجے ایک چاند سا بیٹا، ولی عہد خاندان جنید میں آیا۔ محمد مجتبیٰ عاطف نام رکھا گیا۔ خدائے قدوس سے التجا ہے کہ نومولود کو عمر خضر عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔

• م۔ نگار (ناگپور) میرے بھائی قاضی نصرت علی خاں اور بھابھی آمنہ ناز کے دامن مقصود کو خدا نے گوہر مراد سے بھرتے ہوئے ۲۰ر اگست ۱۹۸۱ء کی صبح انھیں ایک پھول سی بچی عطا کی۔ حریمی بہنیں دعا فرمائیں کہ وہ فخر خاندان بنے۔

• بجز نفیس صاحبہ زوجہ نفیس احمد صدیقی نے اپنی نومولود بچی کے لئے نام تجویز کرنے کی فرمائش کی ہے۔ نام الف سے ہو اور فاطمہ بھی ساتھ ہو۔ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ ارمان فاطمہ یا انوار فاطمہ نام رکھ لیجئے۔
بچی شادی کے آٹھ سال بعد پہلی اگست ۱۹۸۱ء بروز سنیچر بوقت سوا دس بجے دن عالم وجود میں آئی۔

• صواتی صبیحہ عاشی۔ رضیہ اصغر (آمبور) میری بہن رفیعہ علی صواتی اور بہنوئی حافظ غلام علی کے گلشن حیات میں ۱۴ر اگست ۱۹۸۱ء بروز پیر بوقت صبح بمقام مکہ معظمہ پہلی بار ایک خوبصورت پھول کھلا۔ پروردگار عالم سے دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور ہمیشہ ترو بہار رہے۔

• محمود بیگ (میسور) میری بہن صادقہ بیگم اور بہنوئی وسالے سید عبدالحسن (غالباً ابوالحسن نام ہوگا) کے گلشن حیات میں پہلی بار بمقام سعودی عرب بتاریخ یکم اگست ۱۹۸۱ء بروز ہفتہ ایک کلی مسکرائی۔ نام صبوحی حسن رکھا گیا۔ خدائے قدوس سے دعا ہے کہ بچی والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور ہمیشہ آفتاب کی کرنوں کی طرح چمکتی رہے۔

• تسنیم فاطمہ سنبھلی (سنبھل) محترم سجاد چچا (ابن مولانا منظور نعمانی صاحب) کو اللہ پاک نے ایک چاند سی کلی عطا فرمائی۔ نام سمیہ نشاط قرار پایا۔ حریمی بہنوں سے درخواست ہے کہ میری ننھی بہن کے لئے اللہ پاک سے دعا فرمائیں کہ وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھ کر فخر خاندان بنے۔

• مس سارہ رمزی (ملیح آباد)، میری بہن اسما جاوید اور بہنوئی جاوید علی کے گلشن حیات میں ۱۲ر اگست ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت تین بجے شب ایک کلی مسکرائی۔ نام صالحہ خاتون رکھا گیا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ بچی والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

پیغامات نشاط

• سید عیاض احمد (پوری - اڑیسہ)، میرے ماموں زاد بھائی سید شکیل اعظم انجم ایم۔ ایس۔ سی (فرزند سید جان عالم صاحب) کی شادی شبانہ جبیں عرف روز (دختر نیک اختر ڈاکٹر حاجی سید ابوالبرکات صاحب) کے ساتھ بمقام قاضی بازار کٹک بتاریخ ۱۲ر جون ۸۱ء بروز جمعہ بخیر و خوبی انجام پائی اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد آباد رکھے۔

• مسز کامراں، کاشفہ (آمبور) ہماری پیاری دیدہ صنوبر (بنت ڈی۔ بشیر احمد۔ دیلور) کی شادی الفکا ٹیم حبیب الرحمٰن (دانمباڑی) کے ساتھ بتاریخ ۱۶ر اگست ۸۱ء بروز اتوار انجام پائی۔ اللہ پاک ان کی ازدواجی زندگی کو خوشیوں سے ہمکنار کرے۔

• قریشہ تاج (کلکتہ)، میرے ماموں منصور احمد کی شادی ہاجرہ بی (بنت الحاج نعیم الرحمٰن صاحب) سے ۱۶ر اگست ۱۹۸۱ء بروز اتوار بمقام دہلی کلب کلکتہ، بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہمارے ماموں اور مامی کی زندگی کے دامنوں کو خوشیوں سے بھر دے۔

• ابراہیم محمد جادو بیت صاحب کے پوتے محمود سلمہٗ (فرزند مسٹر سلیمان ای عمر جی) کی شادی ہاجرہ سلمہا (دختر محمد امین الیس صالح جی) کے ساتھ پارٹس ہال میں ۲۰ ستمبر ۸۱ء بروز اتوار بوقت ساڑھے چھ بجے شام بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• افتخار احمد صاحب (لکھنؤ) نے اپنے فرزند الخالد افتخار احمد سلمہٗ کی شادی کے سلسلہ میں جو سکینہ بانو سلمہا (دختر نیک اختر صالح بھائی مرحوم) کے ساتھ ہوئی تھی ایک دعوت ولیمہ ۱۳ ستمبر ۸۱ء بروز اتوار بوقت ۷½ شام نادرن ریلوے انسٹیٹیوٹ لکھنؤ میں۔ دی جس میں افتخار صاحب کے اعزہ اقربا و معززین نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• مسرور جہاں صاحبہ کے برادر عزیز اختر سلمہٗ کی شادی کے سلسلہ میں جو عفت صاحبہ (بنت مسٹر عسکری مرزا) کے ساتھ عمل میں آئی، ۲۰ر ستمبر ۱۹۸۱ء کی شام کو محترمہ مسز نصیر حسین خیال (والدہ اختر سلمہٗ) کی جانب سے ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی جس میں معززین شہر نے بھی شرکت کی۔ میں بصد خلوص مسرور جہاں صاحبہ اور ان کی والدہ محترمہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اختر و عفت کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ (نسیم انہونوی)

انتقال پُر ملال کی خبریں

• بہن فاطمہ مڈلینڈ انگلینڈ سے تحریر فرماتی ہیں: میرے بڑے بہنوئی عصمت اللہ مغل صاحب ۷ر اگست ۸۱ء کو بمقام برمنگھم انگلینڈ انتقال فرما گئے۔ مرحوم پر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ۷ر اگست ۸۱ء بروز جمعہ بعد نماز جمعہ تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔ مرحوم عصمت اللہ، میری بڑی بہن کے شوہر تھے۔ اپنی یادگار چار بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑ گئے ہیں سب بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ (بہن فاطمہ ملک صاحبہ سے جو دلی تعلق مجھے ہے اس کے تحت اس حادثہ کی خبر سن کر مجھے بھی تاسف ہوا اور بہن موصوفہ کا شریک غم ہوں۔ نسیم انہونوی)

• نیاز احمد پاشا (منڈیا۔ کرناٹک)، افسوس میرے دوست اقبال، مشتاق، داؤد اور مقصود (ایک نام پڑھا نہ جا سکا) کی والدہ فیض النساء بیگم صاحبہ زوجہ عبدالستار صاحب کلاتھ مرچنٹ (منڈیا) اپنے پورے خاندان کو رنج و غم میں ڈبو کر ۱۸ ستمبر ۸۱ء کو صبح چھ بجکر دس منٹ پر، طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ نے اپنی یادگار چھ بیٹے اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں، جن میں صرف ایک بیٹی ہی کی شادی کر سکی تھیں۔ اللہ پاک انکے بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ شعر موزوں، معیاری اور سنجیدہ ہو اور ہمارے مقررہ عنوان پر ہو۔ جو اشعار ۲۰ر تاریخ تک دفتر میں موصول نہیں ہو جاتے وہ شائع نہیں کئے جاتے۔ ہر ماہ کا شعر علیحدہ علیحدہ کاغذ پر لکھنا چاہئے۔ نومبر کے لئے عنوان ہے «موت» اور دسمبر کے لئے "خیال"۔

دل کو برباد کر کے بیٹھے ہیں
کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

مرسلہ قرۃ العین (کرنول)

جب تک نہ تم ملے تھے جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

مرسلہ: نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

حمد رب العالمین، شکر خدائے ذوالجلال
صبح عشرت میں ہوئی تبدیل شام پُر ملال

مرسلہ: نجمہ انصار منا (کشکل)

نوید عید سے کچھ کم نہیں تیرا اجال
ادھر نگاہ ملی، مٹ گیا ملال اپنا

مرسلہ: محمد ساجد منا (مخونہ۔ امراوتی)

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
بیٹوں کی جان کا بچنا ہے اب محال

مرسلہ: نور جبیں (رحمت نوادہ)

دنیا نے ضبط غم کے سلیقے سکھا دئے
حد سے بڑھا ملال تو ہم مسکرا دئے

مرسلہ: روحی اختر ملکی محلہ آرہ
وثریا بدر کلی پٹنہ۔

مرے دل میں تھا کہ کہوں گا میں وہ جو دل پہ رنج و ملال تھا
وہ جب آ گئے مرے سامنے تو نہ رنج تھا نہ ملال تھا

مرسلہ: ساجدہ بیگم (بنگارا پیٹ)

کچھ رنج کچھ ملال یہ آنسو ہے نصیب
مجھ کو ملا ہے میری وفاؤں کا یہ صلہ

مرسلہ: قدسیہ شاہین (وڈیشالی)

سارا ملال پیار کی نظروں سے مٹ گیا
ان رہزنوں نے لوٹ لیا کاروان داغ

مرسلہ: کلیم احمد (کرنول)

تجھ سے کہہ دوں تو ترے دل پہ ملال آتا ہے۔
آبگینے کی نزاکت کا خیال آتا ہے

مرسلہ: عطیہ۔ ذکیہ۔ رقیہ۔ فوزیہ۔ کرشنا پوری

(بقیہ بزم حریم صفحہ ۳۱ کا)

• ناجرہ منصور (کلکتہ) افسوس میری نانی مریم بی بی صاحبہ ۲۱ اگست ۸۱ء بروز جمعہ بوقت ۷ بجے صبح اس جہان فانی سے رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ بے حد پابند صوم و صلوٰۃ نیک ملنسار اور خوش اخلاق تھیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• زبیدہ بتول۔ شہیدہ بتول (آمبور) افسوس میری ممانی صفورہ صاحبہ (ساکن وانمباڑی) ۱۷ اگست ۸۱ء کو بعارضہ قلب رحلت فرما گئیں۔ مرحومہ کے شوہر جو فرط غم سے نڈھال تھے اپنی دور افتادہ بیٹی کو فون پر اطلاع دیتے ہوئے بیہوش ہو کر گرے اور خود بھی اپنی شریک حیات کے سفر آخرت میں ساتھ ہو لئے۔ مرحوم کا نام کاتب محمد یوسف تھا بڑے عالم فاضل تھے۔ اپنی یادگار نو بچے چھوڑ گئے ہیں۔ جنکا رنج و غم سے حال زار ہے۔ یہ حادثہ شوہر و بیوی کی سچی محبت کی ایک زندہ مثال ہے۔ اللہ پاک دونوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ (واقعی سانحہ افسوسناک ہے۔ میں بھی شریک غم ہوں۔)

"کی تھی اس گدھے نے بے ہودہ سی بات۔" امی نے بند کر دی:
"مجھے بھی تو بتایئے کیا کی تھی آپ نے انھیں بیلن سے بھی مارا تھا۔"
"ارے بڑا پاجی ہے۔ جھوٹا کہیں کا۔ نہیں مارا میں نے!"
"آخر جھگڑا ہوا کاہے پر تھا؟" زچ ہو کر امرینہ نے پوچھا۔
اور تمام ماجرا دہرا کر نوشینہ باجی نے جز بز ہو کر کہا: "خبیث کہہ رہا تھا کہ جولاہا کا بھائی ایک طرف۔! ہنھ!"
امرینہ کو ہنسی آگئی۔ "آپ نے خط نہیں منگوایا۔؟"
"پاگل نہ بنو۔!"
"اچھا۔ انھوں نے مجھ سے بھی جھوٹ کہا تھا۔ اب سزا دیں گی:"
"اے کہیں ڈنڈے نہ کھلوا دینا۔ سمجھیں۔ میں اس سے خفا نہیں ہوں:"
امرینہ بھن بھناتی ہوئی چلی گئی۔
رحمٰن صاحب کے آنے کی وجہ سے خواتین کی دلچسپی کا سامان پیدا ہو گیا۔ انھوں نے بے حد خوش ہو کر نوشینہ کا جہیز دیکھا اور مشورے دیے۔ پھر کہا کہ جب بڑی آپا تاریخ لینے آئیں تو ان کو بھی بلوا لیا جائے۔
"ہاں بھیا۔ آپ کا رہنا ضروری ہے:" ممی بولیں: "بڑے بھائی صاحب بھی موجود رہیں گے۔ دونوں بزرگوں کے سامنے بس آپ ہی منھ کھول سکتے ہیں ہم سے تو کچھ کہا نہ جائے گا۔"
"کب تشریف لا رہی ہیں۔ بڑی آپا:" رحمان صاحب نے پوچھا۔
"انھوں نے تو کہا تھا کہ وقاص کے آنے کے بعد وہ کہلوائے بغیر آجائیں گی۔" ممی بولیں
"اچھا صاحب!" رحمٰن صاحب جمائی لے کر بولے: "یہ تو ہوا۔ اب میں ذرا سی دیر سوؤں گا بھابی۔ ابھی کسی کافی آپ بنا کے لائیے۔ سر گھو رہا ہے۔" (باقی آئندہ)

ایک تنخواہ وہ اٹھالیں اس کے بعد بیاہ کر دیں گی۔ کیونکہ انھوں نے منت مان رکھی ہے کہ وقاص کی پہلی تنخواہ سے نیاز دلائیں گی! اس سے پہلے شادی نہ کریں گی:
ممی نے طویل سانس لی "خیر۔ اس میں خوف کیا۔ اللہ نے بیٹیاں دی ہیں تو انھیں اٹھانا تو ہے ہی۔ آج نہیں تو کل۔ لڑکیوں کی تقدیر۔ جیسے ہم نے اپنے زمانے میں راج سہاگ کے خزانے سمیٹے۔ اللہ کرے ان بچیوں کی تقدیریں بھی سنہری ہوں۔!"
"بس بھائی تمھارے دل میں خواہ مخواہ ہی کی دہشت بڑی آپا کی طرف سے بیٹھ گئی ہے۔" چچی جان نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: "انھوں نے ہم سے کتنی اچھی طرح باتیں کی تھیں میں تو ان کی بہوؤں ہی کا جائزہ لیتی رہی۔ مجھے تو ماشاءاللہ سب ہی ہنس مکھ خوش مزاج اور خوش حال لگیں! اپنی نوشینہ بھی خدا کے فضل سے اچھی رہے گی۔ بیکار وہم نہ کرو بھابی:"
ممی نے موضوع بدل دیا۔ اور خریدی ہوئی چیزوں کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔
"چچی جان نے کہا "آج چل کے گوٹا کناری اور لچکا لے آئیں گے:" پھر وہ مسکرائیں: "بھابی میں کب تک آپ کے پاس رہوں۔ بتا دیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں سنجر کے ڈیڈی آجائیں۔ پھر دھری رہ جائے گی شوپنگ۔"
"میں کہہ دوں گا امی ڈیڈی سے کہ وہ آپ کے آنے سے اتنی بے زار تھیں:" سنجر نے کہا۔
"اس لڑکے سے میری جان اور آفت میں ہے بھابی:" وہ بسور دیں: "رتی رتی بات ان سے لگا دیتا ہے۔ وہ مجھے نجانے کیا کیا کہتے ہیں۔ بد [illegible] ۔ عقل نہیں ہے۔ کب تک بچی بنی رہوں گی۔ اور یہ بدذات سب سنتا ہے۔ یہ باتیں اسے اچھی لگتی ہیں:"

اچھا تو پھر آج ہم اور محترمہ نوشینہ بھی فلم دیکھنے جائیں گے۔" سنجر بولا۔

برابر والوں کی طرح بھولی بھالی چچی جان بولیں "اچھا اچھا تم جاؤ فلم دیکھنے شام کو۔ میں نے اگر بھائی صاحب سے نہ کہہ دیا تو نام بدل کے رکھ دینا۔ جب وہ بید سنبھالیں گے تو کوئی نہیں جائے گا بچانے کے لیے۔!"

حد ہے امی کہ آپ اور بڑی امی تو سیر سپاٹے کرتی پھریں اور ہیں گھر میں انڈے دیا کروں" وہ جھلایا۔

ہم تو ضروری کام سے جا رہے ہیں" ممی نے کہا۔

مگر میں تمہارے ساتھ فلم دیکھنے جا کب رہی ہوں" باجی بولیں۔

نہیں جا رہیں؟" سنجر تعجب سے بولا۔

بالکل نہیں۔!

چلتیں تو اچھا تھا۔ کچھ سبق ہی سیکھتے۔ آج کل کے فلم بہت سبق آموز ہوتے ہیں" سنجر نے کہا۔

بجلی گرے فلموں پر۔ سوائے عریانی بے ہودگی اور بکواس کے ان میں ہوتا ہی کیا ہے۔ مجھے تو بالکل پسند نہیں" ممی نے کہا۔

"اے بھائی وہ تو اچھا خاصہ تھا۔ کیا نام۔ مقدر کا سکندر" چچی جان نے جلدی سے کہا "میں تو کئی مرتبہ رو دی تھی بیچ بیچ میں"

ہائے چچی جان۔ اس کے گانے کتنے کرخت ہیں" باجی نے تڑپ کر کہا "جب بھی ریڈیو سے اس فلم کا کوئی گانا آتا ہے میں ریڈیو بند کر دیتی ہوں۔ گانوں کی آواز ایسی لگتی ہے جیسے سماعت پر روڑے کوٹے پڑ رہے ہوں"

ملازم لڑکی نے برآمدے میں پہنچ کر ایک خط امرینہ کو پکڑا دیا "باہر سے آئی تھی ڈاکیہ دے کر چلا گیا"

بات ہے۔ لو بھلا کون سی بری بات کہی تھی۔ مگر انھوں نے تو مجھ پر بیلن اٹھا لیا اور بات چیت بند کر دی۔!"

باجی کی بھی باتیں" امرینہ نے برا سا منہ بنا لیا "بڑی ترقی پسند بنتی ہیں۔ تو آپ نے نہیں چرایا وقاص بھائی کا خط۔؟"

"ارے کیا مجھے اپنی گردن کٹوانی تھی۔!"

"ہنہ"

تم میں ہمت ہو تو تم ذرا تلاش کرو۔ خط کہاں ہے۔ کم سے کم باجی مجھ سے پہلے کی طرح نہیں بولیں تو"

نہ بابا نہ۔ ممی زندہ دفن کر دیں گی۔ کہیں گی کہ کتنا پاکنے لگی ہے۔ افسوس افسوس"

سنجر نے آہ بھر کر کہا "مومن نے سچ ہی کہا تھا ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

امرینہ برا سا منہ بنا کر اٹھ گئی۔ نوشینہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ امرینہ اس کے پاس آئی اور کسی تمہید کے بغیر اس پر برس پڑی۔

باجی یہ آپ نام ڈبونے کی حرکتیں کیوں کر رہی ہیں۔ غضب خدا کا۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ وقاص بھائی کے خط پڑھنے کا آپ کو اس قدر ارمان ہے تو ممی اور چچی جان کیا سوچتیں دل میں۔ اتنی سی بات پر آپ سنجر بھائی سے ناراض بھی ہو گئیں۔ حد کرتی ہیں آپ!"

نوشینہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "کو دوں تو نہیں کھائی تم نے۔ بڑی آئی ہو۔ سنجر بھائی کی سگی بن گئے۔! میری بلا پڑھے گی کسی کا خط۔ میں تو خاموش بیٹھی اپنے ناول کے لیے مکالمے سوچ رہی تھی بے وقوف کہیں کی۔!"

تو پھر آپ نے ان سے بات چیت کیوں بند کر دی؟" حیران ہو کر امرینہ بولی۔

ہوئے پیچھے چچی جان بھی چل دیں۔

اکیلے میں نوشینہ کو سنجر کے ساتھ بیٹھنا قطعی اچھا نہ لگا۔ آخر اس نے ایک بے تکی سی بات ان سے کیوں کر دی تھی۔ وہ بھی جھٹکے سے اٹھ کر چل دیں۔ سنجر نے منھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ بالکل پیاسے کوے کی طرح چونچ اٹھا دی تھی۔ نوشینہ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔ مگر انھوں نے چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔!

نجانے کیوں امرینہ کو پہلی دفعہ اپنی باجی کی سنگدلی پر غصہ آیا۔ اور اسے سنجر کی خاموشی بھی اچھی نہ لگی! اس نے اپنی عادت کے خلاف ایک ٹھنڈی سانس لی تھی! جو تھی تو دسویں صدی معنوی لیکن امرینہ کو سو فی صدی اصلی لگی تھی۔ ضبط کرنے کے باوجود اس نے استفسار کیا۔

"کیا کیا ہے آپ نے۔ باجی آپ سے بول نہیں رہی ہیں!"

اسے متاثر دیکھ کر سنجر کو بدمعاشی سوجھی "بہت بد نصیب ہوں۔ مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ کاش میرے بھی دس بارہ بھائی بہن ہوتے۔ بدقسمتی کی حد ہے کہ میرا تو کوئی دوست بھی نہیں۔ ہیں۔!"

"یہ ساری لن ترانی میں نہیں پوچھ رہی۔ میں پوچھ رہی تھی کہ باجی کے ساتھ آپ نے کیا کھیلا کیا کہ وہ خفا ہیں۔ آپ کی اور ان کی تو بہت گاڑھی چھنتی تھی۔!"

"بس۔ ذرا سی بات پر خفا ہو گئیں۔"

"کیا بات تھی۔"

کہہ رہی تھیں کہ وقاص بھائی کا خط بڑی امی کے پاس سے چرا لاؤ۔ میں نے انکار کیا کہ عورت بیچاریاں ایسے کام نہیں کرتیں۔ آپ افسانہ نویس [illegible] پڑھنا بڑی دلچسپی

"وقاص بھائی کا خط ہے" امرینہ دالان میں نکلی۔ سنجر نے کنکھیوں سے اسے دیکھا اور بولا "یہ دفعتاً اندھیرا سا کیوں چھا گیا۔ دھوپ کالی کالی لگ رہی ہے"

"جالا چھا رہا ہو گا آپ کی آنکھوں پر" امرینہ ترکی بہ ترکی بولی "آنکھوں کا ٹسٹ کروائیے! اور پھر۔ خبردار۔ میرے منھ نہ لگیئے گا۔ بڑے آئے کہیں سے۔ بیدے کی لوکی شلجم ایسی صورت کو دیکھنے سے ابکائی آتی ہے"

سنجر ہکا بکا ایک ایک کو تک رہا تھا۔ ممی نے امرینہ کو ڈانٹا "کیوں زبان اتنی چل نکلی ہے۔ کچھ تم کو کہا ہے اس نے کہ خوامخواہ بک بک کیے جا رہی ہو۔ یہ تیزی طراری اچھی نہیں ہے۔ سنا؟"

امرینہ نے خط فرش پر پھینک دیا اور پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی۔

"جی چاہتا ہے کہ تمھارا ٹینٹوا ہی دبا دوں" چچی جان دانت پیس کر سنجر پر الٹ پڑیں۔

"سب ہی مجھ کو کہتے ہیں۔ میں کیا بولا ہوں۔ خاموش تو بیٹھا تھا" سنجر بولا۔ پھر وہ اٹھ گیا "میں جا کے دین محمد صاحب کے ہاتھ کے نیچے کام کرتا ہوں۔ کم سے کم کچھ سیکھ تو جاؤں" وہ بھی غصے میں چلا گیا۔

نوشینہ کو وقاص کے خط کے تذکرے سے حجاب آ رہا تھا وہ بھی چل دیں ممی نے خط کھولا اور پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور خوشخبری لکھی تھی کہ ان کے آنے کے ساتھ ہی ان کا تقرر بھی ہو جائے گا۔ اگر کسی کو ان سے کچھ خدمت لینی منظور ہو تو تحریر فرمائیں۔!

"بڑا اچھا لڑکا ہے" ممی خوش ہو گئیں۔

"لکھ دو جا بی کہ آتے آتے محمد رفیع کے گانوں کے کیسٹ" چچی جان بولنے چلی تھیں کہ ممی نے بات کاٹ دی۔

اچھا اچھا" وہ خوش ہو گئے: "ماشاءاللہ۔ تمہاری تحریر میں بڑا اثر ہوتا ہو
ایک صاحب نے مجھے کوئی رسالہ دیا تھا کہ دیکھئے جناب اس میں آپ کی بھتیجی کی
کہانی آئی ہے۔ نام میں بھولتا ہوں۔ کیا نام تھا۔ بہرحال پوری کہانی پڑھ
کے تو میرے آنسو نکل آئے۔!

جی ہاں۔ بھوٹ بھوٹ کے تو میں بھی رو دیتا ہوں ڈیڈی" سنجر نے گرہ لگائی۔
ادھر نوشینہ کی اور اس کی بات چیت بند تھی۔ وہ بے شک آس پاس رہی،
مگر نوشینہ خفا تھی۔

آپ نے وہ افسانہ پڑھا ہوگا چچا جان" نوشینہ نے خوش ہو کر کہا "جس میں
ایک لاوارث لڑکا سو سال بعد اپنے باپ سے ملتا ہے۔!
بالکل ٹھیک ہے" وہ گرجے "یہی افسانہ تھا۔ واہ واہ۔ باپ بیٹے کی ملاقات
کا تاثر۔ دل کھارے دلگداز مکالے اور اخیر میں۔!
اخیر میں باپ بیٹا دونوں مر جاتے ہیں" سنجر خوش ہو کر بولا۔
لاحول ولا قوۃ۔ انجام یہ نہیں ہے بھئی۔!
اچھا" سنجر کا منہ لٹک گیا "تو پھر میں نے دوسرا پڑھا ہوگا۔ جس میں اخیر
میں چل کے بیٹا باپ کی شادی کرا دیتا ہے۔!
کیا بکواس ہے؟" وہ بگڑے۔
معافی چاہتا ہوں ڈیڈی" وہ گھبرا گیا "دراصل کہانیوں کا گھورہ کچرا
میرے دماغ میں اتنا بھر گیا ہے کہ بولتے وقت سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔"
رحمان بھائی آئیے میں آپ کو نوشی کا جہیز دکھاؤں" ممی نے یک بارگی
موضوع بدل دیا۔
نوشینہ سمٹ گئی۔ ارحمن صاحب مسکرائے اور ادھم کو حد گئے ہاں

اوئی آمنہ۔ رتاس سے داماد کا رشتہ ہے دل میں کیا سوچیں گے کہ بڈھی
ساسوں نے گانوں کے کیسٹ لانے کی فرمائش کی ہے۔!" ممی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے
اور کیا" وہ ہنس دیں "میں بے سوچے سمجھے بول دیتی ہوں۔ جب وہ آپ کے
داماد ہوئے تو میرے بھی ہوئے۔ بس ان کو لکھ دیجئے بھابی کہ میاں جم جم آؤ۔ اللہ کا دیا
یہاں سب کچھ غریبا مئو ہے۔
میں کچھ لکھوں گی ہی نہیں" ممی نے کہا "یہ تو ایک طریقہ ہے کہا ہر رہنے والے چھتیجے
ہیں ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیے۔!! اب سچ مچ ان سے کوئی کچھ منگوانے
تھوڑی بیٹھ جائے گا۔!

نوشینہ کو باورچی خانے میں دیکھ کر سنجر نے پوچھا "کیوں۔ کیا بات ہے آپ
کچھ خاموش سی ہیں۔
میں بالکل خاموش ہوں" نوشینہ نے کہا۔
وجہ بتا دیجئے۔ ورنہ آلو چھیلنے میں میرا دل نہیں لگے گا" سنجر نے تشویش سے کہا
میاں آپ سے کس نے کہا ہے کہ آلو چھیلئے" خانساماں نے سرزنش کرنے کے
لہجے میں کہا "آپ کو آتا نہیں۔ آدھے آدھے آلو کاٹ کر پھینک رہے ہیں۔"
بھائی اسی لیے کوشش کرتا ہوں کہ سسرال میں کوئی نام نہ رکھے کہ لڑکے کو ماں باپ
نے کچھ سکھایا ہی نہیں۔ نہ تو نگوڑا سوئی پکڑنا جانے نہ آلو چھیلنا۔"
خانساماں کو غصہ تو آیا مگر اس نے اخلاقاً دانت نکالے اور سنجر کے ہاتھ سے چاقو
لے لیا۔ وہ خانساماں کے ایپرن سے ہاتھ پونچھ کر نوشینہ کے پاس جا بیٹھا۔
فکر ہو رہی ہے آپ کو کہ رتاس بھائی نے کیا تحریر فرمایا ہے" سنجر نے پوچھا
پھر خود ہی سے بولا "میں ابھی جا کر خط پار کیے لاتا ہوں۔ ٹھاٹ سے جواب لکھ دیجئے۔
آپ خدا رکھے خود افسانہ نویس۔ ایک سے ایک پھڑکتا ہوا انسانی مکالمہ لکھئے اور

ناشتے پر ان میں بے حد دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ رحمٰن صاحب زاہد خشک نہیں تھے۔ ہنسنے ہنسانے والے آدمی تھے۔ ممی سے ان کی نوک جھونک چلتی رہی۔ ناشتے کے بعد بڑے ابا حسب معمول جا چکے تھے۔ انھیں آزادی نصیب ہو گئی تھی۔! رحمٰن صاحب کے بلند قہقہے گونج رہے تھے!۔

چچا جان۔ ابکی تو مجھے ضرور ناگر جونا ساگر دکھا لائیے: امرینہ ان کے پاس بیٹھی تھی۔ ان سے بے حد مانوس تھی اور وہ بھی اسے بہت چاہتے تھے۔

سنا ہے ادھر علاقہ میں مان سون کا زور ہے بیٹی۔ سواریوں کی آمد و رفت پر پابندی ہو گئی ہے ورنہ میں ضرور لے چلتا: وہ بولے۔

میں سائیکل کے پیچھے بٹھا کے لے جاؤں ڈیڈی؟ سنجر بول پڑا۔ حماقت انگیز باتیں مت کرو۔ تم بھی اکیلے دکیلے ادھر مت جانا۔!

تو پھر میں آپ کے ساتھ چلوں! دکنے پر؟:

کیوں۔ یہ کیا سوجھی ہے۔

کالج بند ہے۔ دل نہیں لگ رہا!: امی کہتی ہیں کہ فلمیں ہی دیکھ لیا کرو مگر میں اسے تضیع اوقات سمجھتا ہوں!۔

ایک ہفتہ بعد کالج کھل جائے گا۔ مصروف ہو جاؤ گے۔! تم خبردار فلمیں مت دیکھنا انھیں امی ہی کی طرح شوقین ہو کر رہ جاؤ گے۔!

جھوٹ بولتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ منہ میں لوکا ہی لگا دوں: چچی جان ... برافروختہ ہو گئیں۔

چچا جان زبردست ہنس کر نوشینہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

آج کل تمھارا کیا مشغلہ ہے بی بی؟:

اب تو میں نے ایک ناول بھی شروع کر رکھا ہے چچا جان"

کیا کہتے ہیں کہ پرخچے اڑا دینے والے اشعار۔

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

سارے دانت ہاتھ پر رکھ دوں گی۔ مجھ سے اگر بے تکی بکواس کر دگے" باجی بے حد چڑ چڑی ہو رہی تھیں۔

لگتا ہی نہیں آپ ایم اے کر رہی ہیں بالکل خالہ بفاتن معلوم ہو رہی ہیں۔

تمیز سے۔ تمیز سے۔! میں تم سے پورے چھ سات مہینے بڑی ہوں۔

ارے چھ مہینے بڑی ہیں۔ مگر آپ کے پاس اس فرا مہینا ہے جسے آپ قبل مسیح پیدا ہوئی ہیں اور میں بعد از نیا مت پیدا ہوا ہوں۔ چھ مہینے کی بڑائی۔ منہہ!:

بدزبان۔ ٹرّے۔ کیا یہ کوئی فرق ہی نہیں ہے۔؟"

نہیں!"

کیسے نہیں۔

میں تو نہیں سمجھتا۔ ذرا بھی رومانس پن نہیں ہے اس میں۔

گھانس چھیل رہے ہو۔ ایم ایس سی۔ اور رومانس کے ساتھ پن لگاتے ہو۔

میں نہیں چاہتا کہ بالکل ہی انگریز ہو جاؤں۔ تھوڑی سی اردو اس لیے بولتا ہوں کہ آپ جیسے کم پڑھے لکھوں کی سمجھ میں میری بات آ جائے:

سن رے احمق۔ میری فکر کی بات دوسری ہے: باجی ستی ان سنی کر کے بولیں۔

اب اس قدر بھی چھوٹا مت سمجھئے مجھے ! "

"جاؤ نہیں کہتی ۔ تم اس لائق ہی نہیں !۔

کہئے کہئے ۔ میں اس سے بہت زیادہ لائق ہوں جتنا آپ سمجھتی ہیں!"

دہ مارے اہمیت کے باجی کے اور قریب سرکا ۔ انھوں نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا اور وہ پھر اپنی جگہ جا بیٹھا ۔ منھ لٹکا لیا ۔

تم تو جانتے ہو کہ مجھے اپنی ادبی دلچسپیوں کا کتنا زیادہ خیال رہتا ہے۔

جی ہاں "

تو پھر یہ جو مصیبت آنے والی ہے " باجی نے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا کر لیے " کل ممی جا کے ان محترمہ سے مل آئیں ۔ اور آپ کی ساس سے ۔ ؟" اس نے معصومیت سے سوال کیا ۔

"ایسی کھوسٹ باتیں کرتے ہو تو بالکل عورت معلوم ہوتے ہو" باجی بگڑ گئیں ۔

لیجئے میں گونگا بن کے آپ کی باتیں سنوں گا "

"میرے ذہن میں ناول کا ایک اچھوتا موضوع ہے ۔ کئی افسانے ادھورے پڑے ہیں ۔ اور ابھی تو میرا آخری سال باقی ہے " باجی تو نکروں کے مارے بھٹ پڑتی جا رہی تھیں " سنجر تم بے حد پیارے ہو ۔ کیا تم یہ سب پرابلم ممی کے سامنے نہیں رکھ سکتے ؟

بشرطیکہ جان کی امان پاؤں " سنجر نے سنجیدگی سے کہا " اگر بڑی امی نے میری گردن پر چھری چلا دی تو کیا آپ امی کو خون بہا ادا کر دیں گی؟

ابھی کہہ رہے تھے کہ آپ کے کام آؤں گا ۔

یہ کب کہہ رہا تھا کہ آپ کے کام میں کام آجاؤں گا ! "

میں ڈر کے مارے چلا آیا ہوں ! "

اچھا جاؤ ۔ اندر جا کے ناشتہ کرو ۔ اور کچھ آرام بھی کر لو ۔

"جی بہت اچھا "

رحمن صاحب اندر آئے ۔ آمرینہ کرسی سے اٹھ کر ان کے سینے سے لگ گئی انھوں نے ہنس کر اس کی پیٹھ تھپکی ! ۔

دعا سلام کے بعد ممی نے ان کی خبر لی " دروازے کی آڑ سے میں نے آپ کو بھائی صاحب سے جھوٹ بولتے سنا ہے ۔ یہ نہیں کہا آپ نے کہ بیوی کو ٹرک کے بھاگ آیا ہوں ۔ خواہ مخواہ بخار کو بدنام کیا "

رحمن صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا " کون سا مائی کا لال میں ہوں کہ بھائی صاحب کے سامنے ایسا خطرناک سچ بول دیتا ۔ تشنج کا حال تو ایسا ہے کہ اب وہ میرے بدن میں گھس کے تو نہ دیکھیں گے لہذا اگر دو چار روز اور تشنج رہے گا تو میں بھی آپ کے پاس رہ سکوں گا ! "

مگر ایک بات میں صاف صاف کہے دیتی ہوں " ممی نے للکارا ۔

"ارشاد ۔ !"

آپ کو اکیلے ہی واپس جانا پڑے گا ! آمنہ نہیں جائے گی آپ کے ساتھ "

"کمال کیا ۔ ارے میں کب کہہ رہا ہوں کہ کسی کو گود میں اٹھا کر اضلاع پر مارا مارا پھروں گا "

ذرا تولیہ لا دیجئے ۔ بچے چل پھر رہے ہیں ! " چچی جان نے کہا ۔

ناشتہ لاؤ بھائی " رحمن صاحب نے بات اڑا دی " رات کو برائے نام کھایا تھا ۔ بہت بھوک لگی ہے ۔ آمرینہ ۔ بیٹی ۔ ہری اپ ! "

اچھا چچا جان " وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی ۔

میں جھانک آؤں"۔ ممی بولیں اور گھبرائی گھبرائی سی کچن کی طرف ہولیں۔
سنجر کے ڈیڈی عبیدالرحمٰن صاحب باہر بیٹھے بڑے ابا سے باتیں کر رہے تھے!
"بھئی تمھاری غیر متوقع آمد سے ہمیں مسرت تو ہوئی ہے"۔ بڑے ابا کہہ رہے تھے: "لیکن اتنی جلدی واپسی کا قصد کیوں کیا ہے تم نے؟ ہم سے تو غالباً دو ماہ کے بعد ملے ہو تم؟"

"جی کیا عرض کروں بھائی صاحب"۔ رحمٰن صاحب نے پاس ادب سے مدھم آواز میں کہا:
"یہ انجینئرنگ لائن مجھے شروع ہی سے پسند نہ تھی۔ لیکن اب پیشہ ہی یہ ٹھہرا ہے تو مجبور ہو گیا ہوں... آپ کچھ کوشش کیجئے کہ مجھے اس طرح جلد جلد ادھر ادھر بھاگنا نہ پڑے۔"

"ہم ضرور کوشش کریں گے"۔ بڑے ابا نے کہا: "تم نے جلد واپسی کی وجہ نہیں بتائی۔"

"جی وہ۔ صبح کو بخار سا معلوم ہوا تھا جناب عالی۔ تشنج بھی محسوس ہوا۔ میں ڈر گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ یہ علالت کی تمہید ہو۔ ایسے مقام پر تھا جہاں ڈاکٹر کی سہولت بھی نہ تھی۔ بس۔ ایک صاحب بائی کار آ رہے تھے۔ میں نے کہا کر مجھے بھی لے چلئے۔ بس چلا آیا۔!"

"اب بھی بخار معلوم ہوتا ہے"۔ بڑے ابا کا بھاری بھر کم چہرہ ان کی طرف اٹھا۔ موٹے موٹے شیشوں کی عینک سے انھوں نے رحمٰن صاحب کو گھورا۔
"جی نہیں"۔ انھوں نے جلدی سے اپنی پیشانی ٹٹولی: "اب تو بالکل نہیں ہے!"

"بڑے بیدرد خبیث ہو۔ سچی کسی کام کی نہیں تمھاری دوستی۔ اٹھو میرے پاس سے جاؤ۔ اب مجھ سے کبھی نہ بولنا۔ بلکہ میرے قریب بھی نہ آنا!"
"ارے ارے۔ بیٹھئے تو۔ ایسا دھڑن تختہ کر دینا مناسب نہیں ہے۔" وہ بوکھلا کر بولا: "آپ پوری بات تو سنیئے۔ یہ بیلن آپ نے کیوں اٹھا لیا ہے۔"
"مار ڈالوں گی تمھیں۔"
"بیلن سے؟"
"قطعی ناکارہ آدمی ہو"۔ وہ اٹھ کر چل دیں۔
"اجی آپ میری قدر و قیمت کیا جانیں"۔ وہ ان کے پیچھے لپکتا ہوا بولا: "مجھ جیسے انسان دو ہی چار پیدا ہوئے ہیں۔ مثلاً غالب اقبال شیکسپئر اور میں۔!" اس نے آدھے راستے ہی سے انھیں جا لیا اور بازو سے پکڑتا ہوا بولا۔
"اچھا اس طرف آئیے۔ اب میں قطعی سنجیدگی سے آپ کے مسائل سنوں گا اور مناسب رائے مشوروں سے نوازوں گا۔ یہ اتنی جلدی جلدی خفا ہو کر آپ تو رہے سہے ہاتھ پاؤں پھلا دیتی ہیں!"
اس نے منا کے چمکار کے انھیں شہ نشین کے پاس سنگی بنچ پر لا بٹھا اور متانت سے بولا۔
"ہاں۔ اب فرمائیے"۔
"فرما تو چکی۔ تم نے گت سے سنا بھی ہوتا۔ اسی کو کہتے ہیں کہ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔"
"ان نوہ"۔ سنجر نے کھوپڑی سہلائی: "لیجئے۔ میں اب کوئی ادا نہیں

دکھاؤں گا۔ بے شک آپ کے پرابلم سننا اور انھیں حل کرنا میرا فرض ہے۔
اچھا آپ نے فرما دیا اور میں نے سن لیا۔ اب میرا جواب سنیئے۔!"
سچ کہتی ہوں کہ میرا معاملہ مذاق میں اڑایا تو بری طرح پیش آؤں گی۔ لو صاحب۔ چہ پدی کا چہ پدی کا شوربہ۔ آپ ہم سے مذاق فرما رہی ہیں!
خوامخواہ آپ ایمپرن ہو رہی ہیں"۔ وہ جھنجھلا گیا۔" کوئی آپ کی ادبی دلچسپیوں میں ٹانگ نہ اڑائے گا۔ میں جانتا ہوں۔ وقاص بھائی ایسے بہترین انسان ہیں۔ جب وہ الہ آباد جا رہے تھے تب میں بھی انھیں چھوڑنے گیا تھا۔ ارے۔ میں نے انھیں اپنا آئیڈیل بنا لیا ہے اس قدر عمدہ انسان ہیں کہ بس۔ جب تک ہمارے ساتھ رہے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ مذاق کیے۔ راستے میں الٹی ہماری خاطریں کیں۔ بار بار چائے پلائی۔ مجھ سے تو خصوصاً بہت محبت سے ملے۔ اسٹیشن پر مجھے ایک قمیص کا پیس اچھا لگا تھا وہ خرید دیا۔ ہزار میں نہیں نہیں کرتا رہا۔ مگر وہ نہ مانے۔ آپ ان بے چاروں سے خوامخواہ ڈر رہی ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز آپ کی آزادیوں پر اپنی مرضی کی پابندی نہ بٹھائیں گے۔ مجھے یقین ہے"۔
سچ کہہ رہے ہو۔ سنجر؟" باجی نے مشکوک لہجے میں پوچھا کچھ دبیلے انداز میں مسکرائیں۔
"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا؟"۔
مگر انھوں نے یہ سب کچھ تمھارے ہی ساتھ کیوں کیا؟ وہاں تو اور بھی لڑکے تھے۔ سنا تھا میں نے کہ عامر، شکیل، سجاد، رنجانے کون کون انھیں [illegible] اسٹیشن تک گئے تھے۔

بتا دوں سچ سچ کہ انھوں نے صرف میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں کیا؟
ہاں" باجی نے کچھ شرما کر کہا۔
اس لیے کہ۔ وہ جانتے تھے۔ ساری خدائی ایک طرف اور جورو کا بھائی ایک طرف" سنجر نے بڑے اطمینان سے کہا۔
دفعتہً باجی کی شرم خوفناک طیش میں بدل گئی۔ انھوں نے سنجر کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دھڑام دھڑام پیٹھ پر گھونسے رسید کرنے شروع کر دیے۔
"باجی بدمعاش کمینے ذلیل" وہ بسور رہی تھیں" اچھا اب مجھ سے بات کرنا۔ چمار، موچی، بھنگی کہیں کا۔ منہ پھٹ۔
"ارے ارے۔!" سنجر پکارتا رہ گیا مگر وہ کچن سے چل دیں۔!

چوتھے دن صبح سویرے سنجر کے ڈیڈی اپنے دورے پر سے اتفاقاً آ گئے۔ اور گھر بھر میں کھلبلی سی مچ گئی!۔
سب سے پہلے ممی نے چچی جان کا ہاتھ پکڑ کر گھگھیا کر اور بوکھلا کر کہا تھا۔
"آمنہ! چلی نہ جانا خدا کے لیے۔ اور اپنے میاں سے دلار بگھارنے بیٹھ جانا میں تو بول رہی ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ تمھیں اپنے ساتھ لے کر چل دیں۔!
ارے کاہے کے دلار بھابی۔ ہٹو" چچی جان شرمائیں" پتہ نہیں وہ کیوں آ گئے ہیں۔ کہہ تو گئے تھے کہ واپسی میں کم سے کم مہینہ بھر تو لگے گا۔
[illegible]

The Hareem Lucknow October 1981 (Phones : 44559 45334) Regd. No. LW/NP 32

PRICE Rs. 8/-

The Hareem Lucknow October 1981 (Phones : 44559 45834) Regd. No. [illegible]/NP 32

PRICE Rs. 8/-

نیاز فتح پوری

ایڈیٹر
نسیم انہونوی

گذشتہ ۵۱ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنیوالا ہندوستان میں اُردو کا سب سے پُرانا رسالہ ہے

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار

سیّد محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۹	فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۸۱ء	نمبر (۱۱)

ایڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم جانی بیگم ردولوی

فی شمارہ کی قیمت ۱.۳۰ روپیہ
چندہ سالانہ منی آرڈر سے ۲۰ روپیہ
چندہ سالانہ اعزازی ۲۵ روپیہ
چندہ سالانہ مخصوص ۲۳ روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپیے زائد
غیر ممالک سے ۵۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل۔ ایئر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر: فہیم انہونوی

آفس و ترسیل زر کا پتہ: نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ — فون آفس: ۲۲۵۵۹ رہائش: ۴۵۳۲۴

فہیم انہونوی نے باہتمام سید افضال حسین سرفراز قومی میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

کیا آپ اخبار پڑھتی ہیں۔ کیا آپ ریڈیو پر خبریں سنتی ہیں۔ کیا آپ ریل اور بس سے سفر کرتی ہیں۔ کیا آپ گھر سے نکل کر بازار جاتی ہیں۔ کیا آپ سینما دیکھتی ہیں۔

میرا خیال ہے ۹۹ فی صدی بہنوں کا جواب اثبات میں ہی ہوگا اس لئے کہ اس ترقی یافتہ دور میں سب ہی خبریں سنتے ہیں اور سب ہی ریل یا بس سے سفر کرتے ہیں۔ خرید فروخت سے مفر نہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ چند فی صدی بہنیں سینما نہ دیکھ پاتی ہوں۔

ان سوالات سے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اخبار پڑھتی ہیں اور ریڈیو پر خبریں سنتی ہیں تو یہ بھی پڑھتی اور سنتی ہوں گی کہ ہر روز حادثات کی خبریں ملتی ہیں۔ کہیں بس گر گئی یا لڑ گئی۔ کہیں ریل پٹڑی سے اتر گئی اور مسافر مرے یا زخمی ہوئے۔ شہروں میں موٹروں، ٹرکوں اور اسکوٹروں سے حادثے ہوتے رہتے ہیں اور اتنے زیادہ کہ اب تو گھر سے نکلتے وقت لوگ اس طرح رخصت ہو کر نکلتے ہیں جیسے کہ وہ کسی لمبے اور خطرناک سفر پر جا رہے ہوں۔ اور جب وہ واپس ہوتے ہیں تو وہ خود اور ان کے متعلقین اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ واپسی بخیریت ہو گئی۔

آپ ریل یا بس پر سفر کرنے جاتی ہیں، ذرا سوچئے کس طرح جگہ حاصل کرتی ہیں۔ آپ میں جو سن رسیدہ بہنیں ہوں گی، انھیں وہ زمانہ بھی یاد ہوگا جب بڑی آسانی کے ساتھ ریلوں میں جگہ مل جایا کرتی تھی، اس وقت لوگ جانتے ہی نہ تھے کہ رزرویشن کیا چیز ہے۔ اسٹیشن گئے۔ ٹکٹ لیا اور گاڑی پر بیٹھ گئے۔ بلکہ کچھ دیر پہلے جانے پر لیٹنے کی جگہ مل جاتی تھی۔ اور آج جبکہ ٹرینوں کی تعداد پہلے سے دس گنی ہے اور ٹرینوں میں لگنے والی بوگیوں کی تعداد بھی ۵-۶ کے بجائے ۱۰، ۲۰-۲۲ تک ہوتی ہے، پھر بھی صورت یہ ہے کہ مہینہ پندرہ دن پہلے رزرویشن کرائیے تو کہیں سفر ممکن ہوتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ کمپارٹمنٹ میں گھس آتے ہیں اور آپ کچھ نہیں کر پاتے۔ یہ بھی شاید آپ دیکھتی ہوں کہ لوگ جب ریل کے ڈبوں اور بسوں کے اندر جگہ نہیں پاتے تو ان کی چھتوں پر جان کی بازی لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ کتنا خطرناک سفر ہوتا ہے۔ تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کیوں ہے، صرف اس لئے کہ مسافر اب لاتعداد ہو گئے ہیں۔

سینما پہلے بھی دیکھا جاتا تھا۔ اس وقت لوگ اڈوانس بکنگ کا نام بھی نہ جانتے تھے۔ جب دل چاہا سینما پہنچے۔ ٹکٹ خریدا اور بیٹھ گئے، لیکن اب تو، تاوقتیکہ آپ دو ایک دن پہلے سے ٹکٹ نہ منگا لیں، ٹکٹ ملنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ سینما بینوں کی تعداد کا اب اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔ جن شہروں میں چار سینما گھر تھے وہاں اب چودہ ہیں پھر بھی آسانی ٹکٹ نہیں ملتے ہیں۔ کیوں صرف اس لئے کہ سینما دیکھنے والوں کی تعداد نسبتاً سینما گھروں سے بہت زیادہ ہے۔

آپ پہلے بھی بازار جاتی ہوں گی۔ یاد ہوگا کہ کس آسانی سے سواریاں گذر جاتی تھیں اور لوگ سڑکوں پر اطمینان کے ساتھ چلتے پھرتے تھے، لیکن اب سڑکوں پر چلنا، ہتھیلیوں پر جان لے کر ہوتا ہے۔ ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لئے نہ جانے کتنی کتنی دیر تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ انسانوں اور سواریوں کی وہ ریل پیل ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ حالانکہ ہر شہر کی سڑکیں کشادہ کر دی گئی ہیں۔ ٹرافک کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ پھر بھی کوئی اطمینان سے راستہ نہیں چل سکتا۔ اور اس ہنگامے میں کوئی پرس چھین کر بھاگ جاتا ہے، کوئی گلے کی زنجیر کھسوٹ کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ عام گذر گاہوں پر میلوں کی سی کیفیت ہونے لگی ہے۔ لیکن کیوں۔ شہر وہی ہیں اور سڑکیں بھی وہی۔ لیکن چلنے والوں کی تعداد کا اب ٹھکانا نہیں رہا۔

پہلے کے مقابلہ میں اب پچاس گنے اسکول اور کالج ہیں لیکن

بچوں کو ان میں داخل کرانے کا وقت آتا ہے تو الدین کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ ایسی دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے، جیسی کبھی ملازمت کے لئے بھی نہیں کرنا پڑتی تھی۔ بسی سفارش کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ رشوت دینا پڑتی ہے تاکہ بچے کا داخلہ کسی طرح ہو جائے۔ مانا کہ اب تعلیم حاصل کرنے کا پہلے سے زیادہ رواج ہے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ لاتعداد تعلیمی ادارے بھی کافی ثابت نہ ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر تعلیمی ادارے پچاس گنا زیادہ ہوتے ہیں، تو بچے سو گنا زیادہ ہیں۔

منصوبہ بندی کے ایک مخالف سے میری بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ پہلے بھی تو لوگوں کے دس دس بارہ بارہ بچے ہوتے تھے۔ لیکن کوئی واویلا نہ مچتا تھا۔ آخر اب کیا مصیبت آگئی ہے جو اس پر پابندی لگائی جا رہی ہے۔

میں نے کہا آپ کا فرمانا درست ہے، لیکن جس زمانہ کا آپ ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں شاید ہی دو منزلہ مکان کہیں کہیں نظر آتے ہوں عام طور سے گراؤنڈ فلور ہی کے مکان ہوتے تھے اور ایسے کہ ان میں بڑے بڑے صحن ہوتے تھے۔ طویل و عریض کمرے اور دالان ہوتے تھے اس کے باوجود ۲۵ فی صدی مکانوں پر T O L E T (کرایے کے لئے) کی تختیاں لٹکی رہتی تھیں۔ اور آج شاذ و نادر ہی صرف گراؤنڈ فلور والے مکان نظر آتے ہیں۔ دو منزلے، تین منزلے اور اس سے بھی زیادہ منزلوں کے مکانات بننے لگے ہیں۔ صحن تو اب نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ کمروں کا طول و عرض کوٹھریوں جیسا ہو گیا ہے۔ جس مکان میں ۴۔۶ لوگ رہتے تھے اب ۴۰۔۵۰ رہتے ہیں۔ اور کسی بھی مکان پر "کرایہ کے لئے" کی تختی نظر نہیں آتی۔ آج کی پود کو تو یہ بھی علم نہیں کہ کبھی مکانوں پر ایسی کوئی تختی لٹکی رہتی تھی، جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مکان خالی ہے۔ آج تو یہ عالم ہے کہ ایک کمرے کے مکان کے لئے لوگ سو سو، دو دو سو روپیہ کرایہ دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں لیکن مکان نہیں ملتے، جبکہ مکانوں کی تعداد پہلے سے پچاس گنا زیادہ ہو گئی ہے۔

ہر شہر کے گرد بڑی بڑی کالونیاں بن گئی ہیں جن میں لاکھوں انسان رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کتنے لوگوں کو سر چھپانے کی جگہیں نہیں ملتیں۔ آخر کیوں۔ صرف اس لئے کہ آبادی کی تعداد مکانات کے مقابلہ میں بھی کہیں زیادہ ہے۔ اور پھر میں نے انھیں شطرنج کے موجد کا قصہ سنایا کہ جب بادشاہ نے اس کھیل کو پسند کر کے اسے انعام و اکرام سے نوازنا چاہا تو اس نے کہا کہ شطرنج کے خانوں پر گیہوں اس طرح رکھو کر عنایت فرمادیں کہ پہلے خانے میں پانچ دانے، دوسرے میں دس، تیسرے میں بیس اور چوتھے میں چالیس۔ اسی طرح آخر تک تعداد دونی ہوتی رہے۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ انعام ہماری شایان شان مانگو۔ موجد نے کہا حضور میرے لئے اتنا ہی کافی ہوگا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی خواہش پوری کی جائے، لیکن جلد ہی بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ حضور، اتنا گیہوں آپ کی ساری مملکت میں بھی نہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں دو چند ہونے والی تعداد زیادہ محسوس نہیں ہوتی، لیکن جب نوبت کروڑوں اور اربوں تک پہنچتی ہے تو انسان حیران رہ جاتا ہے۔ بالکل یہی صورت اضافہ آبادی کی بھی ہے۔ سنہ ۲۱ء میں اس ہندوستان کی آبادی ۳۱ کروڑ تھی جس میں برما، سیلون، ایسٹ بنگال اور پاکستانی علاقے بھی شامل تھے۔ اور اب صرف ہندوستان کی آبادی غالباً اسی کروڑ سے کم نہ ہوگی اور ۲۰۔۲۵ برس میں یہ ایک ارب سے بھی تجاوز کر جائے گی۔

اس بڑھتی ہوئی آبادی کی رہائش، خوراک اور ضروریات زندگی کی فراہمی ابھی دشوار ہے، لیکن کچھ عرصہ بعد شاید ممکن ہی نہ رہے۔ اس لئے کہ مکانات تو ۳۰۔۴۰۔۵۰ منزلہ تعمیر کئے جا سکتے ہیں، لیکن کاشت میں آنے والی زمین کو اسی نسبت سے بڑھایا نہیں جا سکتا۔ نئی نئی کھادوں کی ایجاد اور ٹریکٹر وغیرہ کی مدد سے اتنا غلہ پیدا ممکن نہ ہوگا جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی ہے۔

اس وقت بھی دودھ کی قلت ہے، گھی اور مکھن کی کمی ہے۔ اس لئے کہ آبادی کے تناسب سے بھینسیں نہیں بڑھ سکتیں۔ ہوشربا گرانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پیداوار ضرورت کے مقابلہ میں کم ہو پاتی ہے۔ جو چیز بھی کم ہوگی اور خریدار زیادہ ہوں گے تو قیمت بڑھنے لگے گی۔ امول مکھن کا ۵۰۰ گرام کا پیکٹ معلوم ہوا ہے سولہ روپیہ میں بکنا چاہیے لیکن وہ بیس بائیس روپیہ کا بک رہا ہے اور لوگ لے رہے ہیں اس لئے کہ کمیاب ہے۔ یہی حال اکثر چیزوں کا ہے۔

ان تمام دشواریوں پر غور کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ آبادی پر کنٹرول نہ ہو سکا تو انسانی زندگی دشوار ہو جائے گی۔ حکومت منصوبہ بندی کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔ اس سے تعاون کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس سلسلہ میں ہم بھی حکومت کو ایک مشورہ

دیتے ہیں۔ اسے بھی کر کے دیکھئے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

آبادی کو کم کرنے کے لئے اربوں روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ حکومت اس طرح کا ایک اعلان کرے کہ جس شادی شدہ جوڑے کے پہلا بچہ ہوگا۔ اسے ایک مقررہ عمر تک سو روپیہ ماہوار بچے کی پرورش و پرخت اور تعلیم کے لئے دیا جاتا رہے گا۔ دوسرا بچہ ہونے پر پچاس روپیہ ماہوار کا اضافہ ہو جائے گا یعنی ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملے گا۔ لیکن اگر تیسرا بچہ ہو گیا تو یہ امدادی رقم بالکل بند کر دی جائے گی۔ اس طرح میرا خیال رکھیں کہ لوگ وظیفہ کے باعث خیال رکھیں گے کہ بچوں کی تعداد دو سے زیادہ نہ بڑھنے پائے۔

اس سلسلہ میں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ پیدائش اطفال کی رفتار غریب لوگوں ہی کے یہاں عموماً زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے وظیفہ کی رقم ان کے لئے قابل توجہ ہوگی۔ ایک فائدہ اس سے یہ بھی ہوگا کہ جن لوگوں کو یہ وظیفہ ملے گا وہ نسبتاً اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت بھی بہتر کر سکیں گے۔ جو آمدنی کی کمی کے باعث اکثر ناممکن ہوتی ہے۔

اُردو کی ترقی

اردو کے سلسلہ میں ترقی کا جو شور ہو رہا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اس سے ہی معلوم ہو سکتی ہے کہ ذوق ادب لکھنؤ کا ایک پوسٹ کارڈ مورخہ ۳۰ جولائی ۸۱ء، ۷ اکتوبر کو وصول ہوا ہے۔ صرف اس قصور پر کہ اس پر پتہ صرف اردو میں لکھا تھا۔ ایسے خطوط ڈیڈ لیٹر آفس بھیج دیئے جاتے ہیں اور وہاں سے ان کی تقسیم مہینوں بعد ہوتی ہے۔ لکھنؤ جیسے عظیم شہر کے جی پی او میں شاید ایک بھی اردو داں اس کام کے لئے مقرر نہیں کیا گیا ہے جو اردو پتوں کو ہندی یا انگریزی میں کر کے ان کی بر وقت تقسیم کرا سکے۔

حضرت یوسف علیہ السلام

تحریر: سیّد فضل الرحمان جعفری

حضرت یوسفؑ جب مصر کے دار الحکومت پہنچے تو ان کی عمر ۱۷ سال کی تھی دو تین سال عزیز مصر کے شاہی ایوان میں رہے۔ پھر ۹ سال تک جیل کی کوٹھری میں بند رہے۔ ۳۰ سال کی عمر کو پہنچے تو مصر کے تاجدار بنے اور فرمانروائی کی اور یہ سلسلۂ بادشاہت کے تنہا مالک و وارث تھے۔ کوئی ان کے حکم سے سرتابی نہ کرسکتا تھا ان کا نہ کوئی حریف تھا نہ کوئی رقیب یہ وہی یوسفؑ تھے جنھیں ان کے سوتیلے بھائیوں نے حسد و رقابت کی وجہ سے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔ جب انھیں کنوئیں میں پھینکا جارہا تھا تو سب بھائی یہ سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے اپنی راہ کا کانٹا ہٹا دیا ہے۔ ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس واقعہ سے یوسفؑ کو بام عروج پر پہنچنے کا موقع مل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو علیم و بصیر ہے اور جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے جو ظاہر و باطن ہر چیز کے اجالے کا پورا حال جانتا ہے۔ اور جسے پوری قدرت حاصل ہے۔ اس اللہ سے یوسفؑ کے بھائیوں کی رقیبانہ چالیں کیسے چھپ سکتی تھیں وہ یوسفؑ کو کنوئیں میں ڈال کر مطمئن تھے کہ وہ زندہ نہیں رہے اور ان کے لئے راستہ صاف ہوگیا اور باپ کی ساری شفقتیں صرف ان کے لئے رہ گئی ہیں۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے یوسفؑ کے لئے عروج و ترقی کی راہیں کشادہ کردی تھیں۔

یوسفؑ صالح اور سعید تھے۔ مکر و کید سے ان کا ذہن خالی تھا۔ حسد و رقابت سے ان کا دل پاک تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت و عظمت اور عروج و سربلندی کا بلند ترین مقام عطا کیا اور ایک وقت ایسا آیا جب کہ ان کے اپنے بھائی یوسفؑ کے دربار میں فخر و عزت کے ساتھ جانے اور اپنے بھائی سے محبت و مسرت کے ساتھ ملاقات کرنے کے بجائے گدا بن کر حاضر ہوئے۔ ان کی گردنیں شرم و ندامت سے جھکی ہوئی تھیں۔ اور اپنی حاسدانہ چالوں کے تصور سے وہ سخت پشیمان تھے۔ یہی حال عزیز مصر کی ملکہ زلیخا کا ہوا۔ اس نے یوسفؑ کو اپنے دام محبت میں گرفتار کرنا چاہا لیکن اس کی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ پھر اس نے انتقاماً یوسفؑ پر بہتان لگاکر جیل بھجوایا۔ زلیخا نے انتقامی کارروائی کرکے درحقیقت یوسفؑ کے لئے تخت شاہی کے حصول کا راستہ ہموار کیا۔ اور ایک وقت وہ آیا جب کہ دنیا بجائے اس کے کہ یوسفؑ کی محسنہ اور مربیہ کہتی۔ اور اسے پاکباز اور عفیفہ کا مقام دیتی۔ خود زلیخا نے اپنی تردامنی کا اعتراف بھری مجلس میں کیا، اور اسے خیانت کا برملا اظہار کرنا پڑا۔

تاریخ کے واقعات شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو عزت دینا چاہتا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت ذلت نہیں دے سکتی۔ بلکہ دنیا کے حریص و حاسد لوگ اپنی جس تدبیر کو کسی شخص کو ذلیل کرنے کا کارگر حربہ سمجھتے ہیں اور جس مکر و فریب کو اپنی فراست کا شاہکار قرار دیتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعے عزت و عظمت کا مقام عطا کرتا ہے، اس کے برعکس اللہ تعالیٰ جسے ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ اسے دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی عزت عطا نہیں کرسکتیں۔ بلکہ ایسی تمام تدبیریں الٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والے خود ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ دنیا کے ان واقعات سے یہ سبق ملتا ہے کہ قوت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور قانون الٰہی سے سرمو تجاوز کرنے سے سوا نقصان و خرابی کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ حضرت یوسفؑ کے قصے سے سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ اگر ایک مرد صالح ہو اور اسلامی سیرت و کردار سے آراستہ ہو تو وہ اپنی اخلاقی قوتوں اور روحانی برکتوں سے کسی ملک کا فاتح بھی بن سکتا ہے۔

حضرت یوسفؑ نے ۱۷ سال کی عمر میں جس عزم و ثبات اور ہمت و استقامت سے کام لیا وہ ان کی مومنانہ فراست کا آئینہ دار ہے۔ وہ کنوئیں میں پھینک دیئے گئے تھے۔ وہ ایک قافلے کے ہاتھ آئے تھے وہ مصر کے بازار میں بیچے گئے تھے۔ وہ عزیز مصر کے قصر شاہی میں لائے گئے تھے اور غلام بن کر رہے۔ ان پر اخلاقی جرم کا سخت الزام لگایا گیا تھا۔ اور بالآخر وہ جیل کی تاریک کوٹھری میں ڈال دیئے گئے تھے اور ان تمام مراحل زندگی میں ان کا کوئی رفیق کوئی ہمدرد اور کوئی

غمخوار نہ تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ ایک کمسن لڑکے میں یہ حق پسندی یہ ایمانی قوت، یہ صبر و استقامت یہ عزیمت و ہمت کیسے پیدا ہوئی۔ وہ کون سی طاقت تھی جو آج آزمائش و ابتلا کی اس جانکاہ حالت میں اس کی دستگیری کرتی رہی اور کون سی وہ چھپی ہوئی قوت تھی جوان کی روح کو تسکین پہنچاتی رہی وہ اکیلے تھے وہ بے سر و سامان تھے وہ ایسے ملک میں تھے جہاں ان کا کوئی جاننے والا نہ تھا۔ پھر غلام کی حیثیت تھی کسی کے دل میں ان کے لئے نرم گوشہ نہ تھا۔ ان کے لئے مصر کے لوگ نئے تھے مصر کا آسمان نیا تھا اور مصر میں انکی حیثیت غلام کی سی تھی۔

لیکن پھر بھی یوسفؑ کے چہرے پر معصومیت کا رنگ قائم رہا۔ وہ صبر و استقامت کا ایک پیکر عظیم بنے رہے وہ حق و صداقت کا عین مجسمہ معلوم ہوتے رہے اور بالآخر وہ تمام پرپیچ اور ہولناک وادیوں کو طے کرتے ہوئے دشت و بیابان کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اس منزل کو جا پہنچے جہاں اللہ تعالٰے نے ان کے سر پر سرداری اور جہانبانی کا تاج رکھا اور مصر کی بادشاہت عطا کی۔ اور یہ سب یوسفؑ کی ایمانی قوت، تفویض الی اللہ اور توکل علی اللہ کی کرشمہ سازی تھی۔ سچ ہے کہ

دہر میں مسلم فقط ہے آزمائش کے لئے
تمغۂ ایماں نہیں ملتا نمائش کے لئے

پیامِ فطرت

شاعر لکھنوی

کائناتِ ارض پر انساں نے جب رکھے قدم
چپّا چپّا تھا زمیں کا ایک گلزارِ ارم

وادیاں، میدان، سبزہ، گنگناتے آبشار
پھول پھل کی شکل میں نکھرا ہوا رنگِ بہار

سر اٹھاتی کونپلیں، خوشبو بھری تازہ ہوا
دور تک پھیلا ہوا جشنِ نمو کا سلسلا

رقص کرتے موسموں کے روپ، رنگوں کی دھنک
ابر کی مستی، ہوا کی چال، شاخوں کی لچک

کس قدر معصومیت کے حسن سے نکھرا ہے باغ
ننھی تتلی کے لئے روشن ہیں پھولوں کے چراغ

وادیوں کے دامنوں میں زندگی کی آب و تاب
جنگلوں کی خامشی میں ایک اندازِ خطاب

دیکھ کر سارے مناظر ذہن تابندہ ہوا
آدمی فطرت کے جلووں کا نمائندہ ہوا

روبرو تھے حسن صناعی کے اسباب و علل
ذہنِ انساں نے تراشی ان سے اک راہِ عمل

عمر تھی درکار ہستی کے قرینے کے لئے
تھی غذا سب سے ضروری چیز جینے کے لئے

دست و بازو میں سمٹ آیا جو محنت کا ہنر
آدمی نے رکھ دیا سینہ زمیں کا چیر کر

خامشی کے بطن سے رنگیں ترانے جاگ اٹھے
خاک سے غلّے کی فصلوں کے خزانے جاگ اٹھے

آدمی کی کامیابی میں تھا محنت کا ظہور
اور محنت ہی نے بخشا اس کو صحت کا شعور

روشنی، تازہ ہوا، سبزہ ہیں انساں کے طبیب
اس کو سب کچھ ہے میسّر جسکو صحت ہے نصیب

کوئی صورت ہی نہیں تفریح کی، آرام کی
پاس اگر صحت نہیں تو زندگی کس کام کی

لطف فطرت کے مظاہر سے اٹھانا ہے اگر
سب سے پہلے ہے ضروری اپنی صحت پر نظر

مانگیے اپنے خدا سے ہر گھڑی صحت کی خیر
کوئی محنت ہو نہیں سکتی ہے صحت کے بغیر

بشکریہ ہمدرد صحت کراچی

میاں بیوی کی لڑائی دودھ پر کی ملائی

عبدالمجیب سہالوی

پرانے زمانے میں بی بھٹیارن اور میاں بھٹیارے کے قصے بہت سنائے جاتے تھے۔ جس میں بی بھٹیارن کی چٹخارے دار زبان مزا دے جاتی تھی۔ آج ہم بی بھٹیارن اور میاں بھٹیارے کی لڑائی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں سنیئے اور لطف لیجئے۔

بی بھٹیارن نے رات کی بچی ہوئی تین چپاتیاں ناشتے میں میاں بھٹیارے اور ان کے تین بیٹوں کے سامنے رکھ دیں۔ تین چپاتی اور چار آدمی یعنی اونٹ کے منہ کا زیرہ دیکھ کر میاں بھٹیارے کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور منہ بنا کر بولے تم نے تو "تین چپاتی نو براتی کھاؤ چوم چوم" والی مثل سولہ آنے نہیں بلکہ سوا سولہ آنے پوری کر دی۔

اس پر بی بھٹیارن چراغ پا ہو کر بولیں اور تمہارا یہ حال ہے کہ "روٹی کھائے دس بارہ دودھ پیئے مٹکا سارا کام کرنے کو ننھا بچارا" جب دن بھر مٹر گشتی کرتے رہو گے، اٹھو کر تنکا نہ ہلاؤ گے تو میں کہاں سے کما کر لاؤں گی جو تم کو ناشتے میں گھی چپڑی روٹی کھلاؤں کام چور نوالہ حاضر والی مثل شاید تمہارے ہی لئے کہی گئی ہے تم چاہتے ہو کہ چار پائی پر لیٹے اینڈا کرو اور میں دن رات آنے والے مسافروں کی خدمت میں سر کھپا کر تمہارے لئے شوربہ روٹی کا انتظام کیا کروں تو کان کھول کر سن لو یہ نہ ہوگا کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں۔

میاں بھٹیارے کے صبر کا جام لبریز ہو گیا تو انھوں نے کہا بڑی کی اماں منہ نہ کھلواؤ۔ صاف صاف کہوں گا تو تلملاؤ گی۔ یہ کڑے، بازو بند، طوق اور بالیاں سب تمہاری ہی کمائی سے گڑھائی گئی ہیں۔

بی بھٹیارن نے کہا کہ چار دن چودھری صاحب کے یہاں نوکری کی تھی تو کون ہزار سیکڑا کما لیا تھا جس میں میرے یہ زیور گڑھا دیے۔ تمہاری نوکری تو چار دن کی کوتوالی پھر وہی کھرپا وہی جالی، جیسی تھی۔ اس میں کہاں سے ایسی برکت ہو جاتی کہ زیور گڑھائے جاتے پھر اگر یہ تمہاری ہی کمائی سے بنے ہیں تو ہر وقت ان کا طعنہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو اوچھے گھر کھانا۔ قدم قدم طعنہ، والی بات ہوئی۔

لوگ تو اپنی گھر والی کو سونے سے پیلا کر دیتے ہیں اور زبان پر نہیں لاتے۔ کہتے ہیں کہ نکی دیوے اور شرمائے، مگر تمہارے لئے تو یہ زیور اوچھے گھر کا تیتر باہر رکھوں یا بھیتر کی طرح ہیں۔ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے ہمارے ابا کو کہ اماں کو سر سے پاؤں تک زیور سے لاد دیا مگر کیا مجال جو کبھی زبان پر لائے ہوں۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ گگری دانہ سود اُتانا۔ چار زیوروں ہی پر کپتے نہیں تھکتے۔ سچ ہے کھانے کے گال اور نہانے کے بال نہیں چھپتے، جو کھاتے پیتے اور پہنتے اوڑھتے رہتے ہیں ان کی نظریں اونچی ہوتی ہیں وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نہیں اتراتے۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ تمہاری باتوں سے تو مجھے یہ زیور سانپ معلوم ہو رہا ہے۔

میاں بھٹیارے خفا ہو کر بولے، بڑی کھری ہو تو ہمارے زیور اُتار دو اور اپنے گھر کی راہ لو۔ یہ سننا تھا کہ بی بھٹیارن آگ بگولا ہو گئیں اور آپے سے باہر ہو کر بولیں، نکالی جائیں تمہاری اماں بہنا خبردار آئندہ مجھ سے اس طرح کا کلام نہ کرنا ورنہ جب تک ڈھائی چلو خون نہ پی لوں گی چین سے نہ بیٹھوں گی۔

یہ دھمکی سن کر تو میاں بھٹیارے کے حواس باختہ ہو گئے اور کان دبا کر بھاگنے ہی میں خیریت سمجھی۔ بی بھٹیارن نے جب میاں کو بھاگتے دیکھا تو ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور بولیں ذرا سی بات پر کہیں گھر چھوڑا جاتا ہے۔ جب گھر میں برتن ہوں گے تو لڑیں گے بھی۔ میاں بیوی کی لڑائی دودھ پر کی ملائی ہوتی ہے آؤ بیٹھو میں تمہارے لئے انڈا روٹی لاتی ہوں۔

انڈا روٹی کا نام سن کر میاں بیوی کی لڑائی دودھ پر کی ملائی معلوم ہونے لگی اور مسکراتے ہوئے لوٹ آئے۔

- کسی ماہ اگر ۲۵ تاریخ تک آپکو حریم نہ ملے تو فوراً دفتر کو اطلاع دیں۔
- تبدیلی پتہ کی اطلاع پہلی تاریخ تک آنا ضروری ہے۔

ایک آپ بیتی

افسانہ لکھ رہی ہوں

صوفیہ نقوی

میرے سرتاج!

تمہارے ساتھ میں نے اٹھارہ سال گزارے ہیں۔ اس مدّت میں تیرہ بچوں کو جنم دیا ہے۔ اسلم تو اب خدا کے فضل سے سولہ سال کا ہوگیا ہے۔ اس کی آواز میں بھاری پن آگیا ہے مسیں بھیگ رہی ہیں۔ خدا نے چاہا تو چار پانچ سال بعد اس کی شادی بھی ہو جائے گی۔ تمہاری یہ بات صحیح ہے کہ میری ساس کو خدا کا خوف ہے۔ وہ نماز پڑھتی ہیں، روزے رکھتی ہیں، دو حج بھی کر آئی ہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہتی کہ وہ مجھے بہو بنا کر ناخوش ہیں پچاس لڑکیوں کو دیکھنے کے بعد ہی پسند آئی تھی۔ ویسے میں جاہل بھی نہیں۔ قرآن پاک ختم کیا ہے۔ نماز پابندی سے پڑھتی ہوں۔ روزے رکھتی ہوں۔ اردو کی بھی بہت سی کتابیں پڑھ چکی ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ میں آج کی لڑکی نہیں، جو اپنے پیر پر کھڑی ہو سکتی ہے اور یہ بتا سکتی ہے کہ وہ بھی مرد سے کم نہیں، لیکن اس میں میرا قصور بھی کیا ہے تم اور میری ساس صاحبہ بھی تو اتنی ہی تعلیم چاہتی تھیں۔ میں نے کئی بار ان سے سنا ہے، تعلیم یافتہ لڑکیاں جو مدرسوں میں پڑھاتی ہیں ان کے چہرے سے نور غائب ہو جاتا ہے اور آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے (حالانکہ میری چچازاد بہن مدرسے میں پڑھاتی ہے۔ لیکن میں نے کبھی انھیں بے نور، بے حیا نہیں دیکھا۔ نور اور حیا تعلیم سے غائب نہیں ہوتے۔ یہ تو عورت کا ذاتی کردار ہے۔ اچھے اوصاف اور اچھے کردار سے عورتوں کے چہرے پر نور آتا ہے، لیکن ان پرانی عورتوں کو کون سمجھائے) یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ایسے گھر میں آئی جہاں عورتوں کی تعلیم کو برا سمجھا جاتا ہے اور جہاں اس کو سوا چولہا چکی کے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی میں نے بھی اٹھارہ سال تمہاری، ساس کی اور اپنے بچوں کی خدمت کی ہے۔ اس کے عوض مجھے کھانا کپڑا ملتا رہا ہے۔ میرا کوئی شوق ایسا ہے ہی نہیں جسے تمہیں پورا کرنے کی ضرورت پڑی ہو۔ دعوتوں پارٹیوں سے میں بے نیاز سینما تھیٹر کو میں خود فضول خرچی سمجھتی ہوں۔ ہاں ہر سال اتنا ضرور ہوتا ہے۔ تمہیں ایک لیڈی ڈاکٹر کو زچگی کی فیس دینا پڑتی ہے اس کے علاوہ کیا کبھی میں نے کچھ مانگا ہے؟

تم جانتے ہو میں اس سال پھر ایک بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ اب مجھ میں کیا رہ گیا ہے۔ کھوکھلا جسم اور اس ہڈیوں کے پنجر میں سے ایک جان پیدا ہونا خدا کی کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔ روزانہ صبح کی متلی، قے، جیسے کوئی میرے جسم سے میری روح نوچ رہا ہو، لیکن میری فکر کسی کو نہیں۔ تم اور میری خوش دامن پرانے جھگڑے لئے بیٹھی ہیں۔ کل ہی جہیز کی بات چھڑی۔ انھوں نے صاف کہہ دیا "اچھے اچھے پیام آئے تھے میں نے نہیں کئے۔ غریب کی بیٹی کی تاکہ وہ نبھا کر چلے، ورنہ لوگ تو جوڑے ہی کے دو ہزار دے رہے تھے اور ہزاروں کا جہیز تھا۔" ان کا یہ جملہ زہر میں بجھا تیر تھا جو میرے کلیجے میں پیوست ہوگیا۔ وہ دنیا سے یہی کہتی ہیں۔ ہم غریب ہیں تو کیا، مگر خود ان کا دل جانتا ہوگا۔ میرے والدین نے اپنے آپ مصیبتیں اٹھا کر جوڑے کی ڈیڑھ ہزار رقم اور ہاتھ میں تین تولے کے کڑے، گلے میں نکلس دوہرہ دیا تھا۔ ایک جڑاؤ اور ایک سادہ پاؤں میں سونے کے چھلے، برتن، اگالدان، جوڑے کپڑے کے سہری، سنگاردان، پھر بچے کے پہلے چھلے پر جھولا، بچے کو کپڑے، مجھے جوڑا، تمہیں سلامی۔ اب بتاؤ، اس سے زیادہ اور کیا دینا تھا اور پھر اٹھارہ سال کے بعد اب جہیز کا طعنہ! تم ہی ٹھنڈے دل سے سوچو میرے دل کی کتنی دھجیاں اڑائی ہیں انھوں نے۔ پھر بھی وہ کیوں کہ تمہاری ماں ہیں، میں سب کچھ برداشت کرتی چلی آئی ہوں۔ مگر جب وہ مجھے دیکھ کر کہتی ہیں "میرے دل میں پھوڑا ہوگیا میرا کلیجہ پھوٹ گیا" تو بس مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھ پر بجلی گر گئی ہو۔ میری وجہ سے ان کے دل میں کیوں پھوڑا ہوگیا کلیجہ کیوں پھوٹ جاتا ہے۔ کاش یہ سوال ان سے کوئی پوچھنے والا ہوتا یا میری اتنی ہمت ہوتی۔ مانا وہ ضعیف ہیں بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں۔ لیکن یہ کہہ کر میں ہی تو اپنے دل کو تسلی دے سکتی ہوں۔ تم کیوں سمجھتے نہیں۔ تم کیوں اماں جان کا یقین کر لیتے ہو کہ میں ان کے ساتھ برا سلوک کرتی ہوں۔ میری ماں تو میرے بچپن ہی میں مر گئی تھیں اب میں انھیں اپنی ماں سمجھتی ہوں۔ لیکن پھر میری تو زندگی بھی کچھ عجیب ہوگئی ہے تم بھی کھنچے کھنچے سے، اماں جان

سبھی خفا

اگر کبھی کبھار تم مجھ سے خوش رہتے بھی ہو تو اماں جان کے دل میں پھوڑا ایک جاتا ہے۔ انھیں اپنا وطن، اپنا شوہر مرحوم، جس کے ساتھ انھوں نے چار سال بھی ہنسی خوشی نہیں گذارے، شدت سے یاد آجاتے ہیں۔ حالانکہ تین بچے ہونے کے بعد ذرا سی رنجش ہوئی اور اماں جان نے اپنی ماں کا گھر سنبھالا۔ سسر صاحب تو مرد ٹھہرے انھوں نے دوسری شادی رچالی۔ یہ اماں جان ہی کی کیا ہر عورت کی بدقسمتی ہے۔ مجھے اس بارے میں اماں جان سے پوری پوری ہمدردی ہے اور سسر صاحب کے اس رویّہ سے شکایت۔ شاید وہ زندہ ہوتے تو اماں جان کی زندگی سدھر جاتی، لیکن شادی کے چند سال بعد وہ گذر ہی گئے۔ اماں جان کے دوسرے لڑکے اور ایک لڑکی کا بھی انتقال ہوگیا۔ اماں جان نے اپنی جوانی کی پروا نہ کی اور تمہارے سہارے جیتی چلی گئیں۔ میں ان کی ہمت اور استقامت کی داد دوں گی کیوں کہ بائیس سال کی عمر میں بیوہ ہونا اور اس کے بعد کی زندگی ایک بیٹے کے لئے اکیلے گذارنا واقعی بہت ہی مشکل ہے۔ کتنی مصیبتوں سے انھوں نے تمہیں پالا ہوگا اور کتنی امیدیں تم سے وابستہ ہوں گی۔ پتہ نہیں کس طرح انھوں نے تم کو اتنی تعلیم دلائی کہ تم جاہل نہ کہلا سکو، کسی کام کے بن سکو۔ اماں جان کے چونکہ تم اکلوتے فرزند ہو، اس لئے وہ چاہتی ہیں کہ تم میرے شوہر نہیں، میرے آقا، میرے حاکم بنو، جابر اور ظالم حاکم بنو، جس کے ہاتھ میں ہمیشہ کوڑا ہو۔ جو ذرا سی نافرمانی پر جسم کی کھال کھینچ لے۔

کئی دن سے دیکھ رہی ہوں تم میں پہلی سی بات نہیں رہی ہے۔ نہ اب وہ صحت رہی ہے اور نہ ہنستا ہوا چہرہ۔ ادھر اماں جان کو کچھ کہتے ہو تو وہ خفا ہو جاتی ہیں، مجھے کچھ کہتے ہو تو میں روٹھ جاتی ہوں۔ تم کرو گے بھی کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے بھونچال آگیا ہے۔ بچوں کو مار دھاڑ، نوکروں پر چیخ پکار اور بچا کھچا غصہ مجھ پر اتر جاتا ہے۔ بلا وجہ، بلا سبب آخر کب تک جھڑکیاں سنتی رہوں۔ تمہارا خیال ہے یہ تم ماں کو خوش کرنے کے لئے کر رہے ہو، لیکن تمہارے اس رویّہ سے خدا تو خوش نہیں ہوگا۔ کسی بے کس پر بلا وجہ کی خفگی کہاں تک روا ہے۔

میرا حال تو قیدیوں کا سا ہے۔ پڑوس میں بھی چلی گئی تو گھر میں آفت آجاتی ہے اتنے تنگ دل تو تم کبھی بھی نہ تھے۔ اب تو تم بھی مجھ سے از حد ناراض ہی نہیں رہتے مجھ سے نفرت کرنے لگے ہو میری زندگی کے ساتھی! آخر مجھ سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوئی ہے جس کی سزا تم لوگ مجھے دے رہے ہو۔ اماں کا جو رویہ ہے۔ وہ بجا ہے۔ کیوں کہ گھر گھر ساس کا نام ہے لیکن اگر شوہر اپنی بیوی کو یہ کہہ کر سمجھا دے کہ میری ماں ضعیف ہے۔ اس کا دل دکھا ہوا ہے۔ تمہاری ماں ایسا کرتی تو تمہیں سہنا ہی پڑتا۔ تم اس کا اثر مت لیا کرو ماں کا احترام کرو کیونکہ وہ بزرگ ہستی ہیں۔ سوچو تو میرا دل کتنا بڑا ہو جاتا اور میں اماں جان کی ہر جھڑکی کو اپنے پیار میں لپیٹ لیتی۔ لیکن جب تم دونوں مجھے نشانۂ ملامت بناتے ہو تو مجھ میں میری کمزوریاں ابھر آتی ہیں۔ میرے سینے میں بھی آگ سلگ اٹھتی ہے اور مجھے ایک آواز غیب سے آتی ہے "بھاگ جا — اپنے عزیزوں کے پاس چلی جا۔ جہاں تیری قدر نہیں وہاں تیرا گزر نہیں ہونا چاہیئے" کتنا ناقابلِ تلافی نقصان ان معصوم بچوں کا ہوگا۔ جو میری محبت اور میری تربیت کے بھوکے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ اماں جان کی بعض ملنے والیاں مجھے پھوہڑ کہتی ہیں میں نے ہزار بار سنا ہے۔ انھوں نے میری چال ڈھال، رہن سہن سبھی باتوں پر زبردستی کی تنقید کی ہے لیکن وہ سب کچھ اسی لئے کرتی ہیں تاکہ اپنی پارسائی ظاہر کریں اور میرے پست کردار کو اجاگر کریں۔ مگر انھیں میری برائیاں جھانک کر کیا مل جاتا ہے۔ شاید انھیں اماں جان کی تھوڑی سی محبت اور توجہ مل جاتی ہو، بات کرنے کا کوئی موضوع ہاتھ لگ جاتا ہو۔ لوگوں کی ذہنیت کبھی کسی کی اچھائی کی طرف جاتی ہی کب ہے کہتے ہیں کسی لکچرر نے بلیک بورڈ پر ایک سفید کاغذ چپکا دیا اور اس میں ذرا سا کالا نقطہ لگا دیا اور پوچھا کہ "تم کیا دیکھ رہے ہو"؟ لوگوں نے جواب دیا "ایک کالا نقطہ" انھوں نے پوچھا "کیا تمہیں سفید کاغذ نظر نہیں آیا؟"

تمہاری صورت پر کتنا وقار تھا۔ لیکن اس غصّہ نے تمہیں کتنا بدل دیا ہے۔ تم کیسے تھے اور کیسے ہو گئے ہو۔ اماں بی کا غصّہ جب سے تیز ہو گیا ہے انھیں بھی بلڈ پریشر کی شکایت ہو گئی ہے۔ ایک گھر میں ہم تین مریض ہو گئے ہیں۔ ہم سب کا علاج ایک ہی ہے لیکن سمجھ میں کسی کی نہیں آتا۔ خدا نے جب جی بھر کر اولادیں دی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی خوشیاں کبھی نہیں دیکھنے کو ملیں۔ مگر مجھے تعجب یہ ہوتا ہے کہ میرے پیٹ کی اولاد بھی میری نہیں ہو سکی۔ ہمارے بچے دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ اسلم، ساجد، ماجد میری پارٹی

میں ہیں اور باقی بچے تمہاری اور اماں جان کی طرف۔ اس تقسیم نے بچوں کی کچی ذہنیتوں کو بہت بڑا دھکا پہنچایا ہے۔ دیکھئے نا پرسوں ہی آپ نے بچوں کے سامنے مجھے ڈانٹ دیا۔ بدسلیقہ بے ڈھنگی کہہ دیا۔ اولاد کے سامنے ذلیل کرنے سے وہ بھی نڈر ہو گئے ہیں۔ میں انھیں ڈانٹتی ہوں تو وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ ذرا سی بات ہوئی اور اماں جان نے انھیں پھسلا کر ہاتھ میں ایک آنہ رکھا اور انھوں نے غلط سلط آپ سے لگائی شروع کر دیں آپ ضرور کہیں گے کہ تم ماں ہو۔ ماں کی تربیت ہی بچے کو ملنی چاہیئے مگر میں تربیت دوں بھی تو کس طرح میری ہر بات انھیں زہر معلوم ہوتی ہے اور اب تو میں ان کی ماں نہیں، کھلونا ہوں۔ جب دل چاہتا ہے کھیل لیتے ہیں۔ اور جب جی چاہتا ہے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ انھوں نے بھانپ لیا ہے کہ نہ ابا امی کی عزت کرتے ہیں نہ دادی کے نزدیک امی کی عزت ہے۔ پھر ہمیں کیا غرض پڑی ہے کہ امی کا کہنا مانیں یا انھیں وہ عزت دیں جو ہر اولاد کو اپنی ماں کو دینی چاہیئے۔ میں چاہتی ہوں میری اولاد کی تربیت بہت اچھی طرح ہوئی ہو۔ انھیں اچھا ماحول ملے۔ اچھا مدرسہ ملے۔ گھریلو جھگڑے میاں بیوی میں ناچاقی ان تمام باتوں کا اثر ان غریبوں کے ذہن پر کتنا چھایا ہوا ہے۔ اسکول برابر جاتے نہیں۔ اڑوس پڑوس سے لڑائی جھگڑے مول لاتے ہیں۔ گھر میں ماں کی چغلی دادی کے سامنے کرتے ہیں۔ ایسی اولادیں جن کو بچپن ہی سے مجھ سے بدظن کر دیا جا رہا ہے، آگے چل کر مجھے کیا سہارا دیں گی۔

تمہیں یاد ہوگا چھ مہینے پہلے تم نے مجھے بڑے پیار سے ساڑھی خرید کر لا دی تھی۔ یاد ہے اس ساڑھی نے کتنا غضب ڈھایا تھا۔ اماں جان بری طرح روٹھ گئی تھیں، میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرا پہننا اوڑھنا انھیں کیوں کھٹکتا ہے اور ایک دن میں جب سخت بیمار تھی تم نے دوا لا دی تھی۔ تب وہ کتنی گرم ہوئی تھیں ایک دن انھوں نے کہہ بھی دیا تھا "موئی شادی کیا ہوئی نحوست آگئی۔ اب بتاؤ کیا میں بیماریوں کو دعوت دے کر بلاتی ہوں؟ اور جب بھی ساڑھی پہنتی ہوں ان کا جملہ کھٹکتا ہے "بہو کے بدن پر تو کانٹے ہیں ہیں۔ کپڑا ادھر پہنا اُدھر پھٹ گیا" سر تاج۔ سچ بتا نا کہ ان اٹھارہ سالوں میں تم نے کتنے کپڑے بنائے اور میں نے کتنے پھاڑ ڈالے سال میں حساب سے کپڑے بنتے ہیں۔ دو ساڑھیاں دو بلاؤز دو پیٹی کوٹ۔ اب کپڑے کم ہوں گے تو ضرور ہے کہ زیادہ دن نہ چلیں گے پھر میرے کپڑے تو دھوبی کو بھی نہیں جاتے۔

اماں جان کا میں بے حد احترام کرتی ہوں۔ انھوں نے تمہیں جنم دیا ہے، لیکن ان باتوں کو جنھیں ابھی تک چھپاتی چلی آئی ہوں آج صاف صاف تمہارے سامنے رکھنا بھی تو ہے۔

میری ایک سہیلی نے مجھے مشورہ دیا کہ تم دو چار لڑکیوں کو اردو اور قرآن شریف پڑھا دیا کرو دو چار پیسے ہاتھ میں رہیں گے۔ تم اپنی جان اور اپنے لئے خرچ کر سکو گی۔ مشورہ مجھے مفید معلوم ہوا۔ معمولی اردو اور قرآن تو میں اچھی طرح پڑھا سکتی ہوں۔ لیکن یہ ارمان بھی جی کا جی ہی میں رہ گیا۔ کچھ تو لڑکیاں ہی بہت کم آئیں۔ وہ بھی بے چاری دو دو تین تین روپے مہینہ دینے والی۔ پھر خوش دامن صاحبہ کے طعنے کہ میں نے یہ بھیڑ اس لئے جمع کر رکھی ہے کہ خوب شور شرابہ ہو، خوب ہڑدنگے لگیں اور ان کا مرض بڑھ جائے۔

کل پروفیسر وحیدہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ پانچ سو روپے کماتی ہے۔ شوہر الگ کماتے ہیں لیکن اولاد نہیں ہے بے چاری نے ہر خوشی خرید لی ہے، لیکن بچوں کے لئے ترستی ہے لیکن اس پر بھی ساس کماؤ بہو پر واری جاتی ہیں۔ انھیں بس ایک آرزو ہے، ان کے گھر ایک جیتا جاگتا کھلونا آجائے۔ گھر کی تمام ذمہ داری ساس کے ہاتھ ہے۔ بہو کو تو وہ رانی سمجھتی ہیں۔ کیا مجال جو بہو کو ایسی ویسی بات کہہ دیں اور بہو کو کب فرصت ہے کہ تلخ و ترش ساس کے منہ سے سنیں انھیں تو کالج کا کام سنبھالنا ہے۔ فرصت کے وقت میں بچوں کی کاپیاں درست کرتی ہیں۔ نہ گھر سے غرض نہ گھر کے کاروبار سے۔ میاں بیوی ٹھاٹھ سے شام کو گھومنے چلے جاتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ کاش میں بھی وحیدہ کی طرح پڑھی لکھی ہوتی تو میری ساس بھی میری اتنی ہی قدر کرتی، دل میں چاہے کتنی ہی گالیاں دیتی، لیکن منہ پر بلائیں ہی لیتی۔ میں اٹھارہ سال سے اپنی ہڈیوں کا سرمہ بنا رہی ہوں۔ پر ساس نے ہمیشہ مجھے کاہل ہی کہا ہے۔ اتنے سارے بچوں کو جنم دیا ہے پھر بھی ہمیشہ ساس نے مجھے جنم جلی کہا ہے۔ میرا اتنا ہی قصور ہے تمہارے پیسے پر پلتی ہوں۔ خود سے نہیں کما سکتی۔ اب مجھے معلوم نہیں، وحیدہ کی قدر اس کی قابلیت کی وجہ سے ہے، اس کے پیسے کی وجہ ہے۔ اس کے بانجھ ہونے کا طعنہ بھی تو کبھی ساس نے نہیں دیا۔ میں سوچتی ہوں اگر میں کہیں بانجھ ہوتی تو میرے سر پر ساس سوت لے آتیں اور میری چھاتی پر مونگ دلے جاتے میں تو خدا کا شکر کرتی ہوں اس نے مجھے پیٹ بھر اولاد دی ہے۔

میں پھوہڑ ہوں، زباں دراز ہوں، جاہل اور نکمی ہوں۔

میرے جانے سے ساری پریشانیاں دور ہونے کی امید تمہیں بھی ہے اور ساس صاحبہ کو بھی، کیونکہ پریشان میری ہی وجہ سے ہوتی ہیں میرے نہ ہونے سے بچوں کی تربیت ٹھیک ہوگی کیونکہ میں ہی ان کو بگاڑتی ہوں اساس محترمہ کی صحت اچھی ہو جائے گی، کیونکہ ان کی بیماری کا سبب میں ہی ہوں، تمہارا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا، کیونکہ غصہ مجھے دیکھ کر ہی آتا ہے۔

تم سب کو خوش دیکھنے کی بڑی آرزو ہے۔

اس لئے خدا حافظ۔ آج میں اس گھر سے ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔

تمہاری فریدہ

(بشکریہ حنا۔ لاہور)

نماز کی اہمیت

مرسلہ عرفانہ منظور (آمبور)

اسلام کے پانچ فرائض میں نماز دوسرے مقام پر ہے نماز ہر مومن مرد اور عورت پر فرض ہے۔ نماز جنت کی کنجی ہے حضورؐ نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کہا ہے نماز بے حیائی کو دور کر دیتی ہے ارشاد باری ہے۔

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَر" (بے شک نماز بے حیائی اور بدی کو دور کر دیتی ہے۔)

ایک شخص کے گھر کے سامنے ایک چشمہ ہو اور وہ اس میں پانچ وقت نہاتا ہو تو اس کے جسم میں میل باقی نہ رہے گا بالکل اسی طرح پانچ وقت نماز پڑھنے سے وہ گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ جب تک انسان کے ہوش و حواس درست ہوں وہ نماز نہیں چھوڑ سکتا۔ بے نمازی کی جگہ دوزخ میں ہے۔ قرآن میں ہے کہ جو نماز میں غفلت برتتے ہیں۔ ان پر پھٹکار ہے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے۔ جس نے نماز پڑھی اس نے دین قائم کیا جس نے نماز چھوڑ دی اس نے دین کو ڈھا دیا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ میدان کربلا میں تھے۔ دوستوں اور عزیزوں کی لاشیں سامنے تھیں پھر بھی آپ نے اشقیا سے فرمایا کہ انھیں اتنی مہلت دیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں اور پھر سجدہ کی حالت میں شہید ہو گئے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ آپ نے ایسے وقت بھی نماز سے غفلت نہ برتی۔

نماز سے دلی سکون ملتا ہے۔ تمام دنیاوی پریشانیوں کا واحد حل نماز ہی ہے مسلمانوں کو حکم ہے کہ خود نماز پڑھیں اور اپنے بچوں کو نماز کی ہدایت دیں۔ مرد کو گھروں میں نماز پڑھنے سے کم ثواب ہے باجماعت پڑھنے سے زیادہ۔ اسی طرح عورتوں کو گھروں میں نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب ملتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عورتیں مردوں سے علیحدہ نماز پڑھیں۔ بچوں کو سات سال کی عمر سے نماز کی عادت ڈالنا چاہیئے دس سال کی عمر سے مار کر پڑھانا چاہیئے۔

جو مسلمان ضعیف ہیں انھیں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ بیمار یا مجبوری کی حالت میں لیٹ کر یا اشارے سے پڑھنا بھی جائز ہے عام مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔

نماز میں سب مسلمان برابر ہیں۔ نہ کوئی چھوٹا ہے اور نہ بڑا نہ غریب اور نہ امیر۔ اقبال نے کہا ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

بارگاہ ایزدی میں اپنے رب العزت سے دعا ہے کہ اللہ پاک تمام مسلمانوں کو پنجگانہ نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

واٰخر دعوٰنا ان الحمد للّٰہ رب العالمین ہ

ماں کے لیے بچوں کی پرورش عبادت ہے

(یہ خیالات کسی گھریلو خاتون کے نہیں۔ پاکستانی فلم اسٹار دیبا کے ہیں)

دیبا نے اپنے بچوں کے کپڑوں کا ذکر بڑی محبت سے کیا۔ واقعی جہاں ہر ماں یہ چاہتی ہے کہ اس کے بچے اچھے سے اچھے درزی کے سلے ہوئے کپڑے پہنیں وہاں ماں کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ کے سلے ہوئے کپڑے اپنے بچوں کو پہنائے اور جب ماں خود سلائی کڑھائی میں ماہر ہو تو اس خواہش کی تکمیل کیسے ادھوری رہ سکتی ہے۔

دیبا نے کہا نعیم رضوی مجھ سے ہر بات پر لڑتے ہیں لیکن ہماری یہ لڑائی بڑی پر لطف ہوتی ہے۔ کیونکہ نعیم کا کہنا ہے کہ لڑائی سے محبت بڑھتی ہے۔ ہماری لڑائی ایسی نہیں ہوتی کہ اس سے دل دکھے سر پھٹول ہو، یہ تو محبت کو مزید مستحکم بنانے کی جانب ایک قدم ہوتا ہے۔

دیبا نے کہا میرا زیادہ تر وقت اپنے بچوں کی دیکھ بھال پر صرف ہوتا ہے۔ دیبا نے مسکراتے ہوئے کہا جب تک اپنا گھر نہ ہو، پیارے سے بچے نہ ہوں تب تک شاید زندگی کا کوئی خوبصورت خواب جنم نہیں لیتا۔ گھر ادھورا اور ویران رہتا ہے زندگی بے مقصد نظر آتی ہے۔ اور بعض اوقات تو انسان کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

دیبا نے کہا بیوی اور ماں دونوں رشتے انمول اور مقدس ہیں۔ بیوی کی حیثیت سے شوہر اس کا مجازی خدا ہوتا ہے۔ ماں کی حیثیت سے عورت اپنا عظیم کردار ادا کرتی ہے۔ بیوی اور ماں میں سے کون سی حیثیت عورت کے لئے عظمت کی نشانی ہے تو میں یہی کہوں گی دونوں ہی رشتے عظیم ہیں۔ بیوی بن کر عورت ایک نئی دنیا بساتی ہے ایک نئی زندگی کو جنم دیتی ہے اور ماں بن کر نسل آدم کو پروان چڑھاتی ہے۔ دیبا نے کہا جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، میں عورتوں کا مذاق اڑاتی تھی کہ وہ بیک وقت کئی کئی بچوں کی پرورش کس طرح کرتی ہیں۔ انھیں ہر بچے پر یکساں پیار کس طرح آتا ہے وہ صبح سے شام تک گھریلو مصروفیات میں کس طرح کھوئی رہتی ہیں۔ حالانکہ ان کے علاوہ زندگی میں اور بھی رنگینیاں ہیں اور بھی دلچسپیاں ہیں۔

لیکن شادی کے بعد یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ عورت کیلئے بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال ایک عبادت ہے۔ اس سے عورت کو ایک گونا سکون ملتا ہے۔ عورت کے خواہ کتنے ہی بچے ہوں اس کے لئے سب یکساں ہوتے ہیں۔ گھر عورت کی کمزوری ہے وہ دن رات اس کی آرائش و زیبائش اور صفائی میں معروف رہتی ہے

دیبا نے کہا عورت کو دیکھنا ہو تو اس کے گھر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی سلیقہ شعار ہے گھر سے عورت کی شخصیت آئینہ کی طرح سامنے آجاتی ہے۔

دیبا نے کہا مجھے وہ عورتیں قطعاً پسند نہیں جو دن بھر خود تو بنی سنوری رہتی ہیں۔ ٹیلیفون پر بات کرنے سے پہلے بھی لپ اسٹک لگانا ضروری سمجھتی ہیں لیکن ان کے گھر دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ سبزی منڈی میں جانکلی ہوں۔ گھر کیا اچھا خاصا کباڑخانہ نظر آتا ہے۔ صفائی جزو ایمان ہے جو عورت گھر کی صفائی کا خیال نہیں کرتی اس گھر میں رحمت کے فرشتے کبھی نہیں آتے اور جس گھر میں رحمت کے فرشتے نہ آتے ہوں وہاں دکھ درد بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ میں تو اس عورت کو عورت نہیں سمجھتی جس کو اپنے گھر اپنی اولاد سے پیار نہ ہو۔ گھر تو جنت کا ایک حصہ ہوتا ہے اگر ہم چاہیں تو اسے سچ مچ کی جنت بنا دیں یا دوزخ میں تبدیل کردیں۔ شوہر عورت سے اور کچھ نہیں چاہتا، وہ چاہتا ہے کہ جب وہ دن بھر کا تھکا ہارا گھر میں داخل ہو تو اسے بچوں کے صاف ستھرے چہرے نظر آئیں۔ گھر کے ہر گوشے سے اس بات کا احساس

ہو کہ اس گھر میں ایک عورت رہتی ہے۔ جس مرد کو یہ گھریلو آسائشیں میسر نہیں آتیں۔ ان کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ بیشمار ازدواجی زندگیوں میں تلخی محض اس لئے نظر آتی ہے کہ عورت کو اپنے گھر سے محبت نہیں ہوتی۔ عورت گھر کو گھر نہیں ایک سرائے سمجھتی ہے۔

دیبا نے کہا ہو سکتا ہے میری باتیں میری بہنوں کو بری لگیں۔ لیکن اس پر عمل کر کے چند بہنوں کی زندگیاں بھی سدھر جاتی ہیں تو میں سمجھوں گی کہ میں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

دیبا نے کہا میں نے چند ماہ سعودی عرب میں گزارے ہیں۔ خانۂ کعبہ اور روضۂ اقدس کی زیارت کا شرف حاصل کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ اس پاک سرزمین سے دنیا بھر کے مسلمان محبت کرتے ہیں۔ اس کی فضاؤں میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی خواہش کرتے ہیں جن کی یہ آرزو پوری ہو جاتی ہے دنیا انھیں خوش نصیب سمجھتی ہے مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں نے سعودی عرب کی فضاؤں میں کئی مہینے گذارے ہیں۔ انہی روح پرور فضاؤں میں ایک بچے کو جنم دیا ہے اور پھر انہی فضاؤں میں لوٹ جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔

دیبا نے کہا خانہ کعبہ اور روضہ اقدس پر حاضری دیتے ہوئے مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ان لمحات بے اختیار میرے ہونٹ پر ایک ہی دعا ہوتی تھی کہ اے اللہ میرے سہاگ کو قائم رکھ۔ میرے بچوں کی دنیا و دین کو نواز تاکہ یہ بڑے ہو کر اپنے ملک و ملت کی خدمت کر سکیں۔ دیبا نے آخر میں کہا عورت تو ہر موقعہ پر یہی دعا کرتی ہے کیونکہ اس کی تمناؤں خواہشوں کا واحد مرکز اس کا شوہر اور اس کی اولاد ہوتی ہے۔ عورت کا وجود مرد کے بغیر نامکمل ہے اور ازدواجی زندگی کی خوشیاں بچوں کے دم سے ہیں کیونکہ ان مسکراتی کلیوں کی مہک سے زندگی مسکراتی ہے۔

صالحہ عابد حسین صاحبہ سے ایک انٹرویو

از نجم اعزاز

س۔ پیدائش۔ نام بچپن اور تعلیم کے متعلق کچھ بتائیے۔

ج۔ پیدائش پانی پت کی ہے میرا خاندان پانی پت کے مشہور خاندانوں میں سے تھا۔ والد صاحب نے میرا نام مصداق فاطمہ رکھا اور والدہ صاحبہ نے صالحہ خاتون ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی اس زمانہ میں میری ایک ٹیچر جو انگریز تھیں مجھے مس داغ کہہ کر پکارتی تھیں جس پر لڑکیاں مجھ سے پوچھتی رہتی تھیں کہ آیا میرے والد صاحب کا نام داغ ہے بہرحال میں نے مصداق فاطمہ کے بجائے صالحہ خاتون کے نام سے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ حالانکہ مجھے اپنا نام مصداق فاطمہ بہت پسند تھا جیساکہ اس زمانہ میں ہوتا آیا ہے میں بھی کہانیاں لکھ لکھ کر چھپواتی رہتی تھی۔ ۱۹۳۲ء میں آٹھویں کا امتحان دیا پھر ادیب فاضل کے بعد انگریزی کا امتحان پاس کر کے میٹرک کیا۔ شروع سے ہی مطالعہ کا شوق تھا سو آج میں جو کچھ ہوں اپنے وسیع مطالعہ کی وجہ سے ہوں۔

س۔ ادبی زندگی کی شروعات کب اور کیسے ہوئی؟

ج۔ آٹھ نو سال کی عمر سے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ادبی زندگی کی شروعات کیسے ہوئی یہ کہنا ذرا مشکل ہے کیونکہ اُسوقت ہمارے یہاں کا ماحول ہی ادبی تھا تقریباً سارا خاندان ہی جیّد عالم و فاضل تھا سو میری طبیعت بھی اس طرف راغب ہوئی۔

س۔ کس ادیب سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں؟

ج۔ میرے پسندیدہ ہندوستانی ادیب ہمیشہ ہی سے منشی پریم چند ہیں ان سے متاثر ہونے کی وجہ تو میں یہی سمجھتی ہوں کہ انھوں نے گاؤں کی زندگی اور ہندوستانی معاشرہ کی عکاسی ایسے فطری ڈھنگ سے کی ہے کہ اس کا ایک ایک پہلو اجاگر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ٹالسٹائی، جین آسٹن اور ٹیگور بھی مجھے بہت پسند ہیں۔

س۔ پہلی ادبی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی؟

ج۔ جہاں تک لکھنے کا سوال ہے میں نے پہلی کہانی ۱۹۲۶ء میں لکھی اور پہلا ناول "حسن اتفاق" ۱۹۲۹ء میں لکھا لیکن حسن اتفاق کہ یہ کبھی شائع نہ ہو سکا کیونکہ اس زمانہ میں ایسی ہمت کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ویسے میرا پہلا ناول "عذرا" ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اس کے بعد ہی مجھے ناول لکھنے کا خیال آیا۔

س۔ کیا آپ نے بچوں کے لئے بھی کچھ لکھا ہے؟

ج۔ ہاں۔ بچوں کے لئے بھی بہت کچھ لکھا ہے اصلاح پسند تحریریں اسی سلسلہ کی ہیں۔ ترقی اردو بورڈ نے بھی کئی کتب لکھوائی ہیں۔

س۔ معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ کی وجہ آپ کیا سمجھتی ہیں۔ اور اس کے سدھار کے لئے کون سا انداز اپنانا پسند کرتی ہیں آیا واعظ کا یا مصلح کا۔

ج۔ معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ کے کئی وجوہ ہیں لیکن خاص وجہ تو میرے خیال میں کم تعلیم ہے۔ جہالت کی وجہ سے اخلاقی قدریں پامال ہوئی ہیں اس کے سدھار کے لئے تعلیم عام کرنا ضروری ہے اور اصلاح پسند تحریریں خاصا رول ادا کر سکتی ہیں اور جو کوئی اس طرح نہ سدھر سکے، اس پر نہ تو واعظ کا وعظ اثر کر سکتا ہے نہ مصلح کا عمل۔

س۔ آپ کے خیال میں نئی نسل کی بے راہ روی کی بنیادی وجہ کیا ہے آیا ملازمت پیشہ معروف ماں کے پیار کی بچپن سے محرومی یا مشرق میں تیزی سے بڑھتی ہوئی مغربی تہذیب۔

ج۔ میں نہیں سمجھتی کہ نئی نسل کچھ زیادہ بے راہ رو ہے۔ رہا ملازمت

پیشہ ماں کی مصروفیت کا سوال تو اس کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہوگا کیونکہ اگر ماں میں صلاحیت ہی نہ ہو تو اس کے ملازمت پیشہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہاں نئی نسل کے بگڑنے کی کچھ ذمہ داری مغربی تہذیب پر ہے اس سلسلہ میں میں خصوصاً ٹیلیویژن کو مجرم گردانتی ہوں کیونکہ متوسط طبقہ کے نوجوان ذہن اس سہل الحصول ذریعہ سے فیشن کے نام پر بہت کچھ لغویات سیکھ رہے ہیں جبکہ ہوٹل سینما ہاؤس۔ کیبرے ہال یا ڈسکو تھیٹر ان کی پکڑ سے بہت زیادہ دور ہیں محض شاہانہ اخراجات کی وجہ سے۔

س۔ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوتی۔

ج۔ جہاں تک گھریلو ذمہ داریوں کا سوال ہے تو میں تقریباً ریٹائرڈ زندگی گذار رہی ہوں اب تو صرف لکھنے لکھانے اور مطالعہ میں لگی رہتی ہوں۔ ہاں جب خاندانی ذمہ داریاں تھیں تب قدرے مشکل ضرور ہوتی تھی پھر میں نے گھریلو اور ادبی ذمہ داریوں کا وقت مقرر کر رکھا تھا جس سے کوئی خاص پریشانی لاحق نہیں ہوتی تھی۔

س۔ آپ نے پہلی کہانی افسانہ اور ناول کب تحریر کیا، کب شائع ہوا اور اب تک تحریر و طبع شدہ کہانیوں افسانوں ناولوں و دیگر تخلیقات کی تعداد کتنی ہے۔

ج۔ پہلا ناول، حسن اتفاق، ۱۹۲۹ء میں لکھا پہلا افسانہ ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا۔ پہلا ناول، عذرا، ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا اس کے بعد آٹھ ناول شائع ہوئے ہیں جن میں سے کئی اب نہیں ملتے۔ افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں یوں تو ناول افسانوں اور کہانیوں کی تعداد پینتالیس سے زیادہ ہے لیکن بے شمار ریڈیو تقریریں و کہانیاں ان میں شامل نہیں۔ ۱۹۳۶ء میں جب آل انڈیا ریڈیو شروع ہوا تب میری پہلی ریڈیو تقریر نشر ہوئی تھی ان تقاریر اور کہانیوں کا مجموعہ بات چیت کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ویسے عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں میں صرف افسانہ نگار یا کہانی کار ہوں لیکن میں نے اسکے علاوہ کچھ کام ایسے کئے ہیں جو بہت کم خواتین نے کئے ہیں میں نے تین چار ادبی کتابیں لکھی ہیں جیسے ادبی جھلکیاں۔ ڈرامے وغیرہ۔ یادگار حالی جو کہ سوانح حیات حالی ہے در ۱۹۵۳ء میں چھپی ہے اور تب سے اب تک بی۔ اے اور بی اے آنرز کے کورس میں متعدد یونیورسٹیوں میں شامل ہے۔ انیس پر بھی میں نے کام کیا ہے۔ انیس سے متعلق میں نے کئی کتابیں لکھیں جیسے بچوں کے لئے ہمارے انیس، انیس سے تعارف، انیس پر مضامین کا مجموعہ۔ ہندی میں انیس کے بارہ مرثیوں کے معانی و مطالب لکھے ہیں پھر میں نے اپنے بھائی سید حسین کی سوانح عمری لکھی جو انھوں نے نامکمل چھوڑی تھی۔ میں نے "ذکر جمیل" کے نام سے پوری کی۔ ڈاکٹر صاحب (محترمہ کے شوہر ڈاکٹر عابد حسین صاحب) کے انتقال کے بعد ان کے خطوط سے ان کا سفرنامہ "رہ نورد شوق" کے نام سے ترتیب دیا ہے اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے نام ان کے احباب و بڑی شخصیتوں کے جو خطوط آتے تھے ان کو "احباب نامہ" کے عنوان سے ترتیب دیا ہے گذشتہ بیس سال سے میں اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھ رہی تھی جو اب مکمل ہو گئی ہے اور مکتبہ جامعہ نے اس کی کتابت شروع کرا دی ہے یہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اردو ترقی بورڈ اور تعلیم بالغاں کے تحت میں نے دس بارہ کتب بچوں اور کم تعلیم یافتہ افراد کے لئے لکھی ہیں۔

س۔ آپ کو اپنی کون سی ادبی تخلیق زیادہ پسند ہے۔

ج۔ آپ ایک ماں سے کیسے پوچھ سکتی ہیں کہ اسے اپنی کون سی اولاد زیادہ پیاری ہے ویسے اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو میں کہوں گی کہ مجھے اپنے دو ناول "اپنی اپنی صلیب" اور "راہ عمل" پسند ہیں۔ ایک اور ناول "گوری سوئے سیج پر" کی قارئین بہت تعریف کرتے ہیں کہ جیسے یہ میری اپنی کہانی ہے لیکن ایسا نہیں ہے بہرحال مجھے اپنے وہی دو ناول پسند ہیں ویسے اب ناول لکھنے کی طرف طبیعت

واقف نہیں ہوتی۔ کیونکہ ادبی مضامین و دیگر ادبی
مصروفیات میں دل زیادہ لگ گیا ہے۔

س۔ آپ کے پسندیدہ مشاغل کیا ہیں؟۔

ج۔ آپ سچ پوچھئے تو اس وقت میرے کوئی پسندیدہ مشاغل
نہیں۔ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد میں کھوکھلی ہو چکی
ہوں کسی مشغلہ میں دل نہیں لگتا کوئی شوق نہیں بس
لکھنا پڑھنا ہی مشغلہ کے طور پر رہ گیا ہے مطالعہ تو میں
کسی طرح چھوڑ نہیں سکتی حالانکہ نظر کمزور ہو چکی ہے۔
اسی طرح ادبی مضامین لکھنا بھی نہیں چھوٹ سکتا۔
دیگر ادبی ذمہ داریاں بھی پوری کرنا پڑتی ہیں ویسے تو
ایک زمانہ میں باغبانی اور فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا
دستکاری اور کھانا پکانا تو ہر عورت کرتی ہے میں نے
بھی کیا حالانکہ کھانا پکانے میں الجھن ہوتی تھی لیکن
چونکہ ڈاکٹر صاحب عمدہ کھانوں کے شوقین تھے اس
لئے میں نے یہ ہنر بھی سیکھا اور مشغلہ کے طور پر اپنایا
بہرحال اب تو صرف لکھائی پڑھائی اور خدمت خلق
کا مشغلہ باقی رہ گیا ہے۔

س۔ قلمی دوستی کو آپ کیسا سمجھتی ہیں اور کس حد تک
نباہ سکتی ہیں۔؟

ج۔ قلمی دوستی بذات خود اچھا سلسلہ ہے۔ لیکن لڑکپن
کا شوق ہے میں اب کہاں قلمی دوستی کرتی پھروں
گی ہاں قارئین کے سنجیدہ خطوط کو ضرور اہمیت دیتی
ہوں۔

س۔ کیا مذہب مسلم قوم کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو سکتا
ہے۔

ج۔ سب سے پہلے تو میں یہ واضح کرنا پسند کروں گی کہ میں
بچپن سے آج تک سویرے پابندی سے کلام پاک کی
باترجمہ و تفسیر تلاوت کرتی ہوں۔ مولانا آزاد کا ،،
،،ترجمان القرآن،، میرے مطالعہ میں رہتا ہے۔ میں
مذہب کو توہمات سے پاک سمجھتی ہوں اور تعصب سے
نفرت ہے مجھے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جب ہم
شروع شروع یہاں (دہلی) آئے تھے یہ تیس چالیس
سال پہلے کی بات ہے تب سے ہم محرم میں مجلس تو کرتے
ہی تھے مگر ربیع الاول میں پابندی سے میلاد شریف کا
بھی اہتمام کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان مجلسوں
ومحفلوں میں ہم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی فیملی وغیرہ
بس چند ہی اشخاص حاضر رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ
جب سب کو اس کا علم ہوا تو سبھی ہر دو اقسام کی محفلوں
مجلسوں میں شامل ہونے لگے اور اب حاضرین کی
تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے۔ میں نے حج بھی کیا ہے
اور یورپ کا سفر بھی کیا ہے۔ ایک عرصہ تک میں برقعہ
بھی پہنتی رہی تھی۔ ہر جگہ ہر وقت ہر قدم پر میں نے
محسوس کیا ہے کہ مذہب کوئی سا بھی مذہب کسی قوم
کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ ہاں نقاب ضرور
مسلم خاتون کی ترقی میں حائل ہوتی ہے لیکن میں نے
کئی عالموں و مولویوں سے معلوم کیا ہے کہ ہاتھ پیر اور
چہرہ پردہ میں شامل نہیں ہے اس کا ثبوت اس سے
بھی ملتا ہے کہ اس خاتون کا حج ہی صحیح نہیں ہوتا جس
کا چہرہ ڈھکا ہوا ہو۔ بہرحال جس طرح کا رواج اپنے
یہاں پردے کا ہے وہ ضرور مسلم خواتین کی ترقی میں
حائل ہو سکتا ہے لیکن مذہب میں نہیں کیونکہ تاریخ
شاہد ہے غزوات النبی میں عورتیں مجاہدین کو میدان
جنگ میں پانی پلاتی تھیں زخمیوں کی دیکھ بھال کرتی
تھیں لیکن اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ پردہ ترک
کر دیا جائے پردہ دل کا آنکھ کا اور جسم کا رہنا چاہئے
آج جن مسلم خواتین نے پردہ ترک کیا ہے ان میں سے
زیادہ تر ایسا برہنہ لباس پہنتی ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا
وہ اگر لباس ہی ترک کر دیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے لیکن
اسلام ایسا لچکدار مذہب ہے کہ اس کی حدود میں
رہتے ہوئے مسلم قوم بیشک ترقی کر سکتی ہے۔

س۔ مشرقی خواتین کو کس حد تک مغربی دھارے میں
بہنا چاہئے۔

ج۔ مغربی لباس یا مغربی فیشن کی تو بات ہی نہ کیجیے اب تو فیشن ہر آٹھویں دن تبدیل ہونے لگا ہے کبھی سب کچھ کھلا ہے کبھی سب کچھ ڈھکا ہے کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ بہر حال میں تو یہی کہوں گی کہ زمانے سے کٹ کر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ قرون اولیٰ کے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں کا ذکر رہنے دیجئے۔ بس اتنا ہونا چاہیئے کہ ہر معقول لباس ہر معقول فیشن اپنایا جائے تو کافی ہے۔

س۔ اردو کی ترقی کے لئے کیا کیا کیا جا سکتا ہے۔

ج۔ اُردو کی ترقی کے لئے سب سے پہلے تو ہمیں اپنے بچوں کو اُردو پڑھانا چاہیئے۔ اردو اردو کا شور مچانے والے لوگوں کے بچے انگریزی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ خیر انگریزی اسکول میں پڑھنا بیجا نہیں لیکن کم از کم گھر پر تو اردو پڑھانا چاہیئے جس کے لئے سب اعتراض کرتے ہیں کہ بچے اسکول میں ہی اتنے مضامین پڑھتے ہیں اب کیا ان پر ایک اور مضمون لادا جائے۔ ویسے تو اسکول کالج یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو پڑھنا اور پڑھانا چاہیئے ورنہ ہمارا ادب ہمارا ادبی سرمایہ ہماری تہذیب کا کیا ہوگا۔

بے بس محبت

——— تبسم آرا

سلمٰی کالج سے حسب معمول چار بجے گھر لوٹی تو اس کے گھر کی سجاوٹ کسی کی آمد کی غمازی کر رہی تھی۔ اس کا دل ایک انجانے خوف سے دھڑک گیا۔ سامنے دالان میں ایک تخت پر نانی ماں بیٹھی تھیں مگر وہ کچھ پریشان پریشان سی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی خالہ کو کھانے لانے کے لیے کہہ دیا۔ خالہ کھانا لئے آگئی تھیں مگر ان کا چہرہ بھی مرجھایا سا لگا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ عاشی کہیں نظر نہیں آیا وہ تو روز کھانے پر اس کا منتظر

رہتا تھا۔

عاشی کہاں ہے نانی ماں!

بیٹا! تیرے چچا چچی آرہے ہیں نا ان کے لیے کچھ ضروری سامان لانے بازار گیا ہے۔

وہ لوگ کیوں آرہے ہیں۔؟ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ خالہ بول پڑیں اور ساتھ میں عارض بھی آرہا ہے۔ تجھے وہ لوگ یاد ہیں۔ ساتھ ہی ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔

ہاں! مجھے یاد ہے وہی نہیں خالہ ماں ہر ایک بات یاد ہے وہ اتنا کہتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔

عاشی نے بھی آج نہیں کھایا ہے۔

ٹھیک ہے جب عاشی آجائے تو صرف چائے ہم لوگوں کے لیے بنا دینا۔ خالہ اس کو آنسو بھری نظروں سے دیکھتی رہیں اور وہ اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گئی۔ سنگار میز بالکل سامنے تھی جس میں اس کا عکس صاف نظر آرہا تھا۔ آج سے لگ بھگ بیس سال پہلے ماں تو بالکل میری طرح ہی لگتی تھیں کتنی حسین تھیں میری ماں جتنا خوبصورت چہرہ خدا نے انھیں عطا کیا تھا شاید اس سے بھی خوبصورت دل؟ اسے ماں کیا یاد آئی سب کچھ یاد آنے لگا۔ اپنا باپ اپنا ظالم اور بے رحم کنبہ اور ننھا عارض! وہ سوچنے لگی کتنے سہانے تھے وہ دن؟ جب میری ماں تھی۔ گھر کا ہر فرد میری ماں سے خوش رہتا تھا مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو میری ماں کی عزت دیکھ کر دل ہی دل میں جلنے لگے تھے۔ اس وقت میں لگ بھگ سات سال کی تھی اور اسکول جایا کرتی تھی میری ماں اچھے اچھے کپڑے پہنا کر خوب پیار کرتیں پھر اسکول کے لیے روانہ کر دیتی تھیں ساتھ میں عارض بھی رہتا تھا جو میرا چچازاد بھائی تھا اور عمر میں دو سال بڑا تھا۔ ماں ہم دونوں کی ہر ہر ادا پہ نثار ہوتی رہتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے میرے ہنستے مسکراتے گھر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ایک دن جب میں اسکول سے لوٹی تو میری ماں بستر پر لیٹی تھیں انھیں کئی دن سے تیز بخار تھا آج ان کا ماتھا بہت جل رہا تھا مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔

افسوس کہ یہ مضمون اس ماہ مکمل شائع نہ ہو سکا (اڈیٹر)

عورت کا رومان اور اس کا المیہ

جارج ایلیٹ: حیات خیالات اور فن

قسط سوم: سادہ اور خاموش — فہیم انہونوی

> ایک شریف روح اپنے تئیں تقدس رکھتی ہے
>
> — نتشے (جرمن فلسفی)

> ایشور کے احساس ہی سے ایک عینی زندگی پانے کی جستجو پیدا ہوتی ہے جس کا اظہار نیکی اور پاکیزگی حاصل کرنے کی بیتاب کاوش میں ہوتا ہے۔ ایشور کا احساس اور نیکی کی آرزو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ جو سچے مذہبی ہیں انکے لئے ساری زندگی مقدس ہوتی ہے۔
>
> — ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن

میں نے پہلی قسط میں لکھا تھا کہ ہم کو نہ صرف اپنے تیئں بلکہ پوری زندگی کے سلسلے میں سنجیدگی اور تقدس سے پُر ہونا چاہیئے۔ آج کی دنیا میں لڑکے اور لڑکیوں میں ذرا بھی سنجیدگی اور تقدس نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے اب کچھ پاک اور صاف نہیں رہ گیا ہے اسی لیے اتنی جہالت اور نفرت، بے دردی اور بدصورتی موجود ہے۔ یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ انسانوں میں جتنی بھی برائی ہے اس کا ذمہ دار پورا سماج ہے اور اسی لیے بجائے غصے کے دکھ ہوتا ہے شاید دکھ ہی سے سنجیدگی بھی پیدا ہوتی ہے غم سے زیادہ اپنائیت اور انسانیت کسی چیز میں نہیں ہوتی — افسوس تو یہ ہے کہ اب غم بھی نہیں ملتا۔ غم روزگار تو ہے مگر وہ بجائے انسان بنانے کے حیوان بناتا ہے شاید غم جاناں ہی انسان بنا سکتا ہے اور پھر کیوں ایسا نہ ہو۔ غم جاناں کا تعلق انسانوں اور زندگیوں کا تعلق ہوتا ہے اور آج لڑکے اور لڑکیوں کو غم جاناں سے ہی سنجیدگی مل سکتی ہے مگر اب محبت میں بھی تقدس نہیں ہوتا۔ میں تو ہر اس غم کو غم جاناں مانتا ہوں جو کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے

رشتے سے ملے اب تو بس یہی کر سکتے ہیں
آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

سنجیدگی کے معنی یہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ان معصوم مسرتوں سے محروم کرلیں جو ہمیں ہنساتی ہیں یا وہ شوق ترک کر دیں جو ہمارا دل بہلاتے ہیں۔ ایک لطیف احساس مذاق اچھے انسان کی نشانی ہے اور پارسائی کے معنی پاکیزگی نہیں ہوتے جس طرح انکسار کے معنی انکار نہیں ہوتے۔ سنجیدگی یہ بھی نہیں کہ آپ اپنے آپ کو تج دیں۔ بھول جائیں خود کو۔ دراصل اپنے آپ کو پانے اور سمجھنے کی کوشش ہی سے ہم دوسروں کو جان سکتے ہیں، اپنے مداوے سے ہی دوسروں کا علاج کر سکتے ہیں۔ میں اور کچھ لکھنے کے بجائے برطانوی فلسفی برٹرینڈ رسل کی سوانح حیات کا دیباچہ درج کرتا ہوں۔

"میں کس لیے جیا ہوں"

تین سادہ مگر بے پناہ جذبات نے میری زندگی پر

حکمرانی کی ہے۔ محبت کی آرزو، علم کی جستجو اور انسانوں کے دکھ اور درد کے لیے ایک ناقابل برداشت رحم ان تین جذبات نے ایک آندھی کی طرح مجھے ادھر سے ادھر اڑایا ہے درد کے ایک گہرے سمندر کے اوپر بے زاری کی حد تک۔

میں نے سب سے زیادہ اور پہلے محبت چاہی کیونکہ وہ مسرت دیتی ہے۔ اتنی زیادہ کہ جس کے چند گھنٹوں کی خاطر میں اکثر اپنی پوری زندگی تج دیتا۔ میں نے محبت چاہی اس لیے بھی کہ وہ تنہائی دور کرتی ہے وہ ہولناک تنہائی جس میں ایک کانپتا ہوا احساس دنیا کی سطح سے جھانکتا ہے تو اسے ایک ایسی وادی نظر آتی ہے جس میں زندگی نہیں۔ میں نے محبت چاہی اس لیے بھی کہ اس کے ملن میں میں نے اس جنت کو محسوس کیا جس کا تصور پیغمبروں اور شاعروں نے کیا ہے۔ اسے میں نے چاہا اور خواہ انسان کے لیے ایک ناقابل حصول اچھائی معلوم ہوتی ہو میں نے آخرکار اسے پا لیا ہے۔

اتنی ہی جستجو مجھے علم کی رہی ہے۔ میں نے چاہا کہ میں انسانوں کے دلوں کو سمجھوں کہ مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستارے چمکتے کیوں ہیں۔ یہ تھوڑا سا علم مگر زیادہ نہیں میں نے پا لیا ہے۔

محبت اور علم نے مجھے جہاں تک یہ مل سکے، آسمان کی طرف اٹھایا مگر ہمیشہ رحم مجھے زمین پر کھینچ لیا ہر درد کی صدا نے میرے دل سے اپنی بازگشت پائی۔ کال میں بھوکے بچے، ظالم حکمرانوں کی بے رحمی کے شکار، بوڑھے ماں باپ اپنے بیٹوں کے لیے ایک ناگوار بوجھ، تنہائی غریبی اور درد کی یہ ساری دنیا جو اس زندگی کا مذاق اڑاتی ہے جو انسانوں کی ہونا چاہیئے تھی۔ میں نے ان دکھوں کو ان مصیبتوں کو کم کرنا چاہا لیکن میں بھی نہ کر سکا اور اسی لیے میں بھی اذیت اٹھاتا ہوں۔

یہ رہی ہے میری زندگی۔ میں نے اسے جینے کے قابل پایا ہے اور میں خوشی سے اسے دوبارہ جی لوں گا اگر اس کا موقع مجھے مل جائے"۔

یہ اسی رتن کے جذبات ہیں جو اپنے بچوں کو کار میں سیر کرانے لے جاتا تو ان سے کہتا کہ راہگیروں کو یہ کہہ کر چڑھاؤ "تمھارے دادا بندر تھے"۔ آج ان جذبات کا فقدان ہے۔ محبت ذلیل ہو چکی ہے، علم کی راہیں بجائے انسان تک لے جانے کے ہمیں اس سے دور لے جا رہی ہیں اور دکھ درد اتنا زیادہ ہو گیا ہے، غریبی اور بے دردی اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہمارے دلوں میں سماتی نہیں ہم میں سے اکثر اپنی سماجی عزت، اپنے کاروبار، اپنے گھریلو فرائض کے سلسلے میں سنجیدہ ہوتے ہیں اور ہونا بھی چاہیئے لیکن اگر یہ تین جذبات ہمارے اندر نہیں ہیں تو ہم کسی طرح سے سنجیدہ نہیں زندگی کی گہرائی اس کی عظمت اور اپنی دائمی حقیقت ہمیں کبھی محسوس نہ ہو سکے گی اور نہ ہی اس لاشعور کا احساس ہو سکے گا جو ساری دنیا میں ہمارے اور آپ کے اندر اور ہم سے باہر موجود ہے۔ لیکن اگر یہ تین جذبات ہمارے ہیں تو ہم سب کے ہیں۔ تب ہمارے غم، دنیا میں جو اچھائی ہے اس سے تسلی پائیں گے، ہماری ذاتی مسرتیں دنیا کا غم یاد رکھیں گی اور ہمارے اندر ہر مظہر قدرت کے لیے دوسروں اور اپنے آپ کے لیے ایک تحیر بھرا تقدس پیدا ہوگا۔ اس وقت ہم جان جائیں گے کہ خوبصورتی اور خوشی میں کوئی رشتہ نہیں مگر غم اور خوشی میں ہر رشتہ ہے اور اسی رشتے سے محبت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن انسان کے جذبات حالات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اب غم جاناں کبھی نہیں ملتا۔ وہ اہم دور ہوتا ہے ہماری عمر کا جب ہم عنفوان شباب میں ایک بھولی اور معصوم رومانی محبت کا تجربہ کرتے ہیں۔ اسی سے ہم انسانیت نرمی اور محبت سیکھتے ہیں مگر یہ اساسی اور سچا تجربہ بھی آج کی آزادی اور جنسی بے راہ روی نے چھین لیا ہے۔ تو پھر ہمیں یہ سنجیدگی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے بے شک یہ ایک دم سے ہمارے اندر اپنے آپ ہی پیدا ہو سکتی کسی طرح سے سوچ کر کوشش سے نہ مل سکے گی۔

شاید یہ ان لمحات کے کسی پل میں مل جائے جن میں ہم تنہا

اپنے کمرے میں دنیا سے دور اپنے سے قریب بیٹھ کر اس آواز کو
سنتے ہیں جو ہمارے اندر کی خاموشی ہے، تب شاید ہمارے
اندر چھپا ہوا ایشور ہم سے باتیں کرتا ہے۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن
کہتے تھے کہ ہمارا مذہب وہی ہے جو کچھ ہم اپنی تنہائی میں کرتے
ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو ان خاموش اور تنہا لمحات کی
اہمیت سمجھاتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"ہم سب اپنے آپ کو فریب دیتے رہتے ہیں
اور صرف مستقل تنہا اندرونی زندگی کا مطالعہ
ہی ہمیں اس سے بچا سکتا ہے۔ خاموش
عبادت ہر مذہب کا حصہ ہوتی ہے۔ انجیل
میں ایک جگہ یہ حیرت انگیز واقعہ بیان کیا گیا
ہے کہ جب حضرت عیسیٰ فرشتوں کو خدا کے
تخت کے سامنے عبادت کرتے دیکھ رہے تھے
تو یکایک جنت میں خاموشی طاری ہو گئی،
جنت کے باجے بند ہو گئے۔ نغمہ سرمدی خاموش
ہو گیا۔ وہ خاموشی کوئی مردہ خاموشی نہیں
تھی بلکہ اس میں زندگی کی دھڑکن تھی، اب
فرشتے خاموش ہو کر خدا کی آواز سن رہے
تھے۔ اس خاموشی میں ہم حقیقت سے قریب
ہو جاتے ہیں اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے
کہ کسی طرح ہم اپنی زندگی کو اس قابل بنا
سکتے ہیں کہ وہ خدا کی نذر کرنے کے قابل ہو
جائے۔ اس خاموشی میں ہم اپنی روح کی
آواز سنتے ہیں جس کی پکار میں فریاد ہوتی
ہے ایک مسافر کی اپنے گھر کے لیے ایک قیدی
کی رہائی کے لیے، محدودیت کی لامحدودیت
کے لیے۔ ہم سب کے اندر ایک چھپا ہوا مندر
ہوتا ہے جس کے اندر کوئی اور نہیں جا سکتا
ہمیں اس مندر میں جتنا زیادہ ہو سکے اتنا
وقت بتانا چاہیئے تاکہ ہم اپنے اس سچے
روپ کو جان سکیں جو ہمارے اس روپ
سے مختلف ہوتا ہے جو ہم دنیا کے سامنے
پیش کرتے ہیں۔
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر ہم
کو اپنے دن خاموشی میں گذارنے پڑیں۔ اگر
ان دنوں میں ہم کسی بچے پر مسکرا دیں، کسی
دوسرے انسان کو اس طرح تسلی دے سکیں
کہ جس سے وہ خوش ہو جائے اور اس کے
دل میں نئی امید پیدا ہو جائے۔"

خاموشی کے لمحات کے بعد جب ہم اپنے کمرے
سے نکلیں گے تو دنیا اور اس کی زندگی سے ہمیں محبت
ہو جائے گی۔ جس طرح کسی انسان کے قریب رہنے
کے بعد، اس سے دور جا کر ہی اسے سمجھا جا سکتا ہے،
جس طرح پہاڑ کو دور سے دیکھتے ہی اس کی خوبصورتی
اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اسی طرح دنیا سے دور
ہو کر اپنوں کو چھوڑ کر ہمیں تنہائی میں بھی کچھ لمحات
گذارنے چاہئیں۔ ہم سب ہی سال میں چھٹیوں کے
دوران تفریح کے لیے کہیں جاتے ہیں۔ ہر بار کسی
نئی جگہ جائیں گے اور وہاں جا کر سارے دن مشہور
مقامات اور عمارات دیکھنے میں صرف کر دیں گے۔
کیا وہ خوبصورتی جسے دیکھنے ہم دور دور جاتے ہیں اس
خوبصورتی سے مختلف ہوتی جو ہمارے ارد گرد ہے؟
کیا ایک مقام اپنی خوبصورتی میں دوسرے مقام کی
خوبصورتی سے جدا ہوتا ہے؟ بے شک وہ خوبصورتی
جو ظاہری ہے ہر جگہ ایک نیا منظر رکھتی ہے۔ ہر جگہ
کا سماں مختلف ہوتا ہے مگر خوبصورتی ہر جگہ خوبصورتی ہوتی ہے۔ وہ خوبصورتی
جو دیکھی بھی جاتی ہے اور محسوس بھی ہوتی ہے اور
جس کے احساس میں خدا کا احساس ہوتا ہے
ہمیں چاہیئے کہ کسی چھوٹے سے پہاڑی شہر میں جا کر
رہیں۔ ہر سال جب اسی جگہ جائیں گے تو وہاں کی

خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہاں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں ایک حسین رشتہ قائم کرلیں گی وہاں جا کر سکون سے قدرت کی گود میں بیٹھ کر سوچیے۔ پڑھیے آرام کیجئے ہر ہوس اور ہر سے غافل تب وہاں کی سردی میں آپ کے ٹھنڈے ہاتھوں کو کسی دوسرے ہاتھ کی گرمی محسوس ہوگی۔ تب بجائے خوبصورتی دیکھنے کے آپ محسوس کریں گی اور اس میں خدا کا احساس بھی پیدا ہوگا۔ تب آپ دیکھئے گا۔

کہ فاصلے نہ زمیں کے نہ آسماں کے رہے
کہ مرحلے من و تو کے نہ این و آں کے رہے
کہ فرق حرف و صدا کے نہ کھیاں کے رہے
کہ حسن کعبہ میں ہے اور نہ سومنات میں ہے
جو حسن ہے وہ فقط آدمی کی ذات میں ہے

اپنے آپ کو سب کی طرح جان کر ہم اپنے آپ کو بھی پا جائیں گے اور سب سے الگ بھی رہیں گے۔ ایک ایسا سکھ ہوتا ہے جو نہ دنیا دے سکتی ہے اور نہ لے سکتی ہے دنیا کی رنگینیاں اور انسانوں کے شور کے درمیان بھی ایک زندگی مل سکتی ہے۔ ایک سادہ اور خاموش زندگی۔

کبھی ہمارے اس پرانے دیش کے پرانے انسانوں میں! جب وہ بھی زندہ تھے اور ان کا دھرم بھی جب ایشور آسمان پر دور نہیں رہتا بلکہ ان کے پاس ان کے اندر ان کے ارد گرد، تب کتنی اچھائی اور نیکی تھی، خوشی اور انسانیت تھی۔ دوسری قسط میں ہم نے ہندوؤں کی قدرت سے محبت اور اس میں چھپے ایشور اور اس کی پوجا کے بارے پڑھا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایشور انسانوں میں بھی رہتا ہے۔ ہم روزہ رکھتے ہیں اپنے خدا کے لیے ان کی عورتیں اپنے شوہر کے لیے برت رکھتی ہیں ان کی بہن بھائی کو راکھی باندھتی ہے۔ ہم صرف خدا کے آگے سر جھکاتے ہیں وہ اچھے انسانوں کی بھی پوجا کرتے ہیں۔ انسانوں کی محبت میں بھی تقدس ہوتا ہے۔ دیکھیے رادھا کرشنن صاحب نے اس محبت کے بارے میں جو سراپا تقدس ہے کیا لکھا ہے۔

"جہاں مرد اپنی تیز اور پر جوش زندگی کے دن سیاست اور کاروبار، عشق اور دنیاداری کے مسائل میں گزارتے ہیں عورتیں جو ان سے کم ہی جہاں دیدہ ہوتی ہیں مگر زندگی اور سچائی سے زیادہ قریب، جانتی ہیں کہ زندگی کے اصلی معنی اور مقصد روزمرہ کے کاموں اور معمول سے آسودہ نہیں ہو جاتے اور اس گہری اور اساسی اصلیت کا دامن تھامے رہتی ہیں جس کی روشنی میں زندگی بے بس اور معمولی نہیں نظر آتی ہے وہ جانتی ہیں کہ ان چیزوں اور حقیقتوں کے علاوہ جو چھوئی اور محسوس کی جا سکتی ہیں، ایک حقیقت ہوتی ہے۔ روحانی اور دائمی۔ وہ بجائے مثال کے اپنے اعمال سے بجائے الفاظ کے اپنی زندگی سے ان گزرتے ہوئے واقعات کو جو ہماری زندگی کا بیشتر حصہ ہوتے ہیں، ایک زیادہ گہرے اور اونچے معنی دے دیتی ہیں۔ ہمارے دیش کی عورتیں کہتی ہیں۔ اگر وہ بے وفا ہیں تو میں وفادار رہوں گی، اگر وہ بھٹک گئے ہیں تو میں گمراہ نہ ہوں گی، اگر وہ دوسری کو چاہتے ہیں تو مجھے ان کا انتظار کرنا ہوگا۔ اگر اس اندھی محبت میں کوئی نقص ہو تو پھر اس ایشور کی محبت میں بھی نقص ہے جو بغیر تھکے صبر سے اس وقت تک ہمارا انتظار کرتا ہے جب تک ہم جھوٹی خوشیوں سے اوب کر تھکے ہوئے اس کے پاس واپس نہیں آجاتے۔ ایک پاکیزہ اور بے لوث محبت جو اپنے چہیتے کی کمزوریوں پر فتح پا لیتی ہے، جنت کا سب سے اچھا تحفہ ہوتی ہے۔"

ہمارے دیش کی عورتوں میں یہ تقدس ہوا کرتا تھا یہ اب بھی انھیں کا ہے۔ ہر مذہب میں یہ ذکر ملتا ہے کہ

خدا نے ہر دور میں ہر دیش میں پیغمبر اتارے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں جو بھی ہمیں اپنی نیکی سے اچھی باتیں بتائے وہ خدا کا پیغمبر ہوتا ہے۔ رادھا کرشنن صاحب تو فرشتہ تھے۔

میری آٹن کی عمر اب دس برس تھی۔ اس قسط میں آپ پڑھیئے گا کہ کس طرح اس کمسنی میں ہی اس میں کتنی سنجیدگی اور تقدس تھا۔ وہ کس طرح پیدا ہوا اور اس نے کیا روپ لیے۔ مگر اپنی ناتمام کہانی پھر شروع کرنے سے پہلے میں اس کی ناول 'مڈل مارچ' کا ایک اقتباس درج کرتا ہوں۔

ایک زندہ اور حساس انسان کے لیے ہر اشارہ، ہر جھلک، ہر نشان، تجربہ، معنی، امید اور اعتقاد پیدا کرتا ہے۔ وہ کبھی اس طرح مجموعی طور پر دھوکہ نہیں کھاتے۔ اکثر غلط سوچ بھی ہم بے چارے انسانوں کو صحیح نتیجہ تک لے جاتی ہے۔ اصل راستے سے بہت ہٹ کر چلنے کے باوجود ادھر ادھر بھٹک کر بھی ہم اکثر اسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں ہمیں ہونا چاہیئے تھا۔"

اس مشاہدہ کے ظاہری معنوں میں نہ جانے کتنے اور معنی چھپے ہیں۔ شاید یہ کہ جو نیک نیت ہیں انھیں نیکی خود ڈھونڈھ لیتی ہے۔ ہمارا کوئی مذہب ہو ہم نے کچھ بھی پڑھا اور سیکھا ہو، ہم کہیں بھی رہتے ہوں اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا صرف ہمارے اندر کی اچھائی یا برائی ہماری پہچان ہوتی ہے۔ انسان کی نیت کو محسوس کیجئے بجائے اس کے کہ وہ کن راہوں پہ چلتا ہے کس طرح گزرتا ہے انسان ہونے کے طریقے اتنے مختلف ہیں کہ وہ کسی ایک زندگی کا تجربہ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح خدا تک جانے کے لیے مختلف راہیں ہیں اسی طرح اچھائی پانے کے راستے بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ مگر ایشور کا احساس ایک ہوتا ہے

ایک اچھی نیت دوسری اچھی نیت سے مختلف نہیں ہوتی ہے ہم اکثر اپنے جذبات سے دوسروں کے خیالات اور اپنے خیالات سے دوسروں کے جذبات محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں سمجھ اور ہمدردی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا چاہیئے خواہ ہم میری آٹن کی زندگی پڑھ رہے ہوں یا ان انسانوں کے ساتھ چل رہے ہوں جن کی زندگی کو ہم چھو سکتے ہیں

پچھلی قسط میں بتایا گیا تھا کہ میری آٹن جب دس برس کی ہو گئی تو اسے ایک قریبی بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں لڑکیوں کو تربیت و تعلیم کی ذمہ داری ایک نوجوان خاتون ماریا لوئس کے سپرد تھی ماریا لوئس کو سادہ اور خاموش میری آٹن سے محبت ہو گئی اور وہ اس سے مادرانہ سلوک کرنے لگی۔ محبت کو ترسی میری آٹن اور اس میں ایک گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ ماریا لوئس کی محبت اور حوصلہ افزائی پا کر میری آٹن نے چند ہی سال میں وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو اس اسکول میں مل سکتا تھا اور تیرہ برس کی عمر ہونے پر ماریا لوئس کے مشورہ سے اس کے والد نے اسے ایک دوسرے بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن اس اسکول میں میری آٹن کی زندگی کے ذکر سے پہلے میری آٹن پر ماریا لوئس کا جو اثر ہوا اسے جاننا ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ آدمی خوبصورتی دیکھنے والوں کی نظر میں ہوتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ساری خوبصورتی ہماری آنکھوں میں ہوتی ہے۔ زندگی اتنی ہی گہری ہوگی جتنی ہماری آنکھیں اور آنکھوں کی گہرائی اپنی اندرونی زندگی کا احساس ہوتی ہے۔ کچھ دلوں میں ساری کائنات سما جاتی ہے۔ تبھی شاید زندگی سے شکایت جھوٹی اور لاحاصل معلوم ہوتی ہے ہماری زندگی ویسی ہوتی ہے جیسی ہم چاہتے ہیں۔ آئینہ میں اپنی ہی شکل نظر آتی ہے اور بقول جوش لوگ اکثر چہروں کے دھبے نہ دھو کر آئینہ دھویا کرتے ہیں۔

میری آٹن ماریا لوئس سے بہت متاثر ہوئی مگر اس کے

تاثر نے وہی جذب کیا جس کو جذب کرنے کی قدرت اس میں تھی۔ میری آئن کے گھر میں سب خدا کے قائل اور اپنے مذہب کو ماننے والے تھے۔ لیکن مذہب کا سچا تعلق روح اور وجدان سے ہوتا ہے اور یہ روحانیت انہیں نہ تھی۔ اس کے برخلاف ماریا لوس عیسائیوں کی اس تنظیم سے تعلق رکھتی تھی جسے ایوانجلیسزم کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس اعتقاد پر مبنی ہوتی ہے کہ انسان بنفسہ غیر ہدایت یافتہ اور خلقی طور سے برا ہوتا ہے اسے بخشش صرف اس سچے اعتقاد سے ملتی ہے جو انجیل کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مذہب کی سادگی روحانیت اور نیک نفسی کی زیادہ اہمیت ہے اور ہمدردی اور رحم کے جذبات ہی اس کی صداقت کا ثبوت ہوتے ہیں۔

ماریا لوس بذات خود بھی ایک نیک اور رحم دل عورت تھی اس لئے اس کا یہ مذہب نہ صرف اپنے آپ میں بلکہ اس کے اپنے نیکیوں سے بھرے دل کی وجہ سے بھی معصوم اور جذباتی تھا۔ اس میں جہنم کے عذاب اور سزا کی ہیبت کے بجائے کریم النفسی زیادہ تھی۔ ماریا لوس غریبوں کی امداد کرتی۔ بیماروں کی عیادت کو جاتی اور ان کی خدمت کرتی کسی انسان کا دل دکھانے کے خیال سے ہی کانپ اٹھتی۔ خود جارج ایلیٹ نے آگے چل کر لکھا ہے۔

"مذہبی رسوم اتنی اہمیت نہیں رکھتیں جتنی کہ وہ روحانیت جس میں ہم اپنے آپ کو تج کر دوسروں کے ہو جاتے ہیں کسی کا دل نہ دکھاؤ' اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرو نیکی اور محبت کرو۔ تب ہی خدا کی سچی بندگی ہوگی۔ اپنی روح کو جانو اور پھر اس سے خدا کو محسوس کرو۔"

میری آئن تو طبعاً رحم دل اور اچھے جذبات رکھنے والی تھی ہی۔ اس مذہب میں اسکو ان کے اظہار کا ذریعہ مل گیا۔ وہ نادانستہ عقیدت سے انجیل پڑھتی کہ اس کے آنسو بہنے لگتے۔ وہ کمسنی کے باوجود ماریا لوس کے ساتھ غریبوں اور بیماروں کے پاس جاتی۔ ان کی خدمت کرتی ان کے لئے دعا کرتی گھنٹوں خاموش بیٹھی اپنے خیالات میں گم اپنی اندرونی زندگی کی تلاش میں کھوئی رہتی ۔۔۔۔ یہ اسی مطالعہ باطن کا نتیجہ تھا، جس نے اس کے اندر دوسروں کے لئے سمجھ اور ہمدردی پیدا کی اور ہر انسان کی اندرونی زندگی کا احساس دلایا۔

ماریا لوس نے میری آئن کی نیکی اور محبت کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت کو بھی محسوس کیا۔ اسے پڑھنے کے لئے خوب کتابیں دیتی۔ محبت کی پیاسی میری آئن کو اب علم کی جستجو بھی ہو گئی تھی۔ چند ہی سال میں یہ اسکول اسے جو کچھ دے سکتا وہ سب اس نے حاصل کر لیا۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ میری آئن کے بچپن کی سب سے اہم اور موثر شخصیت ماریا لوس تھی اور دونوں کی دوستی عرصے تک قائم رہی۔

نئے بورڈنگ اسکول میں میری آئن ۴ سال رہی۔ اور اس مدت میں جو دو تغیر اس میں آئے وہ میری اگلی قسط کا موضوع ہونگے۔ آپ دیکھیں گی کہ جس طرح سے دن رات میں تبدیل ہوتے وقت شام کی لالی دل کو کتنی خوبصورت اور خوش آئند محسوس ہوتی ہے۔ جب کلی پھول بن کر کھلنے لگتی ہے تو کتنا اچھا لگتا ہے آنکھوں کو اسی طرح اس کے یہ دو تغیر بھی کتنے اچھے معنی رکھتے تھے۔ جب محبت کی پیاس محبت کا دریا بن گئی۔ جب لڑکی سے عورت بننے میں ننھے پن کی معصومیت جوانی کی پاکیزگی میں اور بچپن کا ڈر احساس میں بدل گئے۔ شرم حیا ہو گئی ایک نئے جذبے نے انسانیت بن کر نئی زندگی پالی۔ کاش ایسا ہی تغیر سب میں پیدا ہو سکے۔ (باقی آئندہ)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور کم سے کم الفاظ میں لکھی جائے اور نمبر خریداری کے ساتھ ہی پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ روانہ کی جائے جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں، وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کتابت و طباعت کی غلطی کی کوئی ذمہ داری نہیں لی جاتی ــــ

ولادت اطفال کی خبریں۔

● بہن شمس النساء محسن (مدراس) تحریر فرماتی ہیں، میری بیٹی کو اللہ پاک نے ۲۴ جولائی ۱۹۸۱ء کو ایک چاند سی بیٹی عطا فرمائی۔ نام نورین قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

● میرے دوست و بھائی یوسف محمد پاریکھ صاحب مرحوم (ابرنگھم) کی صاحبزادی عائشہ داؤد پاریکھ نے اطلاع دی ہے کہ میرے برادر عزیز احمد پاریکھ سلمہٗ (پسر) جناب یوسف پاریکھ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ۱۲ اگست ۱۹۸۱ء کی صبح چھ بجے دو لڑکوں نصیر اور یوسف سلمہ اللہ تعالیٰ کے بعد ایک پیاری سی بچی عطا فرمائی نام نادیہ قرار پایا۔ اللہ مبارک کرے اور نو مولود کو عمر طویل عطا فرمائے اور پھوپھی عائشہ سلمہا ہی جیسی مخلص اور محبت کرنے والی بنے۔ بہن بیگم صاحبہ۔ یوسف پاریکھ صاحب کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم الکھنوی)

● حنا سیمیں (آمبور) میری چاند آنٹی رفیعہ علی اور چاند خالو غلام علی صاحب کے چمن حیات میں، بمقام مکہ معظمہ بتاریخ ۲۴ ست ۱۹۸۱ء بروز پیر بوقت صبح صادق اللہ تعالیٰ نے ایک تین پھول کھلایا۔ خدائے پاک سے دعا ہے کہ نو مولود کو سورج کی کرنوں کی طرح جگمگائے اور صاحب نصیب بنائے۔

● پریوش جمال۔ گوہر جمال شمسی (آنولہ۔ بریلی) میری پیاری پھوپھی جان یاسمین جہاں اور پھوپھا محمد احمد صاحب کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ایک کلی کے بعد ۲۷ اگست بروز جمعہ ایک پھول کھلایا۔ پیار کا نام عدنان احمد قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

● امروز جہاں (آرہ۔ بہار) میری بہن زہرہ حسن اور بہنوئی یوسف حسن کے گلشن حیات میں ۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بوقت دو بجے شب ایک کلی کھلی۔ نام صباحت فاطمہ رکھا گیا۔ خدا کے پاک سے دعا ہے کہ اس ننھی کی زندگی چاند تاروں کے مانند درخشاں رہے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● نور جبیں (رجہت۔ نوادہ) میری سنجھلی آپی بلقیس خاتون اور نوشے بھائی ڈاکٹر سید وسیم الدین کے گلشن حیات میں ۷ اگست ۱۹۸۱ء بوقت ۱۰ بجے شب ایک حسین کلی مسکائی۔ نام نسیم السحر عرف سیما رکھا گیا ہے۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● شاہدہ تبسم۔ صبیحہ تبسم۔ آسیہ تزئین (لکھی پور) ہماری آنٹی ملکہ زرنگار اور انکل عبد الغنی (پرنام بٹ) کو اللہ پاک نے ۲۴ ستمبر ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بوقت ۷ بجے دن دوسری بار پیاری سی بچی عطا کی، نام اُمّ سلمہ عرف شرین نشاط رکھا گیا۔ دعا ہے کہ بچی عمر طویل پائے اور والدین کے سایۂ عاطفت و محبت میں پرورش پائے۔

● حریم کی قدیم سرپرست بہن شمس النساء محسن صاحبہ (مدراس) کی صاحبزادی عذرا سلمہا اور نوشہ سید نصیر سلمہٗ کے گلشن حیات میں ۲ جولائی ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت ایک بجے دن ایک پیاری بچی عالم وجود میں آئی۔ نام نورین سلمہا قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔ بہن شمس النساء محسن صاحبہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں نسیم الکھنوی

● مسز فیروز سلطان مرچکر (اندھیری۔ بمبئی) میرے چھوٹے بھائی اشفاق عباس قاضی اور بھابی اختری اشفاق کے گلشن حیات کو پُر بہار بناتے ہوئے پہلی بار بتاریخ ۱۹ جون ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت ایک بجے دن ایک پھول کھلا۔ نام سہیل قرار پایا۔ اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ میرے بھتیجے کی زندگی دائمی مسرتوں کا گہوارہ بنی

رہے اور والدین و بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● صوانی صبیحہ عباسی (آمبور) - میری ماموں زاد بہن فرحانہ عثمان و بہنوئی عثمان علی خاں صاحب (مدراس) کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ۵ ؍ ستمبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت ۹ بجے شب ایک پیاری سی گڑیا عطا فرمائی۔ نام مہرینہ ناز قرار پایا۔ رب العزت سے دعا ہے کہ اس کلی کی مہک سے سارا خاندان مہکتا رہے۔ عمر دراز پائے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● مہ ناز فریدی (مراد آباد) میرے بڑے بھائی محسن عالم و بھابی سما کے گلشن حیات میں ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ء بروز پیر ایک کلی کے بعد ایک پھول کھلا۔ نام شاہ اعظم قرار پایا۔ خدا کرے شاہ اعظم سلمہٗ کو اللہ پاک دونوں جہان کی نعمتیں بخشے۔ آمین۔ (آپ نے تین خبریں بھیجی ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کو یہ لکھنا چاہئے تھا کہ کون سی خبر کس ماہ میں چھپے۔ ٹکٹ صرف پچاس پیسے کے آئے۔ مزید ایک روپیہ روانہ کریں تاکہ دسمبر جنوری میں بقیہ خبریں چھپ سکیں۔

● ابن حرمت افضل (وانمباڑی) میری بہن ابن تنویر کوثر اور بہنوئی ابن اقبال احمد کے گلشن حیات میں ۲۹ اگست ۱۹۸۱ء بروز ہفتہ دن میں ۳ بجکر ۵ منٹ پر ایک چاند سی کلی کھلی۔ نام عائشہ تنویر رکھا گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک نومولود کو عمر طویل بخشے اور والدین کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔ آمین

پیغامات نشاط

● میری بہو مسز نجمہ ڈاکٹر شمیم الغونوی کے سب سے چھوٹے بھائی ظفر الحسن سلمہٗ (پسر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب سابق صدر اردو ڈپارٹمنٹ لکھنؤ یونیورسٹی) کی شادی خانہ آبادی فریحہ سلمہا دختر نیک اختر جناب قسیم الدین صدیقی (ریٹائرڈ جج) کے ہمراہ ۲۰ ؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز منگل بوقت ۷ بجے شب بمقام برلنگٹن ہوٹل لکھنؤ۔ بصد تزک و احتشام عمل میں آئی۔ جس میں کافی معززین نے شرکت کی۔ شادی کے بعد ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب اور بہن مسز سرور فاطمہ عثمانی صاحبہ نے ۲۱ ؍ اکتوبر کی شب میں مسلم مسافر خانہ چار باغ لکھنؤ میں اپنے اعزہ، قربا اور معززین کو شاندار دعوت ولیمہ دی۔ یہ شاندار شادی عرصہ تک لوگوں کو یاد رہے گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ظفر سلمہٗ اور فریحہ سلمہا کی زندگی کو خوشگوار رکھے۔ نسیم الغونوی۔

اس شادی کے سلسلہ میں ایک سہرا بھی تقسیم ہوا جو ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ساز عشرت پہ ہوئے نغمہ سرا سہرے کے پھول
ہیں رخ نوشاہ پر کیا خوش نما سہرے کے پھول
اپنے دامن میں لئے ہیں رنگ و نکہت کی بہار
خوش ادا و خوش جمال و خوش نما سہرے کے پھول
جلوۂ حسن ظفر ہے ضو فگن چاروں طرف
بن گئے ہیں نور و نکہت کی فضا سہرے کے پھول
مل رہی ہیں ساری لڑیاں اس طرح باہم گر
جیسے ہیں مدت سے باہم آشنا سہرے کے پھول
شادی فرزند سے نور الحسن مسرور ہیں
جانتے ہیں اُن کے دل کا مدعا سہرے کے پھول
دے رہی ہے آج سرور اور نجمہ یہ دعا
پھولتے پھلتے رہیں یوں ہی سدا سہرے کے پھول
ہیں شمیم و نجمی و نکہت و صفیہ اور سعید
کس قدر خوش، دیکھ کر رنگیں ادا سہرے کے پھول
ہے فریحہ نام دلہن کا تو پھر کیونکر نہ ہوں
راحت افزا، فرحت افزا، جانفزا سہرے کے پھول
تازگی کا ان کے اے عرفان پھر کیا پوچھنا
چن کے لاتی ہے گلستاں سے صبا سہرے کے پھول

پیش کردہ:- عرفان لکھنوی

● میرے کرم فرما منشی عبد الصمد صاحب مرحوم متوطن الغونہ کے فرزند نسیم سلمہٗ عرف منّا، متوطن الغونہ حال لکھنؤ نے اپنے دو نواسوں محمد فہیم سلمہٗ اور محمد وسیم سلمہٗ کی شادیاں دختران محمد ابراہیم صاحب (کلکتہ) اور جلیل احمد صاحب (ٹانڈہ) سے ۱۴ ؍ اکتوبر اور ۱۹ ؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو علی الترتیب کیں اور اس سلسلہ میں بشرت گنج بھیڑی منڈی لکھنؤ میں ۲۳ ؍ اکتوبر ۸۱ء کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ جس میں لکھنؤ کا مشہور کھانا متنجن بھی تھا، جسے اب لوگ فراموش کر چکے ہیں۔

اس موقع پر تقریباً تمام معززین الفونہ نے بھی شرکت کی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک دونوں دولھا دلہنوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ آمین۔ (نسیم الفونوی)

● روبینہ پروین (کانپور) میری باجی ریحانہ خاتون صاحبہ کی شادی بھائی جمشید عالم صاحب (فرزند محمد یوسف صاحب مرحوم) کے ہمراہ ۲۶ اگست ۱۹۸۱ء بروز بدھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ میری بھائی جان اور باجی جان ایک جان دو قالب بنکر زندگی گذاریں۔

● مبصر کامراں۔ کاشف (آمبور) کی مرسلہ ایک خبر شادی کے ضمن میں چھپی تھی۔ اسے یہیں درست فرمالیں۔ دولھا کا نام رفیق احمد ہے اور دولھا کے والد محترم کا نام حبیب الرحمٰن ہے اس غلطی پر ہمیں افسوس ہے۔ نسیم الفونوی۔

● امتہ المجیب سہیلہ (ہاسن) میرے بھائی عزیزی رضوان اللہ خاں عرف جمیل احمد (بن عبدالجبار خاں مرحوم) کی شادی شیر النساء (بنت محمد حنیف صاحب۔ ٹمکور) سے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے ہمارے بھائی اور بھابھی کی زندگی کو ہمیشہ مسرتوں سے ہمکنار رکھے۔ آمین۔

● نیلوفر سعد نجمہ نور (آمبور) میری بھانجی روبینہ صنوبر (بنت ڈی۔ ایم بشیر احمد صاحب ویلور) کا عقد سعید رفیق احمد۔ بی ایس سی (فرزند عالی جناب ایم حبیب الرحمٰن وانمباڑی) کے ساتھ ۱۶ اگست ۱۹۸۱ء بروز اتوار بمقام باقیات صالحات ویلور بحسن و خوبی انجام پایا۔ اور وانمباڑی ہی میں دعوت ولیمہ دی گئی۔ دعا ہے کہ دونوں ایک جان دو قالب ہو کر رہیں۔

● محترم نور الحسن قدوائی صاحب (قصبہ رسولی۔ بارہ بنکی) نے اپنے بھتیجے عزیزی غفران الحسن سلمہٗ (لکچرار جامعہ۔ دہلی) (پسر جناب حفیظ الحسن قدوائی) کی شادی کے سلسلہ میں محلہ جہال لکھنؤ میں دعوت ولیمہ دی گئی۔ میں تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے معذرت خواہ ہوں کہ اپنی مجبوری کے باعث شریک نہ ہوسکا۔ (نسیم الفونوی)

● اپنا۔ ایس مخدوم حسین (میسور) کی صاحبزادی مہ تاج سلمہا بی۔ اے کی شادی ڈاکٹر این۔ پی قریشی (فرزند مسٹر اے۔ آر قریشی۔ میسور) کے ہمراہ ۹ اگست ۱۹۸۱ء بروز اتوار بمقام میسور بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے (نسیم الفونوی)

● نیاز احمد صدیقی (لکھنؤ) کی دختر نیک اختر عذرا صدیقی کی شادی ہمراہ اویس عثمانی (فرزند مسٹر محمد ادریس وکیل گونڈہ) ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز منگل بمقام جھوائی ٹولہ لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

● قمر مہدی، فریدہ بانو، نعیمہ بانو (اکادی۔ کوڈیا) ہماری پھوپھی زاد بہن اختر بانو (بنت سید حسین صاحب) ہمراہ سید جعفر صادق (ابن سید قاسم صاحب مرحوم) بمقام حیدرآباد ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء بخیر و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان دونوں کی زندگی مسرتوں اور شادمانیوں میں گزارے۔ آمین

● پریا نکیم محمد حنیف صاحب (وانمباڑی) کے ہمشیرزادہ احمد عتیق سلمہٗ (فرزند عبدالحمید صاحب مرحوم) کی شادی ہمراہ مسرت جہاں سلمہا (بنت جناب مانگوڑی عبدالرحمٰن) ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار بمقام آمبور بحسن و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔ نسیم الفونوی۔

● صابر علی صاحب کی دختر نیک اختر شہناز سلمہا کی شادی ہمراہ دبیر الدین سلمہٗ ایم۔ اے (فرزند حکیم الدین صاحب فتحپور ضلع بارہ بنکی) بتاریخ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز دوشنبہ بمقام ملکہ گیتی گیٹ لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

● بیگم صاحبہ، سید انصار حسین رضوی صاحب مرحوم (امراؤ گاؤں۔ لکھنؤ) کے فرزند دلبند سید تنویر حیدر رضوی سلمہٗ کی شادی ہمراہ افشاں فاطمہ (دختر نیک اختر احتشام علی صاحب نونہروی۔ نواب گنج۔ کانپور) بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز سنیچر بوقت ۸ بجے شب بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعوت ولیمہ امراؤ گاؤں میں ۱۱ اکتوبر بروز اتوار دی گئی جس میں بکثرت معززین نے شرکت کی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم الفونوی)

• سید ولی الحسن عرف ولن سلمہٗ کے عزیز دوست ڈاکٹر نہال رضا عرف شبن میاں سلمہٗ خلف اکبر ڈاکٹر محمد رضا عرف اچھو میاں سلمہٗ عسکری منزل قصبہ رُدولی کی شادی خانہ آبادی نور بخششی ہما سلمہا دختر نیک اختر سید حیدر کرار حسین کاظمی سلمہٗ محلہ صوفیانہ رودولی کے ساتھ شب ۲۴ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ کو بطریق احسن انجام پائی اس سلسلہ میں ڈاکٹر نہال رضا سلمہٗ کی طرف سے ۲۴ ذی الحجہ مطابق ۲۳ اکتوبر بوقت ۱۰ بجے دن عسکری منزل رودولی میں ایک دعوت ولیمہ ہوئی جس میں ممتاز افراد اور اہل قصبہ نے شرکت کی۔ افسوس کہ میں اپنی خرابی صحت کے باعث اس مسرت میں شریک نہ ہوسکا مگر میری دعا ہے کہ پروردگار یہ تقریب سعید تمام متعلقین کو ہر طرح مبارک ومسعود فرمائے۔

جمیل رُدولوی (ادارہ حریم)

انتقال پُر ملال کی خبریں

• آمنہ خاتون زیدی (نئی دہلی) .. افسوس میرے جیٹھ سید آغا حسنی زیدی (بڑا گاؤں) بعارضہ ٹائیفائڈ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ء بروز بدھ میڈیکل کالج لکھنؤ میں ہم لوگوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم کی عمر ۶۱ سال کی تھی۔ پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• رابعہ قادر (موتی پور) .. افسوس صد افسوس کہ میری پیاری امی صفیہ بانو صاحبہ ۲۲ اگست ۱۹۸۱ء بوقت گیارہ بجے دن اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مرحومہ بڑی نیک صفات بزرگ تھیں۔ سارا خاندان ان کے لئے سوگوار ہے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل دے۔

• مہ ناز فریدی (مراد آباد) میری عزیز سہیلی قمر جہاں ٹائفس میں چار روز مبتلا رہ کر ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت ۹ بجے شب ہم سب سے جدا ہو کر اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ مرحومہ نیک خصلت اور بڑی ملنسار تھیں۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

سالنامہ حریم ۱۹۸۲ء

حریمی بہنوں کی اطلاع کے لئے یہ خبر دے رہا ہوں کہ جنوری ۱۹۸۲ء میں حریم کا سالنامہ عفت بہن کے ناول "شرط" کی شکل میں شائع ہوگا۔ شرط بیحد دلچسپ ناول ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حریمی بہنیں اسے بہت پسند فرمائیں گی۔

حریم کی سالانہ قیمت میں پھر اضافہ

نہایت افسوس کے ساتھ شائع کر رہا ہوں کہ یکم جنوری ۸۲ء سے پھر حریم کی سالانہ قیمت میں ایک روپیہ کا اضافہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ہر چیز روز بروز گراں ہوتی جا رہی ہے جس کا تجربہ خود حریمی بہنوں کو بھی ہوگا۔ اس لئے ہم مجبور ہو کر پھر اضافہ کر رہے ہیں حریمی بہنیں نوٹ فرمالیں کہ اب سالانہ معمولی قیمت منی آرڈر سے اکیس ۲۱ روپیہ اعزازی چھبیس ۲۶ روپیہ۔ مخصوص چوبیس ۲۴ روپیہ ہوگی۔ وی پی سے منگانے کی صورت میں چار روپیہ زائد لئے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ فرمائیں مگر اس طرح کہ (صرف وہ بہنیں جن کی مدت خریداری دسمبر ۱۹۸۱ء میں ختم ہوتی ہے) منی آرڈر دفتر حریم میں ۲۵ دسمبر ۱۹۸۱ء تک وصول ہو جائے۔

• "آپ کے شوہر کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولیاں ہیں"

"کب دینی ہیں یہ گولیاں"

"یہ گولیاں آپ کے لئے ہیں ان کے لئے نہیں"

• ایک فلسفی گھر میں داخل ہوا تو میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ دیکھ کر چونک گیا۔ یہ میز پر گلدستہ آج کس خوشی میں سجایا گیا ہے؟ اس نے بیوی سے پوچھا۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ آج آپ کی شادی کی سالگرہ ہے۔

اوہ! پروفیسر نے ٹھنڈا سانس بھرا جب تمہاری شادی کی سالگرہ ہو تو مجھے بتا دینا میں بھی کوئی ایسا ہی انتظام کر دوں گا۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے، بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ شعر موزوں، پاکیزہ اور معیاری ہو، ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ جو اشعار ۱۰ر تاریخ کے بعد وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں کئے جاتے۔ دسمبر کے لئے عنوان ہے "خیال" اور جنوری کے لئے "رحمت"۔

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

مرسلہ:۔ بی عرفانہ منظور۔ بی فرحانہ پروین (آمبور)

پھول بننے کی خوشی میں مسکرائی تھی کلی
کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام ہے

مرسلہ:۔ گوہر فاطمہ (آرہ)

دینے والے کسی کو غریبی نہ دے
موت دیدے مگر بدنصیبی نہ دے

مرسلہ:۔ نجمہ حافظ (ٹنکور)

موت کی آرزو میں جیتے ہیں
زندگی ہم کو تو راس آہی گئی

مرسلہ:۔ نکہت تنویر (ڈالٹن گنج۔ پالاموں)

موت و ہستی کی کشاکش میں کٹی عمر مری
تم نے جینے نہ دیا شوق نے مرنے نہ دیا

مرسلہ:۔ شمعونہ روحی (حیدرآباد)

کرب نشاط بن گیا موت حیات ہو گئی
عشق میں جب بدل گیا زاویۂ خیال بھی

مرسلہ:۔ نجمہ انصار مٹا (بھٹکل)

جینا ہے تو اٹھ اور لڑا موت سے آنکھیں
اے دوست زمانے کا گلہ شام و سحر کیا

مرسلہ:۔ رقیبہ خاتون (کلکتہ)

غم ہی غم ہے خوشی کے پردے میں
موت ہے زندگی کے پردے میں

مرسلہ:۔ شاہدہ تبسم یوسفی (گمبی پور)

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

مرسلہ:۔ رضیہ جبیں (کرنول)

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مرسلہ:۔ شاہینہ بیگم (کانپور)

موت اک دام گرفتاری تازہ ہے مگر
یہ نہ سمجھو کہ غم عشق سے آزاد کیا

مرسلہ:۔ عطیہ، ذکیہ، رقیہ، فوزیہ (کرشنا پوری پٹنہ)

مجھے اس طرح موت آئے الٰہی
کہ ہو سامنے شہر یار مدینہ

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (بنگارا پیٹ)

آبیٹھ ابھی کر رہا تھا یاد تجھی کو
اے موت حقیقت میں تری عمر بڑی ہے

مرسلہ:۔ ثریا بدلی (پٹنہ)

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

مرسلہ:۔ ساجدہ بیگم (بنگارا پیٹ)

موت سے اور کچھ ملے نہ ملے
زندگی سے جان چھوٹ جاتی ہے

مرسلہ:۔ قرۃ العین (نندیال)

زندگی ہے شیشہ و تیشہ کے ٹکرانے کا نام
موت ہے شیشے کے چکنا چور ہو جانے کا نام

مرسلہ:۔ امروز جہاں (آرہ)

کون سہہ سکتا ہے حیات جاوداں کی تلخیاں
زندگی پر موت کا کتنا بڑا احسان ہے

مرسلہ:۔ روحی اختر (آرہ)

ہر لمحہ اگر موت کا خطرہ ہے تو کیا ہے
یہ دورِ ترقی ہے مرے دوست نہ گھبرا

مرسلہ:۔ منصور احمد نیازی (کلکتہ)

تم عز آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

مرسلہ:۔ فرزانہ زیدی (بہٹ سہارنپور

موت کے انتظار کو دستِ زندگی نہ دے
مرگ خزاں نصیب کو پھول کی تازگی نہ دے

مرسلہ:۔ ہاجرہ نسرین لاری (متونا تھ بھنجن)

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مرسلہ:۔ صواتی صبیحہ عاشی (آمبور)

چھینی گئی نہ موت سے بھی زندگی مری
میں خاک ہو کے سارے جہاں میں بکھر گیا

مرسلہ:۔ نوشابہ عامر صدیقی ایم۔ اے (ابزاری باغ)

موت آنے تک نہ آسئے اب جو آئے ہو تو ہائے
زندگی مشکل ہی تھی مرنا بھی مشکل ہو گیا

مرسلہ:۔ علیم احمد (کرنول)

کم سے کم موت سے ایسی مجھے امید نہیں
زندگی تجھ سے تو سہے دھوکے پہ دھوکا کھایا

مرسلہ:۔ نجمہ ایوب (علی گڑھ

تم بھی دعا کرو کہ خدا صبر دے مجھے
یا موت دے کہ صبر کا اب حوصلہ نہیں

مرسلہ:۔ نسیم شاہدہ بلیاوی۔ (جھریا)

آئے ہے بیکسئ موت پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لکھنؤ)

لطائف

● انگریزی ناول نگار کوریلی نے شادی نہیں کی تھی۔ بغیر شادی شدہ رہنے پر کوئی پچھتاوا بھی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ اس کی نیک دل سہیلی نے ازراہ ہمدردی پوچھا تم نے شادی کیوں نہیں کی؟

وہ بولی شادی کیوں کروں۔ میں نے تین پالتو جانور پال رکھے ہیں جو خاوند کی جگہ بآسانی لے سکتے ہیں یہ کتا ہر صبح سویرے بھونکتا ہے یہ طوطا ہر شام کو ایک ہی فقرہ دہراتا ہے اور میرا بلا رات کو دیر سے گھر آتا ہے۔

● ایک موٹر ساز کمپنی کے مالک سے کسی نے پوچھا!
" آپ کی ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز کیا ہے؟"
کمپنی کے مالک نے جواب دیا۔
" وہی جو میری کاروباری زندگی کا راز ہے۔ یعنی ایک ہی ماڈل سے وابستہ رہنا"

● پیاری! بیوی نے شوہر سے کہا کچھ یاد ہے؟
آج ہماری شادی کو پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے میں نے تمھیں خوش کرنے کے لئے ایک بہت ہی خوبصورت چیز خرید لی ہے۔
شوہر نے فخر سے کہا۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایسی بیوی ملی۔ جو میرا خیال رکھتی ہے۔ ذرا دیکھوں تو کیا لائی ہو؟
" ایک منٹ ٹھہرو" بیوی نے کہا میں ابھی پہن کر دکھاتی ہوں"

● بوڑھی پڑوسن نے چند روزہ دلھن سے پوچھا "بیٹی شادی سے پہلے تم کیا کرتی تھیں؟"
" میں مسز سلمیٰ کے ہاں برتن، فرش، کپڑے دھونے اور کھانا پکانے پر نوکر تھی"
" تب تو تمھیں نئی تبدیلی بہت پسند آئی ہوگی؟"
دلھن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "جی ہاں اب وہی سارے کام مجھے کسی تنخواہ کے بغیر انجام دینا پڑتے ہیں"

● عورت مرد کے دوش بدوش چلتی ہے مگر صرف بازاروں میں"

شگون	ناول	گلشن نندہ	7/-
سانولی رات	"	"	5/-
چندن	"	"	6/-

یہ ملبوس عریاں عورتیں

محمد وزیر علی حیدرآباد

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اے آدم کی اولاد بے شک ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہارے ستر (شرم گاہ اور چھپائے جانے والے حصوں) کو ڈھانکتا ہے۔ اور زینت کا موجب ہے اور تقوے کا لباس یہی بہتر ہے۔ (الاعراف) . . . . اس سورہ میں لباس کی غرض جو بیان ہوئی ہے وہ جسم کے پوشیدہ رکھے جانے والے حصوں کو ڈھانکنا اور زینت حاصل کرنا ہے۔ ساتھ ہی بتلا دیا کہ لباس وہی بہتر ہے جو تقوے (خدا سے ڈر) اور پرہیزگاری کا ہو۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رُبَّ کاسیاتٍ عاریاتٍ (کتنی ایسی عورتیں ہیں جو کپڑے پہن کر بھی برہنہ ہیں۔ ایسی عورتوں کے لیے حضور اقدس ؐ نے سخت وعید فرمائی کہ جو عورتیں کپڑے پہن کر بھی عریاں رہتی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں کرے گا، یعنی جنت میں جانا تو دور کی بات ہے، بے حیائی کا لباس پہننے والی عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکیں گی۔

کس قدر سخت وعید ہے اور کتنی زبردست سرزنش مگر افسوس آج مسلمان کہلانے والی عورتیں بالکل ننگا لباس پہن رہی ہیں۔ پہلے تو ایسا لباس جس سے جسم کی ساخت اور نشیب و فراز ظاہر ہوں پہننا حرام ہے اور جب کہ اس میں بھی ننگاپن اور عریانیت ہو تو اندازہ لگائیے کہ کس قدر گناہ اور عذاب کا باعث ہوگا۔ ہم کو تو فل بلاؤز پہننے ہی پر اعتراض تھا لیکن جدید تراش تو اب ایسی ہو گئی ہے کہ تمام پوشیدہ حصے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ لباس عورتوں کا کس قدر ہے بیہودہ

بہیمیت کا نمونہ اور فسق کا تمغہ

اسی لباس میں ساس داماد کے سامنے، بہو خسر کے آگے سالیاں بہنوئی کے سامنے، بلکہ مریدنیاں مرشد قبلہ کے روبرو ہو جاتی ہیں۔ نہ پہننے والے کو غیرت نہ پہنانے والوں کو حمیت۔ اسی برہنہ لباس سے غیر مردوں میں بھی پھرتی ہیں، خود بھی گنہگار ہوتی ہیں اور دوسروں کو بھی گناہ گار بناتی ہیں۔

نمازی عورتیں ایسے ہی لباس سے نماز پڑھ لیتی ہیں۔ حالاں کہ اگر عورت کے جسم کا کچھ حصہ تو کیا بلکہ اگر اس کی کلائی یا ٹخنہ نماز میں نظر آجائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ پیٹ اور پیٹھ اور کھلے بازو نظر آئیں تو نماز کیسے درست ہوگی؟ . . . . . .

اللہ تعالیٰ مسلم خواتین کو بے حیائی کے لباس سے بچنے اور عذاب سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، لباس، انسانی ضرورت ہی نہیں بلکہ شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

میرے ایک دوست ہیں۔ خیر سے بیچارے دین دار کچھ عرصہ پہلے ان کی شادی ہوئی۔ لڑکی ایم۔ اے۔ بی اور ساتھ نے پرسنہا کا ئیز نگ میں ڈپلومہ بھی رکھتی ہیں۔ اب محترمہ جو گھر آئیں تو ان کی قینچی نہ صرف اپنی نندوں پر چلی بلکہ بوڑھی ساس بھی محفوظ نہ رہ سکیں، ساس صاحبہ بھی بغیر آستین والا نیچی تراش کا بلاؤز استعمال کرتی ہیں۔ بیچارے ہمارے دوست پریشان ہیں کہ کیا کریں . . . .

آخر میں، میں اپنا یہ مضمون ایک دلچسپ لطیفہ پر ختم کرتا ہوں . . . ایک تقریب میں ایک محترمہ نے کافی نیچی تراش کا بلاؤز پہن کر آئیں۔ گلے میں ایک لاکٹ لٹک رہا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک ننھا سا ہوائی جہاز تھا۔ ایک نوجوان بار بار محترمہ کے سینے کو دیکھ رہا تھا۔ محترمہ نے جھینپ کر کہا . . . . "شاید آپ کو یہ ہوائی جہاز بہت پسند آیا ہے"

"جی نہیں ہوائی اڈہ"، نوجوان نے برجستہ جواب دیا۔

باپو نے کہا تھا....
سارے مذاہب بنیادی طور سے ایک ہی ہیں اگرچہ
وہ پھیلاؤ (وسعت) اور باہری شکل میں ایک دوسرے
سے علاحدہ ہیں۔ کوئی بھی دو پتّے آپس میں نہیں لڑتے،
بلکہ ہوا میں ساتھ ساتھ خوشی سے ناچتے ہیں اور ایک
ساتھ مل کر مدھر (سُریلی) موسیقی بناتے ہیں۔
کیا آج
اُن کے یوم پیدائش پر ہم ان کے
اقوال کے مطابق جینے کا عہد کرتے ہیں۔
محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ اُترپردیش

کہا ایک لفظ بھی نہیں ۔!"

" سجو" سنجر کے لبوں سے بمشکل نکلا اور دفعتہً وہ کسی حجاب کے بغیر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ۔!

باجی ہکا بکا رہ گئیں ۔ دیر تک ان کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا ۔ سنجر کو کیا ہو گیا تھا ۔ پاگل ۔ کون سی ایسی بات تھی جسے اس خبطی لڑکے نے سنجیدگی سے محسوس کر لیا تھا ۔؟

سنجر ؟ ! " بالآخر باجی نے خشک حلق سے آواز کھینچی ۔

آپ نے ۔" سنجر نے کہا ۔ اور یکبارگی اٹھ کر چلا گیا ۔

سنو تو سنجر ۔ پاگل ۔" وہ اس کے پیچھے لپکیں اور جھپٹ کر اس کے قمیص کا کالر پکڑ لیا ۔

" سیدھی طرح نہیں چلوگے تو گھسیٹتی ہوئی لے جاؤں گی ۔!"

اور پھر وہ سرکش مینڈھے کی طرح گھسیٹتی ہوئی لائیں ۔ واپس کین چیئر پر دھکیل دیا خبردار اٹھنا مت ۔ جب تک کہ اپنے ڈائیلاگ کا پورا پورا مفہوم بتا نہ دیا کچھ نہیں! وہ اب زچ ہو رہا تھا ۔!

نہیں بتاؤ گے ؟ ! " ان کا لہجہ چیلنج کر رہا تھا ۔

مار ہی ڈالیں گی تو نہیں آپ مجھے ۔

نخرے بند کرو ۔ تمہارے ٹکڑے اڑا دوں گی ۔ تم روانی سے مکالمہ بک رہے تھے مجھ سے ۔ معلوم ہے میں تم سے پورے چھ سات مہینے ۔۔۔ !"

اچھی طرح معلوم ہے ۔ اب یہ رٹ رکھنا چھوڑ دیجئے " سنجر نے خاصی گستاخی سے جواب دیا ۔ میرے دل سے آپ کی انسانوی اہمیت قطعی نکل چکی ہے ۔

اچھا تو پھر ۔ (باقی آئندہ)

بھابی سے کاتی بنوائے گا ؟ " چچی جان نے آنکھیں نکالیں ۔

بالکل جناب ۔ آخر اسی بہانے مجھے تنہائی تو نصیب ہوگی " رحمان صاحب نے کہا ۔

اے لو ۔ جانا کاہے کا ۔ میں جا رہی ہوں ۔ " ہمی ہنسنے لگیں ۔ " مگر کافی نہیں بھیجوں گی ۔ ! " وہ ہنستی ہوئی چلی گئیں اور دروازے کا پردہ برابر کرتی گئیں

آپ کو تو کچھ خیال ہی نہیں ہوتا " چچی جان سرخ ہو گئیں " میرے منہ دکھانے کی جگہ نہیں رکھتے ۔ اب بھابی ہنسیں گی مجھ پر ۔ کچھ تو سوچا کیجئے کہ ماشاء اللہ ... ہو گیا ہے ۔!

ہو جائے لڑکا جوان " رحمن صاحب نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں اپنے پہلو میں کھینچ لیا " اس کا مطلب یہ کہاں ہے کہ ہم بوڑھے ہو گئے ۔ اچھا ظلم ہے صاحب کہ ہم تو الٹے سیدھے بہانے بنا کر بھاگ بھاگ کر آئیں اور یہاں ۔ سنو بیگم ۔ گھر کب چلو گی ۔ میں دو روز اور رہوں گا ۔!"

" میری ناک نہ کٹا دیجئے ۔ خدا کے واسطے " وہ گھبرا گئیں گھبرا گئیں " آپ کو رہنا ہو یہیں رہئے ۔ آپ کے ساتھ گھر تو ہرگز نہ چلوں گی ۔!"

لیکن اس طرح مجھے تڑپانا اور ترسانا تو ٹھیک نہیں ہے ۔

چپ رہیے ۔ آپ بوڑھے ہو چکے ۔! " وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر دور جا بیٹھیں ۔

اچھا میں بھائی صاحب سے اجازت لے لوں جب تو چلو گی " رحمن صاحب نے کہا ۔

کاہے کی اجازت " وہ گھبرا کر بولیں ۔

تمہیں گھر لے جانے کی ۔!" وہ ہنستے ہوئے بولے ۔

وہ پھنکار کر خاموش ہو گئیں ۔ دروازے پر آواز آئی ۔

" چائے ۔!"

آپ چائے پی کر سوئیے ۔ میں تو چلی ۔! " چچی جان نے منہ نکال دیا ۔

چل دیں۔!

بڑے ابا کا حکم تھا کہ گھر کا کوئی فرد رات گئے تک باہر نہ رہے۔ اکثر انھوں نے بڑے ملائمیت پر سنجر یا اپنے بھائیوں ہی کو سزا دی تھی کہ دو دو روز کے لیے انھیں گھر پر نظر بند کر دیا تھا۔

اس رات سنجر کی شامت آئی تھی۔ اس کے دو تین دوست یونیورسٹی سے آگئے تھے۔ گپ شپ کر کے انھوں نے فلم کا پروگرام بنایا۔

سنجر اندر اجازت لینے آیا۔

صحن میں امرینہ سے مڈبھیڑ ہوئی!۔ اسی کو غنیمت جان کر سنجر بولا: "سنو یار میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ایک بجے رات تک آؤں گا۔"

"دعوت ہے کوئی؟" نہایت بھولے پن سے امرینہ نے پوچھا۔

"ہاں ہاں ایک دوست کے یہاں ولیمہ کی دعوت ہے۔" سنجر خوش ہو کر بولا: "اب تم جانو کہ ایسی دعوتوں میں رات تو ہو ہی جاتی ہے۔! مگر۔ بڑے ابا نے پوچھ لیا تب۔؟"

"تب کیا! آپ لوگ تو ان سے اس قدر ڈرتے ہیں کہ انھیں ہوّا سمجھ لیا ہے۔ اب وہ اتنے سخت گیر نہیں رہے۔ سچی!" وہ ہنس پڑی۔

"اچھا تو سنو۔" سنجر بے تکلفی سے بولا: "دعوت وعوت میں نہیں جا رہا ہوں۔ وہ نعمت، ساجد اور صفدر آگئے ہیں۔ سکنڈ شو کا پروگرام ہے۔ کیا خیال ہے جاؤں؟"

"ٹکٹ کے لیے پیسے ہیں کہ میں دوں؟" امرینہ نے حاتم طائی بن کر کہا۔ سنجر نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا اور پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا: "اُو تو نہیں بنا رہی ہو۔ بھلے۔ تم اور ٹکٹ کے پیسے۔ خدا کی شان!"

باجی نے خواہ مخواہ کھانس کر گلا صاف کیا اور بے رخی سے اپنا قلم کھولنے لگیں۔ سنجر خوابوں کی سحر زمین سے تعبیر کی تلخ دنیا میں واپس آیا۔ کچھ لمحے انھیں گھورتے دیکھتا رہا۔ پھر ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ خاموشی سے باجی نے نگاہیں اٹھائیں۔ آج سنجر کھلنڈرا لڑکا نہیں لگ رہا تھا۔ جسے چٹکیوں میں اڑایا جاتا تھا۔ جس کی کوئی اہمیت ہی ان کے نزدیک نہ تھی۔ اس وقت وہ بالکل ایک مرد لگ رہا تھا جس کی گہری سنجیدہ آنکھوں میں زیادہ دیر تک نوشینہ سے جھانکا نہ جا سکا۔ انھوں نے اپنے نئے محسوسات کو لاپرواہی سے نظر انداز کر کے بدستور سرد لہجے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور پوچھا۔

"کیوں۔ کیا بات ہے۔؟"

"اپنے گناہ بے گناہی کی معافی مانگنے آیا ہوں!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"کیا؟۔ میں نہیں سمجھی۔!"

"میں بھی نہیں سمجھا۔ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔" اس کا لہجہ بدستور گلوگرفتہ تھا: "آپ ادیب ہیں۔ انسانی محسوسات کی نبض پر آپ کا ہاتھ رہتا ہے آپ انسانی فطرت کی گہرائی تک اتر سکتی ہیں۔ آپ اپنے کرداروں کی نفسیات پہچانتی ہیں۔ آپ کو کردار سازی آتی ہے۔ آپ اپنے قلم کی جنبش سے انسان کی تقدیروں کا فیصلہ کر دیتی ہیں!۔ کسی رونے والے کو ہنسا دینا اور ہنسنے والے کو آٹھ آٹھ آنسو رلا دینا آپ کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ لیکن۔ آپ۔ سے پوچھتا ہوں۔ کیا آپ جاندار کرداروں کو بھی اپنے بے جان کرداروں کے برابر سمجھتی ہیں۔ لیکن۔ کوئی حساس اور ذی شعور انسان آپ کا وہ کردار نہیں جسے آپ اپنے قلم کی ایک جنبش سے زندگی کی شاہراہ سے ہٹا کر موت کی ڈگر پر ڈال دیں۔۔ کیا اب بھی آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا!"

"نہیں۔" باجی کی سانس ان کے حلق میں گھٹ گئی: "تمہارے اس پورے مکالمہ

بیٹھی آ بیٹھیں۔ اور ضخیم مجلد کاپی قلم سامنے میز پر رکھ کر ارسطو اور افلاطون کے اسٹائل میں بجز تخیل میں غرق ہو گئیں تھا۔ اثاث البیت میں ایک ناول کا جھوڑ جانا بے حد ضروری تھا!۔ ورنہ دنیائے ادب اس عظیم خلا پر سر پیٹتی رہ جاتی! لیکن ان کا ذہن منتشر تھا۔ رات میں سوچے ہوئے سارے پر اثر جانگسل سکالمے بجانے کدھر تحلیل ہو کر رہ گئے تھے کہ ایک پلے نہ پڑا۔ انھوں نے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹیک کر نہایت ہی تمکنت اور بردباری سے آنکھیں بند کر لیں۔!

سنجر کی تو قلب ماہیت ہی ہو چکی تھی!۔ بے حد سنجیدہ اور ملول لگ رہا تھا۔ وہ دیر سے کھڑا باجی کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ آنکھیں بند کر کے اپنے جہان خیال میں پرواز کر گئیں تو وہ چپکے سے ان کے سامنے کرسی پر آ بیٹھا! اور ان کی شکل تکنے لگا!۔

بے حد سج رہی ہیں نیلے رنگ کے لباس میں۔ آسمان نیلا، فضا نیلی اور یہ دلکش پیکر نیلا۔ سارا آسمان اسی برآمدے میں سمٹ آیا تھا!۔ وہ انھیں گھورتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے روشن تابناک چہرے پر سلونی شام کی دلکش و دلفریب سرخیاں ان رخساروں پر ابھر آئیں۔ سلگتے ہوئے عارضوں پر لمبی لمبی پلکوں کا عکس جیسے نیلی جھیل کی ساکن سطح پر اونچے اونچے چناروں کے خاموش سائے۔ خوابیدہ دلکش لب۔ اور ان پر ضیا فگن چمکدار ہموار دانت۔! پسینے سے بھیگی ہوئی پیشانی پر موتی موتی گھنگھریالے بالوں کی لٹیں!۔ یہ بیدار و تازہ حسن، جس کی دید کا کیف بھی عجیب لذت افزا تھا۔ مزاج کی تیزی، معصوم برہمی، غضب ناک سبز رنگیں۔ اور۔ اور سنجر بیداری میں کھلی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھنے لگا۔

اے ہے ابھی نہ گئی کہ کب سے باجی اسے متحیر و مسحور سی کیفیت میں عالم سکون دیکھ رہی تھیں! اس کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں مگر وہ اس چہرے سے دور کہیں

آپ کی طرح کنجوس نہیں کہ جب سے آئے ہیں نہ تو ایک فلم دکھایا نہ کچھ لا کے کھلایا پلایا۔ حتیٰ کہ ایک شرٹ کا پیس تک نہیں لائے؟:

سنجر قلابازیاں کھانے لگا۔ امرینہ کو ہو کیا گیا تھا۔ آج تک تو اس نے ایسی میٹھی میٹھی بولیاں نہیں بولی تھیں۔ اس نے بے حد پیار سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ تو سر جھکائے ہوئے ڈوپٹہ کا آنچل مروڑ رہی تھی۔ از خود رفتہ ہو کر وہ بولا: اچھا اچھا کل لے آؤں گا مگر یار کہنا مت کسی سے! وعدہ کرو۔!

چوکیدار اگر پھاٹک نہ کھولے تو؟: امرینہ نے بھولپن سے کہا۔

اصلی پرابلم تو یہی ہے: مرکھجا کر سنجر نے پر تفکر انداز میں کہا: اس سے کیا کہا جائے گا۔؟۔

اجی آپ کیوں اپنی تفریح کر کری کرتے ہیں: دل ہی دل میں دانت پیس کر مگر بظاہر مسکرا کر وہ بولی: میں اسے دو چار روپے دے دوں گی آپ جب واپس آئیں گے وہ چپکے سے پھاٹک کھول دے گا!:

تو پھر جاؤں؟:

جائیے!:

ایک مشکوک نظر سنجر نے اس پر ڈالی۔ مگر اسے کوئی علامت شرارت یا مکاری کی امرینہ کے چہرے پر نظر نہ آئی۔ وہ باہر مڑ گیا!۔

باہر نکلا تو دونوں نے جھنجھوڑ رکھا یا: ہضم ہی ہو گئے اندر جا کے سالے انڈے دینے لگے تھے کیا!:

سنجر کا موڈ باغ و بہار ہو رہا تھا۔ ہنسنے لگا!۔ کچھ نہ بولا۔ اور اب تو جی فلم دیکھنے کا بھی نہ چاہ رہا تھا۔ کیا دھرا تھا۔ فلم وِلم۔ اس نے جیب ٹٹولی۔ صبح ہی کو جب ڈیڈی نے چلون اتار کر ٹانگ رہا تھا تو اس نے چپکے اطمینان سے

جیب سے پچاس کا ایک نوٹ تڑی کر لیا تھا۔ اس کے بعد خود بھی اس کا پورا خرچ
موجود تھا۔ پورے ڈیڑھ سو یا پونے دو سو تو تھے ہی۔ آج ہی تو اس شیطان کی خالہ
نے بجولین سے فرمائش کی تھی۔ "نہ تو مٹھائی نہ تو کچھ اور نہ شرٹ کا پیس؟" وہ
بوکھلا گیا۔ سچ مچ کیا وہ سنجیدہ تھی؟ چاہتی تھی کہ سنجر اسے سب کچھ لاکے دے
یا خدا۔ اس نے بےچاری کو غلط سمجھا تھا! اس کا دل الٹ پلٹ دھڑکا کیا۔!

"ارے بھائی۔ قلم کل پر رکھو۔ آج مجھے کچھ شوپنگ کرنی ہے" اس نے بہن
سے کہا۔ "شوپنگ کے بچے" صفدر للکارا "پچھاڑ کے ٹرک ہی پر ذبح کر دوں گا
پہلے سے یاد نہ آئی شوپنگ!"

"رنگ میں بھنگ کرتا ہے مردود" ساجد بھی بگڑ گیا "اسی کی خاطر یونیورسٹی
ہوسٹل سے چل کے اتنی دور آئے۔"

"ابے کیا آگ دیکھنے میں کیا اندھے ہوئے جا رہے تھے" رفعت نے ایک گال
بھی عطا فرمائی۔ سنجر بوکھلا کر بولا "چل تو رہا ہوں۔ مرتے کیوں ہو!"

فلم کا نام کیا تھا۔ موضوع کیا تھا۔ کون کون اداکار اس میں کام کر رہا تھا سنجر
کو کچھ پتہ نہ چلا اسکرین پر نظریں جمائے وہ جانے کیا سوچ رہا تھا! بالکل ہی آ
شام ہوات میں تبدیل ہوگئی۔ امرینہ کو ہنسی آ رہی تھی۔ "ٹھہرجاؤ سنجر صاحب۔
تم سے بدلہ اگر نہ لیا ہو۔" وہ کپڑا ڈھیلے کر کے چوکیدار کے پاس آئی۔ چھوٹی مالکن کو
دیکھ کر وہ اپنے اسٹول سے کھڑا ہو گیا۔

"خاں صاحب! آپ کو بڑے بابا کا حکم معلوم ہے نا۔ دس بجے رات کے بعد
پھاٹک قطعی بند کر دیا جائے اور چاہے کوئی بھی آئے کھولا نہ جائے۔"

"معلوم ہے بی بی!"

"آج تو صاحب بڑے ابا کے بہانے سینما دیکھنے چلے گئے ہیں۔"

قسم خدا کی۔ کیا بیٹے کی سی ذہنیت پائی ہے" رحمان صاحب بولے "ایسے
وہ رقم کیا بھائی نہ دھر والیں گی!"

"آپ مع بیوی بچوں کے میرے کلیجے سے آ لگیے۔ بس مجھے کرایہ وغیرہ مل
گیا" ممی نے بے خودی میں کہا۔

"کیا میرے لیے بھی یہی حکم ہے کہ آپ کے کلیجے سے لگ جاؤں" رحمن صاحب
نے بسمی شکل بنا کر کہا۔ ممی جھینپ کر ہنس دیں!

رحمن صاحب جو بہت خوش تھے اٹھ کر تخلیہ مکان کے سلسلے میں چلے گئے!

امرینہ کے سارے ارمان دل کے دل ہی میں رہ گئے۔ وہ تو یہ سوچ بیٹھی تھی کہ
سنجر کا کچومر نکلتے دیکھ کر خوش ہو گی۔ لیکن یہاں تو اس پر یہ پہاڑ ٹوٹا کہ مستقل طور
پر اسے اس کے سر پر مسلط کر دیا گیا۔ کسی کا برا نہیں چاہنا چاہیے۔ ورنہ وہ دوہری مصیبت
خود اپنے پر آتی ہے۔ چاہ کن را چاہ در پیش! یہ مثل اس دکھیا پر پوری اترتی
تھی۔ باہر نکلنے اور سنجر کی صورت دیکھنے اپنے چہرے کے دکھانے کا کوئی سوال ہی
نہ رہ گیا تھا!

میرے خدا۔ میں کیسے اس کی دل شکن بکواس برداشت کر سکوں گی۔ ابھی
کی شادی کے بعد یہ مستقل طور پر میرے ہی پیچھے لگے گی۔

وہ اندر کمرے کی گھٹی ہوئی فضا میں بیٹھی اپنے دماغ پہ بے گنتی فکروں کا بوجھ
لادے رہی تھی! اسے کالج کھلنے میں ابھی کئی دن باقی تھے پھر کیا ہوگا۔

ابھی اکا دل ابھی کسی قدر اچاٹ تھا۔ ناشتہ کے بعد وہ اپنی پسند [illegible]

"افسوس ہے کہ تم اپنے ایک بچے کی صحیح تربیت نہ کرسکے۔!"

انھوں نے اپنے لبوں پر زبان پھیری اور کچھ نہ بولے۔

غالباً تم کرایہ کے گھر میں رہتے ہو؟

جی۔!

"ہمارا مشورہ ہے میاں کہ تم اسے خیرباد کہو۔ یہاں ماشاءاللہ فاطمہ بی بی تمھاری رہتی ہیں۔ عنقریب لڑکی کی شادی ہو جائے گی۔ تنہائی بڑھ جائے گی۔ لہٰذا ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم اور آمنہ بی بی یہیں مستقل قیام کے لیے چلے آؤ۔!"

ممی نے سوچا کہ وہ گھر کے حالات سے بے خبر نہیں سب کچھ خبر رکھتے ہیں۔ دل ہی دل میں پھولی نہ سمائیں۔ رحمٰن صاحب میں انکار کی مجال ہی نہ تھی۔ جھکے سے بولے: "جی بہتر۔!"

"اگر تم فوری سروے پر نہیں جا رہے ہو تو شام تک چلے آؤ" بڑے ابا نے کہا اور پھر ہوا میں گرجے "آ رہا ہوں۔ کیوں خوامخواہ ہارن بجائے جاتے ہو۔ نامعقول:"

پھر وہ در و دیوار کو لرزاتے ہوئے چلے گئے۔!

جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تب ممی فرط مسرت سے بے قابو ہو کر اپنی پیاری دیورانی سے لپٹ گئیں۔

"میری بات تو تمھارے لیے گدھے کی لات تھی۔ ہمیشہ بی بی جل دے کر چلی جاتی تھیں۔ اب کہو۔ ارے میں کہتی ہوں کیا میرا گھر تم کو جیل معلوم ہوتا ہے۔؟"

بھابی ایمان سے: وہ بھی بظاہر مسرور تھیں۔ "یہ ان ہی کی وجہ سے میں اس دھندار گھر میں پڑی تھی۔ ہر مہینے تین سو روپے کرایہ دینا ایسا گراں گزرتا تھا کہ کل [illegible]۔ اب ہر ماہ وہ روپیہ کرایے کے نام سے اکٹھا کیا کروں گی۔"

ارے توبہ توبہ: چوکیدار نے بات اچک لی۔

بڑے ابا نے خاص طور سے میرے ذریعہ آپ کو کہلا بھیجا ہے کہ اگر آپ نے مروت کے مارے ان کے آنے پر پھاٹک کھول دیا تو آپ کو اسی وقت برطرف کر دیں گے!:

ہرگز نہیں کھولوں گا۔!" چوکیدار نے مستعدی سے کہا۔

رات کے کھانے تک بڑے ابا بھی آ گئے! وہ واش اسٹینڈ پر جھکے منہ ہاتھ دھو رہے تھے تبھی شامت اعمال سے ممی نے پوچھ لیا۔

کھانے پر سنجر نہیں آیا۔ کہاں ہے؟: ان کی آواز بلند تھی۔ بڑے ابا تک پہنچی حالانکہ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ بڑے ابا اپنے برآمدے میں موجود ہیں!۔ امرینہ نے ان کے کانوں تک بات پہنچانے کی خاطر اونچی آواز میں جواب دیا۔

ممی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سکنڈ شو دیکھنے گئے ہیں۔ میں نے منع بھی کیا تھا کہ بڑے ابا کو معلوم ہوگا تو وہ خفا ہوں گے۔ مگر کیا وہ کسی سے ڈرتے ہیں۔!

بڑے ابا نے سب سن لیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ان لوگوں نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ رحمان صاحب نے سنجر کو خوب برا بھلا کہا۔ چچی جان بیٹے کی دھاندلی اور دیدہ دلیری پر متعجب تھیں۔!

مار کھائے گا آج۔ فوشینہ نے کہا دونوں بہنیں کمرے میں بیٹھی کافی... پی رہی تھیں کسی کو امرینہ کی کارستانی کا علم نہ تھا۔

میں تو ایک بجے رات تک جاگ کر تماشہ دیکھوں گی۔ امرینہ بولی۔

آہستہ آہستہ رات کے دس بج گئے۔ سب ادھر ادھر بیٹھے گپ شپ ہانک رہے تھے دفعتاً باہر سے بھاری بھاری آہٹوں کی آواز سے چونکے! اور اس طرف متوجہ ہو گئے۔

بھائی صاحب: ممی نے چپکے سے کہا اور خوب [illegible]

رحمان ؟ : وہ اپنی بارعب آواز میں گرجے ۔

جی ۔ رحمان صاحب گھبرا کر پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے ۔

"تمہارا لڑکا نازبان ہوتا جا رہا ہے ۔ اسے معلوم ہے کہ ہم رات گئے کسی کا باہر رہنا قطعی پسند نہیں کرتے ۔ ! ہمارا حکم" ٹالنے کی اس میں ہمت کیسے ہوئی ؟ تم تو نہیں ہو اس قدر گستاخ ۔ ! ؟"

"نج ۔ جی ۔ بھائی صاحب ۔ م ۔ مجھے تو معلوم ہی نہ ہوا ۔ میں سو رہا تھا ۔ یہ تو ۔ مجھے ۔ام ۔ امرینہ سے ابھی ابھی معلوم ہوا" رحمان صاحب بوکھلاہٹ میں ہکلانے لگے ۔

معلوم تو ہو گیا تمہیں ؟ : گھن گرج سے بھر والا فقرہ آگیا ۔ رحمان صاحب سر جھکائے کھڑے رہے ! ۔

خبردار ۔ وہ آئے گا تو پھاٹک نہیں کھلے گا ۔ ورنہ ۔ ؟ " اور ایک خطرناک "ورنہ" کے بعد وہ اس طرح چلے گئے جیسے زمین کو کچل کے بل" دور کر گیا ہو ۔

تم نے بھی نہیں منع کیا" رحمان صاحب نے بیوی سے کہا ۔

مجھے بھی تو ابھی معلوم ہوا : انھوں نے رکی ہوئی سانس چھوڑ دی ۔

اچھا ہے بلقون کو سزا ملے : رحمان صاحب سخت خفا تھے : حد سے باہر چل نکلا ہے ۔ کسی کی کوئی حقیقت ہی نہیں کھتا ۔ !"

رات کے بارہ بج گئے ۔ سب اپنی اپنی خوابگاہوں میں تھے ۔ جاگ رہے تھے بے چین تھے ۔ اور بڑے ابا کے ہال سے دھر پٹخ کی آوازیں آرہی تھیں ۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی ابھی سوئے نہ تھے ! کچھ لکھ پڑھ رہے تھے ۔

چوکیدار نے بڑے سرکار کا حکم ناطق سن کر اس کی تعمیل کر دی تھی ۔ پھاٹک بند کر کے اور حسب معمول بڑا سا قفل ڈال کے وہ سونے جا چکا تھا ! ۔

تو اس کا دم قطعی نکل جائے گا ۔ !

سنجانے کیا کچھ سننا پڑے گا ۔ یرے اللہ ۔

مگر بڑے ابا کی بھاری پر رعب آواز نسبتہً بے حد دھیمی تھی ۔ پھر بھی گونج رہی تھی ۔ وہ شاید بہی سب کچھ کہہ رہے تھے ۔ مگر کوئی فقرہ مربوط ہو کر سنجر کے کانوں تک نہیں پہنچا ۔ بس وہ بے معنی سے الفاظ سن رہا تھا ۔

"آئندہ کے لیے تم بالکل آزاد ہو ۔ وہ تادیب ہی کیا جو تمہیں نازبان بنا کے ۔ لیکن یہ ہم اپنے لیے نہیں کرتے ۔ تمہیں اپنے ماں باپ کے لیے سہارا بننا ہے ۔ دوست احباب کسی کا ساتھ نہیں دیتے ۔ اور ظلم بینی نہایت معیوب اور قابل اعتراض تفریح ہے ۔ اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ ظلم بینی ایک زہر ہے جو عادت و فطرت پر آہستہ آہستہ اثر انداز ہوتا ہے ۔ !

وہ پل بھر رکے ۔ اور پھر بولے : ہم تو تمہیں کڑی سزا دیتے ۔ اس لئے نہیں کہ تم نے ہمارا قدیم اصول توڑا تھا بلکہ اس لیے کہ تم ۔ کو ۔ بگڑتا ہوا ہم نہیں دیکھ سکتے برخوردار ۔ جب تمہارا باپ تمہارے برابر تھا ۔ تب بھی ہم اسے پیٹا کرتے تھے ۔ اس پر پابندیاں بٹھائی تھیں ۔ اور آج دیکھ لو کہ وہ کس مقام پر ہے ۔ سنجر ۔ تم ماں باپ کے ایک ہو ۔ تمہی کو اچھا بننا ہے ۔ تمہی کو برا بننا ہے ۔ جیسی تمہاری مرضی ۔ ہم تو تمہیں ایک اعلیٰ مقام پر دیکھ رہے تھے ۔ مگر ۔ تم ۔ !"

بڑے ابا ! : وہ دفعتہً رو پڑا ۔ اور ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے : مجھے معاف کر دیجئے بڑے ابا ۔ !"

انھوں نے گونجدار آواز میں کھنکھار کر پکارا : چمن ۔

رحمن صاحب اپنے بھائی صاحب کے لیکچر میں ڈوب گئے تھے ۔ بے تحاشہ چونکے ! اور ان کی طرف دیکھنے لگے ! ۔

سنجر نے فلم سے واپسی پر دوستوں کو الوداع کہا۔ اور آتے آتے بہت اچھی اچھی مٹھائی خریدی۔ ایک فل پیکٹ کیڈ بری کا لیا۔ افسوس کہ کوئی بڑا کلاتھا جو وہ کھلانہ تھا ورنہ شرٹ کا پیس بھی خرید لیتا۔ خوش خوش ایک ٹاکسی کرائے کیا اور اسے تیز چلانے کا حکم دے کر مزے میں گانے لگا۔!

گھر پہونچا تو۔ یا للعجب، پھاٹک مقفل۔ لان پر تاریکی اور یہاں سے وہاں تک سناٹا۔

خان صاحب ارے۔ اں۔ پھاٹک کھولیے۔! اس نے ہانک لگائی۔ جو سناٹے میں اندر تک پہونچی۔

دو منٹ انتظار کے بعد اس نے پھر پکارا۔ اجی میں نے کہا۔ خان صاح ح۔ ح ح۔!"

چوکیدار اٹھ کر آیا اور لٹھ سا رسید کر دیا۔ "پھاٹک نہیں کھلے گا۔ چھوٹے صاحب۔ مجھے حکم نہیں ہے۔ آپ بار بار اس طرح مت پکاریئے۔!"

گستاخ۔ بدتمیز، رشوت لینے کے بعد بھی یہ سینہ زوری! سنجر کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگا! اس نے مٹھائی کا ڈبہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں لیا اور پھر نسبتاً کم آواز میں پکارا۔ ڈیڈی۔ او۔ ڈیڈی۔ پلیز دروازہ کھولیئے۔

مگر ڈیڈی میں اتنا دم کہاں تھا کہ وہ بڑے ابا کے ہال کے سامنے سے گزر کر باہر جاتے اور دروازہ کھلواتے۔ سانس گھونٹے پڑے رہے۔!

سڑک پر سناٹا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر سنجر نے ہانک لگائی۔ بڑی امی۔

او بڑی امی مگر صدائے برنخواست۔

امی۔ امی۔!

جواب ندارد۔

کو اپنی منزل بنائے گا۔ مگر نہیں وہ کھڑے رہے تب تک کہ سنجر اندر نہ آگیا پھر اس نے دور تے ڈرتے روش پر قدم بڑھائے۔ اور پورچ تک پہونچ گیا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ انھوں نے پھاٹک بند کر دیا تھا اور اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔!

اور دوسرا کوئی فرد اس کو راہ میں نظر نہیں آیا۔ سنجر کو یہ سناٹا طوفان سے قبل ہونے والا خوفناک سناٹا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا۔ ڈبہ فرش پر پھینکا اور اپنے جوتے بغیر بستر پر گر پڑا۔

آج تو نیند بھی دشمن بن گئی تھی۔ یا وہ بھی اسے سزا دینے پر تل گئی تھی۔ پل بھر کو نہیں آئی۔ سنجر کے دماغ میں دھما چوکڑی مچی تھی۔ نوشینہ کی خفگی، امرینہ کی شرارت اور سب پر مستزاد بڑے ابا کی ہولناک خاموشی۔ وہ بے چین سا کروٹیں بدلا کیا اور رات بھر الٹی سیدھی باتیں سوچا کیا۔!

صبح گویا میدان حشر کے تصفیہ کے بعد ہوئی تھی۔ خاموشی۔ پر ہول۔! سنجر کمرے سے نہیں نکلا۔ گھڑی دیکھتا اور دعائیں مانگتا رہا۔ یا الٰہی جلدی سے دس بجا دیجئے۔! اور بالآخر دس بج ہی گئے! لان پر گاڑی کا مخصوص ہارن بجا! سنجر نے اطمینان کی ایک اتنی طویل سانس لی کہ اگر زیادہ طویل لیتا تو وہ شاید سینے ہی سے نکل جاتی لیکن وہ سانس درمیان ہی میں اٹک کر رہ گئی کیونکہ دروازے میں ملازم لڑکا کھڑا کہہ رہا تھا۔ بھیا آپ کو بڑے سرکار باہر بلا رہے ہیں!

وہ خدا سے اپنے گناہ بخشوا کے باہر نکلا۔ دالان میں سب موجود تھے۔ گم صم سے، سنجر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔!

بڑے ابا آج دالان میں کھڑے تھے۔ ان کی طرف دیکھنے کی ہمت سنجر میں نہیں تھی۔ اس کا دل سینے کی تمام وسعتوں میں فٹ بال کی طرح اچھلتا پھر رہا تھا لگتا تھا کہ دم ہی نکل جائے گا۔

یہ آخر ان سب کو ہوا کیا؟ ۔ وہ گھوم کر پچھلی دیوار تک آیا ۔ یہاں ایک کھڑکی تھی اس میں منہ ڈال کر اس نے اپنے باپ کو پکارا۔ اور طوعاً و کرہاً رحمان صاحب ادھر آ گئے تھے انھیں دیکھ کر سنجر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

ڈیڈی اتنی جلدی سب سو گئے کیا۔ آوازیں دیتے دیتے حلق چھل گیا ہے۔ کھلوائیے اس مردود سے پھاٹک؟ "

تم تھے کہاں۔

میں پکچر دیکھنے گیا تھا۔

کس سے پوچھ کے گئے تھے۔

امرینہ سے کہہ گیا تھا کہ وہ میرے جانے کی اطلاع دیدے۔!

ہاں ہاں۔ تم تو چیف منسٹر ہو۔ اپنے سکریٹری کو اطلاع دے کے جاتے ہو۔ نامعقول کہیں کے۔ بھائی صاحب نے سختی سے حکم دے دیا ہے کسی حال میں پھاٹک نہ کھولا جائے:

"کیا؟"

کچھ نہیں۔ آج ساری رات باہر ہی رہو۔

امرینہ کیا کر رہی ہے ڈیڈی! اس نے تو:

وہ سو رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ بھائی صاحب ابھی جاگ رہے ہیں! ۔ یہ کہہ کر وہ بڑی تیزی سے چلے گئے۔!

اور دیوار سے ٹیک لگائے لگائے اس پر امرینہ کی کارستانی واضح ہوئی۔ اچھا تو اس چڑیل نے اس کا یہ حال کیا ہے۔

غصے کے مارے اس کا سارا جسم دہک اٹھا۔ اس طرح اس نے احمق بنایا تھا۔ جان بوجھ کر سزا دلوائی ہے! میں ابھی دیکھ لوں گا۔

مغرب کے وقت ہی سے موسم ابر آلود تھا۔ فضا میں حبس تھا۔ اور رات سے بادل کو بھگانے والی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اب ان میں خاصی تیزی آ گئی تھی تیز ہوا اپنے ساتھ جانے کہاں کہاں سے گرد و غبار اور کچرا اڑائے لیے جا رہی تھی۔ اتفاقاً چند موٹی موٹی بوندیں پڑیں اور کتے اپنی کمین گاہوں سے بھونکتے غراتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ سنجر گھبرا گیا۔ کیا ہوگا اگر دو تین ایک ساتھ اس کے چمٹ جائیں گے۔

اس کے حواس غائب ہونے لگے تب اس نے سوچا کہ زندگی کا سارا ڈر خوف بالائے طاق رکھ کر اسے خود بڑے ابا کو آواز دینی چاہیئے۔ بلا سے جو چاہیں سزا دیں۔ ساری رات تو وہ کھڑا نہیں رہ سکتا! لہٰذا اس نے پھر پھاٹک کی طرف دوڑ لگائی۔ اور پھاٹک کی سلاخوں میں منہ ڈال کر چیخا۔

"بڑے ابا۔ بڑے ابا۔ خدا کے واسطے پھاٹک کھول دیجئے۔ پھر کبھی اتنی دیر تک باہر نہیں رہوں گا۔ یہاں مجھ پر کتے جھپٹ رہے ہیں۔ بڑے ابا۔ خدا کے لیے آیئے۔ کھول دیجئے قفل!"

بڑے ابا کمرے سے نکلے اور محسوس کیا کہ ان کو دیکھتے ہی چار پانچ سائے جھپٹ جھپٹ کر ادھر ادھر ہو گئے ہیں۔ تو وہ سب جاگ رہے تھے۔ انھیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ ان کے خوف سے سب چپ تھے!

انھیں یاد آیا کہ ایک دفعہ اتفاقاً ان کے کمرے میں بلی کا ننھا سا بچہ بند رہ گیا تھا۔ اس وقت عجیب عالم تھا۔ اندر سے بچہ اور باہر سے اس کی ماں۔ بے چینی سے سر دروازے سے ٹکرا رہے تھے۔ انھیں کتنی بے زاری تھی!۔ وہ بھی مامتا بھی اور یہ بھی مامتا!۔ آگے بڑھ کر انھوں نے جیب سے کنجی نکالی۔ اور قفل کھول کر پھاٹک کھول دیا۔ منہ سے ایک لفظ نہ لے [illegible]

786

FRESH AIR FOR YOU

CITIZEN FAN

GUARANTEED
FOR 5 YEARS

With Compliments from

Citizen Fan Industries, Cal

Distributors for U. P : **BOMBAY ELECTRIC CO.**
Latouche Road, Lucknow
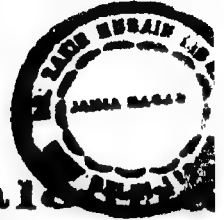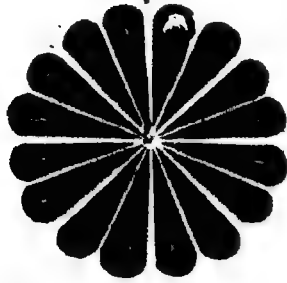
THE HAREEM

Dec. 81

گذشتہ ۵۱ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندستان میں اردو کا
سب سے پرانا رسالہ ہے

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

[illegible] سلیم انہونوی مرحوم

ماہنامہ حریم لکھنؤ

جلد ۵۹ | فہرست مضامین ماہ دسمبر سنہ ۱۹۸۱ء | نمبر (۱۲)

ایڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم جانی بیگم ردولوی

فی شمارہ کی قیمت ... ۲٫۳۰ ... روپیہ
چندہ سالانہ ... منی آرڈر سے ۲۰ ... روپیہ
چندہ سالانہ ... اعزازی ۲۵ ... روپیہ
چندہ مخصوص ... مخصوص ۲۲ ... روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپے زائد
غیر ممالک سے ... ۵۵ ... روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل۔ ایرمیل سے
مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر: ... فہیم انہونوی

آفس و ترسیل زر کا پتہ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس: ۲۲۵۵۹ رہائش: ۲۵۳۳۴
فہیم انہونوی نے باہتمام سید انصار حسین۔ سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر
دفتر حریم سے شائع کیا۔

ایک بھانجی نے لکھا ہے

"میں آپ کا حریم برابر پڑھتی ہوں اس لئے کہ اب یہی ایک ایسا رسالہ ہے جو میرے گھر میں خریدا جاتا ہے اور جس کے پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ میری امی اور ابو نہ جانے کب سے اس کے خریدار ہیں، جب سے میں نے ہوش سنبھالا اسے دیکھتی آرہی ہوں۔ امی جان کو اس کا شدید انتظار رہتا ہے۔ نگاہ کی کمزوری کے باعث وہ اب اسے خود نہیں پڑھتیں، لیکن مجھ سے یا اپیا سے پڑھوا کر سنتی ہیں۔ میں بھی حریم کی منتظر رہتی ہوں لیکن صرف محترمہ عفت صاحبہ کے ناول کے لئے، لیکن امی کو سب سے زیادہ آپ کے لمعات پسند ہیں، سنتی ہیں تو کچھ دینے لگتی ہیں۔ ابو جان بھی لمعات کی تعریف کرتے رہتے ہیں، حالانکہ میں لمعات سے چڑھتی ہوں، جھوٹ کیوں بولوں کبھی کبھی تو سوچنے لگتی ہوں کہ آپ کو اس ترقی یافتہ دور میں جینے کی کیا ضرورت ہے اور جی رہے ہیں تو یہ اوٹ پٹانگ باتیں کیوں لکھتے ہیں۔ میری عقل حیران ہے کہ آخر آپ زمانہ کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ آپ نے تاریخ کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا، تو پھر کیا آپ کو علم نہیں کہ دنیا کے حالات برابر بدلتے رہے ہیں اور انسان مسلسل ترقی کرتا رہا ہے، جو ایک فطری تقاضہ ہے۔ تو پھر آپ اس کلیہ سے کیوں منحرف ہیں۔ کیوں یہ چاہتے ہیں ہم فرسودہ روشوں پر ہی چلتے رہیں اور لکیریں ہی پیٹتے رہیں۔ پردہ، شرم، حیا، قدامت پرستی ہی آپ کی نظروں میں عورت کی زندگی ہے۔ انھیں سے وہ چمٹی رہے، خواہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ خدا را اپنی روش بدلئے اپنے خیالات میں تبدیلی لائیے۔ آپ جو راگ الاپ رہے ہیں، اسے کون سنے گا۔ آج نہیں تو کل میری امی جیسی آپ کی ہم خیال بڑھیاں ختم ہو جائیں گی اور آپ کے حریم کو خریدار ڈھونڈے نہ ملیں گے۔

اچھا ماموں جان اب میں خط ختم کرتی ہوں شاید آپ کو میری تحریر تلخ لگی ہوگی اس لئے کہ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود آپ میری امی کے منہ بولے بھائی ہیں اور میں اس رشتہ سے آپ کو ماموں سمجھتی ہوں اس لئے معافی چاہتی ہوں تحریر کا مقصد آپ کو رنج پہنچانا نہیں، صرف راہ راست دکھانا ہے۔ خدا کرے کہ آپ آئندہ زمانہ کے ساتھ چلنے لگیں، اس سے آپ کے حریم کی بھی ترقی ہوگی۔

اپنا نام و پتہ نہیں لکھ رہی ہوں اس لئے کہ امی کو معلوم ہوگیا تو انھیں دکھ ہوگا۔"

عزیز بھانجی تمہارا خط پڑھ کر مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوا، خدا تلخی میں نے محسوس نہیں کی اس لئے کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے اسے میں حقیقت نہیں سمجھتا۔

سب سے پہلے تو میں تمہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ تمہاری اردو بہت اچھی ہے، تحریر بھی صاف ستھری ہے، آج کل کی لڑکیوں کی طرح بدخط نہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے والدین نے گھر ہی پر کسی مولوی یا قابل اردو داں سے تمہیں اردو پڑھائی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیاں کم ہی ایسے خط لکھ پاتی ہیں۔

بیٹی! تم نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ملتے جلتے نہ جانے کتنے ہی خطوط میرے پاس آتے رہے ہیں۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، یہ اس زمانہ کا قصور ہے جس کے ساتھ تم بھاگ رہی ہو۔ مجھے اعتراف ہے کہ میری روش پرانی ہے اور میں وہ راگ الاپ رہا ہوں جس کے سننے والے اب کم رہ گئے ہیں، لیکن ہیں، خود تمہاری امی جان بھی ہیں اور جب خدانخواستہ ایسی ہستیاں نہ رہ جائیں گی تو میں کہاں جیتا رہوں گا۔ سنہ میں ہی ایسا گذرا ہے کہ کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کی آخری گھڑی آگئی۔ بار بار چراغ حیات گل ہوتا نظر آیا، لیکن خدا

نے پھر اس قابل کر دیا کہ اب میں دفتر بھی کچھ دیر کے لئے آتا ہوں'
کام بھی کرتا ہوں۔

زمانہ بدلتا رہا ہے، اور بدلتا رہے گا، اس حقیقت سے کون انکار
کرسکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ بدلتے زمانوں کی ہر بات اچھی ہی ہو کہ ہم
آنکھیں بند کر کے ان کو اپنا لیں اور پرانی باتیں سب ہی ایسی خراب ہوں کہ
انھیں فراموش کر دیا جائے۔

تبدیلیاں ہو رہی ہیں، میرے بچپن میں محراب دار دروازوں کا
چلن تھا۔ لکڑی پر کافی نقش و نگار بنائے جاتے تھے، ایک ایک دروازے
کی محرابی مسار ہفتوں میں بناتے تھے، ایک ایک دروازہ بڑھئی مہینوں میں
تیار کرتے تھے جتنی منقش ہوتی تھیں۔ لیکن اب محرابیں توڑ کر سپاٹ کی جا رہی
ہیں دروازے منقش کے بعد دلے کے ساتھ بنائے جاتے تھے، اس میں بھی
وقت لگتا تھا لیکن اب لکڑی جا کر بورڈ بن رہے ہیں اور دروازہ ایک سپاٹ
پٹرے جیسا اچھا سمجھا جاتا ہے۔ پاخانے پہلے سونے اور بیٹھنے والے کمروں
سے دور بنائے جاتے تھے، اس لئے کہ سروس لیٹرین ہوتے تھے، ان سے تعفن
آتی تھی، لیکن اب پاخانے سونے والے کمروں سے اس طرح ملحق ہوتے
ہیں کہ ان کے دروازے کمرے کے اندر ہی کھلتے ہیں ـــــ لیکن ایسا
نہیں کہ پاخانے ہوتے ہی نہ ہوں۔ پہلے برقعے ایسے بنتے تھے کہ ایک ٹوپی
میں گھیر جوڑ دیا جاتا تھا۔ اب ان میں تراش خراش ہونے لگی ہے جو خواتین
خوبصورت بنا دیتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ برقع اب سلتا ہی نہ ہو مردوں
کے لباس پائجامہ شیروانی یا دھوتی کرتے ہوا کرتے تھے، اب ان کی جگہ
سوٹ اور بش شرٹ وغیرہ نے لے لی ہے۔ بیشتر یہی لباس چل رہا ہے۔
لیکن جو لباس پہلے تھے وہ بھی ستر پوشی کرتے تھے اور جو اب ہیں وہ بھی
کرتے ہیں جو انسان کے مہذب ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن اس کے برخلاف
خواتین کے لئے جنھیں ستر پوشی کی سخت ضرورت ہے اس لئے کہ قدرت نے انھیں
بعض ایسے اعضا بخشے ہیں جو مردوں کی نگاہوں میں غیر معمولی کشش رکھتے
ہیں پہلے دو پٹہ (یعنی دوپاٹ والا) اس لئے استعمال ہوتا تھا کہ وہ اعضا اس
کی لپیٹ میں پوشیدہ رہیں اور ان کی ساخت وغیرہ کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکے'
لیکن افسوس کہ آج ہماری خواتین ایسے لباس پہننے لگی ہیں جو ان اعضا کو اور
زیادہ نمایاں کرتے ہیں، بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انھیں نمایاں کیا جاتا ہے۔
جبکہ ہر عورت یہ جانتی ہے کہ وہ ہر طرف مرد کی بدنگاہی کا ہدف بنتی ہے۔
اسے مردوں کی بداخلاقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے،
لیکن کیا شکاری درندوں اور پرندوں کو کوئی روک سکا ہے، کیا کبھی ایسا ممکن
ہوسکتا ہے کہ انھیں سبزی خور بنا دیا جائے اور وہ شکار کرنا چھوڑ دیں۔؟
شاید کیا یقیناً ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ فطرتیں بدلا نہیں کرتیں مرد اس بداخلاق
کا مظاہرہ ہمیشہ ہی کرتا رہا ہے، لیکن پہلے اس کے مواقع بہت ہی کم ملتے تھے
اس لئے بداخلاقیاں آجکل کی طرح ظاہر نہیں ہو پاتی تھیں۔ چھوٹی چڑیوں
اور طوطوں وغیرہ کو دیکھئے کہ وہ کس طرح گھنے پیڑوں کی پتیوں میں چھپ کر
رات گذارا کرتے ہیں اور دن میں اڑتے ہیں تو کتنے چوکنے رہ کر اڑا کرتے
ہیں کسی جنگل میں جا کر دیکھئے کہ ہرن وغیرہ کتنی ہوشیاری سے چلتے پھرتے
ہیں، ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنے دشمن پر لگی رہتی ہیں، جو پالی اور بھاگے
جان بچانے کے لئے ـــــ لیکن عورتیں یہ جانتے ہوئے بھی مرد شکاری
جانوروں سے کم درندہ صفت نہیں، وہ جانتی ہیں کہ وہ ہمیشہ انھیں
لوٹنے پر کمربستہ رہتا ہے ـــــ اس کے باوجود وہ نیم عریاں ہو کر ان
کے سامنے اطمینان سے گھومتی پھرتی ہیں اور وہ بھی ایسے لباس اور ایسے
میک اپ وغیرہ کے ساتھ کہ فرشتے بھی انھیں دیکھیں تو ان کی رال
ٹپک پڑے، انسان تو پھر انسان ہے۔ اب آپ کی نظروں میں یہ خوبی
ہو کہ نیم عریاں ہو کر آپ سڑک پر پھر گھومیں، سینٹ و لوڈر میں لباس
جسم کو نمایاں کر دعوت نگاہ دیتی رہیں تو آپ ہی اسے خوبی سمجھ سکتی ہیں۔
میں تو اسے لعنت ہی سمجھوں گا، اس لئے کہ اس میں عزت و عفت کو
زیاں پہنچنے کا خطرہ ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار چوکڑی بھرنے والا
ہرن بھی شیروں کے سامنے سے گذرے گا تو کسی نہ کسی دن شکار بن کر
ہی رہے گا۔

اسلام نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اختلاط مرد و
زن سے زیادہ معاشرے کو گندہ کرنے والی اور کوئی چیز نہیں ہوسکتی
اس لئے اس نے ایسے قوانین نافذ کئے جن سے مرد و عورت ایک جا نہ
ہو سکیں کہ یہ یکجائی آگ و پھوس کی یکجائی ہو سکتی ہے پھوس کتنی ہی دور
کیوں نہ رہے۔ آگ اگر جل رہی ہے تو اس کے شعلے اسے جلائے بغیر نہ
رہیں گے اس لئے کہ آگ بھڑک کر دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔ پردہ
ایک دیوار ہے جو اختلاط مرد و زن کو روکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے
جس کے باعث آپ نے مجھے یہ خط لکھا ہے۔ آپ بے نقاب پھرنا چاہتی
ہیں۔ آپ مشترک پکنک پارٹیوں میں حصہ لینا زندگی سمجھتی ہوں گی۔
آپ کلب گھروں کے ہنگاموں میں شرکت خوش رہنے کا راز

گردانتی ہوں گی۔ آپ بن سنور کر چپ دکھاتی پھرنے کو خواتین کا پیدائشی حق سمجھتی ہوں گی۔ لیکن بیٹی یہ سب باتیں اخلاقی حیثیت سے تو برا اثر ڈالتی ہی ہیں، اسلامی تعلیمات کے بھی سخت خلاف ہیں۔ مذہب سے اتنی بیگانگی بھی مناسب نہیں۔

پردہ کے سلسلہ میں تو یہ بات متفقہ طور پر طے نہیں ہوسکی کہ عورت کا چہرہ کھلا رہنا چاہیئے یا نقاب سے ڈھکا ہوا۔ لیکن اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ستر پوشی کے لئے سخت احکام ہیں بن سنور کر اور خوشبو لگا کر پھرنا قطعی منع ہے۔ اول تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ چہرہ کھلا رکھنے کی ہدایت اگر کی گئی ہے تو کیوں۔ کیا کسی کا بھی چہرہ دیکھے بغیر اس کے حسن و خوبصورتی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک عورت کا چہرہ کسی کپڑے سے بالکل لپیٹ دیا جائے اور جسم پر لباس ہو تو کیا اس کے حسن کا اندازہ کرنا ممکن ہے حسن کا دار و مدار پچاس فی صدی چہرے کی ساخت پر ہوتا ہے، اس لئے اسی کو کھلا رکھنے کی بات کیسے کہی جاسکتی ہے۔ میرے خیال میں ابتدائے اسلام میں سلے ہوئے برقعوں کا تو استعمال ہوتا نہیں تھا۔ چادریں اوڑھ کر خواتین نکلتی تھیں چادروں کا آنچل اگر گھونگھٹ کی طرح گرالیا جائے تو چلنے پھرنے میں بھی دقت نہ ہوگی اور چہرہ بھی چھپا رہے گا۔ بہر حال یہاں میں اس بات سے بحث نہیں کرتا، میں تو صرف اتنا کہتا ہوں کہ مرد جنھیں عورتوں کی جانب سے بدنگاہی اور پیش دستی کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا، وہ تو اپنے جسم کو لباس سے یکسر پوشیدہ رکھتے ہیں۔ صرف بنیائن اور تہبند بھی مکمل ستر پوشی کرتی ہے۔ لیکن خواتین جو جانتی ہیں کہ مرد ندیدے ہوتے ہیں۔ عورت کو گھورنا، اس کے خد و خال پر نظر ڈالنا ان کی فطرت میں داخل ہے تو پھر ان کے لئے اپنے جسموں کی نمائش کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ایسے بلاؤز جن میں سے سینہ جھانک رہا ہو، جنھیں پہننے کے بعد بھی پیٹ اور پیٹھ کا بمشکل ½ حصہ چھپا ہو۔ جو ساق سیمیں اور صراحی دار گردنوں کو نہ چھپا سکتے ہوں کیا کسی طرح بھی اسلامی نقطۂ نظر سے پہننا جائز ہوسکتے ہیں۔

مردوں کو بھی ٹوپی یا صافہ وغیرہ کا استعمال سر کو چھپانے کے لئے ضروری ہے۔ پھر عورتوں کا سر برہنہ پھرنا کیسے اچھی بات ہوسکتی ہے۔

عورتوں کو تعلیم سے محروم رکھنا ایک گناہ ہے، لیکن تعلیم کے لئے انھیں اس درجہ آزاد کر دینا کہ ان میں اور مردوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے میری نظر میں ہرگز اچھا نہیں۔ عورت کو مرد کے مساوی حقوق دے کر انھیں نقصان پہنچانا کیا مناسب بات ہے۔ مرد کے گناہ کمتر ہی ظاہر ہوتے ہیں اور ہو بھی جائیں تو اس سے انھیں کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ لیکن عورت کی لغزش اسے لے ڈوبتی ہے، وہ کسی طرف کی نہیں رہتی اور اس کا گناہ پکار پکار کر اسے بدنام کرتا ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں، میں عورت اور مرد کی مساوات کا قائل نہیں۔ روزانہ ہمارے مشاہدے میں ایسی باتیں آتی ہیں جو اختلاط مرد و زن کے مکروہ نتائج کہے جاسکتے ہیں اور ان سے صرف عورت ہی نقصان اٹھاتی ہے۔

پرانی سب ہی باتیں خراب نہیں کہ ان سے بیزاری کا اظہار کیا جائے۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے، لیکن ہزاروں ایسی باتیں ہیں جو ہر زمانے میں ہی اچھی رہی ہیں اور آئندہ بھی اچھی ہی سمجھی جاتی رہیں گی۔ مثلاً سچ بولنا، ایمانداری کرنا رحم کرنا یتیموں پر ترس کھانا، غریبوں کی مدد کرنا۔ جوا نہ کھیلنا شراب نہ پینا وغیرہ — تو کیا ان باتوں کو بھی ترک کر دیا جائے اور انھیں بھی فرسودہ باتیں قرار دے لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس سے متفق نہ ہوگا، اس لئے میری دتیا تو بیٹی کی باتوں پر غور کریں، سوچیں کہ میری تحریک کا منشا کیا ہے۔

میری عزیز بھانجی ہر وہ بات جو گناہ کی جانب لے جاتی ہے اس عمر میں کیا ہمیشہ ہی اچھی معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ گناہ میں لذت ہوتی ہے۔ آپ بھی اسی طرف دوڑ رہی ہیں جس طرف جانے میں نقصان ہی ہوسکتا ہے۔ طلسم مغرب کی دلفریبیاں ہمارے لئے تباہ کن ہیں اور یہ ساری روشن خیالی اور ترقی پسندی مغرب ہی کا فریب ہے جو ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔

آجکل لوگ عورت و مرد کو گاڑی کے دو پہیے کی مثال دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ انھیں بھی گاڑی کے پہیوں ہی کی طرح چلنا چاہیئے یعنی ہر جگہ دوش بدوش۔ نہ صرف دفتروں بازاروں سینما گھروں وغیرہ میں بلکہ کلبوں اور شراب خانوں وغیرہ میں بھی۔ میں بھی عورت و مرد کو گاڑی کے دو پہیے سمجھتا ہوں، لیکن اس طرح دونوں گردش میں رہیں۔ اس طرح کہ ایک باہر اور گھر کے اندر، باہر کی دنیا مرد کے لئے ہے اور گھر کی دنیا عورت کے لئے۔ میں بلا کسی مجبوری کے عورتوں کی ملازمت کے بھی خلاف ہوں، اس لئے کہ لاکھوں سے بھی زیادہ مرد بیکار پھر رہے ہیں محض اس لئے کہ ان کی جگہوں پر عورتیں کام کر رہی ہیں۔ واقعی اگر سارے مرد کام

سے لگے ہوئے اور کام کی ضروریات پوری نہ ہو سکتیں تو عورتوں کو
بھی مختلف کاموں میں حصہ لینا چاہیے تھا۔

مساوات کے حامی اور عورت مرد کو گاڑی کے دو پہیے بنا کر
گھمانے والے گھروں میں بھی مساوات کا مظاہرہ کریں تو میں جانوں
عورتوں کو تو دفتروں میں کام کرنے کے بعد بھی گھریلو کاموں میں
لگنا پڑتا ہے اور مرد یہاں اپنے پہیے کی گردش کیوں روک دیتے ہیں۔

ایک تہنیتی تقریب

لکھنؤ کے مشہور تعلیم گاہ نسواں کالج میں جس کی پرنسپل اب ہاجرہ
ولی بیگم ولی الحق انصاری صاحبہ ہیں۔ ۲۸ اکتوبر کی شام کو جناب
شاکر علی صدیقی صاحب کی پچیس سالہ حسن خدمات کے اعتراف میں
ایک شاندار جشن منایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تعلیم گاہ نسواں نے اسلامی
معاشرت کے دائرے میں رہتے ہوئے مسلم بچیوں کو اچھی دینی و دنیوی
تعلیم دی ہے۔ جس کے لئے محترمہ حامدہ حبیب اللہ صدر مجلس انتظامیہ
اور خصوصیت سے شاکر علی صدیقی صاحب قابل صد تحسین و ستائش
ہیں۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کی ترقی کا دارو مدار عموماً منیجر پر ہوا کرتا ہے
اپنے پچیس سالہ دور انتظامیہ میں شاکر علی صدیقی صاحب نے اس
تعلیمی ادارے کو جس حسن و خوبی سے نہ صرف قائم رکھا بلکہ اسے ترقی
دی وہ قابل ستائش ہے۔ اس دور میں پردہ کا انتظام رکھتے ہوئے، کسی
گرلس اسکول یا کالج کا چلانا آسان نہیں۔ لیکن مجھے مسرت ہے کہ
تعلیم گاہ نسواں میں مدرسین چاہے اسلامی معاشرت کی پابندی نہ کرتی
ہوں لیکن لڑکیوں کے سلسلہ میں کاربردازان کا رویہ مستحسن ہے۔
افسوس کہ میں تنفس کا دورہ پڑ جانے کے باعث اس تقریب میں شرکت
نہیں کر سکا۔ بہرحال میں بھی شاکر علی صدیقی صاحب کی خدمات کا
اعتراف کرتے ہوئے، انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ شاکر علی صدیقی
صاحب کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں، ان کی ملی اور سیاسی
خدمات سے ہم سب واقف ہیں۔ (نسیم الکھنوی)

مقابلۂ حسن کا مقابلہ

مغربی مہذب ملکوں کی تقلید میں زنانہ مقابلۂ حسن و جمال
ہندوستان میں بھی فیشن کی دوسری چلی ہوئی چیزوں کی طرح رائج
ہونے لگا ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک مقابلۂ حسن نئی دہلی کے ایک
جدید فیشن کے پانچ اسٹار والے ہوٹل کے اندر ہونے والا تھا۔
جس کی خوب پبلسٹی بھی کی جا چکی تھی۔ خبر رساں ایجنسی یو ان آئی کی
رپورٹ کے مطابق نئی دہلی کی مہذب و تعلیم یافتہ عورتوں کی دو تنظیموں
نے اس مقابلۂ حسن کو کھلی ہوئی بے حیائی اور ہندوستانی تہذیب کی
اعلیٰ قدروں کے منافی قرار دے کر اس کا مقابلہ احتجاجی مظاہرہ
کی شکل میں کیا۔ ان احتجاج کرنے والی خواتین نے ہوٹل میں اچانک
داخل ہو کر تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مقابلۂ حسن کے خلاف نعرے
لگائے۔

مقابلۂ حسن تو غالباً اس احتجاجی کارروائی سے رک نہ سکا
لیکن بہرحال اس سے اتنا تو ظاہر ہو کر رہا کہ ہندوستان کی،
تعلیم یافتہ و مہذب خواتین اور ان کی تنظیموں میں اب بھی قدیم
مشرقی اخلاقی قدروں کی قدر زندہ سلامت ہے۔ ان دونوں تنظیموں
کے اس مظاہرہ احتجاج میں شرکت کرنے والی ساری خواتین غیر مسلم
ہی تھیں۔ رجعت پسندی کے لئے بدنام مسلمان نام کی ایک ہستی
بھی اس میں شامل نہ تھی۔ بشکریہ صدق جدید۔ لکھنؤ۔

قابل صد شکریہ بہن

میں نے حریم کے ذریعہ حریمی بہنوں سے درخواست کی تھی
کہ جو بہن حج کرنے جائیں وہ میرے لئے عجوہ کھجور لیتی آئیں،
ابھی تک صرف ایک بہن مسز ایم اے بھورا گیٹو نے کھجور کا
پارسل بھجوایا ہے۔ جس کے لئے میں بہن موصوفہ کا تہ دل سے
شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (نسیم الکھنوی)

اُمِّ عمارہ

سید فضل الرحمٰن جعفری

ام عمارہؓ اسلام کے ابتدائی زمانے میں آغوش اسلام میں داخل ہوئی تھیں اور آپ نے بیعت العقبہ میں شرکت کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ اسلام کا یہ زمانہ بڑی تکلیف اور مظلومیت کا زمانہ تھا۔ لوگ چھپ چھپ کر مسلمان ہوتے تھے اس لئے کہ مشرکوں اور کافروں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور وہ طرح طرح کے مظالم ڈھاتے تھے۔ اُن کے مظالم سے بچنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کی ایک گھاٹی میں لوگوں کو مسلمان کرتے تھے اور مدینے سے جو لوگ آتے وہ بھی اسی گھاٹی میں پہونچکر اسلام لاتے۔ مدینے سے آکر اسلام لانے والے ایک قافلے میں اُم عمارہؓ بھی تھیں۔ یہ انصاریہ تھیں۔ دل جذبۂ ایمانی سے ہر وقت سرشار رہتا تھا اسلام کے لئے جان دینے کا ولولہ رکھتی تھیں اور غلبۂ حق کے لئے اپنی ساری قوت و توانائی صرف کرنے کے لیے پیش پیش رہتی تھیں

میدان جنگ میں آپ کے کارنامے تاریخ کا روشن باب بن گئے ہیں ہمت و استقامت اور جذبۂ فداکاری میں بہت ممتاز تھیں۔ ہجرت کے بعد جب جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت ام عمارہ ایک جانباز اور سرفروش سپاہی بن کر میدان میں پہونچ جاتیں۔ احد میں، خیبر میں، حنین اور یمامہ کی لڑائیوں میں آپ نے سپہ گری اور جانبازی کے بڑے جوہر دکھائے۔ اُحد کی جنگ میں آپ کی عمر ۴۳ سال کی تھی۔ لیکن اس عمر میں بھی جو چستی اور مستعدی دکھائی اس پر لوگ رشک کرتے تھے برق و شرر کی مانند میدان جنگ میں ادھر سے ادھر زخمیوں کو پانی پلاتی پھرتی تھیں۔ اس جنگ میں ان کے شوہر بھی شریک تھے اور دو نوجوان بیٹے بھی اسوقت میدان جنگ کا نقشہ یہ تھا کہ اسلامی لشکر غالب آرہا تھا۔ لیکن کچھ دیر کے بعد نقشہ بدل گیا اور مشرک غالب آگئے۔ یہ المناک منظر دیکھ کر حضرت ام عمارہؓ بے چین ہو گئیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ "میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پہونچ گئی اور حضور کو دشمنوں کے نیزوں اور تیروں سے بچانے لگی۔ ابتدا میں میرے پاس ڈھال بھی نہ تھی لیکن جب مل گئی تو کافروں کے تمام تیر اس پر روکتی رہی"۔

حضرت ام عمارہؓ نے میدان جنگ کا ہوش ربا اور دلدوز منظر دیکھ کر بڑے حوصلے اور ہمت سے کام لیا اور بڑی استقامت سے زخمیوں کی تیمارداری کرتی رہیں آپ کی کمر میں ایک کپڑا بندھا تھا جس میں بہت سے چیتھڑے بندھے تھے جنھیں جلا جلا کر زخمیوں کے زخم بھر دیتی تھیں وہ خود بھی سخت زخمی ہو گئی تھیں جسم کے مختلف حصوں میں کوئی ۱۲ یا ۱۳ زخم آئے تھے۔ ایک صحابیہ اُم سعیدؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت اُم عمارہؓ سے پوچھا کہ مونڈھے پر زخم کس طرح لگا؟ انھوں نے جواب دیا۔

احد کی لڑائی میں جب لوگ منتشر ہو کر گھبرائے پھر رہے تھے تو ابن تیمیہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھا تھا کہ مجھے کوئی یہ بتادے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگر وہ آج بچ گئے تو میری نجات نہ ہوگی"۔

چنانچہ تیمیہ کی یہ باتیں سن کر مصعبؓ بن عمیر چند مسلمانوں کے ساتھ اس کے سامنے آگئے اور میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی۔ ابن تیمیہ نے میرے مونڈھے پر سخت وار کیا میں نے بھی جوابی کارروائی کی اور پے در پے کئی وار کئے لیکن اس نے دوہری زرہ پہن رکھی تھی اس لئے یہ حملہ بے اثر ہوتا تھا۔ اس کا وار البتہ میرے مونڈھے میں اتر گیا۔ زخم بہت گہرا تھا اور عرصہ تک علاج جاری رکھنے کے بعد بھی اچھا نہ ہوا۔ اس زخم کے علاوہ احد کی جنگ میں کئی اور زخم بھی آئے تھے۔ حضرت اُم عمارہؓ کہتی ہیں کہ "دشمن گھوڑوں پر سوار تھے اور ہم لوگ پیدل تھے اگر ہماری طرح وہ بھی پیدل ہوتے تو مقابلہ برابر کا ہوتا۔ جب گھوڑے پر سوار کوئی دشمن میرے قریب سے گذرتا تو مجھ پر وار کرتا میں ان حملوں کو ڈھال سے روکتی اور جب وہ سوار گذر جاتا تو میں اپنی تلوار سے گھوڑے کی ٹانگ پر حملہ کرتی جس سے ٹانگ کٹ جاتی اور سوار زمین پر گر پڑتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میرے اسی سپاہیانہ عمل کو دیکھتے تو میرے لڑکے کو میری مدد کے لئے بھیج دیتے میں اپنے بیٹے کی مدد سے دشمن کا کام تمام کر دیتی"۔

حضرت ام کلثوم کے بیٹے عبداللہ بن زید کا بیان ہے کہ میرے بائیں بازو پر کاری زخم لگا اور خون ابلنے لگا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زخم کی حالت دیکھ کر میری والدہ کو مرہم پٹی کے لئے بھیجا۔ میری ماں میرے قریب آئیں، کمر سے پٹی نکالی اور زخم پر باندھ کر

یہ فرمایا کہ "جا کافروں کا مقابلہ کر"۔ اُم عمارہؓ کی اس ہمت اور شجاعت کو دیکھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

اے اُم عمارہؓ! اتنی ہمت کون رکھتا ہو گا جتنی تو رکھتی ہے"

اُم عمارہؓ کو دوران جنگ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت دعائیں دیں اور ان کے ولولۂ دینی اور جذبۂ سرفروشی کی بڑی تعریفیں کیں۔ اتفاقاً اسی وقت ایک کافر قریب آگیا، جسے دیکھ کر زبان نبوت سے یہ کلمے ادا ہوئے

"اے ام عمارہؓ! یہی وہ شخص ہے جس نے تیرے بیٹے کو زخمی کیا تھا"

اُم عمارہؓ یہ بات سن کر دشمن اسلام پر جھپٹ پڑیں اور تلوار کی ایسی ضرب لگائی کہ اس کی پنڈلی سخت زخمی ہوئی اور وہ گر پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر حضور اکرم کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور آپ نے فرمایا

"اے اُم عمارہؓ! تو نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا"

پھر آپ نے اُم عمارہؓ کو اپنی پیغمبرانہ دعاؤں سے نوازا اور بے حد خوشی کا اظہار فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مشفقانہ توجہ دیکھ کر اُم عمارہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ!

دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں بھی مجھے آپ کی رفاقت کی سعادت بخشے۔

حضور اکرم نے کمال شفقت و مہربانی سے دعا فرمادی۔

وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی حضرت اُم عمارہؓ کا جذبہ سرفروشی کم نہیں ہوا حالانکہ عمر پچاس سال سے تجاوز کر گئی تھی لیکن ہمت و جرأت کا وہی حال تھا کفر کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتی تھیں۔ ان کا جسم ہتھیار سے خالی نہ رہتا تھا۔ حق کیخلاف کوئی بات برداشت نہ کرتی تھیں کفار کے حق میں برہنہ تلوار تھیں لڑائیوں میں بڑے شوق و ولولہ سے شریک ہوتی تھیں جنگ یمامہ میں آپ کی عمر ۶۲ سال کی تھی۔ لیکن اس جنگ میں بڑے جوش و خروش سے شریک ہوئیں اور بہادری اور حق پرستی کے بڑے جوہر دکھائے۔ اس جنگ میں جب گھمسان کا رن پڑا تو حضرت ام عمارہ نعرۂ تکبیر کے ساتھ دشمنوں کی صف میں گھس گئیں اور بڑی بے جگری سے تلوار چلاتی رہیں بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ایک کافر نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ آپ کا ایک ہاتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ لیکن آپ دوسرے ہاتھ سے تلوار چلاتی رہیں اور میدانِ جنگ میں پوری استقامت کے ساتھ جمی رہیں۔ آپ کے جسم پر گیارہ زخم آئے تھے اور زخموں سے شدید تکلیف تھی۔ اسی حالت میں آپ نے مدینہ منورہ کا سفر کیا۔

حضرت اُم عمارہؓ کے سرفروشانہ کارنامے اس حقیقت کی روشن دلیل ہیں کہ ایک مسلمان عورت جب اللہ کے دین کی سربلندی کا جذبہ لے کر میدان میں قدم رکھتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے نور بصیرت بھی عطا کرتا ہے اور جرأت و ہمت بھی اور قوت و طاقت بھی۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اسلام نے معاشرے کی نصف آبادی کو بے شک بے مصرف و بے عمل بنا کر نہیں رکھا ہے بلکہ کار راز حیات میں عورت کو اپنے جوہر اور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا ہے۔

”ظالم“

عفت موہانی

”یہ مرد بڑے بیدرد بے حد سنگدل اور بہت ظالم ہوتے ہیں۔ آپا بی تم سب نے مل کر مجھے کون سے جہنم میں جھونکا ہے۔ اب تو موت ہی آئے۔ جیتے جی اس شکنجہ سے چھوٹنا دشوار ہے“ چھوٹی خالہ ہمیشہ کی طرح امی اور پھچی بی کے سامنے رو نا رو رہی تھیں۔

جواب میں امی نے بڑی طویل اور ٹھنڈی سانس لی ”ارے ہر جگہ ان مردوں نے عورتوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ بیوی اپنے دولھا بھائی ہی کو دیکھ لو۔ ہائے شادی کے بعد کتنا ستم انھوں نے میری جان پر نہیں ڈھایا۔ ہے ہے۔ بھائی بہنوں سے ملنا جلنا تک بند کرا دیا تھا۔ ان کی سواریاں دروازے سے بڑھا دی جاتی تھیں۔ کیسا کیسا جی تڑپتا تھا سب کی صورتوں کو۔ یہ بھی نہ تھا کہ سسرال ہی جنت تھی۔ ارے دور کرو۔ سسرال پر بجلی گرے۔ کولھو کا بیل بنا کر رکھ دیا تھا۔ سب کی خدمت کرو۔ بچے پالو۔ اور نام نہ لو۔ ہمیشہ کی طرح وہی لعن طعن۔ تعریف کے دو بول سننے کو ترس جاتی تھی“

اور تمہارے چچا۔

اور تمہارے ماموں ـ

اُف فوہ۔ صبا نے سر تھام لیا۔ جہاں دیکھو بس بے چارے مردوں کا بکھان ہے۔ حالانکہ بے چاروں کو کانوں کان پتہ نہیں کہ ان کے پیٹھ پیچھے ان کی کیا کیا تعریفیں کن کن الفاظ میں ہو رہی ہیں۔ صبا کو بڑا خراب لگتا۔ مرد اپنی فطرت پر جاتے ہیں عورت اپنی سرشت نہیں چھوڑتی۔ ازل سے دونوں ایک دوسرے کے شاکی ہیں۔ مگر پھر بھی دنیا کی گاڑی عورت اور مرد مل کر کھینچے لئے جا رہے ہیں۔ دونوں کو کبھی کسی کی شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن وہ ہر وقت بس یہی سنتی رہتی تھی۔ اماں ہیں تو بابا سے بیزار، خالہ ہیں تو خالو سے بدظن، پھچی بی ہیں تو چچا کے خلاف ان کے پاس دفتر کے دفتر برائیوں کے تیار۔ آخر دنیا میں کہیں کوئی اچھا مرد بھی ہے؟۔ اسے حیرت ہوتی۔ مردوں سے بیزار بھی ہیں اور مردوں کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتیں۔ لیکن وہ مسلسل مردوں کے مظالم اور سنگدلی کی داستانیں سن سن کر کچھ خائف بھی ہونے لگی تھی۔ کون جانے اسے کیسا میاں ملے۔ گھر میں بیاہ کی باتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں۔ اگر اسے بھی کوئی سنگدل ظالم اور بیدرد مل گیا تو پھر ــــ؟

اور اس کے آگے سوچنے کی ہمت نہ پڑتی!۔

اس نے اپنے گھر کے تمام مردوں کا بغور جائزہ لیا۔ بے چارے ابا جان تھے۔ اس نے تو انھیں امی کے احکام پر اٹھتے بیٹھتے دیکھا۔ امی کے لئے وہ ان کی پسندیدہ ساڑیاں قیمتی زیور لاتے تھے مگر امی کی ناک بھوں چڑھی ہی رہتی تھیں۔ ہزاروں عیب امی ان کی چیزوں میں نکالتی تھیں۔ بے چارے بڑے کرب میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ لیکن امی کی ڈاک گاڑی سی زبان کے آگے ہمیشہ چپ شاہ کا روزہ رکھ لیتے۔ تو پھر ابا ظالم کیسے ہوئے؟۔ بے چارے خالو جان تھے۔ وہ تو غریب جیسے گونگے ہی تھے۔ اگر خالہ جان کبھی حالات حاضرہ، گرانی، لڑکیوں کی بڑھوتری، لڑکوں کی آوارہ گردی اور مردوں کے مظالم کے خلاف تقریر فرمانے لگتی تھیں تو ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت خالو جان میں نہیں تھی۔ بے چارے معصوم بچے کی طرح ٹکر ٹکر بیوی کا منھ تکتے رہتے تھے لہذا خالو جان کبھی ظالموں کی صف میں نہیں آتے تھے۔ البتہ ماموں جان اور چچا جان کچھ سخت گیر تھے۔ وہ اپنی بیویوں کو رلاتے ستاتے بھی تھے۔ چچا جان تو بیوی پر دوسری عورت بھی لے آئے تھے۔ ہفتوں اس چڑیل کی ناز برداری بیوی سے کروائی تھی۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دادی اماں کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے ایسی کس کے چچا جان کی خبر لی کہ انھیں بازاری عورت کو گھر سے نکالنا پڑا۔ ماموں جان بھی بڑے دل کے دیو تھے۔ بھونپو کی سی آواز میں بولتے تھے اور گھر بھر کا دم ان سے نکلتا تھا۔ لہذا صبا سوچتی تھی کہ کہیں اللہ نہ کرے ماموں اور چچا کی صفت کا شوہر اسے نصیب ہوا تو وہ بھی اسے ناکوں چنے چبوا دے گی۔ ہارے گی نہیں۔ رو کے جلے گی بھی نہیں۔ مساوات اور شخصی آزادی کا زمانہ ہے جناب وہ دن گئے کہ مردوں کے ستم سہہ کے عورتیں کونے میں منھ دے کے گھٹ گھٹ کر آنسو بہا لیتی تھیں۔ اونھ!۔

بہر حال اس کی شادی کے جو چرچے ہو رہے تھے وہ بالآخر انجام

کو پہونچے۔

اس کی شادی ہوئی۔ ابا نے اپنے داماد کی سعادت مندی، تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں بے گنتی تعریفیں کر دی تھیں۔ لیکن اس کی شادی شدہ اور بے شادی شدہ سہیلیوں نے اسے سکھا پڑھا کے خوب پکا کر دیا تھا۔ اور وہ تو پہلے ہی دل میں سوچے بیٹھی تھی کہ دنیا بھر کے ظالم اور بیدرد کا بدلہ اپنے اکیلے میاں سے لے لے گی!۔

بالآخر سسرال پہونچی۔ دل میں ان سب کے خلاف زہر تو بھرا ہی ہوا تھا کسی سے بھی سیدھے منہ نہ بولی۔ بڈھی ساس آگے پیچھے پھرا کرتی۔ چھوٹی نند منہ تکا کرتی۔ لیکن وہ اپنے حسابوں بس ملکہ قلوپطرہ ہی بنی رہی۔ بے چارہ توصیف تو اس کا خاص نشانہ تھا ہی۔ اسے کبھی اپنا غلام سمجھا۔ اس کی ساس کا حکم تھا کہ سب کو صبح سویرے اُٹھ جانا چاہیئے۔ صبا کوئی روز نہ اٹھی۔ توصیف اپنی ماں سے گڑبڑاتا۔

" اماں۔ وہ اٹھی تو تھیں لیکن عادت نہیں ہے نا۔ سر چکرایا تھا۔ میں نے کہا کہ اچھا تھوڑی دیر اور لیٹ جاؤ "

صبا کو بڑی خوشی ہوئی۔

وہ میاں سے کہے بغیر میکے آجاتی۔ اور واپسی پر توصیف کے استفسار پر بڑا ظالمانہ جواب دیتی۔

" مجھ سے یہ پابندیاں برداشت نہیں ہوسکتیں۔ آپ کے گھر میں ماما بن کے نہیں آئی کہ نہ میرا ناطہ اس گھر سے ٹوٹ سکتا ہے۔ جب جی چاہے گا جاؤں گی آؤں گی! "

بے چارہ خاموش ہو جاتا۔ کبھی وہ فرمائش کر کے جاتا کہ اس کے کپڑوں پر استری کر دی جائے۔ لیکن صبا نہ کرتی۔ وہ شام کو آکر خود ہی اپنا کام کر لیتا۔ اور کچھ نہ کہتا۔ ان تمام فضول حرکتوں کے علاوہ وہ بات بات پر اس سے روٹھ بھی جاتی تھی۔ توصیف اسے گھنٹوں مناتا سمجھاتا۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتا۔ اِدھر دل ہی دل میں ہنستی!۔

اسے غصہ دلانے کے لئے ایک دن اس کے باپ کے وقتوں کا ایک نادر و نایاب اور قیمتی گلدان کا سٹ جان بوجھ کر اوپر سے گرا کر توڑ دیا۔ اور سمجھا کہ شام کو خوب ہنگامہ برپا رہے گی۔ کیونکہ اپنے بڑے نقصان پر بڑی بی دن بھر بڑبڑایا کی تھیں۔ توصیف گھر آیا تو ماں نے اس سے شکایت کی۔ لیکن توصیف کے چہرے سے کچھ کرب جھلکا اور بس۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ارے یہ کیسا بدھو آدمی ہے۔ صبا نے جھلا کے سوچا۔ اسے تو بس یہی پسند تھا کہ وہ بھی اپنی امی یا باجی کے آگے شوہر کے ظلم و ستم کے جھوٹے سچے کہے اور دل میں قائل بھی ہو کہ وہ سب کچھ بکواس کر رہی ہے۔ مگر توصیف نے اس کا موقعہ ہی نہیں دیا۔ وہ عجیب آدمی تھا۔ جیسے اسے احتجاج کرنا، ظلم کرنا، مارنا پیٹنا، چیخنا چلانا اور دھوم دھاڑ مچانا آتا ہی نہ تھا۔ صبا نے اسے تلخاب سمجھا تھا مگر وہ تو شربت کا گھونٹ تھا۔ اور بار بار کی مٹھاس سے صبا کا جی اوب ہوگیا۔ وہ اسے ظلم پر ابھارنے لگی —

تیز تیز جواب دیتی۔ شاید وہ بے قابو ہو کر اس پر ہاتھ اٹھائے۔ گھر کے کام میں غلطیاں کرتی۔ شاید وہ اسے ڈانٹے ڈپٹے۔ ساس کے ساتھ بیہودگی سے پیش آتی۔ شاید یہی بات توصیف کے طیش و برہمی کا سبب بن جائے۔

چھوٹی نند کو جھڑکیاں دیتی۔ اب تو توصیف ضبط نہ کر سکے گا۔ بُری طرح اس کی خبر لے گا۔ لیکن کچھ بھی نہیں۔ وہ بدستور عفو و درگزر کا پیکر بنا رہا۔ برف کی سل۔ پتھر کی مورتی۔ ہر مرتبہ ہنس کے بیوی کی غلطی انگیز کر لیتا۔ اور اپنی ماں سے اس کی طرف سے معافیاں مانگتا۔ چھوٹی بہن کے آنسو پونچھتا۔

صبا کو اپنے شوہر کی نرم دلی سے نفرت ہونے لگی۔ اس کے گھر کی عورتیں یونہی بکواس کرتی تھیں۔ مرد ظالم نہیں ہوتے۔ انھیں ظلم کرنا آتا ہی نہیں۔ انھیں تو ستم اور ظلم پر خود عورتیں ابھارتی ہیں۔!

پھر قدرت نے صبا کے سر پر شرف مادری کا تاج رکھا۔ پہلے بیٹے کی پیدائش پر توصیف بے حد مسرور تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا میں پہلی دفعہ وہی باپ بنا تھا۔ اس نے بیوی کے دلار زیادہ کر دیئے۔ اس کے لئے مقوی دوائیں لایا۔ بچے کی ایک کھلائی مقرر کی۔ اور باورچی خانے کی خدمت سے اسے سبکدوش کر دیا۔ اب صبا راج کر رہی تھی۔ اس نے توصیف کی نرم دلی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ اب راتوں کو بچے کے رونے پر بھی نہ اٹھتی۔ بے چارہ توصیف ہی

اپنی نیند حرام کرکے اٹھتا اور بچے کو باہنوں میں لے کر جھلاتا تھا! اسے شیشی بنا کے پلاتا اور بیوی کی نیند خراب نہ کرتا۔!

صبا کی قسمت پر سب کو بڑا رشک آتا۔ اس نے کون سی نیکی کی تھی کہ ایسا فرشتہ صفت شوہر ملا تھا۔ وہ اب خود بھی اپنے مقدر پر نازاں تھی اور سب میں بیٹھ کر اپنے سسرال کی تعریفیں کیا کرتی۔ پھر بڑے فخر سے کہتی۔ ارے میں نے ننھے کے ابا کو مٹھی میں کر رکھا ہے۔ مجال ہے کہ میرے حکم سے باہر کوئی کام کریں۔ میرے اشاروں پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ میرے سامنے زبان نہیں کھول سکتے۔ کوئی پوچھتا۔ تمہاری ان زیادتیوں پر وہ کچھ نہیں کہتے تب وہ غرور سے ہنس دیتی۔ ان کی ہمت۔ ہی نہیں کہ میرے آگے زبان ہلائیں۔ دراصل تم لوگوں کو شوہر سے برتاؤ کا سلیقہ ہی نہیں۔ اس مخلوق کی باگیں کھینچے رہو تبھی سیدھے راستے پر چلتی ہے۔ ذرا ڈھیل دی کہ بس راہ سے ہٹ گئے۔ میں نے ایسا موقعہ ہی نہیں دیا۔ سر پر نہیں چڑھایا۔ شوہر کو بس آدمی سمجھا۔ خدا نہیں سمجھا کہ بس کھوپڑی پر بٹھالوں۔

اور صبا اپنے انوکھے راستے پر آنکھیں بند کئے گامزن تھی کہ قدرت کو اچانک غصہ آگیا۔ ایک شام کو توصیف کو بخار آیا۔ دوا علاج کہاں کا طوفان کی طرح بخار بڑھا اور بس دیکھتے ہی دیکھتے قصہ ختم۔ ادوسری رات تک اس کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ گیا!۔

کسی دل خوش کن خواب سے صبا کی آنکھیں کھل گئیں۔

اس کے سامنے زندگی کا بھائیں بھائیں کرتا دیر صحرا تھا۔

وہ اندھے کنوئیں میں گر پڑی۔

اور پھر اپنی غمگسار سہیلیوں کے بیچ میں بیٹھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

ہائے۔ وہ بھی ظالم نکلے۔ سب سے بڑھ کر ظالم۔

ہائے ظالم مجھے اکیلا چھوڑ کے چلے گئے۔

عقیدہ اور صحت یابی

تحریر: وڈورتھ کرسٹوفر ——— ترجمہ: نذر احمد

یہ تو آپ کا بھی مشاہدہ ہوگا کہ مصیبتیں اور پریشانیاں جب حد سے بڑھ جاتی ہیں تو آسان معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہی حال آسانی اور اس کی فراوانی کا بھی ہے۔ جب زیادہ آسانیاں اور راحتیں میسّر آجاتی ہیں تو انسان ان کی جانب سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ قدرت اس آسانی، سادگی اور فراوانی کے ساتھ کائنات کے ذرّے ذرّے میں جلوہ گر ہے کہ ہم بسا اوقات اسے نظر انداز کر جاتے ہیں ہماری دقتِ نظر اسے ہماری آنکھوں سے اوجھل کرا دیتی ہے اور اس وجہ سے اس کا ادراک دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک یورپین ادیب لکھتا ہے۔ "فطرت کا مطالعہ کرنے میں نہ تو فلسفیانہ موشگافیاں کرنے والا ذہن کامیاب ہو سکتا ہے نہ منطقی الجھنیں پیدا کرنے والا دماغ بلکہ اس کا مطالعہ کرنے کو بچوں کا سا سیدھا سادا، سادگی پسند اور معصوم ذہن چاہئے۔

ایک واقعہ جسے آپ نے بھی سُن رکھا ہوگا۔ اس حقیقت کی طرف بڑی اچھی طرح اور بڑا واضح اشارہ کرتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن جب ہفتہ وار عبادت کے لئے ایک گرجا گھر کا دروازہ کھولا گیا تو پتہ چلا کہ مسیح کا ایک طلائی مجسمہ غائب ہے منتظمین بڑے پریشان ہوئے اور ہر طرف ایک ہلچل سی مچ گئی۔ کچھ دیر اسی حالت میں گزری کہ ایک بچّہ اپنی تین پہیوں والی نئی سائیکل پر سوار گرجا گھر کے سامنے رُکا، سائیکل سے اترا اور سائیکل پر سے وہی مجسمہ اتار کر بڑی بے اعتنائی سے گرجا گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ بڑے عجیب انداز سے چلتا ہوا وہاں پہونچا، جہاں یہ مجسمہ رکھا جاتا تھا اور اس نے اسے اپنی جگہ رکھ دیا۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ کسی نے آگے بڑھ کر بچے کو روکا اور اس سلسلے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں نے خدا سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اسے نئی سائیکل ملی تو اس میں سب سے پہلے مسیح کو بٹھائے گا۔ اس کے خیال میں خدا نے اس لئے اس کی دُعا سُن لی اور وہ اس طرح مسیح کو بٹھا کر اپنا وعدہ پورا کرنا چاہتا تھا۔

اس بچّے کی سادگی اور معصومیت سے آپ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور حقیقت یہ ہے کہ فطرت کو سمجھنے کے لئے ایسا ہی سادہ ذہن مطلوب ہے اور کارسازِ حقیقی کی جلوہ گری کا تماشا ایسی معصوم نظریں ہی کر سکتی ہیں۔ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ خدا اور اس کی صفات سب کے لئے یکساں اثرات رکھتی ہیں اور سب پر رافت و رحمت کا ابر تو یکساں پڑتا ہے، لیکن کسی کی ظاہری اور اندرونی نگاہ میں ان میں کوئی فرق نظر آتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ در اصل وہ ہم ہیں، جو بدل جاتے ہیں۔ ہم سب کسی زمانے میں بچّے کا سا معصوم اور صاف ذہن رکھتے تھے اور ہمارا ضمیر بھی انھیں معصوم روحوں کا ضمیر ہوا کرتا تھا۔ بے گناہ اور معصوم ذہن ہی خدا پر سچّا اور بے کھوٹ ایمان رکھ سکتا ہے۔ آدمی جیسے جیسے زندگی کے دشوار گزار سفر کی پُر پیچ وادیاں طے کرتا ہے، اس کا ذہن اپنی فطری سادگی سے عاری ہونے لگتا ہے۔ اس کے اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے اس کے ذہن کی سادگی، معصومیت اور آخرکار اس کا ایمان اور یقین اس کے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلّف محسوس نہیں ہوتا کہ ہمارے تجربے اور معلومات ہمیں فائدے کم اور نقصان بہت پہونچاتے ہیں اور انھیں کی بدولت ہماری زندگی پیچیدہ ہوتی جارہی ہے۔ ہمارے ذہنوں کے راستے ان کی وجہ سے ایسے گنجلک ہو چلے ہیں کہ ایمان انھیں گورکھ دھندوں اور بھول بھلیوں کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔

میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر فطرت کے قریب آکر دیکھیں تو آپ حقیقتِ کائنات کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، جن کی مدد سے آپ میری یہ تحریر پڑھ رہے ہیں۔

میں نے ایک عرصہ معالج کی زندگی گزاری ہے۔ دکھ درد اور بیماری کے وقت جہاں تک میرا خیال ہے، انسان کا ذہن اپنی فطری سادگی کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے پیچیدہ اور ہٹیلے امراض اور ناقابل

بُرداشت تکلیف دینے والی حالتوں میں جو لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں وہ باوجود سمجھ دار اور واقفِ حال ہونے کے جب معروف طریقوں سے صحت حاصل نہیں کر سکتے تو بڑی آسانی سے عطائیت بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ٹونے ٹوٹکے تک اختیار کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ اس طرح کے بعض نامعقول طریقے جو دراصل چالاک اور دھوکے باز لوگ مریضوں کی بے چارگی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے گڑھ لیتے ہیں، کوئی بھلی چیز ہیں۔ میں تو صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ آدمی ان حالات میں اپنے سارے فلسفے اور حکمتیں بھول جایا کرتا ہے۔ میرے یہ خیالات جن کی بنیاد میرے تجربے پر ہے، آپ کی مدد کر سکتے ہیں، خواہ آپ معالج ہوں یا مریض ہوں۔ جس طرح ایک درخت کی شادابی، اس کی شاخوں کی سبزی، پھولوں کی مہک اور پھلوں کی شیرینی سب کچھ اس کی جڑ کی سلامتی اور کارگزاری پر منحصر ہوتی ہے اور زمین کی خفیہ قوتیں جڑ ہی کے توسط درخت کی ایک ایک شاخ تک سرائیت کرتی ہیں، بالکل اسی طرح آپ کی صحت، آپ کی قوت، توانائی، مسرت اور ذہن و جسم کا سکون سب کچھ آپ کے عقیدے اور ایمان پر منحصر ہوتا ہے۔ یقین ہی کی راہ سے خدا کا فیضان آپ کے نفس کو میسّر آتا ہے۔

آپ کا نہیں خود میرا اپنا مشاہدہ بھی ہے کہ ظاہری اور مادی اسباب بھی مفید، کارآمد اور کارساز ہوتے ہیں، لیکن حقیقت اس مشاہدے سے قدرے مختلف ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ پھل میں ایک تو اس کی ذاتی مٹھاس ہوتی ہے اور ایک وہ جو آپ باہر سے لاکر شریک کرتے ہیں۔ کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ ان دونوں کے ذائقے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

اگر آپ مُعالج ہیں تو اپنے مریض کو خدا کی شفا بخشی کا یقین دلائیے۔ اس طرح آپ جو سکون اس کی ذہن کو مہیّا کریں گے وہ اس کو بیماری اور تکلیف کے برداشت کرنے اور حصولِ صحت میں مدد دے گا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ آپ اپنے علم کو پسِ پشت ڈال دیں، لیکن یہ نصیحت ضرور کروں گا کہ آپ اپنے علم کا بہترین استعمال کریں۔ اپنی ساری معلومات دفعیۂ امراض کے لئے استعمال کریں، لیکن اتنا ضرور کریں کہ اس کے ساتھ نسخے میں یقین کی حلاوت بھی گھول دیں پھر دیکھیں کہ قدرت آپ کی مدد کس طرح کرتی ہے۔

اگر خدا نخواستہ آپ مریض ہیں تو پھر آپ اپنے مُعالج سے زیادہ اپنے کارساز پر بھروسہ کیجئے اور اس یقینی ذریعے سے سچا سکون حاصل کرکے میرے اس بیان کی تصدیق کیجئے۔

تلافی

زینت ممتاز

سُرخ شعلوں سے دہکتے کپڑوں میں سجی سنوری سر نیچا کئے وہ مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ دیکھ کر شرما رہی تھی جن پہ اس کے نام کے ساتھ اس دشمنِ جاں کا نام لکھا تھا جو آج اپنے پورے وجود سمیت اس کا ہو چکا تھا کتنی مدہوش ہوتی ہیں۔ یہ گھڑیاں جب جدائی کے نوکیلے کانٹوں کے بیچ راستے پل پل سُرخ گلاب بچھائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ منزل آجاتی ہے جس کی آس میں کومل آنکھیں برسوں سپنے دیکھتی ہیں۔ یہی تو وہ لمحات ہیں جو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں ان ہی لمحوں پر تو زندگی بھی واری جا سکتی ہے۔ مہندی سے دہکتی سُرخ ہتھیلی پر بیچوں بیچ دو نام مہک رہے تھے۔

کتنی جانگسل لمحوں کی اذیت کے بعد یہ اکٹھے ہوئے تھے اور اس طرح کہ اب تا ابد رہیں گے اس نے دھڑکنوں کے شور تلے بس اتنا سوچا اور کمرے کا دروازہ ہلکے سے شور سے بند ہوا، اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ خوبصورت سیاہ گھور آنکھوں سے شبنم کے دو قطرے نمودار ہوئے اور ٹوٹ کر آنچل میں جذب ہو گئے۔

آہ..... یہ خوشیاں اتنی اذیت ناک کیوں ہوتی ہیں کہ انکو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ جان سے گذرنا پڑتا ہے سہج سہج کر سر قدرے نیچا کر کے اس نے گھٹنوں سے ٹھوڑی لگا دی آنکھیں بند ہو چکی تھیں کئی دھڑکتے ہوئے لمحے گذر گئے اور وہ نہ معلوم کن کیفیات میں معلق رہی۔ ایک ظالم سے جھٹکے سے اس کا گھونگھٹ اترا کس قدر شدید حملہ تھا اس کے نازک احساسات پر۔ چونک کر بھاری آنکھیں اٹھائیں۔ معید لبوں پر سفاک مسکراہٹ لئے طنزیہ انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ روپ بہت قاتلانہ تھا بہت سفاک تھا۔ وہ وحشی ہرنی کے سے انداز میں سہمی اسے دیکھتی رہی۔ اور وہ چہرے پر غرور کا ہلکا سا تفاخر لئے بے رحمی سے کھڑا تھا گویا یہ جو اس نے بے دردی سے گھونگھٹ کھینچا تھا اس میں اس کا کوئی دخل نہ تھا شکوہ تھا۔ دن رات کی عبادتوں کا یہ ثمر ملا اسے کہ اس کی نگاہوں تلے دھند چھائی جا رہی تھی۔

معید..... مژگان نے ٹوٹے لہجے میں اسے پکارا ان لمحوں کی جھنجھلاہٹ بہت واضح تھی اس کی آواز میں گلہ تھا شکوہ تھا۔ دن رات کی عبادتوں کا یہ ثمر ملا اسے اس کی نگاہوں تلے دھند چھائی جا رہی تھی۔

"نیچے اترو" ایک لفظ کو چبا کر معید نے کہا اور وہ پوری جان سے لرز اٹھی۔ بکھرے وجود کو سنبھالتی نیچے اتری۔ سرخ آنچل چہرے پر خوبصورت سائے پھیلا رہا تھا۔ چہرے کے حسن کو آج معراج ملی تھی۔ ماتھے پہ جھومر کا شان سے دمک رہا تھا۔ حنائی ہاتھوں کی پوریں اضطراب سے دوچار ہو رہی تھیں۔ کتنا حسین احساس تھا جو اس نے اس ایک لمحے کے لئے سینت سینت کر رکھا تھا مگر وہ لمحہ فنا ہو چکا تھا۔ معید کو اسنے چاہا تھا۔ دل و جان سے اپنی امیدوں سے بڑھ کر آرزوؤں سے زیادہ وہ بھی تو اس کی چاہت کا قائل تھا۔ لیکن شاید کل تک اور وہ کل چاہت کی ڈوریاں سمیٹے نہ معلوم کہاں کھو گیا۔ تھا کہ اس کا اک عکس تک معید کی آنکھوں میں نہ تھا۔ اس کا دراز قد بے حد نمایاں محسوس ہو رہا تھا۔ مژگان سہمی کھڑی رہی۔ معید نے اچانک سنگدلی سے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اور وہ اس کے بے انتہا قریب آگئی۔ ایک ہاتھ سے اس کی پشت تھامے دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو قدرے اوپر کر کے وہ تضحیک آمیز انداز میں ہنسا۔

"حسن تو غضب ڈھا رہا ہے آج تمہارا۔"

کیا کہہ رہے ہو معید۔ مژگاں بے چارگی سے بولی۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ بتاؤ کیا قصور ہے میرا؟ وہ بڑے سکون سے سنتا رہا۔ پھر ابرو اچکا کر بلند آواز میں ہنسا۔

نہیں نہیں قصور تمہارا نہیں ہے۔ قصور تو میرا ہے اس قدر دلکش روپ اور۔ خیر جب اس منزل تک پہنچ ہی گئی ہو تو اب تمہیں یہ پوری داستان سنانے میں کوئی حرج نہیں۔ تم کیا سمجھ رہی تھیں پاگل لڑکی یہ جو میں تم سے ملتا رہا تھا یہ سب سچ تھا۔ نہیں پگلی کا فریکی گل نہیں تھا وہ تو سب ٹائم پاسنگ ہو رہا تھا یہ تو بہت لمبی داستان ہے سنوگی اچھا تمہاری یہی مرضی ہے تو یونہی سہی!!

بے نیازی سے سگریٹ سلگا کر وہ صوفے پر گر گیا۔ پیر لا پرواہی سے سامنے رکھی میز پر پھیلا دیئے۔ اور کش پر کش لیتا ذرا تھم کر بولنے لگا۔
• ہاں تو یہ سب اک کھیل تھا جو صرف تم سے ہی نہیں کھیلا گیا اور بھی بے وقوف لڑکیاں اس جال میں پھنس چکی تھیں ان سب کو اس منزل تک لا کر میں اپنے باس کے حوالے کر چکا ہوں۔ جنھوں نے مجھ پر بہت سے احسانات کئے ہیں اور ان احسانات کا بدلہ میں صرف اسی طرح سے چکا سکتا ہوں کہ اس میں ان کی خوشی بھی۔ بہرطور شامل رہی ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے مژگاں کی طرف نظر کی۔ جو خوف کے بھرپور احساس سے آنکھیں کھولے اس کو تکے جا رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں بھونچال سا آگیا تھا ہیجان کا ایک دباؤ تھا جو اس کا ذہن مفلوج کئے جا رہا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں رکنے لگیں۔ اور وہ ساکت ہو کر زمین پر گر چکی تھی۔ ہونٹوں پر واضح ارتعاش تھا اور نہیں نہیں کی اک ناکام صدا بلند ہو ہو کر فضا میں بکھر رہی تھی۔

اور جب اسے ہوش آیا تو وہ بڑے آرام سے مسہری پر نیم دراز تھی کمرے کی فضا وہی تھی۔ خوابناک سی، اس کے چاروں طرف پھولوں کی لڑیاں لہرا رہی تھیں اور مدھم خوشبوؤں کے سائے ڈول رہے تھے۔ کھڑکیوں پہ دبیز پردے سرکائے گئے تھے۔ فضا کچھ اندھیری سی ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ بالکل خالی ذہن سے یک ٹک چھت کو گھورے چلی گئی۔ بغیر کسی مقصد کے کیونکہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ پھر جب ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو جھٹکے سے وہ اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا وہ اکیلی تھی۔ تو کیا معید اپنے باس کو۔۔؟ اس سے آگے وہ سوچ نہ سکی رہی تھی۔ اسے رونا آ رہا تھا اپنی حالت پر اپنی کیفیت پر۔ ابھی تک وہ اسی روپ میں تھی جی چاہ رہا تھا کہ سرخ لباس نوچ ڈالے۔ خود کو نیست و نابود کر ڈالے اتنی بڑی ذلت اتنا بڑا دھوکہ جسے وہ نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی وہ رہزن نکلا۔ خود اسے ہی لوٹ گیا۔ کیسے ظالم ہوتے ہیں یہ لوگ کیسے روپ بدلتے ہیں۔ وہ ساتھ نبھانے کی قسمیں وہ سب دکھاوا تھا اتنا بڑا جھوٹ اور وہ اسے سہہ بھی گئی لیکن اس سے آگے کی راہیں معید نے متعین کی تھیں وہ ان پر کبھی نہ چلے گی۔ کبھی نہیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنے غرارے کو سنبھالتی وہ جوں توں اٹھ کھڑی ہوئی لرزتے قدموں سے ذرا ہی آگے بڑھی تھی کہ اک دھماکے سے دروازہ کھلا اور معید اندر داخل ہوا۔ اور وہ تقدیر کے اس وار پر تلملا بھی نہ سکی۔ کیا تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ نہیں ایک تو راہ بچ گئی تھی اور وہ اس کے عزم کی تھی۔ آہنی عزم کی۔ بند دروازے سے ٹیک لگائے۔ بڑے آرام سے سینے پر ہاتھ باندھے وہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لبوں پر شوخ مسکراہٹ مچل رہی تھی۔ میں جا رہی ہوں معید اور تم مجھے نہیں روک سکتے اور جو روکنا چاہو گے تو تمہیں میرا بے جان جسم ملے گا مجھے" وہ پوری قوت سے چلائی۔ اس کے لہجے میں آگ کی سی تپش تھی۔

معید نے اس کا بدلا ہوا روپ دیکھا اس کا ذہن اک لمحے کو چکرا گیا۔ کچھ سوچ کر وہ قریب آتا گیا۔ مژگاں قدرے ہٹ گئی۔ مجھ سے دور رہو۔ تم اپنے جسم کا ناپاک سایہ تک میرے وجود پر نہیں ڈال سکتے۔ افسوس تو اپنی عقل پر ہے، رونا تو اپنی بے وقوفی پر آ رہا ہے کہ سورج کے دھوکے میں اک ذرے کو سورج کا روپ دیا۔

معید تڑپ کر آگے بڑھا اس کے ہاتھوں کو زبردستی تھام کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے وہ بھیگے لہجے میں کیا کہہ رہا تھا۔ مژگاں کہہ دو یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ تو صرف اک مذاق تھا۔ تمہارے اعتماد کی آزمائش تھی اور کیا تم نے اپنے معید کو اتنا کم ظرف سمجھا تھا۔ بتاؤ وہ ٹوٹتے لہجے میں کہتا گیا۔ پل میں مژگاں کی آنکھوں کے سامنے سے سیاہ پردے سرکنے لگے۔ مگر پھر بے یقینی کی اک گرفت نے اس کے دل کو جکڑ لیا۔ کیا یہ جو سب کچھ میں سن رہی ہوں یہ جھوٹ ہے یا وہ جو میں نے سنا تھا اور پھر اتنا بڑا جھوٹ اتنی بڑی آزمائش۔

نہیں معید تم مجھے کب تک اعتماد کی آزمائش میں ڈالتے رہو گے میں تو بہت کمزور ہوں اتنی کہ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت تھی۔ پھر تم نے کیا سوچ کر مجھ پر اتنا ستم ڈھایا! ہچکیوں سے اس کا بدن ڈول رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرے چھانے لگے تھے۔ معید نے اس کے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے لیا اور مدھم خوابناک لہجے میں شرمسار سا وہ کہہ رہا تھا۔ بس جان... یہ آخری غلطی تھی میری اور پھر کیا تم اس سنگین غلطی کو نظر انداز کر کے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہ دو گی۔

مژگاں جو کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ تمام جذبے آنسوؤں میں سمٹ کر معید کے مضبوط ہاتھوں پر گرے اور جذب ہو گئے اور ان جذبوں کی انتہائی گہرائی میں محبت تھی عقیدت تھی اور احترام تھا جو دونوں کے دلوں کو

غلام نبی اوجؔ امروہوی

تعلیم نسواں

کسے معلوم تھا اے اوجؔ یہ ساماں بہم ہونگے
ہماری قوم پر ہر سمت سے جور و ستم ہونگے
نئے عشرت کدے ہونگے نئے بیت الصنم ہونگے
مصائب بھی نئے ہوں گے نئے رنج والم ہونگے
نیا اک دور دیکھیں گے ہم اس دنیا کی محفل میں
بسے گی اک نئی دنیا ہمارے خانۂ دل میں

یہ باتیں آنکھ دیکھی ہیں نہیں مدت بہت گزری
نہیں دو چار بلکہ تھیں ہزاروں ان میں ایسی بھی
ہماری عورتیں پابند تھیں احکام مذہب کی
کہ جن کو علم دین و علم دنیا سے تھی آگاہی
نہ تھا باقاعدہ کچھ نظم گو ان کی پڑھائی کا
مگر دنیا کو دیتی تھیں سبق وہ پارسائی کا

حساب خانہ داری کا انھیں پورا سلیقہ تھا
زبانی یاد تھے سب واقعاتِ صفحۂ دنیا
نکالیتی تھیں پورا جوڑ اپنی خرچ و آمد کا
سُنادی ہسٹری پوری جہاں نکلا کوئی قصہ
مدارس میں پڑھی تھیں وہ نہ مکتب میں پڑھی تھیں وہ
مگر پھر بھی علوم دینوی کو جانتی تھیں وہ

اگرچہ اُن کی دنیا واقعی محدود ہوتی تھی
مگر ثابت تھی اُن کے کام سے ان کی ہنرمندی
نکلتی تھیں نہ وہ باہر نہ کرتی تھیں ہوا خوری
ہر اک کام ان کو آتا تھا وہ تھیں ہر کام پر حاوی
تکلف سے بری تھیں سادگی سے کام تھا ان کو
حقیقت میں حیا کا پاس صبح و شام تھا ان کو

ہوا بدلی جو عالم کی ہوئے ساماں بہم ایسے
ہر اک دل بستگی رکھتا ہے اب تہذیب حاضر سے
کہ ان کی گود کے پالے مخالف بن گئے اُن کے
نہیں معلوم کیسے پڑ گئے ہیں عقل پر پردے
گلی کوچوں میں دیکھو لڑکیاں چکر لگاتی ہیں
بلاناغہ سنور کر روز وہ اسکول جاتی ہیں

مخالف میں نہیں دنیا کے نسواں کی پڑھائی کا
مگر کچھ اور منشا ہے مری ہرزہ سرائی کا
نہیں انکار ذرہ بھر حدیث مصطفائی کا
حیا والے کہیں شیوہ نہ سیکھیں بے حیائی کا
ہماری لڑکیاں جب درسگاہوں میں ہوئیں داخل
ہوئیں تہذیب لایعنی کی ان کو ڈگریاں حاصل

یہی تہذیب ہے جس نے پلٹ دی دہر کی کایا
کیا بے غیرتی و بے حجابی کا شجر پیدا
بزرگان سلف کی عزت و ناموس کو میٹا
لیا آغوش میں جس کو نہ اس نے کوئی پھل پایا
یہی تہذیب ہے جس نے دکھائی شکل عریانی
اسی تہذیب کے باعث پھرا ناموس پر پانی

سنو اسکول میں بے پردگی کا ہے سبق پہلا
تکلف اور فیشن کو سمجھ لو تیسرا درجا
پھر اس کے بعد بیباکی کا ہوتا ہے چلن پیدا
نصاب آخری ہوتا ہے آخر ترک مذہب کا
جو اس کے بعد کی تعلیم ہے دنیا پہ روشن ہے
کوئی گلچیں بنے، سب کے لئے یہ خار گلشن ہے

ذرا اس پر بھی عمل کیجیے

نجم اعزاز

زندگی کی کئی ضروریات ایسی ہیں جنھیں پوری کرنے کے لیے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن ہم میں سے زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو ضرورت سے بڑھ کر محنت کرتے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر ہم کون سا رخ اپنائیں جس سے ہمیں کم سے کم محنت میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہیئے کہ روزانہ کے کاموں کی فہرست تیار کرلیں کہ کون سا کام زیادہ ضروری ہے اور کون سا بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ ایسی فہرست بنالیں گے تو بہت آسانی ہوگی۔ اگلے دن صبح حوائج ضروری سے فراغت حاصل کرتے ہی فہرست کے مطابق کام پر لگ جایئے سلسلہ وار کام مکمل ہونے تک اگلے کام کو ہاتھ نہ لگائیں۔ جیسے اگر آپ خانہ دار بیوی اور ماں ہیں اور آپ کو کھانا پکانے کے علاوہ بچوں کو اسکول کے لیے بھی تیار کرنا ہے۔ اب اگر آپ پہلے سے کاموں کو نمبر وار ترتیب نہیں دے لیا ہے تو آپ سخت مشکل میں پڑسکتی ہیں جیسے اگر آپ نے بچوں کو اسکول کے لیے تیار کر کے کھانا پکانا شروع کردیا تو اتنے عرصہ میں بچے اسکول کی پوشاک گندی کرسکتے ہیں ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی میں سجے سنورے بال بکھرا سکتے ہیں۔ لہٰذا آپ کو پہلا کام کھانا پکانے کا کرنا چاہیئے ہلکا پھلکا ناشتہ تیار کرنے کے بعد آپ بچوں کو اسکول کے لیے فراغت سے تیار کرسکتی ہیں اور فوراً ہی انھیں وقت پر اسکول کے لیے روانہ کرسکتی ہیں صرف یہی نہیں بلکہ ایک کام کے پورا ہونے کے درمیان کچھ وقت اگر انتظار میں بیکار ہوتا ہے تو اس وقت دال چاول کے ابلنے کا انتظار کرنے کے بجائے اس عرصہ میں آپ سبزی ترکاری کاٹ سکتی ہیں روٹی کے لیے آٹا گوندھ سکتی ہیں یا اپنے شوہر یا بچوں کا کوئی چھوٹا موٹا کام نپٹا سکتی ہیں

بہرحال اس کے لیے "اشد ضروری" اور "اہم" کاموں کا فرق سمجھنا ضروری ہے

نئی نویلی ماؤں کی عام شکایت یہ ہوتی ہے کہ بچے کو سنبھالنا اور گھریلو کام کرنا ایک ساتھ ناممکن ہے اکثر ایسی ماؤں کے بچے ریں ریں کرتے رہتے ہیں اور مائیں گھر کے کاموں میں جٹی رہتی ہیں یا مائیں روتے مچلتے بچوں کو سنبھالنے میں لگی رہتی ہیں اور شوہر کو وقت پر ناشتہ کھانا نہیں مل پاتا۔ جس سے رفتہ رفتہ ازدواجی زندگی میں جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسی ماؤں کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ بچے کے سونے جاگنے کے اوقات کے مطابق اپنے دن بھر کے کاموں کا پروگرام تیار کرلیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچہ صبح دیر تک سوتا رہتا ہے تو مائیں بھی پیر پھیلائے سوتی رہتی ہیں جب بچہ جاگتا ہے تب ماں صاحبہ کا بھی دن شروع ہوتا ہے بچے کو اٹھا سیدھا دودھ پلا کر پلنگ یا جھولے میں پٹخ کر ماں کام میں جٹ جاتی ہے۔ ناشتہ تیار کرنا۔ شوہر کے کپڑوں پر استری کرنا۔ نل بند ہوجانے کے خوف سے جلدی جلدی بچوں کے کپڑے دھونا۔ غرضکہ سارا کام ایک ساتھ شروع ہوتا ہے ایک چھوڑ ایک پکڑ میں وقت کا زیاں تو ہوتا ہی ہے اور محنت بھی دگنی ہوجاتی ہے اور پریشانی الگ ایک طرف شوہر کپڑے اور شائد جوتے تلاش کرنے میں ہانک لگا رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف بچے اسکول جانے کے لیے ناشتہ کی پکار مچائے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ چھوٹے بچے کی بے سری بین ہوتی ہے ہر ایک بے اطمینان رہتا ہے۔ اب اگر پہلے سے پروگرام تیار کرلیا گیا ہوتا تو چھوٹے بچے کو سوتا چھوڑ ماں علی الصباح ہی اپنا کام شروع کرسکتی تھی بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے سارا کام بھی آسانی سے مکمل ہوجاتا اور بچے کو ریں ریں کرنے کی عادت

بھی نہ پڑتی اور ماں کو اتنی تھکن بھی محسوس نہ ہوتی۔

اپنی زندگی سے فکروں اور پریشانیوں کو دور رکھنے کے دو راستے ہیں ایک تو یہ کہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں ہر مشکل پیش آنے پر خود سے یہ پوچھیں کہ اگر اس سے بھی بدتر حالات ہوتے تو کیا ہوتا؟ ایسی حالت میں دل و دماغ کا جواب یہی ہوا کرتا ہے کہ موجودہ حالت غنیمت ہے۔ اس جواب کے بعد فکروں میں ڈوبے رہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی بلکہ موجودہ حالت میں ہی ٹھیک ڈھنگ سے گذر بسر کرنے کا عزم جوان ہو جاتا ہے پھر کوئی مشکل مشکل نہیں لگتی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ تمام پریشانیوں سے نپٹنے کے لیے ٹھوس قدم اٹھائیں اپنے لیے ایک راہ متعین کرلیں۔ بیکار کی پریشانیوں اور فکروں سے پیچھا چھڑانے کی یہ ترکیب آپ کو نیا انسان بنا دے گی تب آپ کو لگے گا کہ آپ کے پاس اتنی قابلیت اتنا وقت اور اتنی ہمت و عقل ہے جس کو آپ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "زندگی پر کالے سائے اس لیے چھائے رہتے ہیں کہ انسان خود اپنی ہی روشنی کو روکے کھڑا رہتا ہے"۔

اکثر لوگوں کو یہ کہتا پایا گیا ہے کہ کام پورا کرنے کے لیے مناسب وقت نہیں مل پاتا۔ کوئی خاص کام انجام نہ دے سکنے پر ہائے واویلا مچانے سے گذرا وقت تو لوٹ کر آنے سے رہا۔ بلکہ الٹا مزید وقت اس ماتم میں برباد ہو جاتا ہے لہذا گذرے پر خاک ڈال کر نئے سرے سے اگلے کام میں جٹ جانا ہی عقلمندی کی نشانی ہے کیونکہ بہت زیادہ کام نہ کر سکنے سے تو یہ اچھا ہے کہ ہم قدرے کم کام کریں لیکن بہتر ڈھنگ سے اور مکمل طور پر۔

بہرحال اس طرح کم سے کم محنت کرکے آپ زیادہ سے زیادہ کام ٹھیک ٹھیک طریقے سے انجام دے سکتی ہیں بشرطیکہ کچھ اصول بنالیں۔

اگر آپ

اپنی شخصیت کو دلکش بنانا پسند کرتی ہیں

یہ نہ سوچیں کہ آپ کو شکل و صورت کے لحاظ سے سب سے بہتر ہونا چاہیئے۔ اس پرانی کہاوت کی سچائی پر یقین کریں کہ خوبصورت وہ ہے جو خوبصورت کام کرتا ہے۔

یہ نہ سوچیں کہ چونکہ آپ کی شکل و صورت اچھی نہیں اس لیے آپ کے لیے پسندیدہ شخصیت بننے کے تمام مواقع ختم ہوگئے کیونکہ عمل کا سلسلہ انسان کی زندگی میں اس کی آخری سانس تک رہتا ہے۔

لوگ ہماری ہر وضع قطع کو قبول کر لیتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں ہماری ذات میں کوئی خوبی نظر آئے۔

یہ نہ سوچیں کہ دلکش بننے کے لیے الٹرا ماڈرن بننا ضروری ہے۔

یہ نہ بھولیں کہ چہرے کی تازگی اور خوشگواری شخصیت کے پسندیدہ عناصر ہیں۔

یہ نہ سوچیں کہ کسی خوبصورت اور مقبول شخصیت کی نقل کرنا ضروری ہے۔

یہ نہ بھولیں کہ دوسروں کی اچھی چیزوں پر غور کرنا مفید ہے مثلاً کسی کا انداز تکلم کسی کی آواز لیکن اپنے طرز عمل میں نقل کی بدولت آپ دلکش نہیں بن سکتیں۔ اپنا فطری انداز اپنائیں۔

یہ نہ سوچیں کہ آپ کو ہر محفل کی روح رواں بننا چاہیئے۔

یاد رکھیں کہ وہ شخص جو ہر ایک کی توجہ کا مرکز بننے کی کوشش کرتا ہے لوگ اس سے چڑنے لگتے ہیں۔

یہ ثابت کرنا ضروری نہیں کہ آپ کی معلومات بہت وسیع ہیں۔

یاد رکھیں کہ آپ کی شکل و صورت، آپ کے طرز عمل، انداز گفتگو، انداز تخاطب سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

اپنے مزاج کی بے ساختگی کے ساتھ خوشگوار لہجے کی اہمیت نہ بھولیں۔ لوگ ہمیں ہمارے رویے کے آئینے میں جانچتے ہیں کہ ہم پسندیدہ ہیں یا نہیں۔

• کیا آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں۔ نوٹ فرمائیں کہ اس کے لیے آپ کو جوابی کارڈ یا لفافہ روانہ کرنا چاہیئے۔

نانی اماں نے میک اَپ کیا

عفت موہانی

یوں تو مجھے اچھی طرحوں معلوم ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ اللہ بے نیاز نے مجھے فرصت سے بنایا ہے۔ ہائے۔ چاہے کوئی مجھے برس سے چالیس برس نیچے اگر دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ جیسے بازاروں کی دکانوں میں سنگ مرمر کے پتھر کی مورتی بنا کے اسے ہی پہنا رہے ہیں نا۔ ویسی ہی کوئی مکھن کی مورت ہے۔ راہ لوگ مجھے دیکھ کے حیرت سے نقش دیوار بنا کرتے تھے۔ اسے تو یہ مت سمجھنا کہ میں یونہی سر جھاڑ منھ پہاڑ پھرا کرتی تھی نہیں چلتے چلاتے اگر منھ پر سے برقے کا لو بڑا ہوا اڑا دیتی تھی تو ایک منظر آتا تھا اور پھر کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

یہ ماجرا میں نے بیان فرمایا تو نجن بولا "امی ڈراؤنی تھیں تم کہ جہاں کسی نے تمھاری شکل دیکھی اور بیہوش ہو کے گر پڑا۔"

اب میں ذرا ابھی سے اُترنے لگی ہوں اس لئے میرا خون بھی نرم ہوتا جا رہا ہے، مطلب یہ کہ اب مجھے دھڑام سے غصہ نہیں انسانیت سے موقعہ محل دیکھ کے آتا ہے۔ اس لئے میں نے اس کی بے فضول بات پر کان نہ دی، اور لاپروائی سے بولی۔

"چل رے ہیل۔ تو نے بھلا کہاں دیکھا مجھے۔ اپنے باوا سے پوچھنا۔"

رات کو اس کے باوا کھانا پانی سے پیے فراغت ہو کے اپنے پلنگ پر سرگٹ پینے بیٹھے تو نجن نے ان سے پوچھ لیا۔

"جی ابا! یہ بتائیے۔ اماں کیا چالیس سال نیچے بہت خوبصورت تھیں؟"

"ہُنھ!" تمھارے نانا نے بڑا سا منھ بنائے۔

"منھ کا کیا مطلب؟" میں گرجی۔

"مطلب یہ کہ۔ کالی کلوٹی تھیں تب بھی جیسی اب ہیں۔ بشیر اسکا چھوہارہ۔"

نجن کی ہنسی نکل گئی۔

"تم ہی کون سے پرستان کے پرے تھے" میں آگ ہو کے بولی "کالے بھجنگ تھے۔ اماں بی۔ خالہ بی اور ممانی بی نے کہا بھی تھا کہ ہائے ایسی حسین مہ جبین گوری بھق لونڈیا کی قسمت یہ جنگل کے کالے دیو سے کس نے پھوڑ دی؟"

"بات مذکور تمھاری صورت کی ہے میری کالی صورت کی نہیں" تمھارے نانا بولے۔ اور شاید غصّے کے مارے تیز تیز سرگٹ دھنکنے لگے۔ اب دیکھو کیسا چرکا لگا۔

"ہر بات تمھاری اور ابا کی لڑائی پر ختم ہو جاتی ہے اماں۔" نجن جھنجھلایا۔

"اچھا تو خالہ البسری سے پوچھ لو" میں طنطنے میں آ کے بولی۔

"البسری نہیں اماں! افسری، خالہ افسری" نجن بولا۔

"ہو گا۔ میری بلا سے" میرا موڈ آف ہو گیا۔

"تمھاری جہالت بہت بری ہے اماں" نجن بولا "میں تو شرم کے مارے گڑا جاتا ہوں۔ تم نے ایک دفعہ دوسروں کا ٹیوشن لیا تھا۔ اب میں تمھارا لوں گا۔ تاکہ تم الفاظ تو کم از کم صحیح بولا کرو۔"

"جمعہ جمعہ آٹھ روز کی پیدائش اور اماں کو پڑھائے گا؟" میں غصے ہوئی۔

"مجبوری ہے" نجن بولا۔ "تم ذرا غور کرو کہ کل کلاں کو اگر بھابی ہی آگئیں۔ یا تم نے میری شادی کر دی تو یہ نئی عورتیں آ کے تمھاری کیا باتیں سنیں گی۔ کتنا ہنسیں گی اور ہم لوگ کھسیائیں گے نا؟"

"جاہل کمینے بے تمیز" میں آپے سے باہر ہونے لگی "تو بھی تو کوئی عالم بالغ نہیں ہے۔"

"میں ایم۔ اے ہوں" وہ اکڑا۔

"ایسا ہوگا ہے میں نہیں جانتی۔ تجھے بڑے بزرگوں کا ادب قاعدہ نہیں معلوم۔ اور یہ بھی تجھے خبر نہیں کہ اللہ صاحب نے اماں کے قدموں تلے جنت رکھ دی ہے۔ مجھ سے بے تمیزیاں کرے گا اور سیدھا جہنم

میں جائے گا جیسے اتنا علم مقدور نہ ہو۔ وہ کیا پڑھا لکھا ہے خاک میں عالم جوش میں تحریر فرمائی گئی۔ بجن جو بے حد ڈھیٹ اور نگرا ہے وہ میری نصیحت فضیحت سے عقل لینے کی بجائے ہی ہی کرتا رہا۔

ستیاناس ہو جنگلے گینڈے۔ میں نے نقلی دانت پیسے۔ تجھ سے سر لڑا کے مجھے کیا اپنی اوقات گرانا ہے۔ بات ہی نہ کیا کرونگی۔

تم لوگ بچوں کی طرح آپس میں نوچم کھسوٹی مت کیا کرو۔ بڑے میاں خوخیائے۔ پھر مجھ سے بولے ؛ ہاں تو تم نے پھر کہا نہیں کہ یہ اپنے بجن کے بیاہ کا کیا ہوگا؟۔

ارے ابا! بس ؛ بجن جھٹ سے بیچ میں کودا ؛ بیاہ ویاہ کا تذکرہ مت کیجئے۔ یاد نہیں ہے۔ اماں نے اب سے دُو دہزار بارہ سو کا چرکا دیا تھا۔ پھول سٹھائی ساڑی اور کیا نام سونے کی انگوٹھی اپنی حضرت آپا کے گھر بھول آئی تھیں ؛

میں کہاں مری جارہی ہوں تیری شادی کے بغیر ؛ میں تڑخی۔

نذیر۔ بڑے میاں سرگٹ کا مرغہ آنگن میں اچھال کر بولے۔

چپ رہو بیٹا۔ بڑوں میں جب شادی بیاہ کا ذکر مذکور ہو تو بیچ میں نہیں بولنا چاہیئے۔

اماں پھر کوئی کانی کھتری لڑکی دیکھ آئیں گی ابا ؛ بجن نے فریاد کی۔

اچھا تو پھر قوہ کاف کی پری تو خود دیکھ کے بیاہ لا ؛ میں غرائی میری دیکھی ہوئی کو تم گھر میں گھسنے دو تو بیاہ لاؤں ؛ وہ بے حیا بے غیرت ہنس کے بولا۔

میں جوتی اٹھانے آگے سرکی اور وہ بھاگ کے اپنے باپ کے پیچھے چھپ گیا۔

وہ ایک ہنکارہ بھر کے اور فقرہ کھا کے بولے ؛ سنو میرے بچپن کے ایک دوست ہیں۔ کیا نام کہ مولوی بیزار بخش کی نواسی بہت اچھی ہے۔ میں سوچا ہوں کہ اپنے بجن کے لئے۔ تم ذرا جا کے دیکھ آؤ تو پھر میں پیغام دوں گا ؛

اگر لونڈیا اچھی نکلی تو میں وہیں کیوں نہ پسند کرکے پیغام دے دوں ؛ میں خوش ہو کے بولی۔ کبھی تو منھ سے شریفوں کی سی بولی نکالا کرو ؛ بڑے میاں بولے۔ وہاں تم لونڈیا بول دیں تو اچھے دل خراب ہوں گے۔

ہوا کریں ؛ میں تڑخی ؛ مجھے تو ایسا ہی بولنا آتا ہے۔ کسی کا جی چاہے سُنے جی نہ چاہے نہ سنے ؛

لڑکی ہی کر کے کیوں نہ بولو اماں ؛ بجن پھر ٹپکا۔

چُپ! ؛ میں گرجی۔

اچھا اماں ؛ وہ چپ ہو گیا۔

ہاں تو پھر ؛ میں بڑے میاں سے فرمائی۔

پہلے لڑکی کا قد قیامت رنگ روپ اور کیا نام چلوائی پھروائی دیکھ آؤ۔ اس کے بعد موقعہ محل سے پیام دیں گے ؛ بڑے میاں بولے۔

لڑکی کا خد میرے اتنا ہوا تو پھر ؛ میں نے پوچھی۔

نہیں اماں تمھاری اتنی بونی نہیں چاہیئے ؛ بجن بول پڑا ؛

صورت حرام! ؛ میں چنگھاڑی ؛ یہی تو تیری باتیں ہیں جن سے میری بڑی جلتی ہے۔ ارے پاجی خبیث ایک زمانہ تھا کہ لوگ میرے سرو کے سے قیامت کی امثالیں دیا کرتے تھے۔

سرو کی سی قامت! اماں۔ قیامت نہیں۔ اور امثال بولو صرف۔ مثال کی جمع امثال۔ بجن نے بڑے پروفیسروں کیطرح کہا

دیکھو جی چینگی کے محرر صاحب! ؛ میں بڑے حضرت پر الٹ پڑی ؛ منا کر لو اپنے اوقات بھرے اولیاد کو۔ ورنہ پھر اس کی شادی وادی سے مجھے کچھ سرکار نہیں۔ کر لو خود ہی شادی آدی ؛

سرکار؟ سرکار کا کیا مطلب؟ ؛ دونوں بولے ؛

سرکار مانئے۔ واسطہ۔ مطلب ؛ میں تحقیر پنے سے بولی۔

ارے سرکار نہیں۔ اسے سروکار کہتے ہیں ؛ بجن یکدم ہنس دیا۔

چل دُور ؛ میں نے اسے جھڑکی دی۔

بجن اب تم اپنے منھ میں ٹانکے لگا لو میاں ؛ بڑے حضت بولے۔

لگالے ابا! ؛ وہ باادب ہو بیٹھا۔

ہاں تو پھر چڑھاوا ؛ میں خوش ہو کے بولی ؛ میں تو سوچ ری ہوں کہ یہ بڑا سا چندن ہار اور یا خوب کی انگوٹھی۔

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ دونوں خبطی باپ بیٹے یکبارگی ہنس پڑے تھے۔

اماں! یاخوب نہیں ؛ بجن ہنستے ہنستے بولا ؛ اسے یاقوت

کہتے ہیں۔

تو کہاں سے جوہری کی اولاد بن کے پیدا ہوا ہے"؟ میں اُس پر اُلٹا ہنسی "ہماری اماں خود ناک میں ننھی سی یاخوب کی کیل پہنے رہتی تھی۔ سدا سب لوگ اسے یاخوب یاخوب کہا کئے۔

تمھاری اماں جاہل ترپٹ تھیں" بجّو نے کہا۔

تو ایک دن سچ مچ میری جوتی سے حلال ہو جائے گا۔ بلاتک بے عزتی کے صدمے سے نڈھال ہو کے میں بولی "اب نہیں سنا جاتا تیری بے تمیزیاں حد سے درگزر کر رہی ہیں"

اچھی بات ہے۔ تم لوگ آپس میں لڑو۔ میں سوتا ہوں بڑے میاں نے دھمکی دی۔ میں بھی سوتا ہوں" یہ کہہ کے بجّو اپنے باوا کے بستر پہ لوندپوند ہو گیا۔

میں آنکھوں میں آنسو بھر کے آبدیدہ ہو گئی تھی۔ بھلا اپنے مرے ہوتے مرحوم لوگوں کو کل کے چھوکرے اول فول بکیں تو دل پر کوہِ ہمالیہ کے پہاڑ آگرتے ہیں

میں تو سوچی تھی کہ ایسی تیسی بجّو اور اس کی شادی کی۔ پھر خیال آیا کہ چلو اسی بہانے کچھ روپیہ ہاتھ میں آئے گا۔ پھر سے سلسلہ چھیڑا۔

"سنو جی۔ میں کل صبح ناشتے پانی کے بعد تمھارے مولوی بیزار بخش کے گھر جاؤں گی، اور اگر لڑکی اچھی ہوئی تو پھر!"

تو پھر وہاں کچھ نہ کہنا" بڑے حضرت میرے منھ سے بات اُچک لے" بلکہ مجھ سے آکے بولو۔ پھر ہم دونوں خوب سوچ بچار کر کے پیغام دیں گے"

شادی کتنے ہزار میں کرو گے؟" میں للچا کے بولی۔

ارے! میں کون سا اعلیٰ حضرت ہوں" بڑے میاں بولے۔ بس ٹوٹی پھوٹی تھوڑی سی رقم جمع کر لیا ہوں۔ اسی میں نمٹا دینگے۔

اور۔ وہ نام کر، جوڑے گھوڑے اور" میں بولی۔

اماں نہ گھوڑے نہ گدھے" بجّو یکبارگی پھر بول پڑا" کیا تم بھی لالچی کنگلی عورتوں کی طرح غیر گھر سے روپیہ مانگو گی چھی چھی چھی۔

تو پھر ہمارے پاس رستم ہند کا خزانہ کہاں گڑا ہے" میں چیخی۔

رستم ہند نہیں قارون۔ قارون کا خزانہ" بڑے حضرت فرمائے ٹھہرو جی۔ دیکھیں گے! اب سوؤ چین سے بڑے۔

پھر وہ دونوں تو سو گئے مگر مجھے نیند کہاں۔ میں تو چٹی پٹی سی منصوبے گانٹھا کی۔ چپکے سے میں مولوی بیزار بخش سے کہوں گی کہ ہمارا لڑکا ایف پاس ہے اور کیا نام ایک جگہ پورے ڈھائی سو اُپرہ پچاس کا نوکر ہے۔ اوپر کی بالائی آمدنی بھی اللہ رکھے ہے۔ اس ہیرے موتی ایسے نورِ نظر صاحبزادے کے جوڑے کے پورے پکے دس ہزار روپے دیجئے، نہیں تو جائیے ہوا کھائیے۔ اور جب مولوی صاحب دس ہزار روپے دے مریں گے تو میں کسی کو بتاؤں گی تھوڑی، مزے میں رکھ لوں گی۔ اور پھر۔ آہا، بی اور مزے داریاں ہیں۔ میں نے پوری فہرس بنا لی کہ مجھے کون کون سے زیور، اچھے اچھے بنارسی کپڑے خرید نا ہیں۔ اللہ پاک کرے یہ کھوسٹ مولوی دس ہزار اُگل دیں۔ میں دعائیں مانگا کی۔

پھر صبح سویرے مارے شوق کے میں جلدی سے جگ گئی۔ اور بے حد جلدی جلدی ناشتہ پکایا۔ باپ بیٹے حق حیران تھے۔

چاپی کے میں بڑے میاں سے بولی "کرائے بھاڑے کے دس روپے سیدھے ہاتھ سے دھر دو۔ میں چلوں، مولوی" صاحب کے یہاں۔

ارے بھاگوان! ایسے نہیں" بڑے میاں کچھ جھنجھلا کے بولے پہلے ان کے یہاں کہلواؤ، کہ ہم آرہے ہیں۔ اُسکے بعد جاؤ"

مجھے تو جلدی تھی، لیکن خیر۔ بڑے میاں کی بات بھی سہی تھی پڑوس میں خالہ چنبیلی رہتی تھیں۔ اُن سے اُن مولوی کے یہاں اپنی آمد کی خبر دی اور پھر وہ خالہ چنبیلی آکے بولیں کہ ان لوگوں نے لڑکی کے دیکھنے کو بعد مغرب بلایا ہے تو میں خوش ہو گئی۔ اور بجّو سے بولی۔

"سن رے ناماقول۔ دنیا کا طریقہ دستور ہے کہ لڑکے والے ذرا بن ٹھن کے اور سولہ سنگھار کر کے سمدھیانے میں جاتے ہیں تم کپڑے تو میں اپنے دہیز کے زیب تن فرماؤں گی پر معاملہ سنگھار کا کچھ جوکھم کا ہے۔ لہٰذا تو مجھے سر پہ لگانے کا کالا خضاب اور منھ پر لگانے کا سفید خضاب ابھی فوراً لادے"

منھ پر لگانے کا سفید خضاب؟" بجّو چندھیا کر بولا۔

ہاں! وہ سفید سفید روئی کا سا ملتا ہے نا خوشبودار، شیشی میں بند" میں نے اس کے جاہل پنے پر ترس کھا کے بتایا۔

اُف۔ اماں۔ اسے سفید خضاب نہیں کہتے۔" اُس نے پھر دانت نکالے۔

جو کچھ بھی کہتے ہوں" میں آپے سے باہر ہو کر چنگھاڑی۔" بس مجھے لادے۔ اور ہر وقت میری بولی مت درست کیا کر۔"

اماں! اسے اسنو کہتے ہیں" بجن بولا۔

اسے سنو! میں نے دوہرایا۔

اسنو۔ اسنو، سمجھیں۔ وہ چیخا۔

اچھا تو وہ لادے۔ اور ساتھ میں خشبو کا عطر اور چہرے پر لگانے کا پوڈر۔"

اماں اپنی ڈاک گاڑی میں بریک دو۔ بجن مجھے گھورنے لگا یہ تم کیا خود چھوٹی کی دلھن بن کے جاؤ گی۔"

اور کیا یونہی چلی جاؤں۔ سفید بال اور کالا منہ۔" میں بھی اسے گھوری۔

بجن ہنس دیا۔ اچھا اماں۔ تمھارا ہی کہا سہی۔ لادونگا میں سب کچھ۔"

دوپہر کا کھانا بگھارے چاول، آلو میتھی کا ساگ کھا کے میں ذرا سی دیر جھپکی لی۔ پھر شام کو بجن نے آ کے پکار ڈالا۔

چلو اماں اٹھو اب تیار ہو جاؤ۔ میں آٹو والے سے بول آیا ہوں وہ تھوڑی دیر بعد آتا ہوگا۔ تم کو وہ زرد رنگ کی موٹریا بہت پسند ہے نا؟"

ہاں بادا! وہ ننھے ننھے تین گول پہیوں والی؟" میں بے تحاشہ خوش ہو کے بولی۔

اماں۔ میں کچھ بولتا ہوں تو تم خفا ہوتی ہو۔ مجھے تم بتا دو کہ کیا پہیے چوکور بھی ہوتے ہیں؟" بجن بے حد انسانیت سے بولا۔

چل ہٹ بہت تقریر کرلی" میں ہنس کے بولی۔

یہ لو اماں تمھاری چیزیں" بجن نے دو تین شیشیاں مجھے دیں "اس میں سفید اسنو اور کالا خضاب اور خشبودار عطر ہے۔ بدبودار عطر آج تک کہیں نہیں ملا اماں۔

یہ کہہ کے وہ اُلوؤں کی طرح خواہ مخواہ ہی ہنس دیا اور میں اسے گدھا سمجھ کے اپنی کوٹھریا میں گھس گئی۔ کپڑے ورپڑے بدل کے تیار ہونا تھا نا بھائی۔"

ابھی میں کنگھی ہی کر رہی تھی کہ لیو صاحب پھک سے بجلی غائب ہو گئی۔ ایک چیخ میرے منہ سے نکلی۔ کسی طرح میں نے چوٹی گوندھ لی۔ پھر خوشی خوشی اپنے کپڑوں پر ڈھیروں عطر ملا کر سر چکرا گیا اب باری تھی۔ کالے اور سفید خضاب کی۔ بھلا میں لڑکے والی ہو کے سفید انڈا بال لئے سمدھیانے میں کیسے چلی جاتی خضاب ملنا بے حد ضروری تھا۔ سو میں نے چکنی چکنی پٹیوں پر خوب ڈھیروں خضاب چپڑ لیا۔ پھر ہاتھ کپڑے سے پونچھ کر دوسری شیشی سے ہتھیلی پر اسنو لیا اور منہ پر مل لیا! اور خوبصورت بن گئی۔

اتنے میں دروازے پر موٹر کا بچہ، پوں پوں کرکے بولا۔ ساتھ میں بجن نے ہانک لگائی۔

اماں سنور چکی ہو تو باہر آؤ۔ تمھاری موٹریا آگئی ہے۔"

چلو نکلو باہر" بڑے میاں بولے۔"

اور پھر جیسے ہی میں اپنی کوٹھری سے باہر نکلی، چمک سے بجلی بھی آگئی۔ یکبارگی بڑے میاں اور بجن کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔

"بھوت۔"

اماں یہ کیا کیا؟" بجن ہنسی کے مارے پیٹ پکڑ کے گر گر پڑا۔ بڑے میاں بھی قہقہے لگا رہے تھے۔ بجن نے میرا ہاتھ پکڑ کے دیوار میں لگے آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ ہائے! میرا منہ کالا سیاہ ہو رہا تھا اور سر پر برف جمی تھی۔ اندھیرے میں میں نے سفید اور کالے خضابوں کی جگہیں بدل دی تھیں۔ باپ بیٹے کے بے تحاشہ ہنسنے سے میں نڈھال ہو گئی اور بھاگ کے پھر کوٹھری میں گھس گئی۔ نگوڑی لڑکی اور شادی کی سوجھے ہیں۔ !!! طبزاد۔

بے بس محبت

(گذشتہ سے پیوستہ)

تبسم آرا

میں ماں کے پاس ہی بیٹھ گئی اور ان کا سر دبانے لگی۔ اب تک نہ تو کسی نے ماں کے لیے ڈاکٹر بلایا تھا اور نہ اسپتال لے گیا تھا۔ ماں کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ابا جان میری سنگدل دادی کے کہنے میں رہتے تھے ان کی نظر میں عورتوں کی بیماریاں کام سے بچنے کا بہانہ ہوتی تھیں۔ ماں نے آنکھیں کھول کر مجھ کو دیکھا۔ کتنی حسرت تھی ان نگاہوں میں کتنے خواب تھے — وہ آنکھیں وہ لمحے میں آج بھی نہیں بھول پائی ہوں اور نہ شاید کبھی بھول سکوں گی۔ تبھی میری ماں کو بڑے زور کی متلی آئی تھی اور ہر طرف خون ہی خون بکھر گیا تھا میں بیہوش ہو چکی تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ جب ہوش آیا تو میں تنہا ایک اندھیرے کمرے میں پڑی تھی باہر شاید ابا جان بیٹھے تھے اور گھر کے بزرگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں رونے لگی۔ نہیں نہیں میں تنہا نہیں تھی میرے سرہانے نہ جانے کب سے عارض بیٹھا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ بھی رونے لگا تھا۔ اسی وقت چچی ماں پیر پٹختی گھر میں داخل ہوئیں۔ ارے کتنی بار منع کیا کہ تو اس کے پاس اور اس کمرے میں نہ آیا کر مگر یہ مانتا نہیں اللہ میری ایک ہی اولاد ہے تو بچانا اسے۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کمرہ سے نکل گئیں اور میں پھر شاید بے ہوش ہو چکی تھی۔ میری زندگی میں ایک زبردست انقلاب آچکا تھا۔ سب لوگ مجھے ٹی۔ بی والی کی بیٹی کہتے۔ مجھے پاس آتا دیکھ کر عورتیں منہ پر آنچل رکھ لیتیں۔ ہر گلاس میں پانی نہ پینے کی پابندی لگا دی گئی۔ میرے برتن الگ کر دیئے گئے تھے۔ جب کبھی ادھر ادھر دیکھ کر عارض آجاتا اور کسی کو پتہ چل جاتا تو ایک قیامت آجاتی۔ کتنا اچھا تھا عارض کتنا پیار تھا ہم دونوں میں۔ ماں نے اسی پیار کو دیکھ کر ہی تو ایک دن بہت سے مہمانوں کو جمع کر کے ہم لوگوں کی منگنی پکی کر دی تھی۔ میں سب کچھ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں اسارا سارا دن گھر میں تنہا پڑی روتی رہتی تھی بڑی بوڑھیوں کی باتیں سن سن کر لرز لرز جاتی۔ میرا خیال میرے ننھے دل کا خیال کسی کو نہیں تھا۔ البتہ ابا کی تنہائی کا سب کو خیال تھا۔

نانی ماں جب فاتحہ میں آئیں تو مجھے لپٹا کر، وہ پھر وہ اپنے ساتھ ضد کر کے مجھے لیتی آئیں۔ میں آج بھی سوچ کر سہم جاتی ہوں اگر میں یہاں نہ آتی تو میں کبھی نہ جانے کہاں ہوتی۔ نانی ماں کی سوکھی گود میں مجھے بہت سکون ملا وہاں ماں کی خوشبو ملی میں اپنا ماضی بھول چکی تھی۔ ایک دن نانی ماں نے بتایا آج شام تیری خالہ اپنے بیٹے کے ساتھ آرہی ہیں تو اب اس کے ساتھ اسکول جانا۔ ان کے میاں عرب چلے گئے تھے۔ میں بہت خوش تھی۔ نانی ماں نے وہی گلابی سوٹ نکال کر مجھے پہنا دیا۔ جسے کبھی ماں نے ایک جگمگ کرتی رات کو مجھے پہنایا تھا پھر میرے سامنے میرا ماضی ناچنے لگا۔ عارض کو میری نگاہیں ڈھونڈنے لگیں تھیں ماں کو دل رو رو کر پکار رہا تھا۔ شاید میں چیخ کر رو دیتی اگر سامنے میرے ماں کی ہم شکل عورت کھڑی نہ ہوتیں۔ نانی نے بتایا یہی تیری خالہ ہیں وہ اپنے سینے سے لگائے سسک رہی تھیں۔ نانی بھی رو رہی تھیں اور عاشی جو پاس کھڑا تھا اپنے ننھے رومال سے ہمارے آنسوؤں کو پوچھ رہا تھا میں اس کو دیکھتے ہی مسکرا پڑی تھی۔ وہ ہنسنے لگا تھا۔ ایک ساتھ مجھے ماں اور عارض دونوں ہی مل گئے تھے: بچپن پر لگا کر اڑنے لگا تھا۔

سلمہ!!!

عاشی کی آواز سے اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ ہاتھوں میں چائے کی پیالی لیے کھڑا تھا۔ ہمیشہ ہنسنے مسکرانے والا عاشی بے حد مغموم اور کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کا کلیجہ کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سلمہ کی آنکھوں سے آنسو بے تحاشہ بہہ نکلا۔ عاشی کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کا باندھ بھی باوجود ضبط کے ٹوٹ گیا۔

.. نہ رو عاشی نہ رو یہ وہ تڑپ گئی۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر تیرے آنسو نہیں۔ سلمہ نے اب سب کچھ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ان لوگوں کا آنا۔ عاشی کے یہ آنسو اپنے دل کی دھڑکن ؟ سلمہ کے آنچل بے اختیار اپنے بچپن کے ساتھی عاشی کے آنسو پونچھنے کے لیے بڑھ گئے۔ اسی لمحے اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ ایک اہم فیصلہ ایک اٹل فیصلہ۔ سلمہ۔ تم اب تک تیار نہیں ہوئیں۔ باہر سب لوگ تمہارے منتظر ہیں! اس نے بڑی مشکل سے کہا تھا۔

ٹھیک ہے؟ میں لے لیتی ہوں مگر تیاری کی کیا ضرورت ہے۔ اپنے ہاتھوں سے چائے کی پیالی لیے وہ اسی طرح دالان میں نکل آئی جہاں سب لوگ باتوں میں مصروف تھے۔ سلمہ کو اس طرح آتے دیکھ کر نانی کا چہرہ زرد ہو گیا؛ چچا اور چچی نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ وہ تو کہیں اور تھی۔ بیٹی میں ایک ماہ سے آنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر فرصت نہیں ملی۔ اب جا کر عارض کا امتحان ختم ہوا تو آ سکی۔ عارض کے نام پر وہ چونک گئی۔ مڑ کر دیکھا تو سامنے عارض بیٹھا تھا۔ کتنا بدل گیا تھا۔ کتنا بڑا ہو گیا تھا مگر معصومیت اب بھی اس کے چہرے پر پہلے ہی جیسی تھی۔ تبھی اسے چچی کا یہ جملہ ۔ ایک ماہ سے آنے کا سوچ رہی تھی۔ ایک ہی ماہ قبل تو نانی ماں نے اپنی ساری جائداد اس کے نام لکھ دی تھی سلمہ کے ہونٹوں پر ایک زہر خند مسکراہٹ دوڑ گئی ـــــ اس نے کہنا شروع کیا۔

مجھے آئے تقریباً دس برس ہونے کو آئے اور یاد اب ایک ماہ سے آئی بہت افسوس ہوا مجھے یہ جان کر؟

اس کی باتوں کی پرواکیے بغیر چچی کہتی رہیں۔ ہاں بیٹا اب تو کافی بڑی ہو گئی ہے اس لیے میں نے سوچا کہ جس کام کو کبھی تیری ماں نے شروع کیا تھا اسے اب میں اپنے ہاتھوں ختم کر دوں ـ!

یعنی

یعنی کیا سلمہ بیٹی؟ میں تیری شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئی ہوں تیری منگنی تو تیری ماں نے اپنی زندگی میں کر ڈالی تھی نا!

چچی جان مجھے معاف کریں۔ شاید آپ بھول گئیں ان دس برسوں میں کہ میری ماں ٹی۔ بی جیسے مہلک مرض میں مری ہیں اور رہی منگنی کی بات تو وہ اسی وقت ٹوٹ گئی تھی جب آپ نے عارض کو ہم سے الگ رکھنے کی منت خدا سے مانگی تھی۔

بیٹی ان باتوں کو بھول جا۔ جو گزر گیا، گزر گیا۔

آپ کے لیے یہ حادثہ تو بہت معمولی تھا آپ بھول گئیں مگر میں اسے کس طرح بھولوں جس نے مجھے ایک نئی دنیا سے روشناس کرایا ہے میں وہی لڑکی ہوں جس کے پاس عارض تھے اور گھر کے لوگوں کے آنے پر پابندی تھی میں اسی ماں کی بیٹی ہوں اور رہوں گی جسے ٹی بی تھی۔ اور ہاں۔ آپ یہ بھی سن لیں کہ میں اس گھر سے اپنا ہر رشتہ دفن کر آئی ہوں۔ آپ سب جا سکتے ہیں۔

اس نے ایک نظر عاشی پر ڈالی وہ مسکرا رہا تھا۔ خالہ اماں کو دیکھا وہ مطمئن سی نظر آئیں نانی ماں کا چہرہ جذبات سے عاری سا تھا۔ اسے عارض کے چہرے کو دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ چچی نہ جانے کیا کیا بولتی رہیں۔ نہ اب اس میں سننے کی طاقت تھی اور نہ جواب دینے کی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرہ میں لوٹ آئی۔ اسی وقت نانی کی کمزور مگر باعزم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ جاتے جاتے آپ لوگ ایک خوش خبری بھی سنتے جائیں میں نے سلمہ کی شادی اسی ماہ کی ۲۷ کو اپنے بڑے نواسے سے جو یہاں آپ کے سامنے موجود ہیں کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اپنی دعاؤں کی ٹھنڈی چھاؤں میں اپنی بیٹی اور بھتیجی کو جو یتیم ہے رخصت کرنے ضرور آئیں گے۔

اس کے بعد سلمہ اور کچھ نہ سن سکی۔ اس کا دل چاہا جاتے ہوئے عارض کو ایک نظر دیکھ لے مگر قدم جہاں تھے وہیں تھم سے گئے۔ نانی کے بلانے پر بھی وہ ان لوگوں سے ملنے نہیں جا سکی اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی ـــ

عورت کا رومان اور اس کا المیہ

جارج ایلیٹ، حیات، خیالات و فن

قسط چہارم: محبت کی پیاس

از فہیم انہونوی

اپنے آپ کو سمجھ لینا، سکون حاصل کرنے کا اچھا اور کلاسکی طریقہ ہے
اپنے آپ کو سمجھنے سے گریز کرنا یعنی اپنے آپ کو فریب دے کر سکون
حاصل کرنے کا انداز جدید اور رومانوی ہے۔ جارج سنتایانا

میری محرومی کی راہوں سے یہ دی اس نے صدا
قرب کی راہوں میں میری ایک راہ دوری بھی ہے
——— اصغر گونڈوی

زمیں میں ایک گڈھا کھود دیجئے اور چھوڑ دیجئے۔ برسات ہوئی تو پانی سے بھر جائے گا لیکن وہ پانی پینے کے لائق نہ ہوگا۔ یا پھر وہ گڈھا کسی اور گندگی سے بھر جائے گا لیکن اسی گڈھے کو خوب گہرا کھود دیئے تو یہ کنواں بن جائے گا اور زمین اسے اپنے پانی سے بھر دے گی۔ اس پانی کو سب پئیں گے اور سب کی پیاس بجھے گی۔ لہذا زمین کھودنے سے گڈھا بنتا ہے یا کنواں یہ اس کی گہرائی پر منحصر ہوگا۔

کچھ اسی طرح سے ہم اپنی محبت کی پیاس کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں۔

محبت کی چاہ کیسے نہیں ہوتی۔ بچہ سوتے سے جاگتا ہے تو اس کی آنکھیں صرف ماں کی پیار بھری آنکھوں کو ڈھونڈتی ہیں۔ بڑے ہو کر بھی ہم کسی کے چہیتے بن جانا چاہتے ہیں اور اکثر تو یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر بڑھنے کی عمر کے درمیان کسی کے چہیتے نہ رہے ہوں تو بڑے ہو کر کسی کی چاہت کے قابل بھی نہیں رہتے۔ جب دنیا دیکھ چکنے کے بعد بوڑھے ہو جائیں گے تب بھی یہ تمنا رہے گی کہ اپنی صورت اپنی اولادوں کی آنکھوں میں دیکھیں۔ جب اپنی زندگی کسی کو پیاری ہو جاتی ہے تو وہ ہمارے لئے بھی قابل قدر اور مقدس بن جاتی ہے، دوسرے بھی ہم کو پیارے ہو جاتے ہیں۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی خواب میں محبت مل جائے تو جی چاہتا ہے کہ صبح کوئی ہم کو دلار سے جگائے اور اس کے چہیتے چہرے کو دیکھ کر ہمارے دل کا سورج بھی چمکنے لگے۔ مگر جس طرح کوئی بانہوں میں رات سلانے والا نہیں تھا اسی طرح کوئی صبح جگانے والا نہیں ہوتا۔ محبت کے پیاسے غم کو نہیں ترستے۔

ہماری محبت کی پیاس بھی اپنی گہرائی سے ہی معنی پاتی ہے۔ محبت کی معمولی تشنگی زمین میں کھدے ہوئے گڈھے کی طرح ہوتی ہے کوئی بادل برسا اور بھر گیا ہم کو۔ ہم تو سیراب ہو جائیں گے مگر کسی اور کی پیاس نہ بجھا سکیں گے۔ مگر محبت کو جتنا ترسیں گے، جتنی زیادہ چاہ ہوگی چاہت کی اتنا ہی غم لگے گا ہم کو، ہم اتنے ہی گہرے ہو جائیں گے، جیسے کہ زمین میں کھدا ہوا گڈھا گہرا کھودنے پر کنواں بن جاتا ہے اور جس کو اپنی ہی زمین اپنے پانی سے بھر دیتی ہے، وہ پانی جس سے سب اپنی پیاس بجھاتے ہیں، اسی طرح ہم بھی اپنے اندر دوسروں کے لئے محبت پیدا کر سکیں گے کیونکہ ہمیں محبت کی ضرورت کا احساس ہوگا جو دوسروں کو دے کر ہی ہمیں ملتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب پیاس بجھتی نہیں تو پانی ہو جاتی ہے۔

جو چیز ہمارے پاس نہیں ہوتی اسی کی ہمیں قدر معلوم ہوتی ہے۔ لہذا محبت کی پیاس جب ہم کو ہوگی اور خوب شدت اور گہرائی سے تب

ہی ہمیں محبت کی قدر معلوم ہوگی، کہ وہ کتنی ضروری ہوتی ہے نہ صرف ہمارے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی۔ محبت کی پیاس ہمارے لئے ایک عجیب سی پریشانی بھی ہو جاتی ہے ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے اپنے آپ میں۔ اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ جارج سانتیانا کا جو مشاہدہ میں نے پہلے درج کیا ہے اس پر ذرا غور کیجئے۔ ہم جب محبت کے پیاسے ہوتے ہیں تو یہی خواہش رہتی ہے کہ کوئی ہم سے خوب محبت کرے۔ جب کوئی چاہنے والا نہیں ملتا تو ہم اپنے آپ پر ترس کھاتے ہیں اور دل میں طوفان اٹھاتے ہوئے جذبات کو بہاتے ہوئے آنسو ہماری آنکھوں سے بہنے لگتے ہیں۔ جب ہم روتے ہیں تو کسی دوسرے کے آنسو ہمیں نظر نہیں آتے، کوئی اور مسکرا رہا ہو تو اس کی مسکراہٹ ہماری نگاہوں میں نہیں بستی۔ رات کی رحم دل خاموشی میں اس طرح آنسو بہانے سے تھوڑی سی تسکین تو ملتی ہے مگر ہماری پیاس تو بجھتی نہیں بلکہ آنسوؤں کے نمکین پانی سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے جب ہم میں سمجھ پیدا ہوتی ہے تو ہم اپنے آنسو پینے لگتے ہیں جو جذبات کو صبر سکھاتے ہوئے دل کو سکون بخشتے ہوئے اندر ہی اندر رہتے ہیں۔ تب ہماری آنکھیں ایسا دریا بن جاتی ہیں جن میں کبھی کوئی سیلاب نہیں آتا اور جس کے کنارے انسان بستی بساتے ہیں جس کے پانی سے اپنے کھیت سینچتے اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔

اس لئے ہمیں چاہئے کہ اپنی محبت کی پیاس کو ہم سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب یہ سمجھ پیدا ہوگی تب ہم جان جائیں گے کہ اس دنیا میں سب کو اپنی پیاس خود بجھانی پڑتی ہے۔ کہ محبت کی خوشی دوسروں کو محبت دے کر ہی ملتی ہے۔ ہم دوسروں کو محبت دیکر ہی اپنی محبت کی پیاس مٹا سکتے ہیں۔ دوسروں کو ایک پیاری زندگی بخش کر اپنی زندگی بھی اچھی کر سکتے ہیں۔ اور پھر ہم جتنے محبت کے پیاسے ہوں گے اتنی ہی محبت بھی ہم پا سکیں گے اتنا ہی سکھ ہوگا ہماری قسمت میں جتنا پیار ہم میں سما سکے گا۔

عورت تو پیدا ہی محبت کی پیاسی ہوتی ہے مگر خدا نے شاید اس کی محبت کی پیاس میں اپنی رحمت کی پیاس بھی بھر دی ہے اور اسی لئے وہ یہ سمجھ لے کر پیدا ہوتی ہے کہ بس دوسروں کو ہی محبت دیئے چلی جاتی ہے۔ دیکھئے جارج ایلیٹ (میری آئن) نے کتنی اچھی بات لکھی ہے۔

"ایک ننھی لڑکی کس طرح اپنی بے جان گڑیا سے پیار کرتی ہے اسے محبت دے کر اپنی پیاس بجھاتی رہی ہے اور اپنی محبت کی فراوانی سے جیسے اس بے جان گڑیا میں بھی ایک چاہنے والی روح پھونک دیتی ہے۔ یہ مادرانہ محبت، یہ دلاری چاہت تو ہر اچھی عورت کی فطرت ہوتی ہے۔"

میری آئن بھی محبت کی پیاسی رہتی تھی۔ بچپن میں ماں کے دلار کو ترسی اس پھول کی طرح جس پر کبھی شبنم نہیں گرتی۔ حسن ظاہر ہے اس کی محرومی نے اس کے شباب کو کبھی خزاں رسیدہ رکھا اور کسی کی محبت سے شاداب نہ ہو سکی۔ لیکن کیونکہ وہ ایک سچی اور اچھی عورت تھی اس لئے اس نے بھی جلد ہی اس راز کو سمجھ لیا کہ دوسروں کو محبت دے کر ہی ہمیں بھی محبت حاصل ہوتی ہے۔

اس قسط میں ہم اس کی محبت کی پیاس کو محسوس کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ کس طرح یہ تغیر اس میں پیدا ہوا کہ محبت کی پیاسی میری آئن کے اندر سے محبت کا دریا بہہ نکلا مگر ایسے اچھے تغیر ایک دم سے تو آتے نہیں بلکہ دھیرے دھیرے کہ جیسے پھول کھلتے ہیں۔ ہم کو بھی ہر زندگی کی کتاب دھیرے دھیرے ہی پڑھنا چاہیئے۔

نئے بورڈنگ اسکول کو دو بہنیں میری اور ربیکا فرینکلن چلاتی تھیں۔ میری فرینکلن سیدھی سادی اور گھریلو قسم کی عورت تھی۔ لڑکیوں کی تربیت اور دیکھ بھال اس کے ذمے تھی۔ تعلیم و تدریس کا کام ربیکا نے سنبھال رکھا تھا، وہ پیرس کی تعلیم یافتہ ایک جہاں دیدہ اور ذہین خاتون تھی اور جہاں تک زبان، لباس اور آداب کا مجلس کا تعلق تھا اس کی رائے حرف آخر مانی جاتی تھی۔

میری آئن کے لہجہ اور بات چیت میں ابھی کافی گنوار پن تھا اس لئے ربیکا کے لب و لہجہ سے وہ بے حد متاثر ہوئی۔ ربیکا جب گفتگو کرتی تو اسے بہت اچھا لگتا، وہ اس کی باتیں بڑے غور سے سن کر اس کے

ب و لہجہ کو اختیار کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند
ہی سال میں اس کی آواز میں ایک ایسا سحر پیدا ہو گیا کہ زندگی بھر جس نے
بھی اسے بولتے سنا وہ اس کی خوش گلوئی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسا
محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اس نے اپنی آواز میں اپنی نیکی کی روح پھونک دی
ہو اپنے جذبات کی ساری نرمی بھر دی ہو اور باتیں تو وہ اچھی کرتی ہی تھی۔

مضامین درس میں موسیقی، مصوری، ریاضیات تاریخ، انگریزی اور
فرانسیسی زبان شامل تھی۔ میری آئن نے جلد ہی ان مباحث پر عبور حاصل کر لیا۔
پیانو وہ بہت اچھا بجانے لگی اور اس کی انگریزی مضمون نگاری سب سے
اچھی ہوتی۔ جہاں اور لڑکیوں کے مضمون کلاس میں پڑھے اور درست کئے جاتے
وہاں اس کے مضامین استانی اپنے ذاتی مطالعے کے لئے وقف رکھتیں۔ ان میں
شاید ہی کبھی کوئی غلطی ہوتی اور بیحد سنجیدہ ہوتے۔ میری آئن کے بچپن کے
جو کاغذات دستیاب ہیں ان میں اس اسکول کی ایک نوٹ بک بھی ہے جس میں
اس کا ایک انشائیہ درج ہے جس کا اقتباس کارڈن ہیٹ نے جارج اطیبٹ
پر اپنی تالیف میں درج کیا ہے اس کا ترجمہ میں یہاں پیش کر رہا ہوں۔

"وہ لڑکیاں جو عہد شباب میں اپنے حسن اور اس کی آرائش و
زیبائش کے سہارے دوسروں کی توجہ اور تحسین حاصل کرتی ہیں
اور اپنی ہم جنسوں کے رشک اور مردوں کی غلامی میں اپنے آپ
کو خوش اور محفوظ محسوس کرتی ہیں۔ دراصل وہ خود نمائی کا شکار
ہوتی ہیں۔ ان کے پاس اپنے ذہن اور سیرت کو سنوارنے کے لئے
تو وقت نہیں ہوتا مگر اپنے سنگار میں گھنٹوں لگی رہتی ہیں۔ یہی
خود نمائی اس وقت تصنع میں بدل جاتی ہے جب جوانی اپنے
حسن کو لے کر جدا ہو جاتی ہے اور تب اس آدمی کی طرح جو اپنا
غم بھلانے کے لئے شراب پینے لگتا ہے یہ عورتیں مصنوعی سنگار
سے حسین بننے کی کوشش کرنے لگتی ہیں، چنانچہ کافی عمر رسیدہ ہونے
کے باوجود وہ جوانوں جیسے لباس اور شوخ چال ڈھال اختیار
کئے رہتی ہیں جو بجائے دلکشی پیدا کرنے کے ان میں بھدا پن پیدا
کر دیتی ہے اور اس طرح جوانی کی خود نمائی جوانی کے بعد تصنع
میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

یہ خیال رکھتے ہوئے کہ یہ انشائیہ میری آئن نے سولہ برس کی عمر میں لکھا
تھا ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہ کتنی سنجیدہ تھی۔ یہ انشائیہ ایک اور بات بھی ظاہر
کرتا ہے۔ عنفوان شباب کے ساتھ ساتھ میری آئن کا احساس بدصورتی
بھی بیدار ہو رہا تھا جس نے اسے بہت رلایا۔ خوبصورت لڑکیوں کی خود نمائی
کی تنقید میں ہمیں اسی کی تلخی محسوس ہوتی ہے۔ اس کی جوانی کی کھلتی ہوئی
آنکھیں صبح آئینے میں اپنے چہرے کی بدصورتی دیکھتیں اور دن
بھر افسردہ رہتیں۔ رفتہ رفتہ یہی بدصورتی کا احساس اپنے چاروں
طرف پھیلی ہوئی خوبصورتی کے احساس میں بدل گیا۔ جب ہمارے
پاس کوئی چیز نہیں ہوتی تبھی ہمیں اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔
دھیرے دھیرے میری آئن کو یہ بھی سمجھ آگئی کہ اس کا سنگار ذہن
کے نکھار ہی میں ہوگا۔ ہمارے اندر جب کوئی کمی ہوتی ہے اور
اس کا احساس ہم کو ہو جاتا ہے تو اکثر وہ کسی اور طرح پوری
ہو جاتی ہے۔ مگر فی الحال یہ احساس بدصورتی اسے رات میں
رلانے اور دن میں شرمانے لگا تھا۔

وہ پیانو تو اچھا بجاتی ہی تھی، اس لئے جب بھی اسکول میں
کوئی معزز مہمان آتے تو ان کی دلچسپی کے لئے میری آئن سے پیانو
بجوایا جاتا۔ بے چاری میری آئن سب کی نگاہ کا مرکز بننے سے
بہت گھبراتی مگر استانی کا کہا کیسے ٹال سکتی تھی، پیانو بجا دیتی
مگر محفل ختم ہونے کے فوراً بعد بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی اور
خوب روتی اور اس طرح بدصورتی کے غم کی بھڑاس نکالتی۔

حالانکہ اس اسکول میں بھی اس کا بہت خیال رکھا جاتا
تھا لیکن ماریا والی محبت تو میسر نہ تھی۔ اب تو بس انجیل پڑھنے
ہی میں اسے سکون ملتا۔ جوں جوں دن گذرتے جا رہے تھے
محبت کو ترسی، اپنی بدصورتی سے بیزار میری آئن اپنی ان
تشنگیوں کو اپنے تئیں خدا کی رحمت سمجھ کر قبول کرتی جا رہی تھی۔

"تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا"

پہلے بھی وہ اپنے سنگار اور لباس سے غافل رہتی تھی مگر
اب یہ غفلت قربانی میں تبدیل ہو گئی۔ خدا کا احساس اور اس کے
بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی جد و جہد، اپنے آپ کو چھوٹی مسرتوں
سے محروم رکھنا تاکہ اپنی روح کا زیادہ خیال رکھ سکے۔ غریبوں اور
بیماروں کی خدمت کرتا اور اسکول میں صبح دعا کے وقت انجیل
پڑھ کر سب کو سناتا۔ بس اب یہی سب میں اسے سکون ملتا۔

اسی دوران میری آئن نے پہلی بار انگریزی کے عظیم مصنفوں
کی کتابیں پڑھیں۔ ربیکا فرینکلن لڑکیوں کو ہر قسم کی کتابیں پڑھنے

کے لئے دیتی تھی۔ میری آئن نے کئی ناول بھی پڑھے۔ اپنی عمر کی تمام لڑکیوں کی طرح اسے بھی رومانی نظمیں بہت متاثر کرتیں۔ اس کی نوٹ بک میں ایک نظم نقل کی ہوئی ملی ہے جس میں یہ منظوم کہانی ہے کہ بہت سے لوگ کلیسا کے باہر جمع ہیں۔ وہاں شادی ہونے والی ہے۔ سب دلہا اور دلہن کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ آخرکار ایک بگھی آتی ہے اور اس میں سے ایک بڈھا نکل کر کلیسا میں داخل ہو جاتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید دلہا کا والد ہوگا۔ اسی وقت دلہن بھی اپنے والدین کے ساتھ آئی اور اندر چلی گئی۔ باہر کھڑے ہوئے لوگ آپس میں سوال کرتے رہے کہ آخر دلہا کہاں ہے؟ کب آئے گا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد نوجوان دلہن بڈھے کے ساتھ کلیسا سے باہر آتی ہے۔ دونوں بگھی میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ دلہن بہت افسردہ نظر آتی ہے۔ ہائے وہی بڈھا ہی اس کا دلہا تھا۔

بقول گارڈن ہیٹ ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک نوجوان لڑکی کی ایک بڈھے سے شادی کا سانحہ ۱۵ برس کی میری آئن کو متاثر کرسکتا تھا۔ بعد میں چل کر اس نے اپنے ناول "مڈل مارچ" میں اس سانحہ کی داستان بیان کی ہے۔ بہرحال میری آئن کو مذہبی نظمیں زیادہ متاثر کرتیں اور وہی اس کی نوٹ بک میں زیادہ تر ملتی ہیں۔

چھٹیوں میں تینوں بہن بھائی میری آئن، کرسٹی اور اساق گھر آجاتے۔ بچپن میں میری آئن اور کرسٹی میں زیادہ لگاؤ نہ تھا لیکن شعور آنے پر دونوں ایک دوسرے کی سہیلی اور رازدار ہوگئیں۔ یہ تو ہم دیکھتے ہی ہیں کہ عموماً بھائیوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو دونوں میں دوستی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف بہنوں خواہ وہ ایک دوسرے کی ہم خیال نہ ہوں پھر بھی ایک دوسرے کی ہمدرد اور غمخوار ہوتی ہیں۔ یہی میری آئن اور کرسٹی کے ساتھ بھی ہوا۔ اپنے بھائی اساق کو میری آئن اب بھی چاہتی تھی مگر اساق نے تو لڑکپن میں ہی اس سے اپنی دلچسپی چھوڑ دی تھی۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اساق کو میری آئن سے محبت نہ تھی کیونکہ بڑے ہوکر لڑکے جذباتی اظہار سے ذرا شرماتے ہیں۔ جی بھی چاہے گا کہ بہن کو پیار کریں تو جھجک محسوس کریں گے۔ اپنے پیار کو مذاق کرکے یا کسی اور طرح خیال رکھ کر جتا دیں گے۔ بہرحال اساق کو کبھی میری آئن کی تنہائی اور دکھ کا احساس نہ ہوا۔ اس میں وہ حساسیت اور نرمی کہاں تھی جو محبت کی پیاسی میری آئن میں تھی۔ وہ تو عام لڑکوں کی طرح شاداں، خرم اور رجائیت پسند تھا۔ اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس نے کبھی وہ آرام دہ دنیاداری سیکھ لی تھی جس کے بغیر ہماری سماجی زندگی دشوار ہو جاتی ہے مگر جس کے باوجود ہمیں سچا سکھ نہیں ملتا۔

مذہب سے غیر معمولی شغف رکھنے والی میری آئن کو کبھی اساق کی بہت سی باتیں اور عادتیں گناہ کی حد تک بری محسوس ہوتیں مثلاً اسا کو شکار کا بہت شوق تھا میری آئن اسے ٹوکا کرتی کہ جانوروں کی جان نہیں لینا چاہیئے۔ اپنے آپ کو چھوٹی چھوٹی مسرتوں سے محروم رکھنے والی میری آئن کو اساق کا اپنے دوستوں کے ساتھ ہنسنا اور ادھم مچانا بھی ناگوار گذرتا۔ بعد میں اس نے خود اعتراف کیا کہ "میں ناحق اساق پر فضول کے اعتراضات کیا کرتی تھی وہ بھی ان باتوں پر جو آج میرے تئیں اچھی اور بے ضرر ہیں" ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان دوری بڑھتی ہی گئی — بیتے ہوئے بچپن کی طرح دونوں کی وہ بچپن والی دوستی بھی پھر کبھی واپس نہیں آئی۔

نئے اسکول میں میری آئن نے ابھی تین سال بھی نہ گذارے تھے کہ ۱۸۳۶ء میں اسکی ماں کا انتقال ہوگیا اور میری آئن اور اسکی بہن کرسٹی کو اسکول چھوڑ دینا پڑا۔ میری آئن پر شاید ماں کے انتقال کا زیادہ اثر نہ ہوا۔ ماں کا دلار اُسے ملا ہی نہ تھا کہ اسے اپنی ماں کی یاد تڑپاتی۔ اب کرسٹی اور میری آئن نے گھر سنبھال لیا۔ لیکن ۱۸۳۷ء میں کرسٹی کی شادی ہوگئی اور گھر کی ذمہ داری اور اپنے والد کی خدمت اب اکیلی میری آئن کے سپرد ہوگئی۔ اساق بھی اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا۔ اسی طرح دو سال اور گذر گئے اور ۱۸۴۱ء میں اساق کی بھی شادی ہوگئی۔ اب میری آئن اور اس کے والد نے اساق کو اپنا گھر دے دیا اور خود پاس ہی کے ایک دوسرے گاؤں میں جاکر رہائش اختیار کرلی۔ رابرٹ ایوانز کی بھی صحت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی، اس آخر عمر میں میری آئن کے لئے اپنے والد کی خدمت عبادت ہوکر رہ گئی۔

رابرٹ ایوانز کم سخن، بردبار اور سخت قسم کے انسان تھے مگر اندر سے ان کا دل بہت نرم تھا۔ وہ میری آئن کو سب سے زیادہ چاہتے تھے مگر اپنے مزاج سے مجبور ہوکر کبھی زیادہ اظہار

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر شائع کی جاسکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو خبر صاف صاف مختصر الفاظ میں لکھ کر نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی جائے۔ ۲۰ر تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر میں کتابت کی غلطی کا ذمہ دار ادارہ نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

● حریمی بہنوں کو یقیناً اس خبر سے مسرت ہوگی کہ اللہ پاک نے ۱۲ر نومبر ۱۹۸۱ء کی شام کو ۶ بجے بمقام ہوٹل نیملی باندرہ۔ بمبئی میری پارہ جگر نجم السحر مسز منصور سلمہ کو اسما اور کاشف سلمہ [illegible] کے بعد ایک اور دختر عطا کی۔ اس سلسلہ میں محترم قاسم اے حق اور ساجدہ مسز قاسم کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعاگو ہوں کہ یہ تینوں نونہال اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھ کر فخر خاندان بنیں۔ غزالہ ۲ر نومبر سے اسی سلسلہ میں باندرہ میں مقیم ہیں۔ امید ہے وہ ۲۰ر نومبر تک واپس ہوں گی

(نسیم انہونوی)

● م۔ نگار (ناگپور) "میرے بھائی ناصر نیر علی اور بھابی شگفتہ کے گلشن حیات میں ۲۷ر ستمبر ۱۹۸۱ء کی شام کو خدائے پاک نے پہلا پھول کھلایا۔ دعا ہے کہ یہ فرزند چشم و چراغ خاندان بنے۔

● مسرت فوتبہ (میلم ٹامل ناڈو) "اللہ پاک نے میرے اور میرے شوہر محترم شجاع اللہ خاں صاحب کے گلشن حیات میں ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت دس بجے شب ایک خوبصورت کلی عطا فرمائی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ اسے عمر طویل عطا فرمائے اور دونوں جہاں کی نعمتوں سے نوازے۔

● برکت تنیم (دیوبند) "میرے بڑے بھیا محمد عبداللہ اور پیاری بھابی عشرت جہاں بیگم کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے ایک پھول کے بعد ۲۰ر ستمبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت پونے دس بجے صبح ایک اور پھول کھلایا۔ نام حبیب الرحمان اور تاریخی نام۔ رفیق اعظم قرار پایا۔ اللہ پاک نومولود کو اس کے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھائے۔ عمر دراز عطا فرمائے اور صاحب نصیب کرے۔

● اشرف النساء (ترنامل۔ مدراس) الحمدللہ میرے چھوٹے بھائی محمد عطاالرحیم سمدانی سلمہ اور بھاوج صفوا جبین سلمہا (بنگلور) کے چمن حیات میں پہلی بار ۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت صبح سات بج کر ۱۳ منٹ پر اللہ پاک نے ایک ننھی کلی عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔ نام فاذیہ رکھا گیا۔

● شاہدہ تبسم، صبیحہ تبسم، نسرین دلشاد (کمبی پور) "ہمارے ماموں زاد بھائی عزیز احمد اور پیاری بھابی ارشاد بانو (ہیڈ مسٹریس گرلس اسکول دانم باڑی مقیم آمبور) کے گلستان زیست میں پہلی بار ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز پیر بوقت گیارہ بجے صبح ایک کلی مسکرائی۔ دعا ہے کہ پھلے پھولے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● شمیمہ پروین و جویریہ مریم (میل وشارم) "ہماری آپا شگفتہ یاسمین اور بہنوئی اقبال احمد کے دامن مقصود کو گوہر مراد سے بھرتے ہوئے ۲۳ر اگست ۱۹۸۱ء کی شام کو ۸ بجے ایک فرزند عالم وجود میں آیا۔ نام محمد اجمل اعجاز رکھا گیا۔ اللہ سے دعا ہے کہ نومولود عمر خضر پائے اور سارے جہاں کی خوشیاں اسے نصیب ہوں۔

● شہناز ظہور (آمبور) "ہماری خالہ زاد بہن عفیرہ تسنیم کے گلشن حیات میں اللہ پاک نے دوسری بار ۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز ہفتہ ایک اور پھول کھلایا۔ نام محمد آصف قرار پایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک نومولود کو عمر طویل بخشے اور وہ والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے۔

● تسنیم (دھنبار) "میرے بھائی مرتضیٰ حسن صاحب انجینیر اور بھابی فرحت حسن کے گلشن حیات میں ۱۳ر ستمبر ۱۹۸۱ء بروز عیدالفطر بوقت ۵ بجے صبح ایک پیارا سا پھول کھلا، میں پھوپھی بن کر خوشی

سے نہال ہوگئی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک میرے عزیز بھائی کا چمن حیات ہمیشہ معطر رکھے۔ نومولود اپنے بزرگوں کے سائے میں پروان چڑھ کر دین و دنیا میں سرخرو ہو۔

• [illegible] بانو [illegible] "میری چھوٹی بہن ریحانہ اور بہنوئی حافظ محمد یوسف کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۲ر نومبر ۱۹۸۱ء کی شب میں گیارہ بجکر ۳۰ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام احمد نور رکھا گیا۔ ہم سب بہنوں اور بھائیوں کی دعا ہے کہ نومولود والدین کے زیر سایہ پروان چڑھے اور فخر خاندان بنے۔

پیغامات نشاط

• نصرت یعقوب سلمہ ابن حاجی محمد حسین مرحوم ببور دی کا عقد ہمراہ سرفرازی بیگم سلمہ بنت جناب محمد حسین صاحب مرحوم (شرڈی) بتاریخ ۱۳ر نومبر ۱۹۸۱ء اور شہلا اختر سلمہا بنت عشرت یقوم سلمہ کا عقد مسنونہ ہمراہ ارشاد احمد سلمہ (ابن محمد ابراہیم صاحب (اعظم گڑھ) بتاریخ ۱۵ر نومبر ۱۹۸۱ء حلیم مسلم کالج کانپور میں بخیر و خوبی انجام پایا۔ میں اپنے قدیم کرم فرما حاجی عبد القیوم صاحب کانپور کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ افسوس کی اپنی خرابی صحت کے باعث شرکت نہ کرسکا۔ (نسیم انہونوی)

• صوفی صبیحہ عاشی (آمبور) "میری سہیلی مسرت جہاں (دختر جناب مانگوڑی عبد الرحمٰن۔ آمبور) احمد عتیق (ابن جناب عبد الحمید، خلد آشیاں۔ وانمباڑی) کے ساتھ ۸ار اکتوبر ۱۹۸۱ء بوقت صبح ساڑھے گیارہ بجے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا گیا۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• فریدہ واجد (میسور) "میری چھوٹی بہن سیدہ صادق النسا (بنت سید عبد الوہاب صاحب۔ میسور) کی شادی، سید شفیع الرحمان با کام منیجر اسٹیٹ بینک میسور نو منشن میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔

• جمیلہ (کاسہ گوڈ) "میرے چھوٹے بھائی محمد رفیق بی۔ ایس سی کی شادی خانہ آبادی ہمراہ عائشہ فرحت ۲۹ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بمقام منجشکل بحسن و خوبی انجام پائی۔ بارگاہ الٰہی میں بصد خلوص دعاگو ہوں کہ یہ جوڑی ہمیشہ شاد و خرم رہے۔

• محمد نسیم صاحب (انہونہ) کے فرزند محمد شمیم سلمہ کی شادی خانہ آبادی ہمراہ دختر نیک اختر محمد انیس صاحب قدنائی ۲۴ر نومبر ۱۹۸۱ء بحسن و خوبی انجام پائی اس سلسلہ میں ۲۵ر نومبر کو ایک دعوت ولیمہ دی گئی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• ربیعہ نثار (چامراج نگر) "میری پھوپھی زاد بہن شاہین تبسم عرف رضوان (رضوانہ ہوگا) کی شادی مقبول احمد شریف کے ساتھ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار بمقام منگلور بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک اس جوڑی کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ یہ میری دلی دعا ہے۔

• شمع جبین۔ ربینہ جبین۔ شبستان جبین (دگیا) ہماری باجی افشاں جبین (بنت سید جلال الدین) کی شادی ہمراہ سید جاوید احمد (فرزند سید ابو العاص صاحب۔ کوٹھی دیگاچمنہ) ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بمقام مودی شہید، شیر گھاٹی، بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کی زندگی ہمیشہ مسرتوں سے ہمکنار رکھے۔

• افضلی مانکوارے (شری وردھن) "میری بھانجی قیصری خطیب (دالوئی) کی شادی ۲۱ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بروز بدھ بوقت گیارہ بجے دن صابر علی قاضی (آرالسٹی) کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ یہ جوڑی ہمیشہ خوشیوں کے جھولے میں جھولتی رہے۔ آمین۔

انتقال پرملال کی خبریں

• نسیم بانو (گنتور) "بڑے غم والم کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ابا محترم سید غالب صاحب ۳۱ر اگست ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بعد اذان الوداع ایک بجے دن میں انتقال فرما گئے۔

اسی روز یعنی ۲۹ر رمضان المبارک کی شب میں بعد عشا سپرد خاک کیے گئے۔ مرحوم کی عمر ۷۳ سال تھی۔ بڑے پابند صوم و صلوٰۃ تھے۔ مبارک دن انتقال فرمایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پسندیدہ اشعار

- اس عنوان کے تحت خریداروں کا ارسال کردہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے
- شعر عنوان کے مطابق، سنجیدہ، پاکیزہ اور موزوں ہو۔
- شعر ۲۰ تاریخ تک ضرور وصول ہو جانا چاہیئے۔ خریداری نمبر ضرور لکھیں۔
- جنوری کے لیئے عنوان ہے "اثر"، فروری کیلئے "فرصت"

ہر گھڑی ان کا تصور ہر گھڑی ان کا خیال
دل انھیں کو دے دیا اب جان بڑی مشکل میں ہے

مرسلہ:۔ ریحانہ تبسم (وانمباڑی)

کبھی کبھی کے تصور سے جی نہیں بھرتا
مرے خیال میں آؤ تو بار بار آؤ

مرسلہ:۔ ساجرہ نسرین لاری (مئو ناتھ بھنجن)

آیا ہی تھا خیال کہ آنسو نکل پڑے
آنسو کسی کی یاد سے کتنے قریب ہیں

مرسلہ:۔ صوالی صبیحہ عاشی

تو نہیں ہے ترا خیال تو ہے
یوں بھی فردوس درکنار ہوں میں

مرسلہ:۔ ساجدہ بیگم (بنگلور)

مرے ندیم وہ لمحات کتنے دلکش ہیں
ترے خیال میں جب ہم اداس ہوتے ہیں

مرسلہ:۔ مس زبیدہ فضلی (رامپور)

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں
خیالِ رزق ہے رزاق کا خیال نہیں

مرسلہ:۔ ہاجرہ منصور (کلکتہ)

تنہائیوں میں بھی مجھے محسوس یہ ہوا
تیرا خیال ساتھ ہے تنہا نہیں ہوں میں

مرسلہ:۔ نسیم شاہدہ بلیاوی (جھریا)

حریم کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

مرسلہ:۔ محمد اسلم (منگولی)

خیال و فکر کی شیشہ گری میں کچھ بھی نہیں
یقیں نہ ہو تو فقط آگہی میں کچھ بھی نہیں

مرسلہ:۔ عصمت آرا (بانکا)

ترے خیال کی جب دل نے روشنی ڈالی
رہِ حیات میں ہم نے نہ تیرگی پائی

مرسلہ:۔ شاہینہ بیگم (کانپور)

خوب ہے یہ خیال کی دنیا، نقش ماضی جہاں ابھرتے ہیں
دل کی بے رنگ و نوروادی سے، یاد کے قافلے گذرتے ہیں

مرسلہ:۔ نگار سلطانہ جلیلی قمر لطیف (آمبور)

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا
ہر برگ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا

مرسلہ:۔ شموئنہ روحی (حیدرآباد)

اس قدر اجنبی نہ بن اے دوست
رسم دنیا کا بھی خیال نہیں

مرسلہ:۔ طلعت فاطمہ (گوموہ)

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا ہجر کی رات ڈھل گئی

مرسلہ:۔ سرمدی خانم (میسور)

بھٹکا ہوا خیال ہے میرا ترے بغیر
رہ کر وطن میں بھی ہوں غریب الوطن ابھی

مرسلہ:۔ روحی اختر (آرہ)

ان کا شباب دیکھ کے آتا ہے یہ خیال
دنیا میں اب شباب کسی پر نہ آئے گا

مرسلہ: امروزجہاں (آرہ)

ہاں تم کو بھول جانے کی کوشش کریں گے ہم
تم سے بھی ہو سکے تو نہ آنا خیال میں

مرسلہ:۔ قرۃ العین (ننداپال)

خیالِ یار ہے اک حسن و عشق کی دنیا
مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی

مرسلہ:۔ نجم السحر (کرنول)

خیالِ ترکِ محبت کی خیر ہو یارب
کچھ آج مست نگاہوں کی روشنی کم ہے

مرسلہ:۔ نجمہ انصار شا (بھٹکل)

اتنا رہے خیال ستانے کے ساتھ ساتھ
ہم بھی بدل رہے ہیں زمانے کے ساتھ ساتھ

مرسلہ:۔ بسیٰ زکریا۔ یاسمین (کونور)

رہنے دے جستجو میں خیالِ بلند کو
حیرت میں چھوڑ دیدۂ حکمت پسند کو

مرسلہ:۔ فہمیدہ پروین (کرنول)

درد کی رت میں خیال یار کے کھلتے ہیں پھول
آنکھ سے گرتی ہے شبنم پیار کے کھلتے ہیں پھول

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (بنگار اپیٹ)

کس کا خیال کون سی منزل نظر میں ہے
مدت گزر گئی کہ زمانہ سفر [illegible] ہے

مرسلہ:۔ کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)

روز آتا ہے مرے دل کو تسلی دینے
تجھ سے تو دشمن جاں تیرا خیال اچھا ہے

مرسلہ:۔ شمع نور الصباح (اوڈی اڈلیہ)

میں ترے خیال میں کھو گیا مجھے دو جہاں کی خبر نہیں
ترا درد میرا سکون ہے ترا درد میرا قرار ہے

مرسلہ:۔ نجمہ ایوب (علی گڈھ)

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

مرسلہ:۔ بی ثمینہ پروین و شوانہ پروین (آمبور)

خیال ہی نہیں آیا ترے نہ آنے کا
کچھ اس خلوص سے ہم محو انتظار رہے

مرسلہ:۔ شمیم ناز (بنگلور)

تری بے رخی سے اگر یہ خیال دل میں گذرا
تری آرزو نہ ہوتی تری آرزو نہ کرتے

مرسلہ:۔ گوہر فاطمہ (آرہ)

بقیہ مضمون عورت کا رومان اور اس کا المیہ

محبت نہیں کرتے تھے، لیکن محبت تو ایسی باتیں بھی سمجھ لیتی ہے جو زبان تک نہ لائی جائیں ـــ میری آنٹی کو احساس تھا کہ اس کے باپ اس سے بہت محبت کرتے ہیں، یہ دوسری بات تھی کہ اس کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ میری آنٹی کو اپنے باپ سے بھی بے پناہ الفت تھی۔ لیکن باہمی چاہت شاید بیچاری میری آنٹی کی قسمت میں تھی ہی نہیں۔

آئندہ قسط میں آپ پڑھیں گی جس طرح ہر اس شخص نے جس سے میری آنٹی نے محبت کی اپنے اسے ٹھیس پہنچائی، اسی طرح اسکے والد نے بھی اسکی محبت کو ٹھکرادیا۔ (باقی آئندہ)

کیا مطلب؟" ان کی آواز اونچی ہو گئی۔

بھائی صاحب آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اسی سے میری گردن؟"
ممی کہہ ہی رہی تھیں کہ بڑے ابا دفعتاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ چہرہ سرخ تھا
ہونٹ بھینچے ہوئے یکبارگی انھیں غصہ آ گیا تھا! ممی فوراً سمجھ گئیں ان کا
جواب معقول نہ تھا۔ بس پھر جیسے ہی وہ ایک جھٹکے سے مڑے۔ ممی دونوں
ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

معاف کر دیجئے بھائی صاحب۔ میری بات آپ کو بری لگی ہے۔ مگر میرا
دماغ ماؤف ہے۔ میرا منشا یہ نہیں تھا بھائی صاحب کہ آپ کا دل دکھے!
وہ دفعتاً پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

میرا تم پر کوئی احسان نہیں فاطمہ بی بی۔" بڑے ابا نے اپنا ہاتھ ان
کے سر پر رکھ دیا۔

اگر سلمان ناوقت تمھارا ساتھ نہ چھوڑ جاتے۔ دل تو تمھارا دکھا ہے
نہ رو۔ بی بی۔ نہ رو۔ ہمارا سب کچھ تمھارا ہے۔ ہم تمھیں اپنی بیٹی
سمجھتے ہیں۔"

اور ان کی آواز رندھ گئی۔ عینک کے شیشے دھندلا گئے۔ انھوں
نے یکبارگی خاموش ہو کر دو تین دفعہ ممی کے کندھے پر تھپکی دی اور پھر
مڑ کر باہر چلے گئے۔!

دالان میں سناٹا چھا گیا۔

بھابی: چند لمحوں بعد چچی جان کی روتی آواز گونجی۔ رحمٰن صاحب بھی
کھنکارے۔ بھابی نہ رو دیئے۔ آیئے بیٹھیے: انھوں نے اٹھ کر ممی کا بازو تھاما اور
تخت پر لا بٹھایا۔! چچی جان نے ممی کو سینے سے لپٹا کر ان کے آنسو پونچھے۔ (باقی آئندہ)

پھر یہ کہ مجھے بتایئے: میز پر گھونسا مار کر سنجر نے کہا: ہفتہ بھر سے یہ جو گھسیانی سی
آپ نے مجھ سے روا رکھا ہے۔ یہ کہاں تک آپ کے لیے جائز تھا۔

گھسیارہ پن۔؟- باجی نے آنکھیں نکالیں: سچ کہتی ہوں۔ ایک ہاتھ میں
سارے دانت حلق میں اتار دوں گی!

"آپ؟؟؟" بے حد استہزائیہ انداز میں ہنس کر سنجر نے کہا۔

جی!!!"

ارے جایئے!

سنجر صاحب۔ آپ کی زندگی تلخ کر دوں گی۔!"

دفعتاً وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور باجی کے پاس گھٹنے ٹیک کر ان کے ہاتھ اپنے
ہاتھوں میں لے لیے اور بے باکی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

آپ نے مجھ سے میرے رونے کی وجہ نہیں پوچھی؟؟"

کیا پوچھتی۔ تمھاری رات کی بپتا کچھ کم تھی؟" ان کے نرم و ملائم ہاتھ سنجر
کے مضبوط ہاتھوں میں مچلے۔ مگر اس نے جان بوجھ کر گرفت سخت کر دی۔

نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک آپ پوچھ نہ لیں گی۔

کیوں رو رہے تھے۔؟" وہ بے ساختہ ہنس دیں۔ اور ایک جھٹکے سے ہاتھ
چھڑا لیے۔

آپ کی خاموشی اور خفگی کا بہت بوجھ تھا میرے دل پر۔!

سچی؟۔

برداشت نہیں کر سکا۔!

بالکل الّو ہو۔

میری تو وہی بات ہے ـــ

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے۔

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔"

"بس ایسے ہی اچھے لگتے ہو۔ پھر کبھی بدتمیزی نہ کرو گے تو خاموش کبھی نہ رہا کروں گی۔"

"کیا میں آپ کا بھائی نہیں؟"

"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"تو پھر میرے اس دن والے فقرے پر اس قدر برا کیوں مانا تھا آپ نے؟"

"سنجر اب زیادہ سرمست کھاؤ۔ میں نے سچ مچ دو دن سے کچھ نہیں کھایا!"

"اور کیا کھیئے گا۔ آپ جانتیں ہی نہیں کہ آدمی کیا چیز ہے۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اپنے دل پر رکھا ہوا بوجھ باجی کے دل پر رکھ کر۔ انھوں نے پھر قلم بند کر دیا اور پھر کرسی کی پشت سے سر ٹیک کر سوچنے لگیں۔ سچ مچ آدمی کیا چیز ہے؟

اب وہ ہشاش بشاش تھا!

رحمان صاحب واپس آ گئے تھے اور اپنے گھر کا آدھا سامان جو قیمتی زیادہ تھا لے آئے تھے! سنجر پر نگاہ گئی تو وہ یکبارگی غصہ ہو گئے!

"سچ ہی تو کہہ رہے تھے بھائی صاحب۔ تم اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر اپنی ذمہ داریوں کا تمھیں کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ کیا یہ تمھارا فرض نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ چلتے اور میرا ہاتھ بٹاتے! پھر وہ چمکائے "تم چور بھی ہو۔ میرے پچاس روپے نکالے ہیں تم نے؟"

بڑے ابا۔ آپا۔ پ۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے۔ تم مجھے۔ باہر بھجوا دیں گے"

سنجر نے پرُسرت لہجے میں پوچھا: "کب بھجوائیں گے۔" "بڑے ابا کہتے تھے ایم ایس سی کے بعد۔" خشک لہجے میں کہہ کر انھوں نے ممی سے پوچھا "بی بی تم نے جواب نہیں دیا؟"

ممی سرنگوں تھیں۔ کیا جواب دیتیں۔ ڈھائی تین سال ہو چکے تھے ان کے شوہر کے انتقال کو۔ ان کے بعد سے ایک ایک پائی کا بار بڑے ابا ہی نے برداشت کیا تھا چونکہ سلمان صاحب اپنی ملازمت کے دوران ہی میں ختم ہوئے تھے اس لیے ان کی بہت قلیل پنشن جو نہ ہونے کے برابر تھی ممی کو ملتی تھی! اس کا بڑا شدید احساس تھا انھیں۔ مگر بڑے ابا جو اکیلے آدمی تھے۔ بڑی اونچی پوسٹ ہولڈ کرتے تھے۔ اچھی تنخواہ پاتے تھے۔ وہ سب کی سب ایک لفافہ میں رکھ کر اپنے ملازم کے ہاتھ سے ممی کو بھجوا دیتے تھے کبھی انھوں نے ایک پیسے کا حساب نہ لیا تھا نہ اس معاملہ میں دخل دیا تھا کہ ممی نے کیا رکھا کیا اٹھایا! تنخواہ کے علاوہ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ دیا ہی کرتے تھے جس مکان میں وہ سب رہتے تھے۔ بڑے ابا ہی کا تھا۔ انھوں نے بیوہ بھاوج کو خرید دیا تھا۔ ممی کو پورا احساس تھا۔ اگر بڑے ابا اتنی امداد نہ کرتے تو ان سب کا نجانے کیا حشر ہوتا!

اور اب۔ ان کی مزید مراعات۔ ان کا دل بھر آیا۔ آواز گھٹ گئی۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔ فاطمہ بی بی": وہ پوچھ رہے تھے۔

"بھائی صاحب۔ میرا سر جھکا ہوا ہے آپ کے سامنے۔ میں آپ کو کیا جواب دوں": وہ بولیں۔

"اتنی جلدی ۔ ؟" چچی جان نے دبی زبان سے کہا ۔

"فاطمہ بی بی ؟" بڑے ابا نے ممی کو مخاطب کیا ۔

"جی ۔ بھائی صاحب !" ان کی مری مری سی آواز نکلی ۔

"ہم تم سے پوچھنا بھول گئے کہ تمھارے پاس ماشاءاللہ نوشینہ بی بی کے جہیز کا سارا سامان تیار ہے کہ ابھی کچھ کسر رہ گئی ہے ۔ ؟"

"ملبوسات اور زیور سب تیار ہیں ۔ بھائی صاحب" ممی نے جواب دیا ۔ "فرنیچر وغیرہ خریدنا تھا اس خیال سے کہ گھر پر رکھے رکھے گرد آلود نہ ہو جائے ۔ خریدا نہ تھا ۔ وہ اب لے لوں گی ۔ مگر ۔!"

"کہو بی بی ۔ رک کیوں گئیں ؟"

"ڈپازٹ کی رقم ملنے میں تین ماہ کی مدت اور باقی ہے !"

"تم سے کس نے کہا ہے کہ تم ڈپازٹ رقم نکلواؤ ۔!"

وہ چپ رہیں ۔!

"تم سمجھتی ہو کہ اس قسم کے اخراجات کا سارا بار ہم نے صرف تمھی پر ڈال رکھا ہے" انھوں نے کہا "لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ ہمارے پاس دونوں بچوں کے نام سے روپیہ رکھا ہے ۔ تم کو جب بھی ضرورت ہو ۔ کہہ دو ۔!"

"دونوں بچے ۔ ؟ ؟" حیرت سے رحمٰن صاحب نے کہا ۔

"ہاں میاں ۔ نوشینہ بی بی کے بیاہ کے لیے ۔ اور سنجر میاں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھجوانے کے سلسلے میں ۔ روپیہ ہم نے محفوظ رکھا تھا" انھوں نے کہا "آدھے حصے کی تو فی الفور ضرورت پڑے گی ۔ تمھاری کیا رائے ہے ۔ رحمان میاں [illegible]

ڈیڈی ۔ بڑے ابا نے یہ بھی تو کہا تھا کہ آپ ہی نے میری تربیت ناقص کی ہے ۔" سنجر نے جواب دیا ۔

"شاباش ہے تمھاری بے ادبی کو" ممی نے بگڑ کر کہا ۔

"بڑی امی ۔ اکلوتے لاڈلے بچے اسی طرح خراب ہو جاتے ہیں ۔" سنجر نے کہا ۔

"بھائی صاحب سے کہہ کر سچ مچ پٹوا دوں گی اگر چپ نہ رہو گے ۔" چچی جان نے اسے لال پیلی آنکھیں دکھائیں ۔ مگر وہ مسکراتا رہا ۔ ان کا ادب تو اس نے آج تک کیا ہی نہ تھا انھیں اپنی برابر والی سہیلی سمجھتا تھا ۔ وہ تھیں بھی ایسی ہی ۔ سادہ لوح ۔ بگڑ کے جلدی سے من جانے والی ۔ ہلکے پھلکے الفاظ میں برا بھلا کہتی رہیں کہ چوری نہایت بری بات ہے ۔

"ادھر کے بڑے ہزار کمرے خالی ہیں ۔ رحمان بھیا" ممی کھلی پڑ رہی تھیں ۔ "اپنے لیے درست کرلو ۔ اے اللہ ۔ برسوں کی تمنا آج پوری ہوئی ہے ۔ بھائی صاحب کو خدا ہزاری عمر دے ۔ وہ میرے دل کی آرزو جان گئے ۔ سچ سچ ۔ میرا تو دل ہی قابو میں نہیں ۔"

ان لوگوں کو اپنے طفلانہ چونچلوں میں مگن چھوڑ کر وہ چپکے سے سرک گیا ! ۔ اپنے کمرے میں آکر مٹھائی کا ڈبہ اور کیڈبریز کا موٹا سا پیکٹ لیا ۔ اور آہستہ سے امرینہ کے کمرے میں قدم رکھے ۔!

وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لمبے لمبے بالوں میں برش کر رہی تھی ۔ ڈوپٹہ اتار کر تکیہ پر ڈال دیا تھا ۔

دفعتہً آئینے میں وہ سنجر کو دیکھ کر پلٹی ۔ اور [illegible]

تلاش کرنے لگی۔ اسے سخت غصہ آرہا تھا۔ اجڈ گنوار وحشی کہیں کا۔ آواز دے کر اندر نہیں آتا۔

سنجر نے آگے بڑھ کر ڈوپٹہ اٹھایا اور بے حد ادب سے اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس حرکت سے امرینہ کو اور بھی آگ لگ گئی۔ بالوں کو پیچھے جھٹک کر اور ڈوپٹہ کندھوں پر برابر کر کے سنجر پر غرائی۔

"کیا کسی کے کمرے میں یونہی گونگے بن کر گھس آتے ہیں؟"

"کسی کے کمرے میں آواز دے کر جاتا ہوں۔ مگر یہ تو تمہارا کمرہ ہے۔"

"تو کیا؟" غصے کی زیادتی سے امرینہ کی آواز بیٹھ گئی۔

وہ اطمینان سے آگے بڑھا اور دونوں چیزیں میز پر رکھ کر کرسی میں گر کر کراہا۔

"میں پوچھتی ہوں آپ ـ!"

"تمہارے پوچھنے سے پہلے ہی بتاتا ہوں۔" سنجر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے کل پیار سے فرمائش کی تھی! مٹھائی لا کے نہیں کھلاتے شرٹ کا پیس تک نہیں لاتے۔ لہذا مٹھائی اور چاکلیٹ حاضر ہیں شرٹ کا پیس آج لے آؤں گا۔ رات والے آپ کے کارنامے کی داد دینی تھی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرنا تھا۔ میں نے سوچا کہ دیر ہونے سے کہیں آپ برا نہ مانیں۔ اس لیے حاضر ہو گیا۔!"

"ذرا سی بات پر آپ کے تلوؤں سے لگتی ہے اور تالو پر بجھتی ہے" امرینہ نے بے حد غصے سے جواب دیا۔ "اور آپ کسی کو بھی کچھ کہہ دیں تو بس [illegible] ـ!"

"میں اگر دیر ہو جائے تو ضروری کام رہ جائے گا۔ دونوں "بچیاں" تو دالان میں موجود ہوں گی۔"

وہ ہمیشہ بھابی اور چچی جان کو "بچیاں، لڑکیاں" ہی کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ چالیس سے اونچی عمروں کی خاصی بھاری خواتین تھیں۔

"جی ہاں۔ دونوں موجود ہیں۔ تشریف لائیے!"

بڑے ابا دالان میں آئے۔ اور بڑی کرسی پر بیٹھ گئے!۔ انھوں نے پہلے جیب سے رومال نکال کر چہرہ پونچھا۔ چشمے کے شیشے صاف کیے اور پھر کھانس کر رحمٰن صاحب کو دیکھنے لگے۔!

"آج یونیورسٹی میں ہمیں قاسم میاں کا خط ملا تھا۔"

چپکے سے نوشینہ پیچھے سرکی اور پھر برآمدے میں بھاگ نکلی!۔

"جی۔!" رحمان صاحب نے لقمہ دیا۔

"غالباً انھوں نے اپنی والدہ محترمہ کو بھی مطلع کیا ہے۔" بڑے ابا نے کہا۔ "وہ اسی ہفتہ آرہے ہیں۔"

"اسی ہفتے؟" دو تین ملی جلی آوازیں ابھریں۔

"ہاں۔" بڑے ابا بولے۔ "ان کے لیے بڑی مجبوری آپڑی ہے ـــ ٹریننگ کے اختتام کے بعد بحیثیت پرچیزنگ آفیسران کا تقرر سال بھر کے لیے الہ آباد ہی میں ہو گیا ہے۔ لہذا وہ صرف شادی کے لیے ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر آئیں گے۔ اور پھر۔ یہ انھوں نے ہماری مرضی پر چھوڑ دیا ہے کہ ہم ان کے ہمراہ نوشینہ کو بھی روانہ کر دیں یا جو ان کی والدہ محترمہ کو منظور ہو!؟"

دو ہفتوں کی مہلت تو ہوگی نا بہن؟" رحمٰن صاحب نے پوچھا۔
"ہاں۔ ابھی تو وقاص ہی نہیں آئے۔ شاید ان کے آنے کے بعد آئیں گی" چچی جان بولیں۔
"خیر جب وقاص میاں آجائیں تو آپ مجھے فوری ایک خط لکھ دیجئے گا۔ میرے اکثر ساتھی تقریباً روز ہی باٹکا را دھر ادھر جاتے رہتے ہیں۔ کسی کے ساتھ چلا آؤں گا۔"
"چچا جان۔ آپ کیوں نہ ایک کار خرید یئے" امرینہ چہکی۔
"ضرور خریدیں گے بیٹی۔ تمہاری چچی جان کرایہ جمع کر رہی ہیں۔ وہ پچاس ساٹھ ہزار جمع کر کے ہمیں دے دیں گی تو اسی وقت جاکے خرید لائیں گے۔" رحمٰن صاحب بولے۔
دفعتاً کمپاؤنڈ میں خلاف توقع مخصوص کار کا ہارن گونجا۔ وہ سب چونک پڑے۔ ایک ملازم بھاگتا ہوا آیا اور اطلاع دی۔
"بڑے سرکار آرہے ہیں۔"
"بھائی صاحب آرہے ہیں" رحمٰن صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں خواتین ڈھنگ سے آنچل اوڑھ کے با ادب ہو بیٹھیں۔ نوشینہ اور امرینہ دور سرک گئیں۔ سنجر دالان کے گوشہ میں پڑی کرسی پر ٹک گیا!۔
بڑے ابا دروازے کے پاس آکے کھنکھارے۔ رحمٰن صاحب نے آگے بڑھ کر جلدی سے پردہ سرکا دیا۔ اور مودبانہ انداز میں پوچھا۔
"خدا کے فضل سے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہوگی بھائی صاحب۔ خا... واقعہ آپ اس وقت تشریف لائے ہیں۔"
"بیٹھے۔ ہم نے سوچا کہ۔ شاید تم آج جا رہے ہو۔ پھر تمہاری واپسی

لڑائی جھگڑے میں پیچھے نہیں ہٹتا۔ آجاؤ میدان میں۔"
"میرا مذاق کیوں اڑایا تھا آپ نے؟"۔
"میں نے؟"۔
"ہاں۔ آپ نے۔ باجی کے سامنے۔!" وہ تو بس بپھری جا رہی تھی۔
"خدا سے ڈرو۔ الزام لگا رہی ہو۔!" سنجر کی یہ حالت تھی کہ ہنسی کا ضبط کرنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔
"بلاؤں باجی کو۔ ہمت ہے ان سے مکرنے کی؟؟"
"باجی کی بچی چلائی۔ کیا میں انہیں بزرگ سمجھتا ہوں؟ کیا وہ میری پردادی ہیں"
"پھر ڈرتے کیوں ہو ان سے؟"
"میری بلا ڈرے۔ بیوی" سنجر بولا "ہاتھوں میں چوڑیاں انہوں نے پہن رکھی ہیں کہ میں نے؟"
"وہ سب آپ جانیں باجی جانیں۔ میں آپ سے صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ"
"صاف صاف نہ کہو بھئی کچھ تو لگی لپٹی رکھو۔ صاف صاف کہنے والے اول درجہ کے منہ پھٹ سمجھے جاتے ہیں!" وہ اس انداز میں مسکرایا کہ امرینہ کے اور چنگاریاں لگیں!۔ بڑے طیش میں جھکی اور سنجر کی لائی ہوئی چیزیں اس کی گود میں پھینک دیں۔
"نہیں چاہیئے مجھے آپ کی رشوت!۔ آپ فوراً میرے کمرے سے نکل جائیے"
"نکل جائیں گے بھئی۔ تم نے اس کمرے کا کرایہ نامہ لکھوا لیا...

آتے ہیں۔ گھر بھر میں اکھاڑ پچھاڑ مچی ہے۔ شور سن رہی ہو۔ بڈھوں کا بچگانہ شور۔ لاحول ولا قوۃ۔ تھوڑی دیر سکون سے آرام کر کے ہم چلے جائیں گے!۔

اس نے اطمینان سے میز پر پاؤں پھیلا دیے۔ امرینہ کے غصے کی پرواہ نہ کر کے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔ اور مٹھائی کھانے لگا!۔

بھوکی شیرنی کی طرح وہ اسے گھورتی رہی۔

نظر نہ لگا دینا۔ ایک آدھ گلاب جامن تم بھی لے لو۔

پھینک دوں گی۔ سڑی ہوئی مٹھائی سڑک پر۔!

محترمہ۔ رات کو آپ نے مجھے جو دھکا دیا۔ اور بڑے ابا کے جوتے کھلوائے۔ اس کا انعام کیا دوں آپ کو۔ پھینک دوں آپ کو اٹھا کر سڑک پر۔!

صورت دیکھی ہے آئینہ میں!۔

آئینہ مجھ سے یہ کہتا ہے کہ کوئی تجھ سا نہیں زمانے میں۔ اب یہ بتایئے کہ آئینہ دیکھ کر آپ کیا سوچتی ہیں؟۔

گھوم پھر کے وہی بات آ گئی۔ جس سے امرینہ کی ہڈیاں جلتی تھیں وہ سی جانتی سے اس نے یہ بات نکالی بھی تھی۔ بس اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ یکبارگی جھپٹ پڑی اس پر۔ مٹھائی کھٹائی پھینکی فرش پر اور بازو میں ناخن چبھو دیے۔ سی سی کر کے سنجر نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ لیکن امرینہ نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ جو چھڑایا تو اس کی ایک چوڑی ٹوٹ کر سنجر کی کلائی میں دھنس گئی۔! اور یکبارگی بہت سا خون امرینہ کے [illegible] گیا۔ خود بخود اس نے سنجر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور خائف

کیا کہنا ہے؟

باجی۔ آپ۔ یونہی۔ مطلب یہ کہ۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ذرا کف الٹ کر دیکھ لیجئے گا کہ زخم گہرا تو نہیں ہے۔ سنا ہے کہ بعض زخموں میں سیپٹک ہو جاتا ہے۔

اوہو۔!! نوشینہ نے آنکھیں نکالیں

خدا قسم باجی۔ بس میں چاہتی ہوں کہ۔ وہ میرا نام نہ لے دیں اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔!

دوپہر خوشگوار تھی۔ کچھ دیر بارش کے بعد چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔ درختوں کے سرسبز پتوں پر جما ہوا پانی کرنوں میں جھلملا رہا تھا۔ زمین سے سوندھی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی!۔ بڑے بڑے گملوں پر گلاب کھلے ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔

اور چمکیلے آسمان کے ایک گوشے میں دھنک مسکرا رہی تھی۔

اور دوپہر اس لیے ناگوار بھی تھی کہ رحمان صاحب واپس ہونے پر جانے والے تھے۔ ان کا سوٹ کیس ریڈیو کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اور خانساماں ان کا ناشتہ تیار کر رہا تھا!۔

بھیا۔ جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ ممی بولیں۔ بڑی آپا کا رقعہ ملا تھا۔ وہ جانے کب چلی آئیں۔ بھائی صاحب سے گفتگو کرنے والی ہیں۔ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہ آئے گا۔

"وہ پہلے آپ کیا کہہ رہی تھیں" امرینہ نے موضوع بدلا "گھر میں
بہت کی چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔؟"

"چچا جان اور چچی جان کی مستقل آگئے ہیں نا۔ ممی بھی بے انتہا
خوش ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان سب میں میری نظر لگی جاتی ہے!"

"وہی تو میں کہہ رہی تھی" امرینہ بولی "گہما گہمی اور شور پکا لیے
زمانہ تو مہینہ بھر بعد آئے گا! سنا ہے کہ دادی اماں بھی بات چیت
کے لیے آنے والی ہیں"

"تمہاری اور سنجر کی بات چیت کے لیے؟؟"

"توبہ۔ آپ کتنی بری ہیں۔ آپ کی اور وقاص بھائی کے سلسلے میں
ہو تو چکی بات چیت!" نوشینہ نے شرارت سے کہا۔

"ہاں اب آپ کو یہ انتظار ہے کہ وہ کھوپڑی پر سہرا لپیٹ کے آئیں
اور آپ کو دن دہاڑے گھسیٹ لے جائیں" امرینہ جل کر بولی۔

نوشینہ بھی اسے چھیڑنے پر تل گئی تھی۔ سوکھے منہ سے بولی "کہاں کا
ہرا باجہ بجے۔ وہاں تو شرع کا معاملہ ہے۔ سب کچھ چپ چپاتے!"

"میں ممی سے کہوں گی۔ آپ کو سہرے اور باجوں کا ارمان بھٹ
[illegible] ہے"

"کب ہوگی؟"

"اے باجی آپ آج کیسی باتیں کر رہی ہیں!"

"پھر کیا کیا جائے۔۔۔ نہ تم وقاص صاحب کا تذکرہ پسند کر رہی ہو
نہ سنجر صاحب کا! پھر تم سے کیا باتیں کریں؟"

"اب میں کہوں گی تو آپ مجھ پر پھبتی کسنے لگیں گی۔"

ہو کر الگ ہٹ گئی!

سنجر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنا ہاتھ نیچے جھکا دیا۔ ٹپ ٹپ کر کے خون
کے قطرے زمین پر گرے!

"تم نے شہ رگ کاٹ دی" وہ بولا "اب میرا بچنا محال ہے"

"آپ۔ آپ" امرینہ ہکلائی۔ سارا غم و غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا

"معاف کر دینا میرا کہا سنا" سنجر نے اسے اور دہلا دیا اور کمرے
سے نکل کر چلا گیا!

"یہ میں نے کیا کیا۔ میرے خدا۔" سر تھام کر وہ اسی جگہ فرش پر
بیٹھ گئی جہاں خون کے قطرے گرے تھے! دھندلی نظروں سے اس
نے دروازے کی طرف دیکھا اور اپنے رومال میں وہ خون پونچھ لیا۔

رات تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ بس انتظار ہی کرتی رہ گئی
کہ اب کوئی آئے گا اور سنجر کے شدید بخار اور خطرناک سرسام کی خبر
دے گا! پھر وہ کیا کرے گی۔ اے اللہ چچی جان کا وہ ایک ہی بیٹا ہے
خدا نخواستہ۔ اگر۔ ویسے سات ہوتے تو کچھ نہ تھا۔ اگر ایک سرک
جاتا تو وہ دوسروں کو دیکھ کر صبر کر لیتیں۔ لیکن یہاں تو۔ بڑے ابا
کیا کہیں گے۔ آخر یہ ہاتھا پائی اس کی سی شریف اور سنجیدہ لڑکی نے
اپنے بڑے بھائی سے کی ہی کیوں تھی بھلا۔ لوگ غلط سلط باتیں بھی تو سوچ لیتے
ہیں۔۔۔؟ وہ کمرے میں بند تھی۔ اور سوچ سوچ کر خون سکھا رہی تھی!

مغرب کے وقت باجی اندر آئیں۔ امرینہ کا منہ فق ہو گیا۔ یہ تبدیلی
باجی سے پوشیدہ نہ رہی۔ اسے گھور کر بولیں۔

"کیا ہوا ہے تمہیں۔ کیوں چور بنی بیٹھی ہو۔ ادھر آ سی گھما گھمی بھی

ہلچل ہوئی تمہارے کان پر جوں تک نہ رینگی!۔

"کیا ہوا؟"

"پوچھو کیا نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب؟۔"

"بے چارہ سنجر۔!" وہ اس کی مسہری پر آکر لیٹ گئیں۔

"سنجر۔ کیا ہوا انہیں" امرینہ کا دل دھک سے ہو گیا۔

"بے چارہ۔!"

"کیا بنے چارہ بے چارہ۔ کچھ آگے بھی تو کہیئے" وہ ان کے پہلو میں بیٹھی۔

"بری حالت ہے اس کی۔!"

"خدانخواستہ۔ بخار اور۔ زہرباد تو نہیں ہے۔!"

"اس سے بدتر۔!"

"اس سے بدتر" امرینہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اسے اپنے بستر پر لیٹا ہوا گم صم سنجر دکھائی دیا۔ کمرہ سنجیدہ اور خوفناک ڈاکٹروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ لوگ اس کے ایمرجنسی آپریشن کی تیاری کر رہے تھے اور لان پر ایمبولنس کھڑی تھی۔ چچی جان پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ چچا جان سسک سسک کر رو رہے تھے۔ سنجر کو امرینہ نے قتل کر دیا تھا۔!

قریب تھا کہ وہ غش کھا جاتی۔ مگر باجی نے جلدی سے کہا "نظر بند ہو گیا ہے نہ کہیں آسکتا ہے نہ جا سکتا ہے۔ چچا جان نے کہہ دیا ہے کہ اس کے ذمہ دار بڑے ابا ہیں وہ نواب کی اس کی کسی بیہودگی پر سے بے خبر رہے!۔"

[illegible] امرینہ پر پڑیں۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھیں۔

امرینہ کا چہرہ سفید بے رنگ تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے اور بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔!

"کیا ہوا۔؟" نوشینہ بھونچکا ہو کر بولی۔

اس کے آنسو گالوں پر ڈھلک گئے۔ ایک سسکی سی لبوں پر مچلی۔

"روتی کیوں ہو؟۔"

"باجی۔ آپ نے۔ میری جان۔ ہی نکال لی تھی۔!"

"میں نے بھلا کیا کیا ہے؟۔" نوشینہ متحیر تھی۔!

اور تب امرینہ نے کھسیا کر جھینپ کر وہ سب باتیں اپنی باجی سے کہہ دیں۔

"میں سمجھی!" نوشینہ نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ اور دانت پیس کر بولیں "کلن! تمہیں اس شیطان سے یقیناً محبت ہو گئی ہے"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں" وہ سر سے پاؤں تک سرخ ہو گئی۔

"پھر ایک موہوم سے اندیشے سے متاثر ہو کر آپ نے گریہ وزاری کیوں فرمائی تھی"

"سچ سچ دیکھئے تو ان کے ہاتھ سے کتنا بہت سا خون نکلا تھا" امرینہ بولی اور دراز سے وہ رومال نکال کر ثبوت کے طور پر دکھایا جو خون میں سن گیا تھا۔!

"اس کا تعویذ بنا کر رکھ لو۔ شہید الفت کا خون ہے۔ کبھی نہ کبھی رنگ لے ہی آئے گا۔!"

"اب یہ فضول باتیں آپ ان کے سامنے نہ کہہ دیجئے گا۔!" امرینہ بولی

"کیا تمہارا لگایا ہوا زخم بھی نہ دیکھوں" نوشینہ نے [illegible] سے پوچھا۔

786

Price Rs. 20

عفت موہانی